اوراق
افسانہ نمبر
وزیر آغا

شکم سیر لوگ فاقہ زدہ چہرے

فعلِ ہضم درست نہ ہو تو اچھی سے اچھی غذا بھی جزوِ بدن نہیں بنتی جس کی وجہ سے صحت متاثر ہوتی ہے، چہرے کی رونق ماند پڑ جاتی ہے اور آدمی سو بیماروں کا ایک بیمار دکھائی دینے لگتا ہے۔

اپنے نظامِ ہضم کا خاص خیال رکھیے، پرخوری سے بچیے، زیادہ چٹپٹے اور مرچ مسالے دار کھانوں سے پرہیز کیجیے۔

بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن اور تیزابیت کی صورت میں کارمینا استعمال کیجیے۔

کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
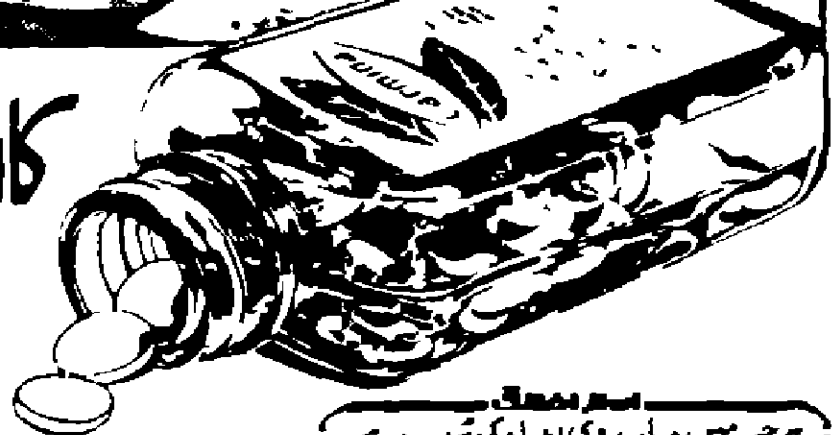
Adarts CAR 5/84

ٹیلیفون: لاہور: ۳۷۰۷۲۶ - ۱۱۵ سرور روڈ لاہور چھاؤنی
سرگودھا: ۹۵۰۷۸۱ - سول لائنز سرگودھا
مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں
ماہنامہ
اوراق
لاہور
جون، جولائی سنہ ۱۹۸۸ء
مدیران
وزیر آغا
سجاد نقوی (اعزازی)
مدیر انتظامی
سلیم آغا قزلباش
جلد: ۲۳
شمارہ: ۶، ۷
چندہ سالانہ: ۱۰۰ روپے
قیمت فی پرچہ: ۶۰ روپے
مقام اشاعت
دفتر اوراق، چوک اردو بازار لاہور

ترتیبِ اوراق

انشائیہ اور انشائیہ نگاری

غزلیں

افسانے

PAINTING BY MOOJID PRINTING AT FUNOON PRESS LAH

پہلا ورق

اس بار ہم اپنی زیر اشاعت کتاب "تنقید اور جدید اردو تنقید" سے ایک ورق بطور اداریہ اوراق پیش کر رہے ہیں —
اس توقع کے ساتھ کہ اسے پڑھ کر اوراق کے وہ قارئین جو ادب کے تخلیقی عمل میں تنقید کی کارکردگی سے واقف ہیں، ہمیں اپنے موقف سے آگاہ کریں
[illegible] "آپس کی باتیں" کے تحت شائع کر کے قارئین اوراق کی وسیع تر برادری کو اس زرخیز موضوع کی طرف متوجہ کر سکیں [illegible]
تنقید نے یہ سوال بارہا کیا ہے کہ کیا ادب کی بوقلمونی اور تنوع کے عقب میں کوئی ایسا سسٹم، جوہر یا اصل الاصول نہیں ہے جسے شعریات
یعنی POETICS کہا جا سکے؟ — جواباً کئی نظریے ابھر کر سامنے آئے ہیں مثلاً یہ کہ ہر تخلیق ایک خود مختار اکائی ہے جس کا باہر کے
کسی جوہر یا سسٹم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ تخلیق غیب سے آتی ہے اور [illegible] "خیال" کا اظہار ہے جو مظاہر سے ماوراء
ہے۔ تیسرا یہ کہ خود تخلیق کا سٹرکچر ہی اس کی POETICS ہے۔ ساختیاتی تنقید نے بالخصوص اس نظریے کو اپنایا [illegible] اس بات
پر زور دیا ہے کہ تخلیق میں پہلے سے کوئی "معنی" موجود نہیں ہوتا بلکہ قرأت کے دوران نقاد یا قاری معنی کی تخلیق کرتا ہے اور یہ معنی زیادہ تر
متن کے چاک یا [illegible] نظر آتا ہے۔ اس کی مثال یوں دی گئی ہے کہ جس طرح ریشمی لباس کے چاک میں سے بدن کا کوئی حصہ نظر آجائے
تو اس کا اثر ECSTACY کی صورت میں مرتب ہوتا ہے بالکل اسی طرح جب قرأت کے دوران معنی کا لشکارہ جنم لیتا ہے تو قاری کو
ایک انوکھی لذت ملتی ہے۔ یہ عمل اس عارفانہ کیفیت کے مماثل بھی ہے جس کے دوران عارف، موجود کی [illegible] میں سے "ابدیت" کی جھلک
پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ مگر ساختیاتی تنقید کسی ماورا حقیقت [illegible] عقب میں موجود "جوہر" کا اقرار نہیں کرتی۔ تخلیق کے
بارے میں اس کا موقف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر کے سٹرکچر یا MODE سے وجود میں آتی ہے۔ رولاں بارت (ROLAND BARTHES)
نے اس سلسلے میں ایک مزیدار بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سٹرکچرل تجزیہ کوئی مخفی معنی دریافت نہیں کرتا بلکہ تخلیق تو پیاز کی طرح ہے جو پرتوں
(نقاطوں) پر مشتمل ہے، جس کا جسم کسی جوہر، کسی [illegible] لا اصل سے عبارت نہیں۔ وہ کچھ نہیں سوائے اپنی پرتوں کے ایک لامتناہی سلسلے
کے جو اپنی ہی سطحوں کی یکتائی (یعنی POETICS) کے سوا اپنے اندر کوئی شے نہیں رکھتا۔ —— ڈریڈا (DERIDA) نے اس ضمن
میں کہا ہے کہ جاننے کے دو طریق ہیں — ایک یہ کہ اس عظیم صداقت کو مانا جائے جس سے یہ سب کچھ عالم وجود میں آیا۔ دوسرا یہ کہ جو
سب کچھ موجود ہے اسے ایک فعال شے سمجھا جائے جو خود اپنی تخلیقی کارکردگی کا مظہر ہے اور عقب کے کسی سسٹم کی طالب نہیں ہے۔

(JONATHAN CULLER: STRUCTURAL POETICS)۔ دوسرے لفظوں میں ادب کی POETICS باہر کے کسی جوہر یا اصل الاصول کے تابع نہیں بلکہ خود اپنے "ہونے" سے مرتب ہوتی ہے۔

مختلف نظریات کی ان تمام تر موشگافیوں کے باوجود بات اُس بنیادی صورتِ حال کو پار نہیں کر پاتی کہ کائنات یا تو اپنے سے باہر کے کسی جوہرِ عظیم کی تخلیق ہے یا صرف خود ایک جوہر ہے جو ہمہ وقت شگفتگیِ ذات میں مبتلا ہے۔ مراد یہ کہ جوہر چاہے اصل الاصول کی صورت میں ہو یا شگفتگیِ ذات کی صورت میں، یہ نظریات اس کے ہونے کا اقرار ضرور کرتے ہیں، ہر چند ساختیاتی تنقید باہر کے جوہر کو تسلیم نہیں کرتی تاہم اندر کے جوہر، سسٹم یا POETICS سے اسے بھی انکار نہیں ہے ——— حقیقت یہ ہے کہ "تخلیق" بیک وقت تخلیق کار اور تخلیق کے قاری کی باہمی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔ اس کی حیثیت اس عمل کی ہے جس میں دو آئینے روبرو آکر محض ایک دوسرے کو منعکس نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کی قوتِ انعکاس کو بھی متحرک کرتے ہیں اور یوں امکانات کے در وا کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ ادبی تخلیق کی اہمیت اس بات میں نہیں کہ اس نے دو ٹوک انداز میں کیا کہا ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا نہیں کہا ہے۔ یہ "ان کہے ہوئے" بھی بہت کچھ کہہ جانا ایک اعلیٰ تخلیق کا امتیازی وصف ہے۔ اسی طرح اچھی تنقید کا منصب یہ نہیں کہ وہ تخلیق کے مقرر اور متعین معانی کو کھول کر بیان کرے بلکہ تخلیق کے چھپے ہوئے پرتوں کو بار بار چھونے میں کامیاب ہو۔ اسی میں تنقید کی تخلیقیت کا سارا راز مضمر ہے کیونکہ اس کا کام محض "تخلیق" کو جھاڑ پونچھ کر چمکانا نہیں ہے بلکہ اس کے بطون میں اُتر کر اس عظیم اسرار کو مَس کرنا بھی ہے جو تخلیق میں بطور "جوہر" موجود ہوتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے تنقید پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف خود ایک آئینے میں تبدیل ہو کر تخلیق کی عکاسی کرے بلکہ قوتِ انعکاس بن کر تخلیق کی قوتِ انعکاس کو متحرک بھی کرے۔ صرف اسی صورت میں تخلیق پُراسرار کو چھونے کی اجازت دے سکتی ہے۔ تنقیدی عمل سے پہلے خود تخلیق کا "جوہر" بھی ایک نامعلوم اور ناموجود شے تھا جسے تنقید کا لمس ہی متحرک کرنے گویا وجود میں لانے میں کامیاب ہوا۔ تاہم تنقید کے باب میں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ نقاد کئی طرح کے ہیں۔ مثلاً ایک نقاد تو وہی عام سا قاری ہے جو اپنے تعصبات اور ہنگامی تحریکات کی زد پر ہے۔ دوسرا نقاد زمانہ ہے جو وقت گزرنے کے بعد ہی فعال ہوتا ہے مگر ایک تیسرا نقاد خود تخلیق کار ہے جو ایک طرح سے آنے والے زمانے کا روپ بھی ہے۔ یوں یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تخلیق نہ صرف تخلیق کار کے عملِ تخلیق کی زائیدہ ہے بلکہ اُس کے عملِ تخلیقِ مکرر کا نتیجہ بھی ہے۔ ایسے عالم میں تخلیق اس صورتِ حال کی مظہر دکھائی دے گی جس میں خود تخلیق کا خالق دو میں تقسیم ہو گیا ہو یعنی تخلیق کار اور قاری (یعنی نقاد) میں ——— یوں وہ دو آئینوں میں ڈھل کر خود ہی اپنی کائنات کی تخلیق بھی کرتا ہے اور اس کا نظارہ بھی! [illegible] سے دیکھئے تو خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ کا ایک نیا مفہوم نظروں کے سامنے ابھر آئے گا اور تنقید و تخلیق [illegible] سے بھی تعارف حاصل ہوگا۔

وزیر آغا

(۲)

ان دنوں تنقید کے میدان میں بعض ایسے نوجوان ادیب سرگرمِ عمل ہیں جو اپنے مضامین کا آغاز اس شکایت سے کرتے ہیں کہ ساری کی ساری اُردو تنقید گروہ بندی کا شکار ہو گئی ہے اور اُردو ناقدین حلقۂ یاراں کی مدح و ثنا میں مصروف ہیں اور اپنے حلقے سے باہر اوّل تو انہیں کوئی ادیب نظر ہی نہیں آتا اور اگر نظر آجائے تو وہ اسے نظر انداز کر دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے خیال میں ان نوجوان ادبا کی یہ شکایت صرف جزوی طور پر صحیح

ہے۔ [illegible] اُردو تنقید پر اس قسم کا الزام لگانا ناروا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو کسی دور میں "کالی بھیڑیں" نہیں ہوتیں۔ یاد کیجیے کہ ایک ادبی تحریک کی بنیاد ہی نظریاتی گروہ بندی پر استوار کی گئی تھی اور اس تحریک نے غیر منسلک ادبا کا ادبی بائیکاٹ کر دیا تھا مگر چند ناقدین یا ایک آدھ ادبی تحریک کے مخصوص اعمال کے پیشِ نظر پوری اُردو تنقید پر گروہ بندی کا الزام لگا کر واویلا کرنا درست رویہ نہیں ہے۔ تاہم [illegible] کو جب یہ دعویٰ اس قسم کا رویہ اختیار کر کے اور اُردو تنقید کے سارے منظر نامے پر خطِ تنسیخ کھینچ کر سُرخرو ہو چکتے ہیں تو پھر دیکھو اس [illegible] کہے ہیں "مشفقہ سہرا" کے مصداق اپنے انہیں مضامین میں جس قسم کی تنقید کا نمونہ پیش کرتے ہیں وہ بجائے [illegible] بندی" کے عارضے میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے حلقۂ یاراں میں آئیے ایسے [illegible] یاد کرتے ہیں جن کو [illegible] برس گزر چکے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے حلقے کے ایسے مبتدی ناقدین کے سر پر تحرِ دور پر [illegible] کے تاج رکھ دیتے ہیں جن کا [illegible] ابھی پوری طرح مرتب نہیں ہوا۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ یہ لوگ الزام تراشی کے بعد اسی شے کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں جس کی مذمت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو) مگر یہ لوگ ہیں کہ وہی شے جو انہیں دوسروں کے ہاں پہاڑ جتنی دکھائی دیتی ہے، اپنے ہاں نظر ہی نہیں آتی۔ ان ادبا کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنے قول و فعل کے تضاد کو ختم کریں، پھر اونچی مسند سے بات کریں۔ کیا عجب اس صورت میں ان کی بات میں کچھ وزن بھی پیدا ہو جائے۔

پچھلے چند ماہ میں اُردو فکشن کو وقفے وقفے سے چار نہایت اہم آدمیوں سے محروم ہونا پڑا۔ [illegible] بعد میں عالم عابد حسین اس دُنیا سے رُخصت ہوئیں، پھر جمیلہ ہاشمی اور آخر میں احمد سعید نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان میں سے ہر ایک کہانی کا اپنا الگ رنگ اور اسلوب رکھتا تھا لہٰذا ان کے بساطِ ادب سے اُٹھ جانے پر جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا محال نظر آتا ہے۔ پاکستانی ادب میں ڈاکٹر بسم اللہ نیاز کی تحقیقی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو گیت پر انہوں نے اچھا کام کیا ہے۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود وہ علمی و ادبی محفلوں میں بڑے التزام سے شریک ہوتی تھیں۔ ان کی وفات بھی ایک ادبی سانحے سے کم نہیں ہے۔ ادارۂ اوراق ان ادبا کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ مشہور جدید غزل گو شاعر اقبال ساجد رحلت فرما گئے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون!

جون ۱۹۸۸ء میں مولانا صلاح الدین احمد کو وفات پائے پورے چھبیس سال ہو جائیں گے۔ اس موقعہ پر اوراق ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ایک خاص گوشے کا اہتمام کر رہا ہے، اس سلسلے میں ہم جناب غلام رسول ازہر کے بطورِ خاص ممنون ہیں کہ ان کے ذریعہ ہمیں مولانا مرحوم کی ایک نادر و نایاب تحریر ملی ہے جو اُن سے مینارِ پاکستان کے لیے بطورِ خاص لکھوائی گئی تھی لیکن جو بعد ازاں بوجوہ مینار پر کندہ نہ کی جا سکی، مگر یہ تحریر ہمارے دلوں پر آج بھی کندہ ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ ثبت رہے گی کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ [illegible]

اوراق کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے پیشِ نظر کتابوں پر تبصرے شامل نہیں کیے جا رہے ہیں، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

سجاد نقوی

انور سدید

دُعا

ہمیں یا تو تازہ ہنسی بھیج دے
نہیں تو پرانی خوشی بھیج دے

مسلط اندھیرا ہے چاروں طرف
[illegible] روشنی بھیج دے

بچوں کے دھماکوں سے سہمے ہوئے
ہیں سب لوگ ان کی خوشی بھیج دے

جلے ہیں مرے ہونٹ بارود سے
جو مرہم بنے وہ ہنسی بھیج دے

اخوت، مروت، [illegible] کال ہے
اخوت، مروت، ابھی بھیج دے

دُعا میری اتنی سی ہے انور سدید
خدا شہر میں آشتی بھیج دے

خادم رز[illegible]

مولا

عمر کی شام ہوئی اور ہیں پیاسا مولا!
اب تو دریا، کوئی جھرنا، کوئی برکھا مولا!
[illegible] کوئی صورت مرہم بھی میسر آتی
[illegible] رہ جاتا مگر زخم تو بھرتا مولا!
بے مداوا جو رہا کل بھی بھری دُنیا میں
اب بھی رستا ہے وہی زخم تمنا مولا!
ریتلے دشت بھی ہیں تیری ہی خلقت سائیں
سبز موسم کا اِدھر بھی کوئی پھیرا مولا!
دائم آباد رہیں شہر ترے، گاؤں ترے
میرے کندھوں پہ دھرا ہے مرا خیمہ مولا!
سیل کی طرح امڈتی ہوئی اس خلقت میں
نہ کوئی مونس، کوئی ہمدم، کوئی اپنا مولا!
تو کہ سنتا ہی نہیں کوئی دہائی میری
میں کہ اب بھی ہے لبوں پر مرے مولا! مولا!
دیکھ سکتا، وہ جسے کھول کے آنکھیں رزمی
اک شبیہ تو ابھرتا کوئی ایسا مولا!

افتخار عارف

نَصرُ مِنَ اللہ...

مرے آقا نے فرمایا کہ لوگو!
سوالِ نور و ظلمت ہے تو آؤ
ہم اپنے انجم و مہتاب لائیں
تم اپنے انجم و مہتاب لاؤ
پھر اس کے بعد یہ دیکھیں کہ خطِ نور کس کے امر کی تصدیق کرتا ہے
کسے حرفِ غلط گردانتا ہے اور کسے صدیق کرتا ہے

وہی ہے وحشتِ ظلمات و ظلمت
نشانِ آگہی بے نور اندیشوں کی زد میں ہے
[illegible]رِ منزل تہِ حجابِ مستور میں ہے
بنامِ انجم و مہتاب اک غولِ بیابانی نے
ایسی خاک اڑائی ہے کہ سارا مطلعِ خیر و خبر دھندلا رہا ہے
کہاں کی حرمتِ میزانِ خاتم
وجودِ نور پر حرف آ رہا ہے
غبارِ بے نہایت کا سماں ہے
"خداوندا! تری نصرت کہاں ہے"

قیوم طاہر

نعت

وہ نظر کیا تھی کہ مٹی بھی گہر ہوتی گئی
رات جیسی شام مانندِ سحر ہوتی گئی

آیتوں کے حرف سورج کی طرح روشن ہوئے
شب زدہ بستی اُجالوں کا نگر ہوتی گئی

نام کیا لکھا کہ اندر تک اُجالے آ گئے
تجھ کو بس سوچا کہ تکمیلِ ہنر ہوتی گئی

ایک خوشبو ہے کہ جسم و جاں میں گھل سی گئی
ایک خوشخبری کہ بس زادِ سفر ہوتی گئی

تیری کرنوں سے جہانوں میں ہوا میرا طلوع
میری مشتِ خاک انوارِ قمر ہوتی گئی

وہ بھی کیا ہجرت تھی جس نے اعتبار ایسے دیئے
چاہ گلیوں اور گھروں کی بے اثر ہوتی گئی

میرے لفظوں کے دیئے اسمِ محمدؐ سے جلے
میری سوچوں پر عنایت کی نظر ہوتی گئی

حامد کاشمیری

حضرت امام حسین علیہ السلام کی یاد میں

حیات فانی ہے [illegible]
زبانِ خلق پہ تا حشر نام تیرا ہے
ستارے روک لیں کیونکر لرزتے اشکوں کو
اِک ایک ذرّے کو [illegible]
سمجھا یہ کس نے کہ کوئی رہا نہیں تیرا
یہ نوحہ کرتا ہُوا اژدحام تیرا ہے

لہُو لہان جبیں، تشنگی، حصارِ سناں
نمازِ عشق کا یہ احترام تیرا ہے
لہُو سے لکھی حکایت وقارِ انساں کی
دلِ بشر میں سدا احترام تیرا ہے
بہا کے خون کا ہر قطرہ [illegible]
شہید ہونے کا یہ اہتمام تیرا ہے
وہ خسروانِ زمیں تھے زمین بوس ہوئے
تُو آسمان ہے دائم مقام تیرا ہے

ناصر شہزاد

پنکھڑی گلاب کی

مورتی شباب کی

باس اور بدن میں وہ سرخوشی ہے خواب کی

پنکھڑی گلاب کی

نیند کے نواس میں، موہنے لباس میں

سیج پر سہائے وہ، روشنی اُگائے وہ

موج اضطراب کی

پنکھڑی گلاب کی

پانیوں کے پاٹ کو، گرم غول کی ٹھاٹھ کو

سونپ دے کہانیاں، تیاگ کر جوانیاں

چاندنی چناب کی

پنکھڑی گلاب کی

ہجر کے حصار میں، درد کے دیار میں

آگہی کو نور دے، شبد کو شعور دے

دلکشی کتاب کی

پنکھڑی گلاب کی

ماس کے مسان میں، جان اور ویران میں

جنگلوں کی ٹوک ہے، کوئلوں کی کوک ہے

جرأت جواب کی

پنکھڑی گلاب کی

احمد ظفر

گیت

بالک اور کھلونا کیا ہے؟
ہنسنا کیا ہے، رونا کیا ہے؟
کل اور آج میں، دل کے راز
غم سہتے ہیں جتنے پیارے
دل کا دیپ بجھا جاتے ہیں
بیٹھے بیٹھے سوچ رہا ہوں
یہ پلکوں کا بھگونا کیا ہے؟
بالک اور کھلونا کیا ہے؟
ہنسنا کیا ہے رونا کیا ہے؟

جلتی شام میں، شب کے دام میں، تیرے نام میں
کھوئے کھوئے چاند ستارے
میرے پاس چلے آتے ہیں
میں کانٹوں کی سیج پہ [illegible]
یہ پھولوں کا بچھونا کیا ہے؟
بالک اور کھلونا کیا ہے؟
ہنسنا کیا ہے، رونا کیا ہے؟

تیرے روپ میں، اُجلی دھوپ میں اور بہروپ میں
ایک ہی جیسے رنگ ہیں سارے
سارے مجھ کو تڑپاتے ہیں
کون بتائے کس سے پوچھوں
ہونا اور نہ ہونا کیا ہے؟
بالک اور کھلونا کیا ہے؟
ہنسنا کیا ہے رونا کیا ہے؟

صابر دت

قطعات

التماس

شوخ کلیوں کو مسکرانے دے
پیڑ، پودوں کو لہلہانے دے
صحنِ گلشن میں لے نہ انگڑائی
آ رہی ہے بہار آنے دے

ملاقات

وقت بڑھتا رہا موسم موسم
نئی رُت آئی نئے پھول کھلے
انہی راہوں میں گزر گاہوں میں
تم سے پہلے بھی کئی لوگ ملے

آرزو

لمحہ لمحہ ہے حال کا چھلنی
وقت کو راہ سے ہٹاتا ہوں
مجھ کو شاید پلٹ کے تم دیکھو
پھر میں ماضی میں لوٹ جاتا ہوں

نصیر احمد ناصر

دوہے

[illegible] کی چھایا تھی وہ میں صدیوں کی [illegible]
[illegible] سے کیسے ملتا میرا پہلا روپ

[illegible] تھے جگنو، تارے، پھول
[illegible] سفر سے رکے جب تم آنکھوں میں تھی دھول

○

دل بھی تیرے ہجر میں پگھلا، رات بھی شبنم روئی
تیرے پیار کا دکھ ہے ایسا [illegible]

○

سورج سفر کے لمبے رستے، یادوں کے بن باس
تیرے قرب کا اک پل گویا جیون بھر کا داس

کیسی رُت ہے، کیسا موسم، کیسے ہیں حالات
[illegible] کوئی نہ سمجھے دن ہے یا ہے رات

○

کاغذی پھولوں جیسے [illegible] رنگ برنگے لوگ
اپنی اپنی سب کی رچنا، اپنے اپنے جوگ

دھرتی ختم کر کے وہاں اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ جب تک پانی کچھ کم ہوتا ہے پھر سیلاب آجاتا ہے۔ اس پانی پر ہر برس ٹکڑیوں میں دُور دراز سے آنے والے پرندے اپنا قبضہ جما لیتے ہیں۔ پانی پر تیرتے ہوئے سینکڑوں پرندے بہت خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ جو بھی یہاں آتا ہے سب سے پہلے وہاں ضرور جاتا ہے۔ کسی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی کہ پانی میں ڈوبی ہوئی دھرتی کے کسان کہاں چلے گئے؟
میرے چھوٹے لڑکے کے سر میں چوٹ لگ گئی۔ وہاں دوائی سے پہلے مل نہیں سکتی تھی۔ کارکر تھی نہیں۔ فوجی نے کچھ بوٹی کا دودھ ملا کر زخم پر ڈال دیا۔
"فکر نہ کرو۔ بالکل چنگا ہو جائے گا جی۔"
مجھے معلوم تھا کہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا — میں دوائی لینے پیدل چل دیا۔ تھوڑی دُور بعد محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ دیکھا تو وہی تھا — مجھے دیکھتے ہی اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تن کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل ان بتوں کی طرح جو شہر میں سڑکوں پر نصب ہوتے ہیں لیکن گاؤں میں مجسمے نصیب نہیں ہوتے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مجسمے کبھی نہیں بنتے۔
"چلنا ہے تو بھائی پھر میرے ساتھ ساتھ چل۔"
وہ میرے نزدیک نہیں آیا۔ ایک ڈر، جھجک اور حیرانی اس کے چہرے پر تھی جسے اس کی بند آنکھیں بھی نہ چھپا سکیں۔
"یار راستہ لمبا ہے کچھ گپ شپ ہی رہے گی۔"
جھجک کچھ کم ضرور ہوئی مگر ہمارے درمیان کا فاصلہ اُتنا ہی رہا — فاصلہ آچکا تو تھا نہیں۔ سینکڑوں برسوں سے جب سے اُس کے پرکھے میری سسرال والوں کے آبا و اجداد کی خدمت اور راکھی کر رہے تھے۔ شاید اس سے بھی پُرانا جب کسی جابر نے اُن سے ان کی دھرتی چھین لی ہوگی — ایسے فاصلے کو ختم کرنے کے لیے اس میں کچھ بھرنا ضروری تھا . . . . .
مجھے اپنے وہ دن یاد آگئے جب دوسروں کو بدلنے کے لیے ایک دیوانگی کی حد تک نشہ مجھ پر سوار ہو جاتا۔ اب نہ وہ دن تھے نہ ہی وہ ماحول۔ اس جیون اور ملک کی دُنیا سے کتنی دُور نکل آیا ہوں میں . . . . . یہ کیسے ہو گیا؟
اس سوال اور اس کے جواب سے بچنا چاہتا تھا میں۔ میں سیٹی بجانے لگا تھا۔ سیٹی ایسے ہی لمحوں میں کبھی کبھی خود بخود بجنے لگتی ہے۔ جب میں بچنا چاہتا ہوں دوسروں سے نہیں بلکہ خود سے۔ میں نے فوراً ایک نشہ خود پر طاری کر لیا اور پُرانے دنوں میں پہنچ گیا۔ میں آزمانا چاہتا تھا کہ کہیں میری وہ طاقت ختم تو نہیں ہو گئی۔
میرا کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے اُسے پکارا — وہ دائیں سے کچھ بائیں ضرور آیا پر فاصلہ برابر بنا رہا۔ کتنے بال بچے ہیں تیرے؟ کمال ہے یار تیرے بھی دو، میرے بھی دو اور گاؤں کی دیواروں پر بھی دو کی ہی تصویریں بنی ہیں۔ ذرا ماچس نکال۔ سُلگا یار۔ اس کی سگریٹ سُلگی ضرور پر بجھ گئی اور اس کے کان میں اڑ گئی۔ سگریٹ نوشی مالکوں کی نظروں میں بے ادبی تھی۔
"ارے ہم دونوں کے سگریٹ بجھ گئے۔"
وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"میں بھی تیری طرح کا بندہ ہوں۔ پھر تو یہ تماشا کیوں کر رہا ہے؟"
کبھی کبھی کترا ہوا وہ کچھ بائیں طرف اور بڑھ آیا۔ میں اُس کی طرف بڑھا تو تیزی سے بھاگا اور ایک گڑھے میں گر گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ

ہی گیا۔

"وڈا رجوجی۔ تُسّاں رب دی۔ اسی گئیں آں"

"جب آج تک پاؤں چھونے سے کسی کا کچھ نہیں بگڑا تب ہاتھ چھوڑ دینے سے کیا بگڑ جائے گا؟"

وہ ایک لمبے فاصلے کو چیرتا ہوا میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ آج تک تم کہاں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس سے چھوٹا محسوس کیا۔ وہ اُوپر سے نیچے تک مجھے گھورنے لگا۔ وہ مسکرایا۔ اُس نے [illegible] اُس کی آنکھوں میں کوئی نئی چمک شامل ہوچکی تھی۔

[illegible] جائے پھر مُڑا ......کیا یاد کروگے بادشاہو"

[illegible] سا تھے۔ کش پر کش کھینچتا ہوا وہ اس چھوٹے بچے کی طرح لگا جسے زندگی میں پہلی بار کُلفی چھوڑے لی ہو۔

اب میرا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ میں اُسی بچے من سے اُس سے جڑنے لگا جس طرح شروع کے دنوں میں لوگوں سے جڑا کرتا تھا۔

یگ بُو [illegible]

[illegible] لوٹ آیا جہاں پہنچ چکا تھا — میرے سامنے دُور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ کھڑی فصلیں تھیں، سرسوں پر تھرکتی ہوئی تتلیاں [illegible] ، خاموشی تھی، دھیما تھی، دھرتی تھی [illegible] اور بہت کچھ تھا..... اب سب ایک منظر، ایک تصویر بن گیا تھی، کچھ اور تھا.....

وہاں سے کٹنے کی وجہ کیا صرف ڈر تھی؟ شاید ان کی دُنیا سے دُور ہونا بھی تھا۔ کچھ اس طرح کے نئے سوال میرے اندر اٹھنے لگے۔

[illegible] اس میں ایک عجیب بھوک اور ہمت جاگ اُٹھی تھی۔ کھیتوں سے گاجر مولیاں اور نہ جانے کیا کیا توڑنے لگا۔ راستے میں جو کوئی ملتا اُسے بتاتا [illegible] ہی کا ہی جوائی ہوں جو آج تک یہاں نہیں آیا تھا — دیہاتی بھولے بھالے کسانوں کے سوال کا جواب دیتے رہتے میں ادب جاتا۔ دیہات کے لوگ [illegible] بھانپ لیتے ہیں اُسی ڈر سے میں ان کی باتوں کا جواب دیتا رہتا — مجھی احساس ہوا جب ان کا سبب [illegible] ہمارے لیے ابھی [illegible] کب یہ ہمارے قریب کیسے آسکتے ہیں؟

[illegible] جہاں تک آنکھ جاتی ہے دیکھ لیں، سب دھرتی کبھی حاکموں کی تھی اب نہیں ہے۔ جو ہے وہ بھی کم نہیں ہے۔ آنے والی پشتیں بھی ختم نہیں کرسکتیں۔ دُور اندیش بندے ہیں حاکم۔"

جو باتیں کسی نے نہیں بتائی تھیں وہ بتانے لگا۔ چار پانچ سو سال پہلے وہاں حاکموں کا بڑا بیوپار اور زمینداری تھی، وسط ایشیا سے تجارت [illegible] دربار میں با رسوخ لوگ — چار سو سال پہلے ساٹھ میل دُور ایک نیا شہر آباد ہوا۔ حاکم بھی وہاں چلے گئے۔ ان کی حویلیاں [illegible] دھرتی ہمیشہ آباد رہی۔ انگریزی حکومت کے وقت بڑے بڑے شہروں میں بس گئے — نئے بیوپار شروع کر لئے — وقت گزرنے کے ساتھ ان کی حویلیاں کھنڈر ہوتے لگیں۔

"ہمارے حاکم کبھی بے رحم نہیں رہے — اب وہ باتیں کہاں! پر خون تو وہی ہے۔ بیاہ شادیوں پر جی کھول کر دیتے ہیں ہمیں۔ [illegible] رہوں تو ہم بھوکوں مر جائیں

[illegible] حویلیاں کسی خوابی دُنیا کی طرح لگی تھیں۔ ایک ایسی [illegible] دیکھ کر بھی سپنے کا گمان ہو۔ نرنج کی چھوٹی اینٹوں سے تعمیر دو منزلہ حویلیاں۔ جن کے قد آور پھاٹکوں میں کبھی اونٹ، ہاتھی اور [illegible] سماجاتے ہوں گے۔ وہ خستہ مسمار [illegible] تھیں۔ زندگی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ ملبے کے ڈھیر، دروازے، برُجیاں اور بکھری [illegible] تین طرف دُور دُور تک پھیلے کھیت، ایک طرف دریا، میلوں دور کوئی آبادی یا گاؤں نہیں۔

[illegible] سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا کسی طلسم سے کم نہیں تھا۔ کوئی یادگار ہو کسی بھولی دنیا کی۔ وقت [illegible] کتنا آگے اور ترقی یافتہ ہوں گے ان حویلیوں کے مالک۔ ماضی میں بھی آگے اور آج بھی آگے . . . . ان کی وابستگی، اُس کا لالچ نہ دھرتی اور نہ ہی حویلیاں۔ بوڑھی بے بس سب کو بتا رہی تھیں [illegible] سب سے پہلے آئی تھیں تو کہاں ٹھہری تھیں . . . وہ کسی [illegible] بھی کر رہی تھیں۔

فوجی کی باتیں سُننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ اُنہوں نے سب گاؤں اپنی دھرتی کی حد پر بسائے تھے تاکہ ایسی ناکہ بندی ہو کہ دوسرے [illegible] کی حفاظت کریں ـــ

گاؤں کے بازار میں بھرپور زندگی تھی ـــ ضرورت کی اشیاء، کپڑوں کی دُکانیں، چارہ کاٹنے کی مشینیں، کھیتی باڑی کے اوزار، ٹریکٹر مرمت کی ورکشاپ، ڈاکٹر، حکیم سب کچھ دکھائی دیا ـــ جو گاؤں کبھی رکھوالی کے لیے وجود میں آتے ہوں گے وہاں زندگی جہاں حکومت تھی وہاں کھنڈر۔

خدا خیر کرتے ہنستے ایسی باتوں کا دھیان آنا میری عادت کے مطابق ہی تھا۔ ایک کڑوی گولی کی طرح من کسیلا ہو گیا۔ بیماری کی حالت میں فوجی کے گاؤں کے لوگ کیا کرتے ہوں گے! اس بات پر شرم محسوس ہوئی کہ حویلیاں دیکھتے ہوئے ان جھونپڑیوں کا خیال کیوں نہیں آیا جو وہاں سے دُور نہیں تھیں! جدھر میری نگاہ سب سے پہلے جانی چاہیئے تھی، کیوں نہیں گئی! جھونپڑیاں گائے، بکریاں، مرغیاں، بھونکتے کتے، گوبر اور گندگی کی بُو میں بھی سب محسوس کیوں نہیں کر پایا ـــ؟

سرکاری مدد اور راحت کی کارگزاریاں گوردوارے کی پُشت پر کندہ تھیں۔ اُن میں تین وزیروں کے نام درج تھے جو فوجی کے گاؤں میں اچھوتوں کی بہبودی کے لیے آئے تھے۔ گاؤں میں کوئی پکی جگہ نہیں ہوگی تبھی پتھر وہاں نصب کیا گیا ہوگا ـــ یا پھر کوئی اور وجہ ہوگی۔

اپنی اس بیزاری پر دُکھ ہوا جو چند سہولتیں میسر ہو جانے کے بعد ہم میں خود بخود آجاتی ہے۔ اور ہم دوسروں کو بھول جاتے ہیں۔ مجھے لگا کہ اس مرض کا میں بھی شکار ہو چکا ہوں۔ نہیں تو سب کچھ مجھے بھی دکھائی دیا ہوتا۔

عام بیماریوں میں کام آنے والی دوائیاں خرید کر بنڈل اُسے پکڑا دیا۔ اسی سے وہ اتنا احسان مند ہوا کہ جذبات میں اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ شاید پہلی بار اُسے بھیک اور انسانی جذبے میں فرق محسوس ہوا۔ چائے کے سٹال پر پکوڑے کھاتا ہوا بار بار مجھے گھورتا اور پکوڑوں پر ٹوٹ پڑتا۔ کبھی کسی جھجک کی وجہ سے اس کا ہاتھ رُک جاتا۔

اُس کے اندر کے خون کو میں سمجھ رہا تھا ـــ لیکن پکوڑوں اور مٹھائی کا بھی اپنا ایک الگ لوبھ ہوتا ہے جسے کبھی میں نے اپنی فاقہ مستی کے دنوں میں چکھا تھا ـــ ہمارے اردگرد گھسر پھسر ہو رہی تھی ـــ فوجی پر طعنے کسے جا رہے تھے۔

" ڈر نہیں۔ دو بہار آکر ہی پاک اور پوتر بنتے ہیں۔ حکم چلاتے ہیں۔ بوٹوں میں سب کے ہاتھ کا چھوا کھاتے ہیں . . .

[illegible] کی!

اس کا منہ کھلا رہ گیا ــــ ہاتھ میں پکڑا پکوڑا نیچے گر گیا۔ اس نے حیرت اور ناقابل یقین لہجہ میں ہی کہا۔ میرے منہ سے مانگوں کے لیے گالی

... کے لیے کسی دوسری دنیا کی بات تھی ــــ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ــــ

"تیری جھونپڑی پکی ہے یا کچی؟"

"اپنی قسمت ہی کالی ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

اس کا چہرہ بجھ چکا تھا ــــ آنکھیں بند ہو گئیں ــــ پر اس کی پکڑ پہلے سے بھی مضبوط ہو گئی۔

"اُن کی بھیک مجھے میرے [illegible] رہی ہے ــــ جو غلطی تیرے پُرکھوں نے کسی مجبوری میں کی ہوگی کبھی، کیا وہ ریت بن جائے گی ــــ

... کو بھی کبھی یہ زمین کسی کو خوش کرنے پر بھیک میں ہی ملی ہوگی۔"

[illegible]

واپس جاتے ہوئے کھیتوں کے بیچ تین چار مٹی کے اونچے ٹیلوں پر اس کی نظریں ٹِک گئیں۔ ڈوبتا ہوا سورج ہر شے پر لال رنگ بکھیر رہا

... فوجی کا چہرہ، کھیت، درخت، آسمان سب اسی رنگ میں دہک رہے تھے۔

"یار فوجی اگر تیری [illegible] اُن کی حویلیوں کی اینٹوں سے ہی اپنا گھر پکا بنا لیتا۔"

[illegible]

وہ رُک کر خوشی میں مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے اچانک کسی بہت لمبے سفر سے لوٹنے کے بعد اس نے کوئی سُراغ پا لیا ہو ــــ لیکن اسی لمحہ میں

... کر بہت پیچھے جا چکا تھا ــــ جب میں ایک لڑکا تھا ــــ اپنی تڑپ سے چھوٹی عمر میں ہی اس دُنیا کو بدلنے کی ٹھان چکا تھا ــــ

اُس دُنیا سے کس نے مجھے الگ کیا؟ اس کا جواب مشکل تھا۔ شروعات اُن ہی دنوں میں ہوئی جب منتخب ہو کر وہ اوپر چلے گئے۔ [illegible]

... سے خطرے ختم ہو گئے ــــ میری آواز جو حکومت اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا کرتی اپنوں کے خلاف اُٹھنے لگی۔ اپنی ہی دُنیا میں غیر

ہو گئے۔

آج وہی فوجی میرے سامنے کھڑا تھا۔

آنکھوں میں چیتے جیسی چمک، ہوشیار، ہاتھ میں ڈنڈا، تراشے ہوئے بال، قمیص پتلون، پاؤں میں انگریزی جوتے ــــ

پُل گئے برس [illegible] باندھ چار سال پہلے تیار ہو گیا تھا ــــ وہ پچھلے برسوں میں ہوتی تبدیلیوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے

ــــ

باندھ کی دوسری طرف سڑک کے پار دُور تک پھیلے پانی پر تیرتے سینکڑوں پرندے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان میں اُڑتے ہوئے

... پانیوں سے ڈھکے ہوئے درخت۔ ہم باندھ پر رُک گئے۔ پتھروں اور مٹی نے دریا کی اس دھارا کو روک دیا تھا جو کبھی ایک بے قابو خونخوار

... طرح بہتی ہوئی گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیتی تھی ــــ دھارا ایک جھیل کی طرح دکھائی دی ــــ کتنا سچ کہا تھا میری کہانی کے ایک کردار نے کہ ایک

دھارا ایک جھیل بن جائے گی۔

اس جھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی ــــ تیرتے پرندے، سادھو لگائے بگلے، گُردوارے کی عمارت

کا ڈولتا ہوا عکس، درختوں کے سائے، حویلیاں اور دوسری چیزوں کے عکس پانی میں تھرک رہے تھے ..... پر میں کہیں اور تھا

"پھر کہا آپ نے !"

"تو ہاں --- سب بدل گیا ہے یہاں !"

میں بڑبڑایا تھا شاید --- جہاں پہلے کچھ نہیں تھا اب وہاں لوگ اور زندگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے - میں ذرا [illegible] ... میرے سسر نے مجھے بتایا کہ باندھ بننے کے بعد یہاں کی دھارا ختم ہو گئی ہے --- اُجاڑ جگہ پر ایک صنعتی مرکز بن رہا ہے - میں پوری رات سو نہ سکا صبح پہلی بس سے یہاں پہنچ گیا - پچھلی بار یہاں سے جانے کے بعد میں نے دو کہانیاں لکھی تھیں - ایک کہانی یہاں کی خونخوار دھارا پر تھی جس کے تیز بہاؤ نے ہرے بھرے کھیتوں کی دھرتی کو ریتلا اور بنجر بنا دیا تھا - غریب کسان اپنی زمین بیچ کر ایک امیر کسان کے جال میں پھنستے جا رہے تھے - اسی کہانی میں ایک نوجوان نے کہا تھا کہ اب پانی یہاں سے ختم نہیں ہو سکتا ..... یہاں جھیل بن جائے گی اور ہمارے ڈھور ڈنگر یہاں پر پانی پیا کریں گے - باندھ کا ٹھیکہ بھی اسی مالدار کسان کو ملا ہوا تھا -

دوسری کہانی حویلی کے مالکوں پر تھی --- جس میں میں نے کہا تھا کہ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں لوٹنے پر انہیں شہروں سے زیادہ منافع ملے گا تو وہ پھر لوٹ آئیں گے ..... حویلیوں میں نہ رہ کر نئے مکانوں میں قیام کریں گے ...

اب میں اور نوجی ناؤ میں تھے سرکتی ہوئی کشتی ہمیں وہاں لے گئی جہاں پہلے ناؤ پُل تھا - اب نہ پُل - نہ دھارا - پُل کی کشتیاں کنارے کے پاس ریت میں دھنسی پڑی تھیں - تختے اکھڑ کر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے - کنارے کے ساتھ درختوں کی ٹوٹی ہوئی شاخیں، کسی بچے کا کھلونا، ربڑ کی چپل لہروں پر تھپکیاں کھاتی ڈول رہی تھیں -

"چھیتی کر دجی --- کچھ دکھانا ہے "

نوجی کے پورے جسم میں ہلچل سی مچ گئی --- وہ بہت بے قرار ہو گیا --- اُس کا چہرہ دمک اُٹھا ---

" بہت کمال کی بات ہے تُسی بوجھ نہیں سکتے جی .... "

میں اس کے ساتھ ساتھ اسی تیزی سے چلنے لگا جتنی تیزی سے وہ چل رہا تھا -

" میں نے بہت چٹھیاں ڈالیں ... تُسی جواب نہیں دتا - کیوں جی ؟ "

"چٹھیاں ؟ "

میں چونک اُٹھا - بالکل اس آدمی کی طرح جسے زندگی میں کوئی خط لکھنے والا نہ ہو اور کسی نے تحریر بھی کیا تو اُسے نہ ملا ہو - اس کی بات مجھے اندر تک چھو گئی --- میرے اندر ایک اشتیاق، ایک جستجو، کچھ دیکھ لینے کی تڑپ جاگ اُٹھی - نہ جانے میں کیا دیکھنے جا رہا ہوں --- ؟'

سامنے سڑکوں کا جال، بڑا بازار، دُکانیں، چائے کے سٹال، اخبار بیچتے ہاکر، ٹرک، جیپیں، پمپ، ٹریکٹر، بس اڈہ، بسوں کے گرد منڈلاتے چھابڑی والے، سائیکل پر دو ڈرم باندھے ڈیزل بیچتا ہوا نوجوان ... پچھلی بار ایسا کچھ نہیں تھا --- ایک بڑے بورڈ پر ان صنعتوں کے نام لکھے تھے جو وہاں لگنے جا رہی تھیں --- تیر کا نشان ادھر تھا جدھر فیکٹریاں سر اُٹھا رہی تھیں --- وہاں رونق تھی، شور تھا، حرکت تھی .. سب بدل جائے گا - چمنیاں دھواں اُگلیں گی وہ سب یہاں بھی ہو گا جو ابھی تک یہاں سے دُور تھا .... ایک فریب یہاں بھی جاری ہو جائے گا ---

دُھول اڑاتی ہوئی دو کاریں ہمارے سامنے سے نکل گئیں - ان کے پیچھے کسی پولیس افسر کی جیپ بھی تھی -

"اپنی موجوں میں ہی ...... کئی باری کارکی پسیاں کی ہیں" اُس کا چہرہ کھل اُٹھا — اُس کی حسرت بھری نگاہیں دُور تک کاروں کا تعاقب کرتی رہیں۔

فیکٹریوں کے سبھی بڑے پلاٹ مالکوں کے خاندانوں نے خرید لیے تھے۔ عمارت اور مشینوں کے لیے سرکار سے مدد، بنا سود کے قرضے، بے شمار سہولتیں اور راحت۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ سب پلاٹ مالکوں کی زمین سے باہر تھے۔ اس کا مطلب تھا بعد میں اُن کی زمین منہ مانگے داموں پر بِکے گی۔

حویلیوں کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس نہیں ہوا جو پہلی بار ہوا تھا۔ وہاں زندگی تھی۔ مرمت کے پیوند ہر در و دیوار پر دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی اینٹوں پر بڑی اینٹیں پھوڑوں کی طرح دکھائی دیں۔ ہر حویلی پر ٹی۔وی کا اونچا انٹینا — اس پر بیٹھے ہوئے کوّے۔ نلی گاڑوں کی دھنیں دُور سے ہی سُنائی پڑ رہی تھیں — محلّے داروں کے بابو اور انجینئر حویلیوں میں آباد ہو چکے تھے۔

اب ہم وہاں تھے جو وہ مجھے دکھلانے کے لیے بے تاب تھا۔

جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا اس پر یقین نہیں آ رہا تھا — وہ ایک ٹھوس حقیقت اور سچائی تھی — ملیش میں کہی ہوئی بات ایک شکل اختیار کر چکی تھی — جس میں کچھ کر دینے کی آگ اور محنت شامل تھی — جھونپڑیاں چھوٹی اینٹوں سے بنے ہوئے گھروں میں بدل چکی تھیں۔

"کچھ یاد آیا ؟" خوشی میں اس کی آنکھیں چھل چھلا آئیں۔

گاؤں کے لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ اُن کی والہانہ دیوانگی نے مجھے محسوس کرا دیا کہ مَیں ان میں سے ہی ایک ہوں۔ وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔

ہمارے نظریے کی ایک چھوٹی سی لَو نے اس گمنام گاؤں کو اونچی حویلیوں سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ جو فاصلہ وقت نہ پیدا کر سکا ایک چنگاری نے پیدا کر دیا۔ تب ہمارے خیالات ان لوگوں کی دھڑکن کیوں نہیں بن پائے ؟

مجھے لگا وہ گاؤں ہمارا ہے۔ اُس کا جنم ہمارے خیالات کی طاقت سے ہوا ہے۔ اب یہ جہاں بھی ہوں گے لڑ سکتے ہیں۔

"آپ کی بات نے بارود کا کام کیا ہے" اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں کہا۔

"مکان بڑی اینٹوں سے کیوں نہیں بنے ؟"

"بڑی اینٹیں ؟"

"اب انہیں چھوٹی اینٹوں کی کیا ضرورت۔ دیکھتے نہیں حویلیوں کی مرمت بھی بڑی اینٹوں سے ہوتی ہے"

میری بات سے انہیں کوئی نئی بات مل گئی جیسے — وہاں کانا پھوسیاں شروع ہو گئیں۔ دراصل مَیں نے بات کسی اُداسی میں ڈوب کر کہی تھی — جسے مَیں ہی جانتا تھا۔

گاؤں کو دیکھتے ہی ایک فخر مجھ میں بھر جاتا اور مَیں تپ اُٹھتا — پہلی بار والا جذبہ پھر مجھ پر حاوی ہونے لگا — ایسے لوہے کو اور تپانے کی ضرورت ہے۔ مَیں نے اُسے تپانا بھی شروع کر دیا —

دن بھر وہ میری گرم باتیں سُنتا رہا

ایک کار میری تلاش میں بار بار چکر لگا رہی تھی۔ انہیں میرے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ جانتے تھے ایک لمبا عرصہ مَیں مزدور تحریک میں

سا ہوں۔ کتنی بار پچھتا بھی گیا ہوں۔ میں جانتا تھا انہیں میری ضرورت کیوں ہے ؟

وہ دو سال پہلے یہاں آئے تھے — خوب جلوس کیا — لنگر کے لیے بھنڈارا بھر دیا — نوجی کے گاؤں میں کمبل اور کپڑے تقسیم کیے۔ سکول اور اسپتال کی بنیاد رکھی گئی — اُن کی آمد سے علاقے میں ایک حرکت شروع ہو گئی۔ ایک مندر بھی دوبارہ بن گیا —

وہ آپس میں خوب لڑتے ہیں۔ لیکن جب یہاں آتے ہیں تو ایک ہوتے ہیں — اور نیک بن کر لوٹتے ہیں لیکن اس بار [illegible] آئے بلکہ اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے آئے تھے۔ ان کے آتے ہی ایک ایسی دنیا کا ماحول بن گیا جہاں سب کام خود بخود ہو جاتے ہیں .... ہر ان کی جی حضوری کے لیے تیار رہتا ہے۔ نوجی کے گاؤں کے لوگوں نے انشا [illegible] اقرار ناموں پر خوشی خوشی انگوٹھے ٹیک دیئے جنا کسی [illegible] کے وہ اپنی زمینیں حاصل کر چکے تھے۔

[illegible] صنعتی شہر کا افتتاح ہوا اور اجاڑ حویلیوں کی صفائی شروع ہو گئی اسی دن سب کو معلوم ہوا کہ کیا ہونے والا ہے ....

[illegible] ہم دونوں بس اڈہ پر کھڑے تھے۔

[illegible] بس پر نہیں چڑھنے دیا۔ [illegible] حیران تھا کہ چند برسوں میں وہاں کی زندگی بالکل بدل جائے گی —

[illegible] جس قدر سمجھنے کی یا سیکھنے کی کوشش کرتا [illegible] زیادہ اُلجھ جاتیں۔ اُس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ کچھ برسوں میں وہاں [illegible] کی بیٹیاں [illegible] اٹھائیں گی ؟ یہ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن سب کے گورکھ دھندے میں کیسے پھنس جائے گا ....

حاکموں نے اُسے مل میں مزدور سپلائی کرنے کا کام سونپا تھا۔ اُس کے بدلے اُسے دس روپے مزدور کے حساب سے اُجرت ملے گی اس نے سب فیکٹریوں کے لیے غریب کسانوں اور مزدوروں کی ایک فوج تیار کر لی تھی — بعد میں اُسے کسی مل کے پھاٹک پر [illegible] بنا دیا جائے۔

"جاتی ہوگی تو یہ بھی ان کی چاکری ہی "

"اسے کل غلام [illegible] "

"پیٹ تو بھرنا ہی ہے۔ پھر اس کے لیے کرنا بھی ضروری ہے۔ پر ہوگی تو راکھی ہی۔ پہلے حویلیوں کی اور اب اُن کی فیکٹریوں کی۔"

[illegible] "اُس کی آنکھیں سُلگ اُٹھیں — " راکھی نہیں کرنی مجھے ،

"اگر تم سب ایک مٹھ ہو گئے تو کوئی نہیں توڑ سکتا تمہیں۔ وہ تمہیں پیسہ دیں گے، خریدیں گے، پھسلائیں گے۔ ایماندار رہے تو بدلے میں بھوک اور ظلم ملے گا — بے ایمان ہو گئے تو عیش کرو گے ...."

— [illegible] نہیں پڑھا —

پہلی بس کے بعد دوسری، تیسری، چوتھی نکل گئیں۔ اب آخری بس کی انتظار تھی۔ وہ بھی آگئی — میں تیزی سے اُس پر چڑھ گیا —

"رُک جاؤ۔ ابھی بہت ساری باتیں پوچھنی ہیں۔ کس سے پوچھوں گا ؟"

اُس نے گرم جوشی میں میرا ہاتھ پکڑ لیا — میرے جی میں آیا رک جاؤں۔ نوجی کو اپنے پرانے ساتھیوں کے حوالے کر جاؤں — کہیں کوئی چالاک اسے ختم نہ کر دے۔ لیکن کس کے پاس جاؤں ؟ انہیں ایسے لوگوں کے لیے فرصت ہی نہیں ہے — وہ تو آپسی لڑائی میں ہی مصروف ہیں ایک تنظیم کی کئی تنظیمیں اُن میں بھی کئی گٹ ...... اب کون کرے گا نوجی کی مدد ؟ کس کے حوالے کروں اسے ؟ کون اس کی باتوں کا جواب [illegible]

سبز شہر کے سوکھے پتے

میں خاصا پریکٹیکل آدمی ہوں — دو جمع دو کرنا ہی میری زندگی ہے۔ سیدھی سادی سپاٹ زندگی نہیں — بزنس میں کچھ اصولوں کا پابند ہوں۔ اگرچہ میں پیدائشی بزنس مین نہیں — بلکہ اگر یہ کہوں کہ میرے خاندان میں کبھی کسی نے بزنس کی ہی نہ تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ مجھے جبری نوکری سے نکالا گیا — تو مجھے مجبوراً بزنس کرنا پڑا — اور پھر آپ جانتے ہیں کہ جب بزنس کا چسکا پڑ جائے تو نوکری مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ یہی یہ ہوا کہ جیسے حادثہ ہوا — تین چار سال کی تحقیق کے بعد جب مجھے ملازمت میں بحالی کا مژدہ سنایا گیا — تو میں نے دفتر جوائن کر کے کچھ عرصہ ملازمت کر کے اپنے تین سالہ واجبات لے کر استعفیٰ دے دیا — کہ میں دو اور دو چار کا حامی ہوں — اور میرے خیال میں میرا محکمہ اسی قابل تھا — کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا — بہر حال میں اپنے فیصلے پر آج بھی قائم ہوں — اور خوش و خرم ہوں — لیکن پھر جانے کہاں اور کب سے یہ سلسلہ چل نکلا —

آپ شاید میری بات سمجھے نہیں — ابھی میں نے بتایا نا — کہ میں دو اور دو چار قسم کا آدمی ہوں۔ سو جب رات بستر پہ لیٹتا ہوں ایسی گہری نیند سوتا ہوں کہ خواب خرگوش والا خرگوش بھی میری نیند سے گھبرا جائے۔

ایک دفعہ دوستوں کی محفل میں خوابوں کا ذکر چل نکلا — میں نے سب کو بتایا — کہ میں خواب نہیں دیکھتا۔ میری بات سن کر سب پہلے حیران ہوئے کہ جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں — اب تو مجھے ایسے ایسے قصے اور ہدایات جاری کی گئیں کہ مجھے بھی لگا جیسے خواب نہ دیکھ کر میں نے بھی کوئی بہت بڑا ظلم کر دیا ہے۔ دوسروں پر نہیں اپنی ذات پر — خیر میں نے بہت سوچا — ماہرین نفسیات سے مشورہ کیا۔ لیکن پتہ یہ چلا — کہ یا تو میں بہت گہری نیند سونے والا آدمی ہوں۔ اس لیے خواب یاد نہیں رہتے — یا واقعی اتنا خالی الذہن ہوں کہ خواب آتے ہی نہیں — بہر حال میں چند دن سے زیادہ اس مسئلہ پر توجہ نہ دے سکا — کہ بزنس میں اپنی توجہ معقولیات پر مرکوز نہیں کرتے — چند دن فکر مند رہنے کے بعد میں یہ بات بھول گیا۔

اس رات بہت ٹھنڈ تھی — اور میں نے سونے سے پہلے کھڑکیوں کے دروازے خود بند کیے تھے — اور پردے گرائے تھے۔ ہیٹر آن کر کے سو گیا — اور جب آنکھ کھلی تو میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سونے اور جاگنے کی کیفیت میں جانے کتنے پل گزر گئے — اور پھر جب کچھ حواس بیدار ہوئے، تو پہلا یہ احساس تھا، کہ میں نے خواب دیکھا ہے — کہ میں ایک وادی میں گھوم رہا ہوں۔ جہاں عجیب قسم کا حُسن

سیدہ حنا

چاندی کی ہیں پازیبیں
اس عیسا [illegible]
تحفہ تمہیں کیا بھیجوں
[illegible] پکڑی گئی چوری
روتی نہ جلا دینا
[illegible] ان میں ہو گوری ؟
[illegible] اپنا بھائی ہے
مہندی لگے ہاتھوں سے
سالن وہ پکائی ہے
کھویا ہوا چہرا [illegible]
بستی میں بہت دن سے
اس شخص کا چرچا ہے
چلنے لگی پروائی ،
گزرے ہوئے موسم کی
اک چوٹ اُبھر آئی
چلتے ہوئے رستے میں
آنکھ کے کناروں کو
دکھ لیتے تھے بستے ہیں

ربّ تیرا ہو رکھوالا
[illegible] آتشِ فُرقت نے
[illegible] کو تو جلا ڈالا
کنگن ہے کلائی میں
گھر والوں سے چُھپ چُھپ کر
روتی ہے جُدائی میں !

ہوا ہے ۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ۔۔۔ [illegible] یہ خواب [illegible] کیوں آیا ۔۔ اور سوچتے سوچتے دوبارہ سو گیا ۔
دوسری صبح میں اس خواب کو تقریباً بھول چکا تھا [illegible] بہت سے نئے ٹینڈر داخل کروانے تھے ۔ پورا دن اس بھاگ دوڑ میں ۔۔ کبھی کسی افسر ۔۔ کبھی کسی منشی ، اور کبھی کسی افسر کے رشتہ دار کے پیچھے بھاگتے گزر گیا ۔۔۔ رات تھک ہار کے بستر پہ لیٹا تو یہی خیال تھا کہ آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی مہربان دیوی اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی ۔

اور یہی ہوا ۔۔ میں جلد ہی نیند کی بھول بھلیوں میں کھو گیا ۔۔ لیکن پھر وہی خواب ۔۔۔ میں گھبرا اٹھا ۔۔ اور سوچنے لگا بھلا میں خواب میں ایسی کون سی [illegible] پریشان ہو کر جاگ اٹھتا ہوں ۔۔۔ یہ کون سی جگہ ہے ، وہ علاقہ میرا اتنا دیکھا بھالا کیوں دکھائی دیتا ہے [illegible] ۔۔۔ تیسری رات اور پھر چوتھی رات تواتر سے اس خواب نے میری خود اعتمادی کو جھنجھوڑ ڈالا ۔۔ اور میں سوچنے لگا کہ نہ تو میں حضرت ابراہیمؑ کی طرح عظیم ہوں ۔۔ جو کوئی بشارت ہو رہی ہے ۔ اور نہ ہی اللہ کا اتنا پیارا بندہ ہوں ۔ کہ وہ اپنی آزمائش کے لیے مجھے چنے ۔۔ ۔۔۔ کہ وہ آزمائش کے لیے اپنے پیارے بندوں کو چنتا ہے ۔ مجھ جیسے دنیا دار اور دو جمع دو کرنے والوں کو نہیں چنتا ۔

[illegible] تفصیلی معائنے کے بعد خواب آور اور تسکین [illegible] خواب آنا بند ہو گیا ۔۔ اور میں مطمئن ہو گیا [illegible] کسی جسمانی یا معدے کی خرابی کا شاخسانہ تھا ۔۔ میں دوبارہ اپنے کاروبار میں گم ہو گیا ۔ کانٹریکٹ بڑھتے گئے ۔

انہی دنوں میں بے حد خوش تھا ۔۔ ایک بہت بڑے کانٹریکٹ کی آس ہو چلی تھی ۔۔۔ بس مجھے دور شہر میں اُس بڑے افسر کے سامنے کو کچھ جانا تھا ۔۔ تاکہ یہ کانٹریکٹ صرف اور صرف میرے ہاتھ میں رہے ۔۔۔ صبح ہی صبح تیاری کرنے کے بعد شہر کی جانب چل دیا ۔ بڑے افسر کے لیے تحائف اور پھلوں کے ٹوکرے گاڑی میں رکھے ۔۔۔ میں اُس شہر کی جانب رواں دواں تھا ۔۔ [illegible] یکسانیت دور کرنے کے لیے میں نے اپنے اچھے کیسٹ رکھ لیے تھے ، وہ بھی جن کی مجھے سمجھ نہیں تھی اور وہ بھی جن کا TASTE مجھے نہ تھا ۔

کبھی کبھی اپنی مرضی کا کیسٹ سنتا اور کبھی بدل کر دوسرا لگا دیتا ۔ اسی چکر میں دو تین گھنٹے کا سفر گزر گیا ۔۔ اور میں [illegible] بس اب آدھا سفر باقی ہے ، گاڑی ابھی چند کلومیٹر چلی تھی ۔۔ کہ پہاڑی کا موڑ کاٹتے ہی جو وادی میری آنکھوں کے سامنے تھی ۔۔ وہ وہی وادی تھی جسے میں اتنے بہت سے دن خواب میں دیکھا ، بلکہ اس وادی کا ایک ایک درخت ایک ایک پودہ ۔۔۔ اور اگر یہ کہوں کہ ایک ایک چپہ میرا دیکھا بھالا تھا ۔ تو حیران نہ ہوئیے گا ، پہلے اس وادی کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا ۔۔ اور سوچنے لگا کہیں ایسا تو نہیں کہ خواب کے ذریعہ ہی مجھے اس وادی تک بلایا جا رہا ہے ۔۔ اور کبھی یہ سوچا کہ شاید یہ وادی میں نے بچپن میں دیکھی ہے جو میری یادداشت کے خانوں میں کہیں چھپی رہی اور اب باہر آ گئی ہے ۔۔ مگر کوئی دلیل مجھے مطمئن نہ کر سکی ، اور آخر میں نے وہی کیا ۔۔ جو مجھ جیسے دو + دو والے انسان کو کرنا چاہیے ۔ میں گاڑی سے اترا گاڑی لاک کی ۔۔ اور وادی کی طرف بے خطر بڑھنے لگا ۔ بے خطر میں اپنے آپ کو باور کروا رہا تھا ۔۔ حالانکہ دل کی دھڑکن کنپٹی سے آ رہی تھی ۔ اور مجھے اپنے ہی دل کی دھڑکن گاڑی میں لگے ڈسکو گانے سے بھی اونچی سنائی دے رہی تھی ۔

وادی میں میرا پہلا قدم اُسی پودے کے پاس تھا جسے خواب میں میں نے پہلی دفعہ چھوا تھا ۔ اُس ہرے بھرے پودے پر صرف ایک ہی ادھ کھلا گلاب کا پھول ویسا ہی تھا ، جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا ۔۔۔ اس پودے کے آگے قطار میں ایسے ہی گلاب کھلے تھے ، اور ویسے ہی ہر پودے پر ایک ادھ کھلا پھول [illegible] قطار میں نہ ایک زیادہ نہ ایک کم ۔۔ اگلی قطار میں سبز پتوں کے ساتھ پیلے پھول تھے اور [illegible]

میں قدم بڑھاتا جا رہا تھا — سبزے نے مجھے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا — اب خوف کی جگہ تجسس نے لے لی تھی — مجھے یہ علاقہ اتنا جانا پہچانا، — اتنا آشنا لگ رہا تھا — کہ خوف کا بُت خود بخود کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا — یہ وادی تو میری اپنی وادی تھی — میں آگے اور آگے چلنے لگ گیا۔ ہر قدم کے بعد مجھے [illegible] قدم کہاں جائے گا — اور آنکھیں کیا دیکھیں گی — میں ایک [illegible] دوسری جانب سوچ کر بڑھتا۔ کہ اگلے موڑ پر کہاں سے جنگل اور پودے ہوں گے — میں اسی خیال میں آگے بڑھا — تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا — اس سرسبز وادی میں ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت کھڑا تھا — جس کے چاروں جانب سبزہ تھا — لیکن اُس درخت کا کوئی پتہ ہرا نہ تھا — وہ درخت ایسا ہی تھا، جیسے خزاں نے اس پر ڈیرے ڈال رکھے ہوں — پوری وادی کے چپے چپے پر اُتری بہار نے اپنا کوئی پَرتو کوئی عکس کوئی سایہ اس ٹُنڈ مُنڈ درخت پر نہیں ڈالا تھا — مجھے پوری [illegible] نہیں کیا تھا — جتنا اس درخت نے — میرے قدم خود بخود غیر مرئی طاقت کے [illegible] اُس درخت کی جانب اٹھنے لگے — اور میں سوچنے لگا، کہ میں بھلا — اس درخت کی جانب کیوں بڑھ رہا ہوں — جبکہ قدم قدم پر مجھے سبزہ اور حسن گھیرے ہوئے ہے۔ پھر یہ ٹُنڈ مُنڈ تنہا درخت مجھے اپنی طرف چلنے پر کیوں مجبور کر رہا ہے، آخر کیوں —

لیکن اس کیوں کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں بس چل رہا تھا — اُس درخت کی جانب بڑھ رہا تھا، اور پھر چلتے چلتے — میں اُس درخت کے پاس پہنچ گیا، اور جب میں اُس درخت کے قریب پہنچا — تو میرے لیے یہ حقیقت تسلیم کرنی بے حد مشکل تھی — کہ وہاں درخت کا نام و نشان تک نہیں تھا — وہاں بہت سے سبزے میں گھرا صرف میں کھڑا تھا۔ ایک ٹُنڈ مُنڈ اور تنہا درخت کی طرح!

لمحہ پہلا

"[illegible] ایک التجا ہے۔"

[illegible] گل کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا، اس نے بوکھلا کے چاروں طرف دیکھا، کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا سوائے ڈھیر ساری کٹھ پتلیوں کے۔ مگر آواز [illegible] کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں وہی آواز دوبارہ آئی [illegible]

"[illegible] ایک درخواست ہے۔"

[illegible] بعد اُس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا آواز یقیناً اس کٹھ پتلی سے آ رہی تھی جس کا نام اس نے اعتبار الدولہ رکھا تھا وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اُس کے تازہ تازہ رنگ کیے ہوئے چہرے پر زندگی کی حرارت موجود تھی اور آنکھوں کی پتلیاں متحرک تھیں۔ گل کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ اس کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی کٹھ پتلی اس سے مخاطب تھی۔

"[illegible] میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" آواز بھاری اور پُروقار تھی مگر لہجے میں احترام شامل تھا۔ گل نے دیکھا اعتبار الدولہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک [illegible]

"تم — تم بول رہے ہو؟"

[illegible] بڑا عجیب لگ رہا تھا وہ ایک کٹھ پتلی سے مخاطب تھا وہی کٹھ پتلی جسے اس نے پچھلے ہفتے بنایا تھا پھر اس کے چہرے پر رنگ و روغن کیا [illegible] جاربٹ کا انگرکھا پہنایا تھا اور ٹین کی تلوار اس کے ہاتھ میں دے کر فیروزہ مروارید کی ڈبیا کا ڈھکن بطور ڈھال اس کی پشت پر [illegible] نام اعتبار الدولہ رکھا تھا وہ واقعی کسی شہنشاہ کے دربار سے وابستہ ہفت ہزاری منصب دار — کوئی بڑا جاگیردار نظر آتا تھا اور اب — اب وہ بول رہا تھا۔

"[illegible] — میں کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اب گل کے حواس بڑی حد تک بحال ہو چکے تھے۔

"تم — تم اعتبار الدولہ تم بول رہے ہو؟" [illegible] کے لہجے میں خلاقی کا اعتماد واپس آ چکا تھا۔

"[illegible] میرے آقا — میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔" [illegible] پر ہاتھ رکھ کر اعتبار الدولہ بڑے سلیقے سے جھکا۔

بول [illegible] ہوگیا تھا اس سوال کا کسی کٹھ پُتلی کے پاس کیا جواب ہوگا۔

"یہ آپ کی عنایت ہے مرے حضور کہ میں بول سکتا ہوں۔" اس کے لہجے میں بڑی پُختگی تھی۔

"کہو۔ کیا کہنا ہے۔" گل اب اس کی بات سننے پر آمادہ تھا۔

"حضور ایک معمولی سی درخواست ہے۔" اعتبارالدولہ جیسے کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"جلدی بولو۔ بولو بھی نا۔" گل [illegible] جاننا چاہتا تھا۔

"حضور یہ لسترن بچھونا۔ اس کو میرے پاس سے ہٹا دیجئے۔ یہ مجھے زہر لگتی [illegible]

میں کہا۔

"کیوں کیا خرابی ہے اس میں" اب گل باقاعدہ گفتگو کر رہا تھا۔

"خرابی کی بات نہیں ہے بس [illegible] یہ مجھے پسند نہیں ہے۔" اعتبارالدولہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "بس یہ

مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"مگر میں نے تو اسے تمہاری جوڑی کے لیے بنایا ہے" گل اپنے ہاتھوں سے بنائی کٹھ پُتلی سے گویا وضاحت کر رہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے حضور —— مگر میری جوڑی کے لیے آپ ایک اور کٹھ پُتلی بھی تو بنا سکتے ہیں —— ایک نازک سی —— کامنی سی

...... " وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"نازک سی۔ کامنی سی —— کیا کہا کامنی سی۔ نازک سی" گل حیران تھا اس نے آگے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ فرزانہ کی کرخت آواز اس کے

کانوں میں در آئی۔

"کھانا کھانا ہے تو کھا لو —— میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی"

"تم شروع کرو فرزانہ میں ابھی آتا ہوں" اس نے نرمی سے کہا۔

"تم بے وقت مت بنایا کرو —— اگر آنا ہے تو فوراً آؤ ورنہ کوئی ضرورت نہیں آکے کھانا کھانے کی" فرزانہ حسبِ معمول آمادۂ فساد تھی۔

گل نے مُڑ کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ مٹاپے کی طرف مائل بدن جو تیزی سے اپنی دلکشی کھو رہا تھا بال [illegible] نیز

قمیص پیٹ سے نیچے بہت میلی اور دوپٹہ غائب۔ گل کو متلی سی ہونے لگی۔

"تم چلو فرزانہ میں آتا ہوں" اس نے بڑی کوشش سے اپنا لہجہ نرم رکھا۔

"فوراً اُٹھ جاؤ" فرزانہ نے گویا ایک دھمکی دی "چلو اُٹھو، ہاتھ دھو لو"

طیش کی ایک کرہ پیکر موج گل کے اندر کہیں اُٹھی اور اُمڈتی ہوئی فرزانہ کی جانب بڑھی۔

"جاؤ" وہ دھاڑا "فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے کھانا نہیں کھانا"

"مت کھاؤ" وہ شاید ڈر گئی "بھاڑ میں جاؤ"

[illegible] سنسنی سی دوڑ رہی تھی فرزانہ اس سے عام طور پر یہی سلوک روا رکھتی تھی۔ وہ ہر کام اس کی مرضی کے خلاف کرنا

چاہتی تھی اور کرتی رہتی تھی جب اسے چائے کی خواہش ہوتی فرزانہ اسے [illegible] پلاتی۔ جب وہ کھانا نہ کھانا چاہتا تو وہ اس کے سر ہو جاتی۔

جب وہ کہیں جانا چاہتا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ وہ جانہ سکے اور جب پھر بھی نہ ٹھہرتا تو اسے کھڑ دیتی "کٹھ پتلی والے" وہ ایسے گھنا ؤنے لہجے میں اسے کٹھ پتلی والا کہتی گویا گالی دے رہی ہو کبھی اسے تکلیف پہنچانے کو کہتی "کوئی معقول کام نہیں کر سکتے تم۔ پنواڑی کی دکان ہی کھول لو ۔۔۔ یوں ان بڑے حالوں پہ گھٹیا کام کرنے سے تو بچ جاؤ گے"

خیال کا سلسلہ ٹوٹا تو گل کو یاد آیا اعتبار الدولہ کچھ کہہ رہا تھا [illegible]

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم" اس نے اعتبار الدولہ کو مخاطب کیا۔

اعتبار الدولہ کی [illegible] زندگی کے کوئی آثار نہ تھے وہ خاموش تھا۔

"تم کچھ کہہ رہے تھے اعتبار الدولہ" گل نے پھر اسے مخاطب کیا مگر اعتبار الدولہ اب بھی خاموش تھا اس کا بے جان پتھریلا چہرہ زندگی سے عاری تھا۔ [illegible]

"مجھے معلوم تھا تم ایک دن پاگل ہو جاؤ گے" گل نے مڑ کر دیکھا۔ فرزانہ دروازے میں کھڑی تھی اس کے چہرے پر استہزائیہ تبسم تھا۔

"[illegible] ان کے ساتھ ۔۔۔ ان کو سلاؤ اپنے ساتھ ۔۔۔ اب یہی کچھ ہوگا یہاں" وہ مسلسل تیر چلا رہی تھی۔ اچانک گل کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور دھیرے دھیرے فرزانہ کی طرف بڑھا اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ فرزانہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ "ذلیل عورت ۔۔۔ تو کسی دن قتل نہ ہو جائے میرے ہاتھ سے" گل دانت پیس رہا تھا۔

وہ پھر اپنے اسٹول پر آ بیٹھا۔ غصے نے اسے دیوانہ کر دیا تھا اس کے اعصاب ٹوٹ رہے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے [illegible] سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی۔ گرم گرم کیف آور دھواں اس کے اندر دور تک اترتا چلا گیا۔

[illegible] اعتبار الدولہ کی آواز پھر اس کے کان میں آئی۔

"ہاں ہاں کہو ۔۔۔ تم کیا کہہ رہے تھے" گل کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"جی ہاں میں ۔۔۔ یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ نسترن مجھے پسند نہیں ہے کیا آپ میری جوڑی کے لیے ایک اور کٹھ پتلی نہیں بنا سکتے" اس کے انداز میں بلا کی لجاجت تھی۔

"نسترن تمہیں پسند نہیں ہے" گل نے حیران ہو کر نسترن کی طرف دیکھا۔ سرخ بنارسی گھاگھرے اور چولی میں کسی کسائی نسترن اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی، اس کے ایک کولہے پر زنگار رنگ نقش و نگار والا مٹکا دھرا تھا جس کی گردن میں اس کی صحت مند بانہہ حائل تھی۔ ایک لمبی سی چوٹی اس کے نصف ادھ کھلے گریبان پر سے ہوتی ہوئی اس کے پیٹ پر لہرا رہی تھی۔ پنکھے کی ہوا میں اس کا گھاگھرا ہلکورے لے رہا تھا۔

"جی ہاں ۔۔۔ اب کیا عرض کروں ۔۔۔ دراصل یہ کسی اور مزاج کی عورت ہے میری تو اس سے بنتی نہیں" نہ یہ میری بات سنتی ہے اور نہ مجھے اس کی کوئی بات بھاتی ہے ۔۔۔ عجیب زہریلی عورت ہے" اعتبار الدولہ اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

[illegible] اس نے پوچھا۔

[illegible] بات نہ کرے میرا تو دماغ کھا لیتی ہے" اعتبار الدولہ نے کہا۔

"نسترن یہ کیا معاملہ ہے" اس نے نسترن کو براہ راست مخاطب کیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی راہ چلتی اجنبی عورت سے بات کر رہا ہو۔ "کیوں بھئی نسترن یہ کیا معاملہ ہے" نسترن کا پتھر بدن ساکت تھا اور آنکھیں بے حرکت۔ "یہ تو نہیں بولتی" گل کو تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔

[illegible] لے جاتے ہی لڑنے لگی اور بولے ہی چلی جانے گی۔"

[illegible] آخر جھگڑا کیا ہے" گل حیران تھا کہ آخر کٹھ پتلیوں کے درمیان کیا وجہ اختلاف ہو سکتی ہے۔

[illegible] ایک عجیب سی بُو آتی ہے [illegible] الدولہ نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ "بُو آتی ہے!" گل بہت حیران تھا۔

[illegible] نے ہاتھ بڑھا کر [illegible] اٹھا لیا۔ گل کو یوں لگا جیسے وہ ذرا سی کسمسائی ہو۔ اس نے اسے ناک کے قریب لے جا کر سونگھا۔ بدبو کا [illegible] اس کے وجود میں [illegible] بالکل ویسی ہی بدبو جیسی فرزانہ کے بدن سے [illegible]

[illegible] بدبو اسی کے بدن سے آتی ہے یا اور کٹھ پتلیاں بھی ایسی ہی بدبودار ہیں۔" اس نے اعتبار الدولہ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر نہ جانے کیا بات تھی [illegible] سے چھو نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اعتبار الدولہ کوئی بھاری بھرکم شخصیت ہو جسے اس کی مرضی کے بغیر چھونا ممکن نہ ہو۔ گل نے بریکٹ پر کھڑی پدمنی کو اٹھا لیا ہلکی ہلکی گلاب کی مہک اس کے لکڑی اور مٹی کے پیکر سے نکل رہی تھی گل حیران رہ گیا۔ پھر اس نے پدمنی کے ساتھ کھڑے رتن سنگھ کو اٹھا کر سونگھا۔ مزید حیرانی اس کی منتظر تھی۔ رتن سنگھ کے جسم سے عجیب سی بُو آ رہی تھی بالکل ایسی جیسی [illegible] کے بعد پہلوانوں کے بدن سے آتی ہے۔ گل متعجب تھا کہ ان سب کٹھ پتلیوں کے جسم کی بُو بھی الگ الگ ہے۔ اس نے جلدی سے رتن سنگھ کو واپس بریکٹ [illegible] دیا اور میز کے نیچے رکھے ہوئے پاٹے خان کو اٹھا کر سونگھا جس کے کاندھے پر رکھا ہوا ننھا منا ہل اس کے پیشے کی علامت تھا۔ پاٹے خان [illegible] جون مٹی کی مہک سے بسا ہوا تھا تازہ تازہ سوندھی سوندھی مٹی کی سہانی خوشبو — عجیب بات ہے گل متحیر تھا۔

[illegible] جانے کیسی جوڑی بناتے ہیں آپ" اعتبار الدولہ نے گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اب دیکھئے نا کہاں یہ ناہنجار عورت اور کہاں میں" اعتبار الدولہ کو جیسے اپنی نجابت، اعلیٰ اخلاق اور خلعت و منصب کا پورا پورا ادراک تھا اور نسترن کی تو وہ جیسے اصلیت سے واقف تھا۔

"میں نے تو اچھی خاصی جوڑی بنائی تھی" گل کا انداز مدافعانہ تھا "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کٹھ پتلیاں بھی اپنی پسند و ناپسند رکھتی ہیں۔"

"کہاں اچھی خاصی جوڑی بنائی تھی" اعتبار الدولہ گویا آمادۂ جدال تھا۔

"آپ ذرا انصاف فرمائیں کہ میرا اور اس نیچ عورت کا کیا جوڑ" گل کو ایسا لگا جیسے نسترن کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے ہوں مگر وہ [illegible] خاموش تھی۔

"کھانا کھاؤ گے یا ممی کو دے دوں؟" دروازے میں کھڑی فرزانہ اس بار قدرے شریفانہ انداز سے مخاطب تھی۔

"جس کو چاہے دے دو" گل نے اکتا کر کہا۔

"گل پلیز وہ اپنی نیوروسس والی گولیاں کھا لو — تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" وہ باقاعدہ محبت بگھار رہی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں خدا کے لیے تم میرا پیچھا چھوڑ دو" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"گل — میں تمہاری بیوی ہوں" فرزانہ مصر تھی "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تم ان کٹھ پتلیوں سے باتیں کر [illegible]"

"میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں — میری جان چھوڑ دو — پلیز یہاں سے چلی جاؤ —" اس کا لہجہ ایسا کڑا تھا کہ فرزانہ فوراً ہی چلی گئی۔

[illegible] ہی ہی ہی — قہ قہ قہ" اعتبار الدولہ ہنس رہا تھا [illegible]

علیش کی ایک اور کہ پیکر موج گل کے اندر اُٹھی۔ یہ کم بخت اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا [illegible]
[illegible] پر پہنچ رہے تھے۔" اس نے غصہ دباتے ہوئے پوچھا [illegible]
"میں معافی چاہتا ہوں ——— ویسے بات ہونے کی تھی۔" بولا کا لہجہ بازتھا کم بخت [illegible]
"تم حد سے بڑھ رہے ہو" گل نے ڈپٹ کر کہا۔
"سرکار میری معذرت قبول ہو" اعتبار الدولہ نے دھیمے لہجے میں کہا [illegible]
"اپنی بات کرو ——— یہ تمہارا نسترن سے اختلاف کب سے ہے" گل پوری بات جاننا چاہتا تھا۔
"جب سے [illegible] کر تخلیق فرماکر میری شریکِ حیات قرار دیا ہے۔" اعتبار الدولہ نے کہا۔ "تبھی سے یہ میرے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔"

[illegible] تمہارا اس کے ساتھ اختلاف کیوں ہے ——— دیکھو نا ——— تمہارا نہ کوئی معاشی مسئلہ ہے اور نہ کوئی ——— اور رہی جسم کی [illegible] ممکن ہے تم ———

"تو کیا مسائل کی نوعیت صرف معاشی ہوتی ہے جیسے آپ کے مسائل۔" وہ بڑے عالمانہ انداز سے گفتگو کر رہا تھا

گل کو پھر فرزانہ کا خیال آیا۔ وہ کل ہی اُسے بتا رہی تھی کہ کیا کیا خریدنا ہے اور اخراجات کہاں کہاں ہونے ہیں اور جب گل نے اسے بتایا تھا کہ جب تک یونائیٹڈ پیٹس کمپنی والے ادائیگی نہیں کرتے یہ سب ممکن نہ تھا تو وہ غصے سے دیوانی ہوگئی تھی۔

"شادی کیسی کی تھی کٹھ پتلی والے۔" اس نے چلّا کر کہا تھا۔ "کسی کٹھ پتلی سے کام چلا لیا ہوتا۔"

"دیکھو فرزانہ باز آجاؤ ——— تم حد سے بڑھ رہی ہو" اور وہ اپنا سر تھامے گھر سے نکل گیا تھا۔

"[illegible] خیال میں آپ کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں ہے" اعتبار الدولہ نے اسے چونکا دیا۔ جو اب تقریباً برابری سے بات کر رہا تھا۔ گل نے اسے غور سے دیکھا، کتنی جانفشانی سے اس نے یہ کٹھ پتلی بنائی تھی چار مرتبہ تو اس کی ناک ٹوٹی تھی۔ اور آخری مرتبہ تو رنگ کرنے کے بعد ٹوٹی تھی جسے اس نے بڑی صفائی سے ایرلڈائٹ سے جوڑ دیا تھا بڑی محنت سے اس کے بال سیٹ کیے تھے کھلونوں کی دکان سے اس کے لیے ایک ننھی منّی تلوار ڈھونڈ کر لایا تھا اور اب یہ کم بخت برابری پہ آمادہ تھا، یہ دو فٹ کا پیٹ ———

"دیکھو اعتبار الدولہ تم بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں سکتے" اس نے تحمل سے کہا۔

"آپ کوشش تو کریں مجھے سمجھانے کی" وہ مسلسل بحث کر رہا تھا۔

"اچھا تو سنو" گل نے آہستگی سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں جو کٹھ پتلیاں بناتا ہوں وہ میری ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں۔ جیسی کٹھ پتلیوں کا آرڈر ملتا ہے ویسی ہی بناتا ہوں اور بیچ دیتا ہوں۔ دراصل ان کی شکل صورت اور لباس وغیرہ میں میری خواہش کا دخل بہت کم ہوتا ہے۔"

"چلیے مان لیا ——— پھر بھی آپ کو جوڑی تو ذرا مناسب بنانا چاہیے ——— اب یہ نسترن اور میری جوڑی ——— محل میں ٹاٹ کا پیوند" وہ لیلیٰ و بیان کے جوہر دکھا رہا تھا۔

"یہ تمہارا خیال ہے ——— میرے خیال میں سارے بیچکے محض بیچکم ہی ہوتے ہیں اور ان کی اپنی پسند ناپسند نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے" گل نے جواب دیا۔

گھنٹی کی آواز نے گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا۔ گل دروازے کی طرف چل دیا۔ یہاں آ کر پھر بے موقع آگیا تھا جب کہ گل نے اسے کئی بار بتایا تھا کہ وہ دوپہر
کے وقت کام کرنا پسند کرتا ہے اور پھر وہ اکرم ہی گیا دُنیا بھر کی باتیں ۔۔۔ قصے کہانیاں اور نہ جانے کیا کیا اول فول سنا کر ہی ٹلا۔ اس کے جاتے ہی
گل اپنے ڈارک شاپ والے کمرے میں واپس آگیا۔ مزید تحیر اس کا منتظر تھا۔ میز اور بریکٹ پر جیسے ایک ایک تبدیلی ہو چکا تھا نشترن میز کے
دوسرے کونے پر کھڑی تھی اس کے چہرے سے خوف صاف ظاہر تھا اور اعتبار الدولہ ۔۔۔ وہ پدمنی کے پاس کھڑا تھا تلوار اس کے ہاتھ میں تھی
پدمنی کے دوسری جانب رتن سنگھ جیسے تنا کھڑا تھا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس مرتبہ اعتبار الدولہ خود ہی بول اٹھا۔

"آپ کے بارہ سو روپے کا خیال آگیا ورنہ اس کا تو میں نے کام تمام ہی کر دیا ہوتا" اس کا اشارہ شاید رتن سنگھ کی طرف تھا جو اسی طرح تنا
کھڑا تھا۔

"[illegible] اعتبار الدولہ ایسی [illegible] شاید بھول رہے ہو کہ تم ایک کٹھ پتلی ہو" گل اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا

"میں ہی تنہا ایک کٹھ پتلی ہوں" اعتبار الدولہ نے پھر استہزا کیا۔

"نہیں تم تنہا ایک کٹھ پتلی نہیں ہو میں نے اور بھی بہت سی بنائی ہیں مگر تم جیسا جھگڑالو ایک بھی نہیں دیکھا" گل نے کہا۔

"[illegible] بارے میں کیا خیال ہے" اعتبار الدولہ کی مونچھوں کے نیچے ایک زہریلا تبسم کلبلایا۔

"کیا میں تمہیں بیوقوف نظر آتا ہوں" گل نے سرد لہجے میں کہا۔

"[illegible] ہے آپ کو کیا نظر آتے ہیں آپ ہی بتا دیجئے" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میں تمہارا سر توڑ دوں گا" اب گل شدید غصے میں تھا۔

"اس سے کیا آپ کی حیثیت بدل جائے گی" اعتبار الدولہ کا ساحرانہ جواب تھا۔

"[illegible] ۔۔۔ تمہیں جہنم رسید کر کے میں نیا پتلا بنا لوں گا" گل کو غصے میں اپنی آواز بھی
[illegible] اب وہ معاف [illegible]

"[illegible] جلدی کیجئے نا ۔۔۔ دیر کس بات کی ہے" گل نے دیکھا وہ اپنی ننھی سی تلوار کے قبضے پر گرفت مضبوط کر رہا تھا "کیا اب بارہ سو روپے
کا خیال آیا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں بارہ سو روپے پر" گل نے چیخ کر کہا اور آگے بڑھ کر اعتبار الدولہ کو گردن سے پکڑ لیا۔ وہ نہ تڑپا نہ چلایا۔ مگر وہ
[illegible] میں جانکنی کا عالم تھا۔ اس کی بھنویں تن گئی تھیں اور آنکھیں شدید نفرت سے لبالب بھری ہوئی تھیں ایک لمحے کے توقف
کے بعد اس نے گھٹی گھٹی آواز میں گل سے کہا "کیا ہوا ڈر گئے ۔۔۔ بارہ سو روپے؟"

[illegible] گل مزید صبر کر سکتا تھا اس نے اعتبار الدولہ کو پوری قوت سے فرش پر پٹخ دیا اسی لمحے فولاد کی آواز اس کے کانوں میں آئی "بھگتنا
[illegible] ۔۔۔ اب تم اُن کٹھ پتلیوں [illegible]"

"نکل جاؤ یہاں سے" اس نے فولاد کی طرف لپکنا چاہا مگر درد کی ایک تیز لہر اس کے بائیں بازو کو چیرتی ہوئی دل تک نکل گئی [illegible]
[illegible] فولاد کو ستانا چاہا ۔۔۔

"فولاد ۔۔۔ میرا ۔۔۔ سانس" میز کا سہارا لینے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اور گل اعتبار الدولہ کے قریب ہی گر گیا۔ مسلسل اختلاج

آنکھوں سے اس نے دیکھا اعتبارالدولہ کا ننھا منا شکستہ سر اس کے قریب ہی کٹا ہوا تھا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کے بالوں سے نکل کر کان کی طرف جا رہی تھی مگر وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، پھر جیسے کہیں دُور سے اعتبارالدولہ کی آواز آئی "کیا میں ہی تنہا ایک پیٹ ہوں" گل کی شاخ جواب دے گئی۔ اس کا دل جیسے کسی اندھے کنوئیں میں گر گیا۔ ہر طرف گہرے سُرخ رنگ کی کہر سی پھیل گئی اور وہ اتھاہ زمینوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

سودا

ہما سید

جب بھی مائی خیراں اپنی مفلوج اور مضبوط ملراس بیٹی بُوجو کو لکڑی کی ریڑھی پر بٹھائے بھیک مانگنے سائیں جھنڈو کے تکیہ کی طرف جاتے ہوئے پھوکے کی جھگی کے سامنے سے گزرتی، پھوکے کا جی جل جاتا "بھک منگی، حرام خور" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا اور کبھی کبھار یہی الفاظ قدرے اونچی آواز میں بھی کہہ دیتا، جس پر مائی خیراں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی اور پھر اس طرح بے دھیان ہو جاتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھوکا تلملا اٹھتا اور پھر یہ سوچ کر کر بھک منگوں، حرام خوروں پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا، وہ اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔

مائی خیراں سے پھوکے کی دشمنی تب شروع ہوئی تھی جب مائی خیراں کے پانچ روپے چوری ہو گئے تھے۔

وہ جمعرات کا دن تھا۔

"ایک ایک روپے کے پانچ نوٹ...... " مائی خیراں اپنے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھول کر اس طرح ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے چور کے خلاف پانچ گواہوں کا بیان درج کرا رہی ہو۔

اس وقت پھوکا جھنڈو سائیں کے لنگر سے روٹی ملنے کی امید میں تنور کے عین سامنے دھریک کے درخت کے نیچے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اسے مائی خیراں کی آواز تو سنائی دے رہی تھی، چونکہ وہ کسی کا نام لیے بغیر الزام تراشی کر رہی تھی اس لیے وہ کان لپیٹے بیٹھا تھا۔

"[illegible] دیر کو بڑے سائیں جی کی چوکھٹ پر سلام کرنے گئی تھی۔ واپس آئی تو یہ ٹھیکریاں رہ گئی تھیں.... " وہ بُوجو کی جھولی میں رکھا ہوا تام چینی کا پیالہ اٹھا کر اس میں پڑی ہوئی ریزگاری چھنکاتے ہوئے بولی "ایک ایک روپے کے پانچوں کے پانچ نوٹ لے گیا وہ چور کی اولاد—"

چور کی اولاد— پھوکا اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے تنور کی طرف دیکھا۔ لنگر تقسیم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تنور ٹھنڈا پڑا تھا۔ پکے چبوترے پر پسکڑا مارے سخی مجاور اپنی تازہ منڈھی ہوئی چندیا پر تیل کی مالش کر رہا تھا اور نیچے زمین پر گھاس کے ڈھیر پر فاضل نائی بیٹھا مزے سے حقہ پی رہا تھا۔

"حرام خور" چھوکا آہستہ سے بڑبڑایا اور درخت سے ٹیک لگا کر پھر اونگھنے لگا۔

"مسکینوں کے پیسے کوڑھ بن کر پھوٹیں گے"، مائی خیراں کہہ رہی تھی۔ اپنی تیز لڑکیلی آواز میں سوز پیدا کرنے کی کوشش میں اس کے حلق سے کانپتی لرزتی سیٹیوں کی سی آواز نکل رہی تھی، اور گرد کھڑے لوگوں کے متجسس چہروں پر ہمدردی کی ایک لکیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ صرف چور کے بارے میں جاننا چاہتے تھے جو بقول مائی خیراں "کتے کی موت مرے گا، اپنے باپ کی طرح۔"

اپنے باپ کی طرح ــــ چھوکے نے پوری آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کوئی غلط بات ہو گئی ہے" اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھتے ہوئے سوچا۔ تیز روشنی میں اسے نزدیک کی چیزیں بھی نظر نہیں آتی تھیں لیکن اس وقت آسمان پر تیرتے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں نے دھوپ کی چمک کو دھندلا دیا تھا، اس لیے وہ شاہ جی کے کنویں کے پاس بُرجو کی بڑھیا کا سہارا لیے کھڑی مائی خیراں کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گرد چھ سات لوگ اس طرح منہ اٹھائے کھڑے تھے جیسے وہ پٹاری سے سانپ نکالنے والی ہو۔

"بھک منگی، حرام خور" چھوکے نے بڑبڑاتے ہوئے لمبی سی جمائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نظر تنور پر ڈالی، وہی تھوڑی دیر پہلے کا منظر تھا۔ وہ بیزار سا سر کھجاتا شاہ جی کے کنویں کی طرف چل پڑا۔

"خیراں مائی ــــ تم نے چوری کرتے دیکھا تھا کسی کو ..... ؟" کماگے کو آنکھیں دیکھی پر یقین تھا۔

چھوکے کے بڑھتے قدم رک گئے۔ سب لوگ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"کیا بات ہے؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مائی خیراں بھی چپ تھی۔ صرف بُرجو کی رال میں لتھڑی غوں، غوں کی آواز آ رہی تھی۔

"کوئی غلط بات ہے ضرور ..... " چھوکے نے ذہن پر زور دے کر سمجھنے کی کوشش کی، لیکن اس کے دماغ پر جیسے ڈھکن سا لگا تھا۔ وہ پریشان سا ہو کر لوگوں کے منہ دیکھنے لگا۔ سب کے چہروں پر ایک جیسا تاثر تھا۔

اچانک اس کے دماغ کا ڈھکن جھٹکے سے اڑ گیا ..... وہ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر ان کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ زور سے چلایا "میں تمہارے باپوں کے بارے میں نہیں جانتا؟ ..... وہ تو چوروں سے بھی بدتر ہیں۔ چوہدریوں کے جوتے کھانے والے ..... مردار خور ہیں۔"

لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

چھوکے کی یہ مجال! ــــ وہ دہشت زدہ ہو کر اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے وہ چھوکا نہیں، چھوکے کا بھوت ہو۔ ماگے کو حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے چھوکے کے قریب جا کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا "پاگل ہوا ہے سالے ..... ہمارے ساتھ تیرا کیا جھگڑا؟ وہ تو خیراں مائی کہہ رہی تھی کہ اس کے پانچ روپے ....."

چھوکے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا "اس بھک منگی کے پانچ روپے بھی تمہارے کسی باپ نے چرائے ہوں گے ..... مجھے چوری کرنا ہوتی تو وہ صندوقچی چراتا ــــ" اس نے ہاتھ سے جھنڈو سائیں کے مزار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ نوٹوں سے ٹھسا ٹھس بھری صندوقچی جو مزار پر رکھی ہے اور ....."

"چپ کر سالے" کماگے نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھوکے کا دوسرا انکشاف اس کے پہلے انکشاف سے زیادہ خوفناک تھا۔

لیکن [illegible] وحشت زدہ چہرے [illegible] ٹانگیں اُٹھے اور منہ سے عجیب عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے [illegible] سارے ہاتھوں کے گھیرے میں تھا۔ [illegible] منہ چھپانے اور بیچ بچاؤ کرنے کے باوجود وہ تھپڑوں، گھونسوں اور گالیوں کی زد میں آکر زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔

[illegible] وہ بمشکل زمین سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ جا چکے تھے، سوائے کماگے کے جو کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا اور زور سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ پھوکے کو صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ شاید آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑوں [illegible] کی روشنی کو مشکل سے [illegible] دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر [illegible] جسم کو سمیٹا اور پھر کانپتی لرزتی ٹانگوں [illegible] کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم بیپ بھرے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اُسے کھڑا ہوتے دیکھ کر کماگے کی ہلتی ٹانگیں خود بخود ساکت ہو گئیں۔ جب پھوکے نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کماگے کے سوجے ہوئے چہرے پر تھپڑوں اور گھونسوں کے لال نیلے کئی نشان تھے۔ پھوکے نے اُسے کچھ نہیں کہا، دوبارہ اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بس خاموشی سے سر جھکائے لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے قریب سے گزر گیا۔

کماگا آنسو بھری آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھوکا اس کا دوست نہیں تھا، اُس کا بچپن کا ساتھی بھی نہیں تھا۔ پھر...... ہاتھوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کماگے کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔

زمین کی سختی اور ناہمواری کا احساس پھوکے کو پہلی بار ہوا تھا۔ ہر قدم پر اُس کا جسم اذیت بھری ٹیسوں سے بھر جاتا اور وہ بے بسی سے راستے میں کھڑے سب سے بھی درختوں کو دیکھ کر رہ جاتا ــــ شاہ جی کے کنوئیں سے تنور تک کا فاصلہ اُسے میلوں پر پھیلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی دھند لی فضا میں اب گرم روٹیوں کی خوشبو بھی شامل ہو گئی تھی۔ مائی خیراں، بُوٹو اور باقی سب لوگ تنور کے سامنے قطار لگائے بیٹھے تھے۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔

"اب ادھر کا رُخ کیا تو ٹانگیں توڑ دوں گا"۔ سئیں مجاور کے غرانے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ بہت سی دوسری آوازیں۔ پھوکا خاموشی سے سر جھکائے چلتا رہا۔ اُس میں کچھ کہنے سننے کی سکت نہیں تھی۔ اس کا غصہ بھی ختم ہو چکا تھا حتیٰ کہ بھوک کا احساس بھی۔

کھیتوں سے الگ تھلگ، برساتی نالے کے کنارے اپنی جھگی میں اکیلا پھوکا ساری رات جاگتا رہا۔ اُسے اپنا باپ یاد آ رہا تھا، اپنی ماں بھی اور وہ وقت بھی جب چوہدریوں کے آدمی اُس کے باپ کو چوری کے الزام میں پکڑ کر لے گئے تھے۔ ماں اُن کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگتی چلی گئی تھی اور وہ خود ڈرا سہما ہوا جھگی کے دروازے میں بیٹھا روتا رہا تھا۔ کوئی اُسے تسلی دینے والا نہ تھا، وہ روتے روتے وہیں سو گیا تھا۔ صبح سویرے وہ اُس کے باپ کو گھسیٹتے ہوئے لائے اور جھگی میں ڈال کر چلے گئے۔ ماں بھی ساتھ تھی، زرد ویران چہرہ لیے ہوئے جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اُس کا باپ آنکھیں کھولے بے حس و حرکت فرش پر پڑا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر زخم ہی زخم تھے۔ وہ باپ کی حالت دیکھ کر چیخیں مارتا ہوا جھگی سے باہر بھاگ گیا تھا اور جب ماں اُسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تو وہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔

بہت دن گزر گئے ــــــ ماں ہر وقت روتی رہتی اور باپ اپنا سارا دکھ، ساری اذیت اپنے اندر چھپائے آنکھیں کھولے چپ چاپ

بتا رہتا۔ وہ تکلیف سے کراہتا تک نہیں تھا۔ ماں حکیم جی سے جو مرہم لے کر آئی تھی اُس کے لگانے سے اُس کے زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی
بڑا تیز بخار چڑھنے لگا اور ایک روز وہ خاموشی سے مر گیا ——— اُس وقت بھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں [illegible] نے اپنی ہتھیلیوں
سے اس کی آنکھیں بند کیں تو سپھکے کو یوں لگا جیسے اُس کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہو۔ "ماں" وہ چیخ اُٹھا۔ "اندھیرا ہو گیا ہے"۔

وہ روزانہ ماں کے ساتھ باپ کی قبر پر جاتا۔ نیلے پیلے جنگلی پھول، جھاڑی کے لال بیر، چڑیوں کے رنگ برنگے پر اور وہ سب کچھ
[illegible] اچھے اور گرد اچھا لگتا تھا۔ اکٹھا کر کے باپ کی قبر پر جا کر ڈال دیتا۔ ماں دیر تک بیٹھی قبر سے باتیں کرتی رہتی اور وہ سر جھکائے
خاموش بیٹھا سُنتا رہتا۔ اُسے یقین تھا، اُس کا باپ بھی ماں کی باتیں سُنتا ہے۔ کئی بار اُس کا جی چاہا وہ ماں سے پوچھے کہ بابا کے
زخم اب ٹھیک ہو گئے ہوں گے؟

اُس کی دُنیا برساتی نالے کے آس پاس [illegible] جہاں دُور دُور تک کانٹے دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور سیاہ بدبو دار پانی
کے چھوٹے چھوٹے گڑھے لمبے ریشے دار خود رَو پودوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جہاں نیلے پیلے جنگلی پھول اپنی مرضی سے اُگتے تھے،
جھاڑیوں کے آس پاس، برساتی نالے کے کنارے لمبی لمبی گھاس کے بیچوں بیچ اور کیچڑ بھرے گڑھوں میں ریشے دار پودوں کی اوٹ
میں چُپ چُپاتے ——— اُسے [illegible] اچھا لگتا تھا۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد ایک روز وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"ماں ایسا نہیں ہو سکتا، ہم یہاں سے چلے جائیں!"

"کہاں!" ماں نے اُداس لہجے میں پوچھا۔

"کہیں بھی، کسی بھی جگہ، یہاں سے دُور"

ماں چند لمحے خاموش رہی، پھر اپنی چادر کے کونے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "تیرا باپ اکیلا رہ جائے گا۔"

"اچھا" اُس نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ بہت جلد وہ خود اکیلا رہ جائے گا۔

اُس روز ماں شام کے وقت نالے سے پانی لانے کے لیے اُٹھ کر جانے لگی تو چند قدم چل کر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ماں؟" اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

[illegible] خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔ اُسے سانس لینے میں دِقت ہو رہی تھی۔ اُس نے
[illegible] کے قریب بیٹھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ برف کی مانند ٹھنڈا اور پسینے میں شرابور ——— اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کرے۔ ماں کی
آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ماں کو پھر کبھی نہ دیکھ سکے گا۔

[illegible] دیوانہ وار ماں سے لپٹ گیا۔

"نہیں، نہیں" وہ پاگلوں کی طرح ایک ہی لفظ دہرائے جا رہا تھا، اور جب اُسے ہوش آیا تو ماں کی سانس بند ہو چکی تھی۔

وہ ناراض تھا، اپنے باپ سے، اپنی ماں سے اور ہر اُس چیز سے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اُس سے ہمدردی
[illegible] آتے تو وہ اُن سے دُور بھاگ جاتا۔ کچھ ہمدردی ترس کھا کر اُسے حویلی میں لانے کے لیے آدمی بھیجتے تو وہ انہیں پتھر اُٹھا اُٹھا کر مارتا۔
نالہ، کانٹے دار جھاڑیاں، کیچڑ بھرے گڑھے اور نیلے پیلے جنگلی پھول، اُس کے لیے سب ایک جیسے تھے ——— بے حس، بے رحم

اُسے کسی پر یقین اور کسی پر اعتماد نہ تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو تسلی دیتا، اپنے آنسو پونچھتا، اپنا دُکھ کہتا اور اپنا دُکھ سنتا ـــــ اس طرح اُس نے بے یقین اور بے اعتماد دُنیا میں زندہ رہنا سیکھ لیا۔

آنکھوں کی نمی اپنے کُرتے کے دامن میں جذب کرتے ہوئے پھوکے نے افسردگی سے چاروں طرف دیکھا، جُھگی کے ویران گُم صُم ماحول نے اُسے اور بھی اداس کر دیا۔ دروازے کی درزوں سے روشنی جھانکنے لگی تھی۔ وہ لمبی سی آہ بھر کر اُٹھا، اور آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔

"بہت سارے آدمیوں سے مار کھانے والا اکیلا انسان ایسے ہے جیسے مُردار چوہا....." پھوکے نے دُکھے دل سے اپنے بارے میں پہلی بار اس طرح سوچا تھا۔

آسمان سے اُترنے والی روشنی نے ویرانی کو اور بھی گہرا اور واضح کر دیا تھا۔

"وہ یہاں سے چلا جائے گا" اُس نے فیصلہ کر لیا۔

"کہیں بھی، کسی بھی جگہ، یہاں سے دُور"

جب تک پھوکے کی طبیعت سنبھلی اس وقت تک وہ اپنے جانے کے فیصلے پر اچھی طرح سوچ بچار کر چکا تھا۔ اُس کی جُھگی اچھی حالت میں تھی۔ چادر کی چھت مضبوط، دیواریں لپی پُتی اور فرش ہموار ـــــ اس کے علاوہ چند برتن، کچھ کپڑے اور ماں کے دو چار چاندی کے زیور۔ "گزارہ ہو جائے گا" پھوکے نے ان سب کی قیمت کا حساب لگا کر اپنی تسلی کر لی تھی۔

جُھگی کا سودا سادھو کمہار کے ساتھ بڑی مشکل سے تین سو روپے میں طے ہوا، وہ بھی دو قسطوں کی صورت میں، البتہ گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں آسانی سے بک گئیں اور رقم بھی پھوکے کے اندازے سے کچھ زیادہ ہی مل گئی جبکہ گاؤں کے لوگ خاص طور پر عورتیں بعد میں بھی اس کی جُھگی کے چکر لگاتی رہیں، اس اُمید پر کہ شاید انہیں کم قیمت پر کوئی قیمتی چیز مل جائے، ایسی چیز جو چھپا کر رکھی ہو۔

جُھگی کی دوسری قسط وصول ہونے تک پھوکے کے لیے وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ اجنبیوں کی طرح اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا اور اکثر جُھگی کے دروازے میں بیٹھ کر جانی پہچانی چیزوں کو اس طرح حیران ہو کر دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ایسے وقت مائی خیراں اپنی مفلوج اور مخبوط الحواس بیٹی بُوجو کو لکڑی کی ریڑھی پر بٹھائے بھیک مانگنے سائیں جھنڈو کے تکیہ کی طرف جاتے ہوئے اس کی جُھگی کے سامنے سے گزرتی، تو اُس کا جی جل جاتا۔ "بُھک منگی، حرام خور" وہ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑانے لگتا اور کبھی کبھار یہی الفاظ قدرے اونچی آواز میں بھی کہہ دیتا، جس پر مائی خیراں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی اور پھر اس طرح بے دھیان ہو جاتی جیسے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ پھوکا تلملا اُٹھتا اور پھر یہ سوچ کر کہ بُھک منگوں، حرام خوروں پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا وہ اپنا غُصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ لیکن ایک روز، جب اُسے پتہ چلا، مائی خیراں اپنی بیٹی بُوجو کو کسی مجاور کے ہاتھ فروخت کر کے شہر چلی گئی ہے تو مارے حیرت کے اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ بُھک منگوں کے بارے میں کیا سوچے! ـــــ بہت سوچ بچار کے بعد آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بُھک منگے صرف بُھک منگے ہوتے ہیں انسان نہیں ہوتے۔

سادھو کمہار سے بقایا رقم ملنے کے بعد پھوکا جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ بس آخری بار اُسے اپنی ماں اور باپ کی قبر پر سلام کرنے جانا تھا۔ وہ نالے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جب قبرستان جانے والے رستے کی طرف مُڑا تو اُسے عجیب سی آواز سُنائی دی۔ انسان کی یا

جانور کی، اُسے سمجھ نہیں آیا۔ وہ رُک گیا اور کان لگا کر آواز کے رُخ کا اندازہ کرنے لگا۔ شاید آواز جھاڑی سے آرہی تھی۔ وہ احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا نشیب میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ ایک جھاڑی میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی جنگلی جانور ہوا تو ! ——— ابھی وہ اسی کشمکش پریشانی میں تھا کہ اُسے آواز قدرے صاف سُنائی دینے لگی۔ کوئی سانس لے رہا تھا۔ مشکل سے، کھینچ کھینچ کر، جیسے اُس کی ماں آخری وقت لے رہی تھی۔ وہ مزید [illegible] آگے بڑھا اور جھاڑ جھنکار ہٹاتے ہوئے جھاڑی میں جھانکنے لگا۔

"کون ہے؟" اُس نے پوچھا۔ آواز آنی بند ہوگئی، کوئی حرکت بھی نہیں ہوئی۔ اُس نے [illegible] جھک کر دیکھا۔ وہاں بُوجو تھی، مٹی کے ڈھیر کی مانند پڑی ہوئی۔ اُس کی گدلی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور کیچڑ بھرے چہرے پر خراشوں کے نشان تھے، جن سے خون رس رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا [illegible] گھسٹتے ہوئے یہاں تک آئی تھی۔ پھوکے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اُسے چکر سا آگیا تھا۔ وہ چند لمحے بدحواس سا کھڑا رہا، پھر [illegible] گھٹنوں کے بل بیٹھ [illegible] بُوجو اُس کی طرف دیکھ رہی تھی، اتنی بے بسی اور لاچاری سے [illegible] پھوکے کا دل [illegible] [illegible] زور سے پکارا۔ وہ بُری طرح کانپی اور پھر ساکت ہوگئی۔

"[illegible]" پھوکے نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"[illegible] کے لیے آیا ہوں" ——— بُوجو کا مفلوج جسم سوکھی لکڑی کی طرح سخت اور اکڑا ہوا تھا۔ پھوکے نے اُسے دونوں ہاتھوں [illegible] کوشش کی تو وہ اس طرح تڑپی، جیسے ابھی ٹوٹ کر لڑھک جائے گی۔ پھوکے نے اُسے جلدی سے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ [illegible] اُسے اُٹھا کر لے جا رہا تھا تو وہ نسبتاً پُرسکون تھی، صرف اُس کے سانس لینے کی آواز آرہی تھی، جس کی حدت اور نمی وہ اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔

"بُوجو کو بُخار ہے" پھوکے کا خیال تھا۔

جھاڑ جھنکار سے اُلجھتا ہوا وہ جھنڈو سائیں کے تکیے کے قریب پہنچا تو اُسے راستے ہی میں سخی مجاور مل گیا جو بُوجو کی خالی ریڑھی کھڑکھڑاتا ہوا لیے جا رہا تھا۔ پھوکے کو دیکھ کر وہ جھٹکا سا کھا کر رُک گیا "یہ کہاں تھی؟" وہ چنگھاڑا۔

پھوکے نے آگے بڑھ کر بُوجو کو ریڑھی میں لٹاتے ہوئے کہا۔ "اسے بخار ہے۔"

"یہ تھی کہاں؟" سخی مجاور نے اپنا سوال دُہرایا۔ "دو گھنٹے سے اسے تلاش کر رہا تھا۔" غصّے سے اس کے نتھنے پھُول رہے تھے۔

"حرام خور۔" پھوکا منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور اُسے بغیر جواب دیئے واپس جانے کے لیے مُڑ گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور گیا تھا کہ اُسے بُوجو کی گھٹی گھٹی سی آوازیں سنائی دیں۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ سخی مجاور بُوجو کو پیٹ رہا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتا ہوا آیا اور اُسے دھکا دے کر پرے کرتے ہوئے چلّایا "اسے مارتے ہو؟" اس کی آواز میں حیرت اور دہشت کا مِلا جُلا تاثر تھا۔

[illegible] سخی مجاور ڈھٹائی سے بولا۔

[illegible] پھوکے کو یقین ہونے کے باوجود یقین نہیں آرہا تھا۔

[illegible]

"شرم نہیں آتی تمہیں" پھوکا روہانسا ہو کر بولا۔

سخی مجاور نے قہر آلود نظروں سے پھوکے کو دیکھا اور پھر بُوجو کو ——— "بہت دھوکہ ہوا ہے میرے ساتھ۔" وہ اپنے ہاتھ آپس میں

گھٹتے ہوئے بولا " اس کی ماں کہتی تھی روزانہ کے بیس روپے ہو جاتے ہیں اور یہ [illegible] ۔ بیس ٹکے کر کے نہیں دیتی ۔ "

" تو اس کا کیا قصور ؟ اگر لوگ بھیک نہیں دیتے تو ان سے جا کر دنگا کرو [illegible]

" قصور اس کا ہی ہے ۔ " سخی مجاور نے آنکھیں نکال کر کہا ۔ " سویرے چوہدریوں کے جوائی نے دس کا نوٹ دیا تھا ، میری آنکھوں کے سامنے ، لیکن اس کے کشکول میں وہی اٹھنیاں ، چونیاں تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں یہ نوٹ کہاں [illegible]

بُوجو جھاڑی میں کیوں چھپی تھی ، یہ تو پھوکا سمجھ گیا تھا لیکن اب کیا ہوگا ؟ اُسے سمجھ نہیں آیا تھا ۔

[illegible] ہو کر پوچھا ۔

" جب تک میرا نقصان پورا نہیں ہوتا ، میں نے اس کی جان نہیں چھوڑنی ۔ " سخی مجاور کے کہے ہوئے لفظوں سے زیادہ اس کے چہرے کی خباثت دیکھ کر پھوکے کا ہاتھ خود بخود اُس کے کُرتے کے نیچے بنڈی کی جیب میں چلا گیا ۔ " کتنے پیسے ہیں ؟ " اُس نے پوچھا ۔

" کس کے ؟ " سخی مجاور نے حیران ہو کر کہا ۔

" بُوجو کے ۔ "

سخی مجاور کی آنکھوں میں چمک آ گئی " پانچ سو روپے " ، وہ جلدی سے بولا ۔

[illegible] اپنی ساری جمع پونجی نکال کر پانچ سو روپے گنے اور سخی مجاور کی طرف بڑھا دیئے ۔ اُس نے جھپٹ کر روپے پکڑے اور [illegible] جانے بغیر ذرا تیزی میں وہاں سے کھسک گیا جیسے اُسے ڈر ہو کہیں پھوکا اپنا فیصلہ نہ بدل لے ۔

اب پھوکے کی ملکیت دو سو چالیس روپے ، بُوجو اور اُس کی ریڑھی تھی ۔

" میں نے کیا سودا کیا ہے ؟ " پھوکے نے ذرا پریشان سا ہو کر اپنے آپ سے پوچھا ۔

" اچھا ۔ " اُس کے دل نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ۔

بقایا رقم جیب میں رکھ کر پھوکے نے ریڑھی کے قریب جا کر بُوجو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا " ڈرو نہیں ، اب میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ "

بُوجو دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے گٹھڑی سی بنی پڑی تھی ۔ پھوکے نے اُسے ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے سہولت سے لٹا دیا ۔ اُس کے نیچے ترپال بچھی ہوئی تھی اور ترپال کے نیچے ۔ ۔ ۔ ۔ پھوکے نے اُس کا کونا اُٹھا کر دیکھا ، پھٹے پُرانے کپڑوں کے ٹکڑے ، گھاس پھونس اور اُن میں جھانکتے چھوٹے بڑے نوٹ ہی نوٹ ـــــــ ایک ایک روپے کے ، پانچ پانچ روپے کے اور دس دس روپے کے ۔

پھوکا ہکا بکا کھڑا تھا ۔ بُوجو نے آہستہ سے اپنا لجلجا سا ہاتھ پھوکے کے ہاتھ پر رکھ دیا ۔

" بُوجو یہ تم ؟ " پھوکے نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا ۔ بُوجو کے سیاہی مائل زرد چہرے پر عجیب سی سُرخی پھیل گئی جیسے [illegible] کی روشنی اندھیرے میں گھل مل گئی ہو ۔

" یہ کیسا سودا ہے ؟ " پھوکے نے حیران سا ہو کر اپنے آپ سے پوچھا ۔

" بہت اچھا ۔ " اُس کے دل نے بے دھڑک ہو کر جواب دیا ۔

ہوا کا جھونکا

[illegible] جعفر

وسط دسمبر کی ایک [illegible] سہ پہر تھی۔ برف کئی دنوں سے وقفے وقفے سے گر رہی تھی، مگر اس روز رات کے پچھلے پہر سے جو برفباری شروع ہوئی تو مسلسل ہوتی ہی رہی اور اس وقت تک آس پاس کی سب سڑکیں اور راستے برف سے اٹ گئے تھے۔ روحی نے سلائیڈ بناتے بناتے چونک کر دیوار کی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا "اوہ، چار بجنے والے ہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا" اس نے جلدی جلدی سامنے پھیلی چیزوں کو الماری میں بند کیا اور اوورکوٹ شانوں پر ڈال تقریباً دوڑتی ہوئی کالج کی عمارت سے باہر نکل آئی۔

ہر طرف ٹھٹھرتا سناٹا تھا اور برف کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کار کے شیشوں پر جمی برف ہٹائی۔ دستانے کا استعمال اسے بھاتا نہیں تھا۔ اس وقت اپنی اس بے تکی عادت کو کوستے ہوئے جب اس نے سن ہوتی انگلیوں سے کار سٹارٹ کی تو پہیوں نے گھر گھر کی احتجاجی آواز کے ساتھ آگے بڑھنے سے قطعی انکار کر دیا۔ روحی نے کار سے اتر کے دیکھا تو چاروں پہیئے ڈھیروں برف میں دھنسے پڑے تھے۔ [illegible] گاڑی آگے کرنے کی دوبارہ کوشش کی مگر ایکسیلیٹر پر پورے دباؤ ڈالنے کے بعد بھی گاڑی اپنی جگہ سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھی۔ کلاس کے سب لوگ بہت پہلے جا چکے تھے۔ کرسمس اتنی قریب تھی۔ ان دنوں میں تو ساری قوم ہی تحفے تحائف کی لین دین کے لیے خریداری کی متوالی ہو جاتی ہے۔ سال میں یہی ایک موقع ہوتا ہے جب یادیں تازہ ہوتی ہیں، ساری [illegible]، کارڈز اور رنگ برنگے کاغذوں میں لپٹے پیکٹوں میں سمٹ جاتی ہیں اور تہوار بیت جانے کے بعد بہت سے اپنے پرانے پھر بھولے بسرے ہو جاتے ہیں۔ روحی اپنے کام میں ایسی منہمک تھی کہ وقت گزرنے کا دھیان ہی نہ رہا۔ "اسے (آٹو موبائیل ایسوسی ایشن) والوں کو بلانے کے لیے فون کروں تو بھی آدھا میل پیدل چلنا پڑے گا۔" اس نے کالج کے CARE TAKER کو بڑا دروازہ بند کر کے باہر جاتے دیکھ لیا تھا۔

"اب کیا کروں —؟" روحی پر بدحواسی طاری ہونے لگی۔

کالج آبادی سے کافی ہٹ کر تھا۔ چاروں طرف [illegible] میدان تھے اور ان کے درمیان وہ بل کھاتی سڑک جو روحی کو بہت بھلی لگتی تھی، اس منجمد سناٹے میں ایسی ویران سنسان پڑی تھی کہ روحی کا ڈر کے مارے گلا خشک ہونے لگا۔

"گاڑی سے اترو۔" کسی نے شیشے کھٹکھٹا کر کہا۔

شیشے دھندلے ہو رہے تھے اور گاڑی نے پھر سے برف کی چادر اوڑھ لی تھی۔ روحی نے آندرے کی آواز سنی تو جان میں جان آئی۔

وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ "لندن جیسا مہذب شہر ان دنوں کتنا غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے —" اس نے سوچا کہ آندرے سے کہے اور
اپنے اندر کے خوف کو اسی بھاری فقرے میں چھپا لے، مگر آندرے نے کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی۔ روحی کے اترتے ہی وہ ڈرائیونگ
سیٹ پر بیٹھ گیا اور چابی اس [illegible] لی۔ اسے روحی کی کلاس میں شامل ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا۔ وہ ہسپانوی امریکی تھا۔
روحی سے اس کی بات چیت بس ہلو ہائے تک محدود تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ رہنے دیا اور اتر کے پہیوں کے نیچے سے برف ہٹانے لگا۔
روحی اس دوران بے چارگی سے ایک طرف کھڑی رہی۔ آندرے آہستہ آہستہ کار بڑھا رہا ہے کبھی کبھی پہیے SKID کر جاتے تھے۔ شیشہ
نیچے کر کے اس نے آواز دی "اندر آ جاؤ" روحی خاموشی سے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "برف کے موسم میں گاڑی چلانا نہیں آتی تو ایسے
[illegible]" آہستہ ٹریفک پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"راستہ بتاؤ۔ میں تمہارے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔" وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"اور انشورنس — پھر تم ابھی تو یہاں آئے ہو — لائسنس کہاں ہے تمہارا —؟"

وہ اسے گاڑی سے اتارنے کا جواز ڈھونڈ رہی تھی۔

"فکر مت کرو۔ لائسنس انٹرنیشنل ہے۔ رہی انشورنس کی بات وہ البتہ گڑبڑ ہے۔" وہ ہنسا۔

گاڑی ہولے ہولے چلاتا ہوا وہ ایسی سڑک پر نکل آیا تھا جہاں ٹریفک کی مسلسل آمدورفت سے برف خاصی صاف ہو گئی تھی
اور فٹ پاتھ بھی ایسے سونے نہ تھے۔ شام کا اندھیرا رات جیسا گہرا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے گاڑی روکی۔ "میں یہاں
اتر جاتا ہوں۔ احتیاط سے چلانا اور دیکھو سیکنڈ گیئر سے آگے نہ بڑھنا — یہ نمبر ہے میرا۔ گھر پہنچتے ہی فون کر دینا۔"

وہ جلدی جلدی ایک پرزے پر قلم گھسیٹ رہا تھا۔

روحی کھٹ سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ لوگوں کے آنے جانے سے وہاں خاصی رونق تھی اور کچھ دیر پہلے والا — خوف بھی
رخصت ہو چکا تھا — "جی ضرور کروں گی آپ کو فون — صدیوں کی ملاقات ہے نا آپ سے —" عورتوں کی ڈرائیونگ کا مذاق اڑانے والوں
سے اس کا جی ہمیشہ جلتا تھا۔ اور آندرے نے تو اسے بالکل ہی اناڑی ڈرائیور سمجھ لیا تھا۔

"ارے تم تو اچھی بھلی ہو۔ میرا خیال تھا گاڑی کہیں الٹ گئی ہوگی کل رات —" وہ پھر چڑانے پر اتر آیا تھا۔

اگلے دن صبح ہی صبح کالج کے لمبے چوڑے کوریڈور میں اس سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"نمبر جانے کہاں کھو گیا — اتنا سا تو پرزہ تھا —"

روحی کی آواز شرمندگی کے بجائے سفید جھوٹ کی کھلی چغلی کھا رہی تھی۔

پل بھر کو سامنے کے طویل و عریض میدان کی ساری برف آندرے کے چہرے پر جم گئی، جسے وہ اپنی آنکھوں کی چنگاریوں سے پگھلا
رہا تھا — روحی ان دنوں بچوں کی ہندوستانی اور پاکستانی کہانیوں کے ترجمے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک تعلیمی پروجیکٹ تھا۔ یہ کہانیاں
نصاب میں شامل ہونے والی تھیں۔ اس کے گروپ میں بارہ افراد شامل تھے جو مختلف مضامین پڑھاتے تھے۔ ان کا کام اپنے اپنے مضامین
سے متعلق مواد جمع کرنا تھا۔ روحی نے بچوں کی کہانیوں کا انتخاب کیا تھا، ترجمہ کرنا تو کوئی مشکل بات نہ تھی مگر دشواری یہ تھی کہ —
ILLUSTRATION کے لیے تصویریں اور خاکے بنانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ ڈرائنگ اور پینٹنگ سے پڑھائی کے زمانے میں بھی

[illegible] دُور بھاگتی تھی۔ اب بھی یہ حال تھا کہ بنانا کچھ چاہتی اور تصویر کچھ کی کچھ ہو جاتی۔ رنگ تو ایسے غلط سلط بھرے جاتے کہ سارے کا سارا خاکہ ہی عجیب سا ہو جاتا۔ آندرے ہسپانوی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا۔ [illegible] اور گیتوں کی گیت بھری کہانیاں خوبصورتی سے انگریزی میں منتقل ہو رہی تھیں، اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے اسے برطانیہ میں چھ مہینے کا ورک پرمٹ ملا تھا۔

ردمی کی کہانی "کنشو بندر اور ندیا گلہری" کے رنگین خاکے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "ایسے بندر کہاں دیکھے ہیں تم نے —! اور گلہری، دیکھو تو ذرا۔ بالکل بلی لگ رہی ہے —" ہنسی کے بجائے اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ردمی کھسیانی سی ہو گئی۔ "بس ترجمے کرتی جاؤ۔ تصویریں میں بنا دیا کروں گا۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

[illegible] ساتھ ہو گیا۔ پروجیکٹ بڑی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ کالج میں دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ [illegible] کے مطابق وہ کسی نہ کسی طرح ردمی کے کام کے لیے وقت نکال ہی لیتا تھا۔ کلاس کے بعد ردمی اسے ہائی گیٹ (شمالی لندن کا ایک محلہ) میں اس کے فلیٹ پر پہنچاتے جاتی تھی۔ کالج سے وہاں تک راستہ آدھے گھنٹے کا ہوگا۔ اس دوران وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کیے جاتا تھا۔ وہ لندن میں فلوریڈا کے شہر سینٹ پیٹرز برگ سے آیا تھا جہاں ہسپانوی نژاد لوگوں کی اکثریت ہے۔

[illegible] — لہراتے ہوئے پام کے درخت اور گرم سمندری ہوائیں — ہسپانوی زبان میں فلوریڈا کے معنی پھولوں کے ہیں — اور نارنجی شگوفے تو اسی اسٹیٹ کی علامت ہیں —"

منظر کشی میں آندرے کا جواب نہیں تھا۔

[illegible] اکلوتی بارہ سالہ بیٹی "الویرا" سینٹ پیٹرز برگ میں ایک ہوسٹل میں رہتی تھی۔

[illegible] کہ یہ کہانیاں اسی کے لیے تو لکھ رہی ہوں۔ مدھر گیتوں بھری کہانیاں [illegible] امریکی ماں نے ہسپانوی لوگوں کی صرف برائیاں ہی اسے گنوائی ہیں —" وہ مجھ سا [illegible] لگا۔ "میں اپنی بیٹی کو ہسپانوی کہانیوں کا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ ان کہانیوں میں تو میرے بچپن کے خوابوں کی نرم ہوائیں، دھیمے دھیمے اور سرگوشیاں کرتی چلتی ہیں۔"

آندرے کی آواز لہروں پر ڈولتی، گم شدہ وادیوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔ ردمی کی کار اس کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے جانے کب سے کھڑی تھی اور ردمی نے اسے اترنے کو کہا بھی نہیں تھا ——

[illegible] فاک لینڈ کی جنگ میں مصروف تھا اور برطانیہ کے مختلف شہروں میں بسنے والے محاذِ جنگ سے ہزاروں میل دُور بیٹھے اپنے گھروں میں بیٹھے روز کی جنگی خبریں ٹیلی ویژن پر دیکھتے تھے۔ ارجنٹائن کو شکست دینے کے لیے منظم کارروائی ہو رہی تھی۔ سیاسی بیانات جاری ہوتے تھے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ہر طرف اسی جنگ کا چرچا تھا۔ ابلاغِ عامہ کے سارے ذریعے عوام کی برین واشنگ پر اُتر آئیں تو حقیقتوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ یوں تو امن تحریک بھی زوروں پر تھی اور امن پسند کارکنوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں NUCLEAR DISARMAMENT کے لیے دستخط جمع کرتی پھر رہی تھیں۔ گرینہم کامن میں خواتین کا گروپ چھاؤنی چھائے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی پکٹنگ کرنے والے لوگ مُردوں کے لباس میں ملبوس زمین پر لیٹ جاتے، کبھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے جلوس بنا کر آگے بڑھتے۔ ایک بار CND والوں نے سروں پر انسانی کھوپڑیوں کی ٹوپیاں پہن کر گشت لگایا۔ راتوں کو مشعل بردار جلسے جلوس منعقد ہو رہے تھے ——

[illegible] سب —" آندرے جوش سے بولتا۔ "امن کا شور مچاتے ہیں تو جنگ کے خلاف اُٹھ کے کھڑے کیوں نہیں ہوتے؟"

"تمہارا ہسپانوی لہو بول رہا ہے، ارجنٹائن والے تمہارے ہم زبان ہیں نا ——" ندمی بیچ میں بول پڑتی۔

"ان ماؤں کے دل سے پوچھو جن کے جیتے جاگتے بیٹے خون آلود، برفیلے طوفانی ساحلوں پر لڑ رہے ہیں ——" ندمی نے گزشتہ شام ایک

سپاہی کی ماں سے باتیں کی تھیں [illegible]

[illegible] اما کی جنگ [illegible] کی آوازیں [illegible]

[illegible] فریقین میں کسی [illegible] نہیں کہا —! پھر فاک لینڈ جو یہاں سے اتنی دور [illegible] کسی

[illegible] نہیں آرہی تھی ——

[illegible] لینڈ —— پھر لینڈ —— ساری بات لینڈ کی ہے۔ انسان کا رشتہ جس سے بہت گہرا ہے، اور اس کی خاطر وہ صدیوں [illegible]

[illegible] بہاتا چلا آیا [illegible] غمگین تھا۔

وہ اس وقت فصلِ بہار کے ایک خوبصورت سے منظر میں رنگ بھر رہا تھا۔ "آبشار کی بلندی سے گرتا ہوا یہ شفاف پانی، بارود

[illegible] دھوئیں اور پٹرول کی بدبو سے گدلا ہو جائے تو کیسا لگے گا ——" ایزل پر لگے خاکے پر اس کے برش کا دباؤ بڑھ گیا۔ "اور پھر چاندی

سی چمکتی ندیاں، لاشوں سے پٹ جائیں، جھیلیں خون سے لبریز ہوں، سورج چاند آزردہ ہوں، تارے ایسے نکلیں جیسے معصوم آنسو بھی

ہوں —— تو، تو کیسا محسوس ہوگا۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

اچانک موسمِ بہار کی آمد پر لکھی گئی روحی کی کہانی کے گلشن میں جیسے ایک دھماکہ ہوا۔ اس نے سہم کر دیکھا۔ چمن کے سارے پھول خون

سے سرخ تھے اور کلیاں جیسے شدتِ غم سے کراہ رہی تھیں۔

آندرے امن اور عافیت کا شیدائی تھا۔ اس کی ماں اسپین کی خانہ جنگی کے زمانے میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جانے

کیسی کیسی مصیبتیں سہتی ہوئی وہ امریکہ پہنچی۔

"میڈرڈ میں وہ قید میں ڈال دی گئی تھی، اور طرح طرح کی اُسے اذیتیں دی گئی تھیں۔ اس کا جسم لہولہان کر دیا گیا تھا۔ اس کے کپڑے پھاڑ

دیئے گئے تھے۔ وہ سسک رہا تھا —— "میری ماں بہت کم پڑھی لکھی تھی۔ اسے پھول اُگانے اور رنگ برنگی چڑیاں پالنے کا شوق تھا۔ وہ سیاست

کی الف بے بھی نہیں جانتی تھی اور اس پر سیاسی الزام تھا —— امریکہ پہنچ کر ٹھوکریں کھاتی پھری۔ پھر اس نے شادی کر لی۔ میرے امریکی باپ

نے پناہ دی اور عوض میں ساری زندگی اسے پاؤں کی جوتی سمجھتا رہا۔ وہ جانوروں کی مانند بے تھکے کام کرتی اور مار چوٹ کی مار کھاتی۔" آندرے

دکھ سے آنکھیں بند کر لیتا۔

ماحول پر ایک گمبھیر اداسی پھیل جاتی اور آندرے کی آواز پھر دھیمے دھیمے بلند ہو جاتی۔

"ماں کو میکسیکو میں بسنے کا بہت شوق تھا۔ تم نے میکسیکو دیکھا ہے؟"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بول رہا تھا۔ "وہاں کی زندگی میں آرٹ جانے کب سے ایک اہم کردار بن گیا ہے۔ مایا اور ٹولٹک انڈین نے

خوبصورت مندر بنائے ... انہیں میورل (دیوار گیر تصویر) سے سجایا۔ AZTEC نے موسیقی اور شاعری کو چار چاند لگائے۔ اور ہسپانیہ والے

اپنے ساتھ تعمیر کا فن اور لٹریچر کا ذوق لائے —— وہاں کے انقلاب کی کہانی میورل میں پینٹ کی گئی ہے۔ ڈیگو اوریا، ڈیوڈ سیکوئیروس"

"ہاں میکسیکو نے بے شک دنیا کو بہت بڑے فنکار، کمپوزر اور ادیب دیئے ہیں ——" ندمی بات کاٹ کر [illegible]

جلیل ملک

ہائیکو

[illegible] ر دل سے [illegible]
باغ سارا ہی ان دنوں جیسے
آئینہ گھر ہے شبستاں

○

خامشی میں اگر بحالت خواب
رات کو دھک سے آنکھ کھل جائے
سارا عالم ہی خواب لگتا ہے

○

تو نے اظہارِ دوستی کر کے
قیمتِ جان و دل ادا کر دی
اب میں تیار ہوں کہ مر جاؤں!

○

جب سے تیرے خیال خواب ہوئے
ہم نے خوابوں سے دوستی کر لی
مستقل ہے وصال کا موسم

○

زندگی غم کا اک سمندر ہے
تہہ میں جائیں مسرتوں کے لیے
ڈھونڈ کر لائیں سیپ [illegible]

"میں نے بھی سوچا تھا کہ وہاں چلا جاؤں ۔۔۔ مگر ماریا، میری بیوی، وہ تو میکسیکو جانے کا نام سن کر ہی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ امریکہ بڑا ابھرا ملک ہے، مگر وہاں کی حالت دیکھو تو ۔۔۔" اس کی آواز میں پھر دُکھ اتر آیا تھا۔

"تیسری دُنیا ۔۔۔ ہماری دُنیا ۔۔۔" ردی چپکے سے بولی۔

چند ہی مہینوں میں آندرے نے آہستہ آہستہ اپنی سرگزشت سُنا دی تھی۔ امریکی ہوتے ہوئے بھی اسے اسپین اور [illegible] زبانوں سے عشق تھا۔ اس نے ردی کو چلی کے مشہور شاعر پابلو نرودا کی نظمیں سنائیں۔ یہ نظمیں جو اضطراب، غم اور سپردگی کی علامتیں ہیں۔ وہ بچوں کی طرح مفہوم سمجھانے لگتا۔ [illegible] محبت کی بیس نظمیں اور ناامیدی کا ایک گیت اور "زمین پر گھر" بہت پسند تھے۔ اور امن کے گیتوں پر تو جان دیتا تھا۔

[illegible] آنے والی ہر شفق کے لیے
[illegible] جو میرا تعاقب کرتے ہیں
جو میرے خون کی لہروں سے اُٹھتے ہیں
[illegible] گیتوں کو
زمین اور محبت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں
[illegible] ہیں۔

(ترجمہ سردار جعفری)

[illegible] آندرے کی آواز میں شعلے سی لپک آ جاتی تھی۔ کبھی نرم کبھی نازک۔ وہ کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی بے حد مضطرب، ردی کھوئی کھوئی نظریں لیے اُسے خاموش تکتی رہتی۔ یہ خواب اس کے بھی تو تھے۔

"تم بھی تو کچھ کہو ۔۔۔" ردی کی خاموشی پر وہ کبھی جھنجھلا جاتا۔

"ہمارے ہاں لڑکیوں کو کہنا نہیں سکھایا جاتا ۔۔۔ ہم صرف سُننا جانتی ہیں۔"

ردی کی خاموشی گویائی وضاحتیں دینا چاہتی ۔۔۔ "میں بولوں تو تمہیں فلوریڈا کی MOCKING BIRD کی یاد آئے گی ۔۔۔ بات دہرانے والی چڑیا ۔۔۔" اس کی متلاشی آنکھیں جیسے چپے چپے پر سکون اور امن ڈھونڈ رہی تھیں۔

[illegible] چپ چاپ گزر گئے۔ پروجیکٹ ختم ہو چکا تھا اور آندرے کی واپسی کی تاریخ آ گئی تھی۔

"کل کی دوپہر میرے ساتھ گزار سکو گی ۔۔۔؟" وہ فون پر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں" ردی نے ایک طویل سانس میں جواب دیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب کالج کے بلیے چوڑے کمروں اور کاریڈور سے باہر وہ دونوں ایک چھوٹے سے مضافاتی ریستوران میں ایک ساتھ بیٹھے

"کل صبح کتنے بجے فلائٹ ہے ۔۔۔؟" ردی نے پوچھا۔

"سویرے تھا، بالکل چُپ چاپ۔ میں تمہیں ایئرپورٹ پہنچا دوں گی۔" وہ جیسے خود سے بول رہی تھی۔

ریستوران سے باہر، بہار نے دھوم مچا رکھی تھی۔ صنوبر کے سبز سائے پھیل رہے تھے۔ سیب کے درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ کسی نے اٹھ کر سامنے والا دریچہ کھول دیا۔ دیوار سے لگی گلاب کی ایک شاخ جھومتی اندر آگئی اور ہوا سے میز پر رکھا مینو گرنے لگا۔

"ہوا کو دیکھ سکتی ہو ۔۔۔؟" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔ پھر اس نے زوددا کی ایک نظم کے بول زیرِ لب دہرائے

"یہاں کون آیا تھا

[illegible] چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ آؤ"

"ہوائیں بھی کسی نے دیکھی ہیں آندرے ۔۔۔ بس پاس سے ہولے ہولے بہتی محسوس ہوتی ہیں ۔۔۔" روحی کو اپنی آواز سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

"تو سنو ہوا کی سرگوشی کہہ رہی ہے کہ میں تمہیں سینے سے لگا لوں۔ بس ایک بار ۔۔۔" وہ اضطراب سے آنکھیں بند کیے تھا

"جانتے ہو، میرے وطن میں کسی نے ایسے کہا ہوتا تو ۔۔۔" وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکی تھی

"تم پتھر مار دیتیں ۔۔ اور کیا ۔۔ مار دو مجھے ۔۔ گستاخی کی سزا تو ہونی ہی چاہیئے ۔۔۔" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تم ایسے سوچتے رہے ہو میرے بارے میں ۔۔۔ مجھے پتہ ہوتا تو ۔۔۔" روحی پر گریہ چھا رہا تھا۔

"اچھی طرح جانتا تھا۔ تم کبھی ایسے تیار نہیں ہوتیں۔ تمہارے ساتھ بس زیادتی ہی کی جا سکتی ہے ۔۔۔ اور یہ سنگدلی میرے بس کی بات نہیں تھی ۔۔"

اس کا لہجہ بالکل کھرا تھا۔

روحی جیسے اپنے ہی بوجھ تلے کچلی جا رہی تھی، وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، ہینڈ بیگ اٹھایا اور دیوار کی طرف منہ کر کے آہستہ سے بولی۔ "تم کیا جانو آندرے ۔۔۔ زیادتی کا کرب کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟"

اس نے آندرے کو خدا حافظ بھی نہیں کہا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔ آندرے اپنی کرسی پر بیٹھا کھلے دریچے سے اسے کار پارک سے گاڑی نکالتے دیکھتا رہا اور روحی ریستوران پر نظریں ڈالے بنا احاطے سے باہر چلی گئی۔ اس احاطے کے باہر، جہاں بے مثل چمن آرائی تھی۔

بہت سے سال دھیمے دھیمے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر نئے سال کے آغاز پر اسے آندرے کا خوب صورت سا تہنیت کا کارڈ مل جاتا ہے اور اپنی سالگرہ کے دن (اسے یاد نہیں کب اس نے آندرے کو تاریخ بتائی ہو) پھول والی دکان کے معرفت خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ بھی پہنچ جاتا ہے۔ پھولوں کے ساتھ کوئی تحریر منسلک نہیں ہوتی۔ مگر سارے پھول اپنی اپنی جگہ لفظ ہوتے ہیں۔ اپنی فضا کی خوشبو سمیٹے پاس چلے آتے ہیں۔ ان ہی لفظوں کی خوشگوار مہک نے بتایا تھا کہ وہ میکسیکو رہنے چلا گیا ہے۔ میکسیکو، جہاں جا کر رہنے کا اسے بہت ارمان تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور بھنورا سے کالے بالوں والی گندمی رنگت کی ماں کے خوابوں کا دیس ۔۔۔ جہاں ہسپانوی موسیقی کی تانیں گونجتی ہیں۔

"اس سال سالگرہ پر پھولوں کا گلدستہ نہیں آیا ۔۔ اور پھر نیا سال بھی مبارکباد کے کارڈ کے بغیر گزرا چلا جا رہا ہے ۔۔" روحی نے سہم کے سوچا۔

اللہ باقی ہے

نورالحسنین

پورے آفس میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی ، ہر ایک جلد از جلد اپنا کام ختم کرنے کی فکر میں تھا ، اور جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا گھر کی طرف دوڑ رہا تھا ۔ وہ بھی اپنی کرسی سے اُٹھا ، لیکن بڑے صاحب کی رپورٹ نے اس کے قدم پکڑ لیے ۔ اُس کے چہرے پر شدید جھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے ، اور پھر وہ منہ ہی منہ میں مغلظات بکنے لگا ، لیکن کرسی چھوڑ کر بھاگنے کی ہمت اس میں پیدا نہیں ہوئی ، مجبوراً وہ پھر ایک بار اپنی نشست پر جم گیا ، اور اُس کی انگلیاں ٹائپ رائیٹر پر تیز بہت تیز دوڑنے لگیں ۔

باہر آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا ، ہوائیں طوفانی سیٹیاں بجا رہی تھیں ، بجلیاں کوند رہی تھیں ، اور اندھیرا دم بدم گہرا ہوتا جا رہا تھا ۔ رپورٹ کو ٹائپ کرنے کے بعد جب اُس نے چپراسی کو آواز دی تو اُسے پتہ چلا کہ آفس میں کوئی نہیں ہے ، اور وہ تنہا اِس طوفان میں پھنس گیا ہے ۔ اُس کے ہونٹ پھر ایک بار پھڑ پھڑائے اور وہ اپنا ہینڈ بیگ لے کر باہر نکل گیا ۔

جونہی اُس نے مین گیٹ سے باہر قدم رکھا ، بارش نے پوری قوت سے حملہ کر دیا ، اور وہ کسی طرح بس اسٹاپ کے شیڈ میں داخل ہو گیا ۔ بارش اپنے عروج پر تھی ۔ سڑک کی لائٹ فیوز ہو چکی تھیں اور دُور دُور تک کسی آٹو رکشے کا امکان نہ تھا ۔ اندھیرا پوری طرح غالب آ گیا تھا ۔ اچانک زور سے بجلی کوندی اور اُسے پتہ چلا کہ وہ اس شیڈ کے نیچے تنہا نہیں ہے بلکہ ایک بکری اپنے نوزائیدہ بچے کو چاٹ رہی ہے ، اور ایک کتا بچے کو ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے موقع ملتے ہی اُس پر جھپٹ پڑے گا ۔ اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ بکری اور اُس کے بچے کی حفاظت کی خاطر اُسے کتے کو بھگا دینا چاہیئے اور ممکن تھا کہ وہ اپنی سوچ پر عمل بھی کر لیتا لیکن ٹھیک اُسی وقت اس کی مطلوبہ بس آکر کھڑی ہو گئی اور وہ پھرتی سے اس میں سوار ہو گیا ۔

باہر طوفان تھا ، لیکن وہ اب محفوظ تھا ، اور سوچ رہا تھا کہ اب وہ کچھ ہی دیر میں اپنے گھر میں ہوگا ——— لیکن اچانک اُس کے ذہن میں بکری اور اُس کا بچہ گھوم گیا ——— بے چارہ اب تو پوری طرح کتے کی زد میں ہوگا ۔ مجھے اُسے بچا لینا چاہیئے تھا ۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا ۔

" صاحب ٹکٹ ——— ؟ " کنڈاکٹر کی کرخت آواز اُبھری ۔

" آں ہاں ——— ڈیری فارم ——— ! " اُس نے مختصر سا جواب دیا ، اور پیسے اُس کی طرف بڑھا دیئے ۔

بس چل پڑی۔

طوفان بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"ارے بھیا! اس طوفانی برسات نے تو اپنی کھٹیا ہی کھڑی کر دی [illegible] پلٹ کر دیکھا کوئی تاجر اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا

"سارا مال باہر ہی پڑا ہے ـــــ جانے اب کیا ہوگا ـــ!"

کتے نے بکری کے بچے پر حملہ کر دیا ہوگا ـــــ! اس کے ذہن پر کسی نے ہتھوڑا [illegible]

"یہ طوفان نہیں ـــــ [illegible] ـــــ اب تو فصل کی کٹائی کا موسم آگیا ہے!" اگلی سیٹ پر کوئی بولا تھا۔ اس جملے [illegible] پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور ذہن میں بیوی کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کے پورے بدن میں سنسنی سی ہونے لگی، اور وہ تصورات کی وادیوں میں [illegible] لگا

"ڈیری فارم [illegible]" کنڈاکٹر نے بس رکوا دی، اور وہ تیزی سے بس کے اگلے دروازے کی جانب لپکا، لیکن شدید بارش کو [illegible] نیچے اترنے کی اس میں ہمت پیدا نہ ہوئی۔ وہ چپ چاپ واپس لوٹا اور قریب ہی کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"صاحب یہ ڈیری فارم ہی ہے ـــــ!" شدید طوفان کے باوجود کنڈاکٹر نے کچھ نشانیاں دیکھ لی تھیں۔

"کرانتی چوک کا ٹکٹ دے دینا ـــــ وہاں اُتروں گا ـــــ!" انہوں نے پھر ایک بار کنڈاکٹر کی طرف پیسے بڑھاتے۔

[illegible]

طوفان اور شدید ہوگیا۔

وہ سوچنے لگا۔ اس قدر طوفانی برسات میں نیچے اُترنا حماقت ہی تو ہے۔ بھیگ کر بیمار ہونے سے بہتر ہے کہ آدمی اگلے اسٹاپ پر [illegible] اور وہاں سے اپنے گھر لوٹ جائے، ممکن ہے کرانتی چوک پہنچتے پہنچتے یہ طوفانی برسات تھم جائے۔! اس نے کھڑکی کے محفوظ [illegible] سے باہر جھانکا اور پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے اخبار نکال کر پڑھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر، ایک چھوٹی سی سرخی پر ٹھہر گئی۔ [illegible] غفلت کے باعث موت سے دوچار ـــــ مرحوم اگر ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتا تو شاید اس حادثے کا شکار نہ ہوتا۔ ناگہاں [illegible] بار پھر اس کے ذہن میں کتے کے خوف سے بے نیاز بکری اور اس کا بچہ گھومنے لگے، اور پھر جانے ایسے کتنے ہی مناظر یکے بعد دیگرے [illegible] کے ذہن کے پردے پر ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ پتہ نہیں کیوں آدمی تحفظات کے اصولوں کو توڑ کر خود شکار ہوتا ہے! وہ سوچنے لگا۔

[illegible] کنڈاکٹر کی آواز ایک بار پھر ابھری، اور بس رک گئی جن کو اُترنا تھا وہ اپنا مقدر جان کر اس شدید طوفان میں بھی [illegible] چاپ اتر گئے، لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا، اور کنڈاکٹر کی طرف پیسے بڑھاتا ہوا بولا۔

"پٹن گیٹ ـــــ پٹن گیٹ دے دینا ـــ!"

کنڈاکٹر نے اس کی طرف [illegible] سے دیکھا اور پھر بولا "صاحب آپ کب تک اس طرح ٹکٹ بڑھاتے رہیں گے ـــ! یہ طوفان تھمنے [illegible] نہیں، بہتر ہوگا آپ ـــــ!"

لیکن کنڈاکٹر کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بولا، "پٹن گیٹ ـــــ!"

کنڈاکٹر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور پھر بس چل پڑی —

طوفان نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔

اور وہ اپنی سوچ میں گم ہو گیا۔

"ویسے ابھی اس کے ہونے کے دن نہ تھے —— !" ایک ضعیف زنانی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اپنی سوچوں پر قابو پاتا ہوا بڑھیا کی باتیں سننے لگا، وہ کہہ رہی تھی، "بس چوتھی ڈیلیوری تھی اُس کی، ارے بہن مجھے دس بچے ہوئے لیکن کسی دایا نے کبھی خون کی کمی کا رونا نہیں رویا —— پتہ نہیں کیا [illegible] —— بس مرگئی میری بچی۔ وجہ پوچھتی ہوں تو کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ ماں بنے کا بوجھ اُٹھا سکے —— ! اے بہن تم ہی کہو، کیا عورت ذات نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھنے کے بعد بھی [illegible] بننے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی —— !"

بڑھیا کی ہمسفر خاتون ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

[illegible] اُس نے بھی کُتّے کو بھگا دیا ہوتا۔ اُس کے ذہن میں ایک بار پھر وہی منظر گھومنے لگا۔ جیسے بکری، ہرنی کی طرح سُبکتگین سے اپنا بچہ مانگ رہی ہو —— !

"پٹن گیٹ ——" کنڈاکٹر نے پھر ایک بار بس رکوا دی، لیکن بارش کا زور اب بھی وہی تھا، اور اُس کے ہاتھوں میں اورنگ پورہ کا ٹکٹ آچکا تھا۔

بس ایک بار پھر اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

طوفان اب بھی اس کے تعاقب میں مستعد تھا۔

"نہیں یار —— تم اس دفتر شاہی کو نہیں سمجھوگے ! میاں یہ تو کُھلم کُھلا استحصال ہے —— آخر اوور ٹائم کے بل کو منظور نہ کرنا چہ معنی دارد —— ؟"

دفتری باتیں سُن کر اُس کے لبوں پر تبسم پھیل گیا۔ پتہ نہیں کیوں لوگ دفتری تناؤ کو بھی اپنے ساتھ گھر لیے جاتے ہیں۔ اُس کو اس طرح تبسم پاکر، نستری شکوے باز نے اُسے گھور کر دیکھا۔ گویا اُس پر جھپٹنا ہی چاہتا ہو کہ بس کے ایک کونے سے ایک نسوانی آواز اُبھری،

"اپنے پیر اپنے قابو میں رکھو —— کیا سمجھتے ہو تم ؟ ایسا تھپڑ رسید کروں گی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے —— !"

سبھی لوگ آواز پر متوجہ ہوئے۔ اور ممکن تھا کہ لڑکی کی حمایت میں کچھ کر بھی گزرتے کہ بس اورنگ پورہ کے اسٹاپ پر پہنچ گئی اور لوگ پیر کے دھکے کو بھول کر خود ہی دھکم دھکا پر آمادہ ہوگئے۔ طوفان کی پروا کیے بغیر کچھ لوگ اُتر رہے تھے، اور کچھ سوار ہو رہے تھے۔

اُسے بیٹھا ہوا پاکر کنڈاکٹر نے ادب سے کہا، "صاحب —— اب یہ گاڑی ریلوے اسٹیشن جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ آپ اُتر جائیں —— یا پھر ایک اور ٹکٹ لے لیں —— !"

اُس نے ریلوے اسٹیشن کا ٹکٹ لے لیا، کیونکہ طوفان اب بھی برقرار تھا اور اسی طوفان میں تر بتر ایک جوڑا سوار ہوا، اور اُس کے مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا، لڑکی کے چہرے پر ابھی تک عروسی نشانات باقی تھے۔ لڑکا طوفان اور بس کے مسافروں سے بے نیاز اپنے ہی نشے میں چُور تھا۔

بس دوڑنے لگی۔

طوفان بھی قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہا تھا۔

لڑکا، لڑکی سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ "جانتی ہو برسات کے بعد کیا ہوتا ہے ——— ؟"

لڑکی نے آنکھوں سے پوچھا ——— "کیا ہوتا ہے ؟"

لڑکے نے اُس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر بولا "دھرتی نئی نئی کونپلوں سے لہلہانے لگتی ہے ——— مَیں بھی اپنے آنگن میں یہی سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں ———" لڑکی نے شرما کر گردن جھکا دی جیسے اُس کی گود میں [illegible] کی نئی فصل لہلہا رہی ہو۔

بس بہت تیز دوڑ رہی تھی۔

طوفان بھی تیز تُند ہو رہا تھا۔

کنڈاکٹر کی آنکھوں میں لمحہ لمحہ چمک پیدا ہو رہی تھی [illegible]

اور وہ [illegible] شیشوں کے باہر جھانک رہا تھا۔

پھر بس کے بریک زور سے چیخے ——— [illegible] کر اپنی سیٹ سے اُٹھتا ہوا بولا، "ریلوے اسٹیشن [illegible]"

بس میں موجود تمام مسافروں نے شیشوں سے باہر جھانکا۔ بارش کا زور اب بھی وہی تھا۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے [illegible] کنڈاکٹر کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گویا تحفظات کا ڈرامہ اب ختم ہو رہا تھا۔

"[illegible] ——— کیا یہاں سے آگے تمہاری بس اور کہیں نہیں جائے گی ؟"

"[illegible] سے آگے اب یہ کہیں نہیں جائے گی ——— اور نا ہی لوٹ کر شہر کی طرف ——— اب آپ لوگ اُتر جائیے۔"

"لیکن اتنی شدید بارش میں ہم لوگ کیسے اُتریں ——— ؟" ایک سوال چیخا۔

"بالکل اُسی طرح جس طرح سوار ہوئے تھے۔" کنڈاکٹر کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی سپاٹ تھے۔

"کیا انسانیت کے نام پر بھی تم کچھ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے ؟ میرا مطلب کم از کم بارش کے تھمنے تک ———" دوسرے [illegible]

"مجبوری ہے ! میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا ——— ڈیوٹی کے اوقات انسانیت کو نہیں مانتے، کیونکہ خواہ کتنی ہی شدید بارش [illegible] مجھے اپنی ڈیوٹی پر اُس کے مطلوبہ وقت پر ہی حاضر ہونا پڑتا ہے۔"

"لیکن ——— ؟ !!" کئی سوال ایک ساتھ اُبھرے۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں ——— میری ڈیوٹی اب ختم ہو چکی ہے، اور مجھے بس کو ڈپو میں جمع کروانا ہے ——— تم لوگ فوراً اُترو ——— ورنہ مجھے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

کنڈاکٹر کا لہجہ اب قدرے سخت ہو گیا تھا، لوگوں نے پھر ایک بار ایک دوسرے کو دیکھا۔ کھڑکی سے باہر طوفان کو بھی دیکھا۔ [illegible] ایک کے بعد ایک اُترنے لگے۔ نوجوان نئی فصلوں کا خواب لے کر، دفتری بابو استحصال کا غم لے کر، تاجر اپنے نقصان [illegible] کر، اور کوئی طوفان کو رحمت جان کر، اور وہ سارے تحفظات کے قلعوں کو روند کر نیچے اُتر آیا تو بکری کا بچہ اُن کے

اپنے اندر بڑی شدت سے چیخ رہا تھا۔

[illegible] طوفان تھا۔ اب ہر فرد اپنے طور پر اس طوفان سے نبرد آزما تھا۔ بدن جب پانی کی مار سے واقف ہوا تو بھیگ جانے کا خوف بھی جاتا رہا۔ سبھی آڑے ٹیڑھے راستوں پر بچتے بچاتے اپنی اپنی منزلوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں پھر ایک بار وہی منظر ابھرا، جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا۔ لیکن اب وہاں نہ کوئی کُتّا تھا، نہ بکری تھی اور نہ ہی اس کا بچہ ——— بس بارش تھی ——— شدید بارش ———

اور وہ ننگے سر پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔

وزیر علی بابو

دباؤ زدہ شخص

[illegible] تیری چاتی پیاں نال گھوڑے آندے

[illegible] نہیں رہندے جہڑے بجلی نوں ٹور آندے

[illegible] کا یہ لوک گیت نہ جانے کیوں اُس کے ذہن میں بُری طرح سما چکا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ غیر شعوری طور پر اس کے بول دل ہی دل میں بار بار دہرا [illegible] گھنٹے یہ گیت اس کیسٹ فروخت کرنے والی دُکان سے [illegible] تھا جہاں وہ رات کے وقت سیلز مین کی حیثیت سے ملازم تھا...... شہر کی مصروف شاہراہ پر اس دُکان کا محل وقوع رات کے وقت بھی اتنے گاہک ضرور مہیا کر دیتا کہ صبح کو مالک کے چہرے پر اطمینان محسوس کراتا۔ جیسے ہی وہ صبح کو واپس دُکان کا کاروبار مالک کے حوالے کرتا تو وہ بھی دوبارہ اسی کیسٹ کو ڈیک میں لگا کر چلا [illegible] .. چناں وے تیری چانی [illegible]

یہ موجود لمحے میں بھرپور بکنے والی —— اس کے لیے ایک ناپسندیدہ کیسٹ تھی مگر بزنس کے آگے ذوق چہ معنی دارد...... اُسے ہر لحاظ سے قائل ہونا پڑا کہ [illegible] اسی قبیل کے لوک گیتوں اور اُسٹیج ڈرامے [illegible] والی کیسٹوں کی مانگ [illegible]

[illegible] ذوق ؟

[illegible] بار رات کے وقت یار دوست آ دھمکتے اور مختلف غزلوں اور قوالیوں کی فرمائش کر ڈالتے تو وہ ڈرتے ڈرتے گاہے بگاہے اُن کی خواہش کی تکمیل کر دیتا کہ اس میں کسی حد تک اُس کی اپنی پسند بھی شامل ہوتی مگر مالک کی تلقین اور کاروباری ایمانداری ...... نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے دوبارہ وقت موجود میں خوب بکنے والی کیسٹ دوبارہ لگانے پر مجبور کر دیتی ....

[illegible] رات تھی اور کل کا آنے والا دن چھٹی کا دن تھا۔ وہ دل ہی دل میں وہی ناپسندیدہ کیسٹ گنگنا بھی رہا تھا اور خود کو کوس بھی رہا تھا اور اپنے ذہن میں بیوی اور بچے کے ساتھ کہیں گھومنے کا پروگرام بھی ترتیب دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک تواتر کے ساتھ گاہکوں کو بھی نمٹا رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر کاروباری جملے ناچ رہے تھے اور کیسٹیں فروخت ہو رہی تھیں۔ سینما کا آخری شو ٹوٹنے کے بعد بزنس میں قدرے کمی واقع ہو جاتی تو وہ چُپکے سے اپنی پسندیدہ میوزک کی کیسٹ نکالتا اور ریکارڈنگ چینل میں اندر گھس کر چند لمحوں کے لیے معمولی سی تفریح کر لیتا۔ کاش ! اس مخصوص میوزک والی کیسٹ کی بھرپور فروخت ہوتی، کاش لوگوں میں عمدہ کلاسیکی موسیقی کا رجحان پرورش پاتا۔

مگر حقیقت اُس کے خیالات کے طلسم سے الگ تھی ۔ شہر کی اس مشہور شاہراہ اور اس کیسٹ والی دُکان اور چند ایک چارپائی بستر سے مہیا کرنے والے ہوٹلوں کی دُنیا دوں سے یکسر مختلف تھی آخری تو ٹوٹنے کے کچھ ہی دیر بعد ایک درمیانی عمر کی خوش شکل اور بھرپور جسم کی مالک مگر گنگی عورت کا میں الگتا تو محمد بھر کو وہ سوچتا اس گونگی عورت کا ایک ایک انگ کیسے بول رہا ہے جیسے بوٹی بوٹی سے زبان و خیالات کا اظہار رچا ہے رہا ہو کیسٹ چلتی رہتی آواز کی حکمرانی [illegible] رہتی ادھر اُدھر سے بھڑے میک اپ کیے نکلتے ۔ شوقین مزاجوں سے [illegible]ں بجا بجا کر بھاؤ تاؤ کرتے اور خا[illegible] ۔ ۔ ۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اُس نے ایک گاہک کو عطاء اللہ نیازی کی ایک کیسٹ فروخت کی اور کُرسی دُکان سے باہر گھسیٹ کر لے آیا تقریباً ہی پہلے سے میز پر رجسٹر کھولے منشی اُونگھ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ منشی ! اُس کی پکار نے منشی کے جسم میں گھس کر چٹکی لی تو وہ ہوش میں آگیا ۔ " کیا ٹائم ہوا ہے ؟ " " آدھی [illegible] " منشی نے جمائی لیتے ہوئے کہا ! دو بج چکے ہیں " کیوں آج رات گزر نہیں رہی کیا ؟ " " ہاں تم ٹھیک سمجھے " " وجہ ؟ " منشی نے ایک سگریٹ اُس کی جانب بڑھایا اور ایک خود بھی سلگایا ۔ " میری بیوی اور بچے گھر پر اکیلے ہیں اور وہ گند آنے والے قاتل آزاد ہیں منشی ! " " ہم سب ایک بحران سے گزر رہے ہیں " منشی نے کش لے کر ہمدردی سے اُسے تسلی دی " خیر وہ جو کوئی بھی ہیں اپنے ضمیر اور خدا کے مجرم ہیں " منشی نے فلسفیانہ انداز میں کہا ! اور ساتھ ہی قریب سے گزرنے والے چند مسافروں کو دیکھ کر ہانک لگائی ـــــ منجی بسترے ! منشی مسافروں کے نام پتے رجسٹر میں نوٹ کر رہا تھا تو منجی بسترے کی ہانک سے اُسے گھر کی خوب یاد ستانے لگی ۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا ؟ کہ اُسے اونگھ سی آگئی یا خوف ایک چھوٹے سے خواب ...... یا دھندآمیز منظر میں اُبھر آیا جیسے ...... جیسے ایک عورت اور بچے کا سر کچلا ہوا ہے اُس کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور وہ چوکنا ہو گیا ۔ وہی نحوس کیسٹ آخری دموں پر تھی اور منشی اونگھ رہا تھا سڑک کے اُوپر بجلی کی اُلجھی تاروں سے اُوپر چاند سنگِ مرمر کے غیر تراشیدہ پتھر کی طرح پڑا تھا ۔ اور یُونہی موسم کا بھرم رکھنے کے لیے ہلکی سی ہوا بے دلی سے چل رہی تھی .... کیسٹ ختم ہوئی تو ساتھ ہی اذان کی آواز جاگ اُٹھی ایک لمحے کے لیے اُس کے کانوں کو موسیقی کا یہ نیا تجربہ بے حد خوشگوار محسوس ہوا ۔ مگر پھر اُس نے استغفار کی ۔ بھلا موسیقی اور اذان خدا معاذ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگی ۔ سوزوکیوں پر سبزیاں لد لد کر آنے لگیں کونے کھدروں میں گُم لوگ نظروں کی حدود کو چھونے لگے اور اُس کے اور کانوں کے لیے ناپسندیدہ کیسٹیں پھر فروخت ہونے لگیں ۔ ایک بار پھر اُس کے دل سے آہ نکلی .... ! کہاں گئے اچھی موسیقی کے طلبگار ! اُس کی دُکان کے سامنے ایک آدمی حلوہ پوری کا تھال لیے آ بیٹھا اور ساتھ ہی مکھیوں کے پروں کا خفیف سا ارتعاش لرزنے لگا اُس نے ایک اور سگریٹ پھونکا ..... اور بغلی جیب کو ٹٹول کر دو پانچ ملی گرام کی ڈیزا پام کی گولیوں کو نگل گیا ۔ ... تاکہ جیسے ہی وہ چھٹی کر کے گھر جائے تو چند گھنٹے فوری طور پر پُرسکون ہو کر سوئے اور پھر شام کو ..... بیوی اور بچے کے ساتھ .... اُس کے خیالات کا سلسلہ ایک زنانہ آواز نے قطع کر دیا .... صبح کی پہلی کرن کی طرح ایک خاتون سفید چادر اوڑھے روشن چہرہ اور آنکھیں لیے اُس سے ایک کیسٹ مانگ رہی تھی .. [illegible] خاتون کے ساتھ بشرٹ اور نیکر پہنے ایک چھ سال کا کم عمر بچہ بھی تھا ... جو کھڑے کھڑے نیند کی حالت میں آنکھیں موندے ہوئے تھا ..... خاتون جو کیسٹ مانگ رہی تھی اُس کے لیے یہ آخری صبح خوشگوار کرنے کے لیے کافی تھی ۔ یہی کیسٹ تو وہ ریکارڈنگ چینل میں گھس کر چپکے چپکے سُنا کرتا تھا ...... خاتون نے سوتے بچے کو ایک بار قدرے جھنجھوڑا اور یہ مُسکرا کر بولی ..... " دیر نہ کیجئے مجھے گھر جلدی جانا ہے " " ابھی لیجئے ! اُس نے پُر اعتماد طریقے سے شوکیس سے پُھرتی کے ساتھ کیسٹ نکالی اور مُسکرا کر کہا ۔ یقین کریں میں تو ترس گیا ہوں اچھی موسیقی کی ڈیمانڈ کو آپ کے ذوق کی [illegible] " شکریہ ! " خاتون نے

[illegible] اور پچیس روپے گن کر اس کے حوالے کیے اور بچے کی انگلی تھامے تقریباً اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئی ....

تھوڑی شام کا جادو ٹوٹا۔ آنے والی صبح نے اپنے ماتھے پر سورج کا جھومر سجا کر کاروبارِ حیات ہاتھوں میں لے لیا۔ دکان کا مالک [illegible] میں گھستے ہی کیش بکس سے نوٹ نکال کر گننے لگا اور پھر پُر اطمینان انداز میں اسی نا پسندیدہ کیسٹ کے ساتھ اپنی بھدی آواز [illegible] لگا ...... خواب آور گولیوں کے اثر سے اسے بار بار جمائیاں آنے لگیں ...... دکان واپس مالک کے ہاتھ تھما کر وہ قریب [illegible] میں واقع اپنے گھر میں داخل ہوا ...... خواب گاہ میں مسہری پر بیٹھی اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔ اور بچہ اطمینان سے سویا ہوا تھا۔ ...... قریب ہی میز پر تھوڑی دیر قبل فروخت کی گئی کیسٹ پڑی تھی ... [illegible] اور بستر کے سرہانے سفید چادر بکھری پڑی تھی ...... اس نے چپ چاپ جیب سے گن کر پچیس روپے بیوی کے حوالے کیے [illegible] کیسٹ اٹھا کر [illegible] اور گولیوں کے غار میں گم بیوی کے پہلو میں بے خبر سو گیا ... [illegible] ہفتے کی رات کو وہ کیسٹ اپنی پرانی جگہ دوبارہ پہنچ جاتی ہے اور جمعہ کی صبح ایک خاتون اور بچہ اسے خرید کر لے جاتے ہیں۔

گلِ نارا کندا

مسعود منور

اُن کے نام ریمنڈ اور اُرسلا ہیں۔

مَیں نیروبی میں بیری تھوکر روڈ پر واقع "ڈیلا دوسے" ریستوران میں جنھیں انہیں یونیورسٹی سے آنے والی سڑک عبور کرتے دیکھ رہی ہوں۔ لڑکا، ڈانگری اور سُرخ قمیص پہنے ہوئے ہے جبکہ لڑکی آسمانی رنگ کا لمبا سکرٹ زیب تن کیے ہے۔ مَیں انہیں ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہنے کا اشارہ مرتب کرتی ہوں اور جواباً اُرسلا بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ چند لمحوں بعد وہ میری میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں پوچھتی ہوں کہ انہیں بھوک تو نہیں لگی لیکن وہ سر ہلا کر انکار کر دیتے ہیں، ہم ایک گلاس جوس کا آرڈر دیتے ہیں، میرے لیے اناناس، اور اُن دونوں کے لیے مالٹوں کا جوس۔

مَیں اُن سے ایک مشترکہ دوست کے ذریعے متعارف ہوئی تھی۔ اُرسلا نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہے، ہم جوس پی چکنے کے بعد کیا مبو روانہ ہو جائیں گے۔

وہ مجھے یونیورسٹی کی مصروفیات کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ لڑکی ریاضی کی طالبہ ہے اور لڑکا زبان کا طالب علم۔

[illegible]

انگریزی اور سواحلی، بعد میں عربی پڑھوں گا۔ کینیا کے لوگ زبان کے بڑے دھنی ہیں، مَیں بہت سے ایسے کم سن کینیائی بچوں سے مل چکی ہوں جو اپنی قبائلی زبان کے علاوہ سواحلی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتے ہیں۔

ریمنڈ بڑے پُرجوش انداز میں نیروبی کی لائبریری کا حال بیان کرتا ہے، اس کے آبائی گاؤں کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔

"[illegible] مطالعے کا خبط ہے" اُرسلا کہتی ہے۔

وہ ایک دوسرے پر نگاہ ڈال کر مُسکراتے ہیں۔ دو نوجوان جن کی عمریں بیس برس کے پیٹے میں ہیں، وہ ایک دوسرے کو بہت بچپن سے جانتے ہیں، جب وہ یونیورسٹی میں آئے تو بچپن کی دوستی، جوانی کی محبت میں بدل گئی لیکن اُنہیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے لیے تعلیم مکمل کرنے تک انتظار کرنا ہوگا۔

"عیسائی مذہب کے مطابق شادی" اُرسلا کہتی ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ اسے صرف ارسلا ملے گی۔ فقط بیوی۔ ارسلا پشیمان سی ہو کر میز کے نیچے دیکھنے لگتی [illegible]

میں ایک روایتی آدمی ثابت نہیں ہوں گا۔ وہ کہتا ہے — ایک بیوی اور بہت کم بچے، شاید تین چار، جن کی صورتیں ارسلا سے ملتی

وہ پشیمان سی لگتی ہے۔ میں اس کے شبنم سے دُھلے پھول [illegible] دیکھتی ہوں۔ وہ نفیس قوسوں جیسے ہونٹ، بادامی آنکھیں سیاہ ریشمیں زلفیں جو کسی گھوڑے کی دُم کی طرح لہرا رہی ہیں اور ریمنڈ کے چہرے پر [illegible] کا خمار سا تعاقب۔ جو اُس کے بارے میں بات کرتے ہوئے اور بھی گمبھیر ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتی ہوں۔ "تم اپنی تعلیم کے اخراجات کیسے برداشت کرتے ہو؟"

"ہمیں حکومت کی طرف سے وظائف ملے ہوئے ہیں" وہ کہتا ہے، اضافی اخراجات ہمارے گھر والے دیتے ہیں۔ ماں، باپ [illegible]..... جب ہم تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے تو حسبِ توقع خاندان کے اُن افراد کی مدد کریں گے، جنہیں تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ میرے ماں باپ کچھ مشکلات سے دوچار ہیں، میرا ایک بھائی ہے جو کافی پیسہ دیا کرتا تھا لیکن حال ہی میں اُس نے شادی کر لی ہے اس لیے اُس نے امداد کا سلسلہ فی الوقت بند کر رکھا ہے۔

"وہ ہفتے میں تین دن، سہ پہروں کو ایک ریستوران میں کام کرتی ہے" ریمنڈ بتاتا ہے۔

"[illegible] میری مدد کرتا ہے" وہ لقمہ دیتی ہے۔

وہ مجھے اپنے خوابوں کے بارے میں بتاتے ہیں، اُن کی آرزو ہے کہ وطن سے باہر نکلیں اور دُنیا دیکھیں، یورپ، امریکہ، شاید مجھے کہیں مترجم کا کام مل جائے اور وہ جو حقیقت پسند لڑکی ہے.....

"ہم ملا ہیت ہوشیار ہے" ریمنڈ کہتا ہے۔

ہم نے اپنے اپنے جوس کے گلاس ختم کر لیے ہیں، اب کیا تیو جانے کے لیے اس جگہ سے چل دینے کا وقت ہے، میں نے ایک ڈاٹسن کار [illegible] ایک پیلے رنگ کی کار، جس کے بائیں جانب کی اگلی سکرین میں ایک نمایاں چیب (ڈینٹ) ہے۔ میں کار میں بیٹھ کر اُسے سٹارٹ کرتی ہوں اور وہ دونوں میرے عقب میں ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہیں۔ جب ارسلا اندر آکر بیٹھتی ہے تو اُس کے ہاتھوں میں زرا کندا کے بنفشی پھولوں کا ہار ہے۔ ہم ریمنڈ کو ہاتھ ہلا کر وداع کرتے ہیں۔ میں اُسے آئینے سے دیکھتی ہوں، وہ چند سے فٹ ہاتھ پر کھڑا ہمیں دیکھتا [illegible] کر کے واپس یونیورسٹی چلا جاتا ہے۔ وہ واپس اپنی انگریزی اور ہسپانوی کے پاس۔ شاید بعد میں عربی کی طرف رجوع

ہم گاڑی چلاتے شہر سے باہر نکل آتے ہیں، ہم کھڑکیاں کھولتے ہیں اور تھوڑی ہوا کو اندر آنے دیتے ہیں تاکہ گرمی ہمیں دق نہ کرے۔ لمبی لڑکی کے دو روتیہ کشیدہ قامت پیڑ کھڑے ہیں، اُس کے ہاتھ مسلسل پھولوں کی اُس مالا کو سہلا رہے ہیں جو اُس کی آغوش کے حلقے میں ہے۔ میں محبت کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں اپنے آپ کو وقف کر دینے کی صلاحیت کے بارے میں، ایک دوسرے پر فخر کرنے کے احساس کے متعلق —

لمبی شاہراہ پر بچے اور عورتیں گدھوں پر بھاری بوجھ لادے چلتے نظر آتے ہیں، ہم بڑے بڑے کھیتوں کے پاس سے گزرتے ہیں

کی لمبی پگڈنڈیاں مرکزی گھروں تک جاتی ہیں۔ ہم مٹی اور گارے کے مکانوں کے پاس سے گزرتے ہیں جن کی طرف سے اُکتائی دھلوانیں سڑک سے آملتی ہیں۔ یہ کھیت پر کام کرنے والے مزارعین کے گھر ہیں۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد اُرسلا مجھے گاڑی موڑنے کے لیے کہتی ہے۔ یہ ایک تنگ سی، مٹی کی ناہموار سڑک ہے، اس کے دونوں جانب جھاڑ جھنکار اُگا ہے۔

تھوڑی دیر میں ہم منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

ایک بڑی سی دیہی حویلی ہے جو ایک کھلے احاطے کے گرد پانچ کمرے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی ایک عورت بھی احاطے میں داخل ہو، وہ سیدھی کھیتوں کی جانب سے چلی آرہی ہے اور اُس کے ہاتھوں میں کھلا ہوا چاقو ہے۔ اُرسلا اور عورت تسلیم و تپاک کا تبادلہ کرتی ہیں۔ مجھے متعارف کرایا جاتا ہے۔ اُس عورت سے ہاتھ ملاتی ہوں جو اُرسلا کی سوتیلی ماں ہے۔ ہم اُس کمرے کی طرف جاتے ہیں جہاں اُرسلا کی حقیقی ماں رہتی ہے۔

وہ لیٹی ہوئی ہے اور علیل ہے۔ وہ بدقت تمام اُٹھتی ہے، مجھ پر نگاہ ڈالتی ہے اور بیٹی سے دھیمے لہجے اور ایک ایسی زبان میں بات کرتی ہے جسے میں نہیں سمجھ پاتی۔ مجھے گھر کی فضا میں تکدر کا احساس ہوتا ہے۔ کیا ماں اس بات پر تو خفا نہیں کہ وہ ایک بن بلائے مہمان کو گھر لے آئی ہے؟ میں اس انتظار میں ہوں کہ اب وہ مٹھائی اُنہیں پیش کروں جو اہل خانہ کے لیے لائی ہوں۔

وہ کئی منٹوں تک مجھے نظرانداز کرکے اسی طرح باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میں بیٹی کے دھیمے لہجے سے اندازہ لگاتی ہوں کہ وہ ماں کا کتنا احترام کرتی ہے، ساتھ ہی یہ نتیجہ بھی اخذ کرتی ہوں کہ وہ ماں کی باتوں پر اعتراض کر رہی ہے۔ بالآخر وہ دونوں چپ ہو جاتی ہیں اور ماں میری طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

"یا میو"

"یا میو" میں جواب دیتی ہوں، اپنی نوآموختہ مراٹھی میں۔

اُرسلا بتاتی ہے کہ اُسے کہیں جانا پڑ رہا ہے، کسی سے ملاقات کرنی ہے اور اسی وقت کرنی ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ معلوم نہیں، اُرسلا کا کہنا ہے کہ اُسے فوراً جانا ہوگا، اس دوران میں اُس کی ماں کے ہاں ہی رہوں گی۔ وہ وعدہ کرتی ہے کہ جلد ہی لوٹ آئے گی۔

اُرسلا درختوں کے درمیان ہی کہیں غائب ہو جاتی ہے، ماں میرے لیے ایک مونڈھا آگے بڑھاتی ہے اور پھر کہیں چلی جاتی ہے — اب وہ واپس آگئی ہے، اناناس لائی ہے، وہ دہلیز پر بیٹھ جاتی ہے اور چھیلتی ہے۔ وہ چاقو کو ایک دھاتی پلیٹ میں رکھ دیتی ہے اور اناناس کی قاشیں میری طرف بڑھاتی ہے، میں چاکلیٹ کے ساتھ ایک ٹکڑا لیتی ہوں۔

"اُسنتے سانا" ماں کہتی ہے، میں سمجھ جاتی ہوں کہ یا تو وہ انگریزی سے بالکل نابلد ہے یا شکوک کی شدید زد میں ہے۔ میں بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ صرف سر ہلا دیتی ہے، ہاتھ جھٹکتی ہے اور مجھے مزید اناناس پیش کرتی ہے۔

ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ دوسری عورت پاس سے گزرتی ہے، اپنا چاقو لیے اور ایک بچے کو بازوؤں میں بھرے، یہ دونوں عورتیں ایک آدھ جملے کا تبادلہ کرتی ہیں۔

ہم کچھ دیر مزید بیٹھے ہیں

"اُرسلا ؟" میں ایک گھنٹے کے بعد پوچھتی ہوں۔

وہ دوسری عورت کندھے اُچکا کر رہ جاتی ہے۔

میں گاڑی تک آتی ہوں اور سگریٹوں کا پیکٹ اُٹھاتی ہوں جو ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ جگہ جہاں اُرسلا بیٹھتی تھی، شاداکندا کے پھولوں [illegible] میں واپس جاتی ہوں۔ سگریٹ سلگاتی ہوں۔ دوسری عورت مجھ سے کوئی سوال کرتی ہے جسے میں سمجھ نہیں پاتی۔ وہ پہلی بار [illegible] اور کمرے میں مدھم سا الاؤ روشن کرتی ہے۔ اب وہ چائے بنا رہی ہے۔

[illegible] بیٹھے ہیں اور استعجاباً ایک دوسرے پر مسکراتے ہیں۔ باہر رات بھیگنے لگی ہے۔

[illegible] انتظار کے بعد ایک شخص آتا ہے۔ میں اندازہ لگا لیتی ہوں کہ وہ اُرسلا کا باپ [illegible]

[illegible] بیوی کی وضاحت [illegible]

[illegible] انتظار کرنا دانشمندی نہیں" وہ انگریزی میں کہتا ہے اور مجھ سے [illegible]

"لیکن کیوں؟" میں پوچھتی ہوں۔

[illegible] نہیں آئے گی [illegible]

"لیکن کیوں؟"

وہ پریشان ہو جاتا ہے اور میرے سوال کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ باہر نکل جاتا ہے اور دوسرے کمرے میں دوسری عورت کے پاس چلا جاتا ہے۔

میں اُرسلا کی ماں کو دیکھتی ہوں لیکن اندھیرے کے باعث اُس کا تاثر معلوم نہیں کر پاتی۔ وہ نیا الاؤ روشن کرنے لگی ہے، میں سمجھ جاتی ہوں کہ وہ [illegible]

میں مونڈھے سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہوں، سگریٹوں کا پیکٹ بیگ میں رکھتی ہوں اور اُس دوسرے کمرے کی طرف چند قدم جاتی ہوں جہاں وہ مرد غائب ہوا تھا۔ وہ دوبارہ باہر آ جاتا ہے۔ گاڑی کی طرف بڑھتا ہے اور اُس کے بونٹ کے اوپر سے پار اُتر آتا ہے۔

"مجھے افسوس ہے" وہ کہتا ہے۔

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر الوداع کہتا ہے۔ میں آہستہ آہستہ کار میں جا بیٹھتی ہوں اور دھیرے دھیرے اُس مختصر سے احاطے سے کار کو باہر لے آتی ہوں۔

اگلے دن ریشنڈ کو تلاش کرتی ہوں اور اُسے بتاتی ہوں کہ کیا مسو میں کیا ہوا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں۔ اُسے میرا بیان پسند نہیں آیا۔

وہ چپ پڑی ڈاٹسن ابھی تک میرے ہی پاس ہے۔ وہ اُسے عاریتاً لینا چاہتا ہے تاکہ جا کر دیکھے کہ اس پر کیا بیتی ہے۔

شام گئے وہ واپس [illegible] اُداس نظر آیا [illegible]

ہم نیچے اُترتے ہیں اور اُس ہوٹل کے بار [illegible] میں، جہاں میں مقیم ہوں، ایک کنارے پڑی میز کے گرد جا بیٹھتے ہیں۔ میں اپنے لیے کپاری اور [illegible] کے لیے وہسکی منگاتی ہوں۔ وہ گلاس غٹاغٹ چڑھا جاتا ہے اور ایک اور کا اشارہ دیتا ہے۔ اُس کے ہاتھ پر ضعف کے مارے لرزہ

تائی ایسری

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

انسانی معاشرہ، عموماً طرزِ زندگی کے مالک کرداروں کا انبوہِ عظیم ہوا کرتا ہے۔ اس بھیڑ میں صرف وہی معدودے چند لوگ اپنی پہچان آپ
پاتے ہیں جو عادات و اطوار، حرکات و سکنات یا بعض غیر معمولی صفات کی بنا پر دوسروں سے مختلف دکھائی دیں۔ یہ مخصوص صفات
غیر معمولی خصوصیات مثبت بھی ہو سکتی ہیں اور منفی بھی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ بعض لوگ، خواہ وہ اشخاص کی شکل میں انسانی
کا حصہ ہوں یا کرداروں کی صورت میں کسی ناول یا افسانے کا، جس کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں اس کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے
، اردو ناول اور افسانے کی تاریخ میں یوں تو بہت سے کردار اپنے امتیازات کے سبب غیر معمولی اہمیت کے حامل سمجھے گئے، لیکن ان میں
ن کردار ایسے ہیں جو اپنی اساسی اہمیت کی وجہ سے افسانہ نگار یا ناول نگار کا کارنامہ کہلائے جانے کا حق رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی
تا ہے کہ کچھ افسانے اپنے کسی مخصوص کردار کے وسیلے سے پہچانے اور یاد رکھے جاتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کا عام رجحان کردار نگاری پر بہت زیادہ توجہ صرف کرنے کی طرف نہیں رہا۔ انہوں نے کردار کے مقابلے میں مسائل
موضوعات کی بالادستی اپنے افسانوں اور ناولوں میں ہمیشہ برقرار رکھی۔ ان کے ہاں کرداروں کی حیثیت اُن وسیلوں کی رہی ہے جو مسائل کی
ت اور موضوع کی بھرپور پیش کش میں معاون ثابت ہو سکیں۔ تاہم "تائی ایسری" کرشن چندر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو اول تا آخر، کردار کا افسانہ
۔ اس افسانے میں موضوع سے زیادہ انسانی عظمت اور سماجی مسئلے سے زیادہ آفاقی اقدار کی بالادستی آغاز سے انجام تک اپنی سحر کاری
تی نظر آتی ہے۔ تائی ایسری، نام کی وہ خاتون جو اسی نام سے موسوم افسانے کا مرکزی کردار ہے، دراصل وہی اس افسانے کی ساری خصوصیات
امن ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کردار افسانے سے نہیں بلکہ یہ افسانہ اپنے اس کردار کے سبب زندہ اور ناقابلِ فراموش
یا ہے ——— تائی ایسری ایک ادھیڑ عمر کی ایسی خاتون ہے جو اپنے پرائے اور چھوٹے بڑے میں یکساں طور پر مقبول اور ہر دل عزیز ہے۔ وہ
ر کی محبت اور تعلق سے محروم ہے مگر اس سے شاکی نہیں، اُسے زندگی نے سوائے دُکھ درد کے اور کچھ نہیں دیا مگر وہ دوسروں میں خوشی
سرت بانٹنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ وہ ہر کس و ناکس کے لیے ایثار و محبت اور شفقت کی دیوی سماں ہے لیکن اسے کسی سے صلے اور
ائش کی آرزو نہیں۔ کرشن چندر تائی ایسری کے سراپا کا بیان کرتے ہوئے، ساٹھ سال کی عمر، سر کے کھچڑی بال، اور گندمی رنگ کے چہرے کے
ے بلکہ وہ جب اس کی آنکھوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو آنکھوں کی راہ سے گویا اس کی شخصیت کی عظمت اور روح کی وسعت و گہرائی کا ایک

ساتھ مشاہدہ کرلیتے ہیں ۔

"... مجھے اُن کے چہرے پر ان کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں ۔ اُن کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے ، میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے ، کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادرِ آب کا خیال آیا ہے ، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان کی آنکھوں کے اندر جو محبت ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں ، جو معصومیت ہے اس کی کوئی تھاہ نہیں ، اس کا کوئی [illegible] میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں ، جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں کہ زندگی کا بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی ان کے لیے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو ۔ آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب کچھ بہالے جائیں ۔ ایسی انوکھی معاف کردینے والی درگزر کردینے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں ـــــ "

اس عبارت میں کرشن چندر نے تائی ایسری کی تمام صفات کا عکس اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا ہے ۔ جب کہ پورے افسانے میں جہاں کہیں اس مرکزی کردار کے حلیہ یا چہرہ بشرہ کا بیان کیا گیا ہے وہ بیان چھوٹی چھوٹی تصویروں سے تائی ایسری کے کردار کا مرقع تیار کرنے کے مترادف ہے ۔ اس کے برخلاف آنکھوں کے بیان میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری سمٹ آئی ہے جو اس کردار کی انفرادیت کے تمام نقوش کو روشن کردیتی ہے ۔ آنکھوں کو دیکھ کر دھرتی کا خیال آنا ، میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا تصور اُبھرنا ، دریائی چادرِ آب کا گمان گزرنا ، اور بے کنار محبت ، معصومیت اور عفو و درگزر کا سرچشمہ ان آنکھوں کو قرار دینا ، درحقیقت کرشن چندر کی ایسی فن کاری ہے ، جس کے نتیجے میں ہم ایک ساتھ تائی ایسری سے سرزد ہونے والے افعال اور اس کی شخصیت کے سارے گوشوں سے متعارف ہوجاتے ہیں ـــــ اس لیے آگے چل کر پیش آنے والے واقعات اور انسانی عمل کے تاثرات ہمارے لیے بہت غیر متوقع یا حیرت انگیز نہیں رہ جاتے ۔ تائی ایسری کی شخصیت ہر قسم کی وسعت اور کشادگی کا اثبات کرتی ہے اور تنگی یا تنگ نظری کی نفی کرتی ہے ۔ اُس کی شخصیت کسی بھی لحاظ سے تنگ نہیں ۔ مذہبی ، سیاسی یا صنفی تنگ نظری اُس کے پاس سے بھی نہیں گزری ۔ وہ رسمی چھوت چھات کے ماحول میں جینے کے باوجود جب کسی اچھوت بچی کا منہ چومتی ہے تو اسے کوئی تکلف نہیں ہوتا ، اور جب اسے اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے تو بظاہر اپنے ناپاک ہونے اور غسل کرنے کی بات تو ضرور کرتی ہے مگر بچی کو اداس دیکھ کر دوبارہ اسے اپنے گلے سے لگا لیتی ہے ـــ تائی ایسری کی کشادہ قلبی کا یہ عالم ہے کہ وہ ساری زندگی اپنے شوہر کی محبت سے محروم رہنے کے باوجود بھی دوسری عورتوں سے مبتلا اپنے شوہر کی رکھیل طوائف کی بیماری کی اطلاع پاکر اُس کی تیمارداری کے لیے بے قرار ہو اُٹھتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نفرت و حقارت ، غم و غصہ اور بغض و حسد جیسی کوئی چیز اسے چھوکر بھی نہیں گزری ۔ کرشن چندر تائی ایسری کی فطری خصوصیات اور اُفتادِ طبع کی ان عجیب و غریب کیفیات کی تصویر کشی خالصتاً انسانی اور اخلاقی بنیادوں پر کرتے ہیں ۔ کرشن چندر نے اپنی افسانہ نگاری کے عام رجحان کے برخلاف تائی ایسری کی کردار نگاری میں کسی قسم کی نظریاتی ، سیاسی یا سماجی کا سہارا نہیں لیا ۔ وہ کردار نگاری کی ساری صلاحیت ، تائی ایسری کے کردار کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں صرف کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ کرشن چندر ایک مقام پر اس کردار کا ذکر خود کلامی کے انداز میں کرتے ہیں ، کہ خود کلامی کی تکنیک بجائے خود صداقتِ بیان اور تکلف سے اجتناب کا ایک طاقتور ثبوت ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

" .... بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ جوانی میں یہ کیسی رہی ہوں گی ؟ مگر تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہ آیا ۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ تائی ایسری شاید بچپن سے ، بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی ۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے پتی کو

ہاتھ پھیلا کر آشیرباد دی ہوگی اور شاید بڑے میٹھے، بڑے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو، تجھے میرے لیے بڑے دُکھ اٹھانے پڑے۔" افسانہ نگار اور رویّے کی عظمت کا اندازہ اُسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب ہم افسانہ پڑھ کر یہ جان لیں کہ تائی ایسری کو شادی کے نام پر شوہر نہیں صرف شوہر کا نام ملا تھا یا اس نام سے وابستہ دُکھ درد اور تنہائی اور بے گانگی ملی تھی —

تائی ایسری نام کا یہ افسانہ جس طرح کرشن چندر کے افسانوں کے عام مزاج اور انداز سے مختلف ہے اسی طرح [illegible] کے دوسرے افسانوں کی طرح کسی نوع کی نظریاتی وابستگی کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ عام طور پر ترقی پسند افسانوں میں کسی مخصوص طبقے کی نمائندگی کرنے والے کرداروں کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ خود کرشن چندر بھی اپنی تحریروں میں اس اصول پر سختی سے عمل پیرا رہے ہیں، کرشن چندر کے ہاں اس رویّے کا نقطۂ عروج۔ مہالکشمی کا پُل۔ ہے۔ مہالکشمی کا پُل، میں کردار نگاری کا جوہر دکھانے اور ہر عورت کی ساڑھی سے اس عورت کی شخصیت اور انفرادیت کا نقشہ کھینچنے کے باوجود طبقاتی نمائندگی کا اصول ہر جگہ کار فرما دکھائی دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ افسانہ کردار اور جزئیات نگاری کی ساری خوبیوں کے باوجود ٹائپ کرداروں کا مجموعہ بن کر [illegible] تائی ایسری [illegible] غیر جانبداری کا توازن پوری طاقت سے برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں چونکہ [illegible] نہیں آتا اور راوی کے کردار میں ڈھل کر جانب داری اور غیر جانب داری کی سطح سے بلند ہو کر افسانہ لکھتا ہے، اس لیے اس نے اپنے محتاط رویّے کو نباہنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اُس نے اس کردار پر ایسی توجہ صرف کی ہے کہ اسے انسانی معاشرے کی زوال آمادہ صورتِ حال میں اُمید کی کرن بنا کر پیش کر دیا ہے اور چونکہ وہ خود راوی کی شکل میں ایک عام دیکھنے والے کی طرح تائی ایسری کو دیکھتا، سُنتا اور برتتا ہے، اس لیے اس کا ہر بیان مبنی بر حقیقت معلوم ہوتا ہے اور ہر تاثر، وہاں تخلیقی تبصرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کرشن چندر نے فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والی دہشت و بربریت کے موضوع پر متعدد افسانے لکھے ہیں، [illegible] افسانہ اس موضوع سے براہِ راست تو تعلق نہیں رکھتا، لیکن اس افسانے میں تائی ایسری کی شخصیت کے بعض پہلو، تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے مسائل کے پس منظر میں بھی ابھارے گئے ہیں۔ تقسیم کے بعد رفیوجی کیمپوں میں جا کر مصیبت زدہ لوگوں کی سیوا کرنا، یتیم اور لاوارث بچوں کو منہ بولی اولاد کی طرح پالنا پوسنا اور پناہ گزینوں کے لیے اپنے مکان کا بڑا حصّہ خالی کر دینا، خدمت اور قربانی کے ایسے نمونے ہیں جو تائی ایسری کے کردار کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کرشن چندر اس کردار کو اُبھارنے کے لیے صرف واقعات اور توصیفی کلمات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے زاویۂ نظر کے استحکام کے لیے نفسیاتی [illegible] سہارا لیتے ہیں۔ تائی ایسری ایک عورت ہے، اور عورتوں میں شوہر کو بلا شرکتِ غیرے اپنی ملکیت سمجھنا فطرتِ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن تائی ایسری کے کردار کی پیش کش میں کرشن چندر نے انسانی عظمت اور آفاقی اقدار کو فطرتِ ثانیہ پر غالب ہوتے ہوئے دکھلایا ہے، افسانہ نگار کو معلوم ہے کہ انسانی نفسیات کے حوالے کے بغیر کسی غیر معمولی شخصی خوبی کا جواز فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جب وہ تائی ایسری کے مکان کو پناہ گزینوں اور رفیوجیوں کے قیام کے سبب ایک گھر میں تبدیل ہوتا ہوا دکھاتے ہیں تو ساتھ ہی تائی ایسری کے اس مزاج کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جو عام عورتوں سے قطعاً مختلف تھا۔

"وہ اپنے گھر میں باہر سے اس طرح آتی تھیں جیسے وہ گھر اُن کا نہ ہو، اُن پناہ گزینوں کا ہو جنہیں اُنہوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی — عورتوں میں شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے مگر ...... قدرت نے اُن کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا — اُن کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لیے وقف تھا —

ہندوستان کی تقسیم خالص مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی لیکن تقسیم کے بعد بھی تائی ایسری لاہور کے مسلم شناساؤں اور گوجرانوالہ کے چاچا کریم بخش کا تذکرہ اُسی اپنائیت اور محبت سے کرتی ہے۔ جس محبت کا جذبہ تقسیم سے پہلے [illegible] رہا ہوگا۔ تائی ایسری اتنی معصوم اور سادہ مزاج ہے کہ سیاسی مسائل اور فرقہ وارانہ الجھنیں اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ وہ جغرافیائی سرحدوں اور ذہن میں پیدا ہونے والی دراڑوں کو [illegible] [illegible] پاتی۔ تائی کا دیور اس سے ایک لمبے عرصے کے بعد ملتا ہے اور اپنے بچوں کی تعلیم، شادی اور ملازمت کا ذکر کرتا [illegible] جواب میں تائی ایسری بھی ایک [illegible] شادی، ایک کی ملازمت اور لڑکیوں کی شادی کے فرض سے اپنے عہدہ برا ہونے کا ذکر اسی خوشی اور بشاشت [illegible] کرتی ہے گویا وہ سب، لاوارث لڑکے اور لڑکیاں نہ رہی ہوں، بلکہ اس کی اپنی اولادیں ہوں ——— اس افسانے میں تائی ایسری کا کردار انسانیت، اخلاقی اقدار، اور الہامی صفات کی تمثیل بن کر نمودار ہوتا ہے، اور جب ہم اس کی زبان سے یہ جملے سنتے ہیں تو اس کردار کے ہر عمل کا جواز [illegible] ہو کہ:

"[illegible] زندگی، دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا! تائی سنجیدہ ہو کر بولیں۔ اُسے چکاتے رہنا چاہیئے، تُو، کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟ [illegible] تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی، تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟ پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دُنیا آگے کیسے چلے گی؟"

آسمانوں میں پھیلا ہوا یہ نظارہ مجھے دیکھتا ہے
میں ستاروں کو تکتا نہیں ہر ستارہ مجھے دیکھتا ہے

میں شجر کی طرح راستے میں کھڑا ہوں بس کا رہیں
کوئی ایسا نہیں جو پلٹ کر دوبارہ مجھے دیکھتا ہے

جانے کب اپنے پاؤں پہ چلنے کی عادت پڑے گی مجھے
جب میں ٹوٹ جاتا ہے جو بھی سہارا مجھے دیکھتا ہے

کیا مرے شہر کے پاس اب دیکھنے کے لئے کچھ نہیں
مجھ کو لگتا ہے یوں جس طرح شہر سارا مجھے دیکھتا ہے

راستہ مجھ کو دیتی نہیں جلتی بجھتی ہوئی روشنی
جب سڑک پار کرنے لگوں سرخ اشارہ مجھے دیکھتا ہے

جا رہا ہوں تو لگتا ہے پھر لوٹ کر میں نہیں آؤں گا
[illegible] پیار سے گھر تمہارا مجھے دیکھتا ہے

وہ [illegible] ہے [illegible] مجھ کو آتا نہیں ہے نظر
میں کہاں ہوں نہیں کچھ خبر میرا پیلا مجھے دیکھتا ہے

جان کیسے رہے جان میں سو قیامت ہے اک آن میں
[illegible] نہیں جو دوبارہ مجھے دیکھتا ہے

میں ابھی میں زمان و مکاں بیچ کے شہزاد جاؤں کہاں
جس غبارے میں میں قید ہوں وہ غبارہ مجھے دیکھتا ہے

اب کسی کو نہیں معلوم کہ کیا ہونا ہے
ایک لمحے کو بچھڑنا بھی جدا ہونا ہے

میں تو اس دھول کو آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں
جس کی تقدیر میں نقشِ کفِ پا ہونا ہے

یار تو منزلِ مقصود سے [illegible]
اور ابھی تک مجھے پیڑوں پہ کھڑا ہونا ہے

ابھی جنگل میں اُترنی ہے اندھیرے کی برات
ابھی چڑھتے ہوئے سورج کو دیا ہونا ہے

چھپتا پھرتا ہے جو اس وقت مرے پیروں میں
ابھی سائے کو مرے قد سے بڑا ہونا ہے

رہِ گم کردہ مسافر کی طرح کھو جانا
حاصلِ عشق نہ ملنا ہے نہ جدا ہونا ہے

وہ جو بگڑا ہے تو یہ دکھ نہیں جھیلا جاتا
اور ابھی سارے زمانے کو خفا ہونا ہے

دلِ محبوب جسے سنگ کہا کرتے ہیں
اسی پتھر کو کسی روز خدا ہونا ہے

اے خدا کوئی ہدف پھر [illegible] میرا
وہ نشانہ تو نہیں ہوں جو خطا ہونا ہے

ساری دنیا ہے تباہی کے دہانے کے قریب
اور میں سوچ رہا ہوں مرا کیا ہونا ہے

اے خدا کوئی تو ہوگا جو تجھے یاد کرے
یوں تو ہر چیز کو دنیا میں فنا ہونا ہے

سب مری طرح لگاتے ہیں قیافہ شہزاد
کوئی ایسا نہ ملا جس کا کہا ہونا ہے

نذیر قیصر

میں گہرا ہوں، مجھ سے دریا گہرا ہے
ہم دونوں سے شام کا سایا گہرا ہے

ٹوٹ رہی ہیں شاخیں صدا نہیں آتی
جلتے جنگل کا سناٹا گہرا ہے

آنکھیں خشک ہیں دل میں بارش ہوتی ہے
وہ جتنا پیاسا ہے اُتنا گہرا ہے

ناؤ جاگتی ہے اور لہریں سوتی ہیں
دریا سے مانجھی کا سپنا گہرا ہے

پلکیں جھکیں کہ دل میں شام اُتر آئی
آنکھیں گہری ہیں کہ سُرمہ گہرا ہے

ڈوب گیا میں قیصر سر کے بالوں تک
پھر بھی میری ذات کا پیالہ گہرا ہے

میں سوتا ہوں سمندر جاگتا ہے
سمندر میرے اندر جاگتا ہے

کئی صبحیں علم تہ کر چکی
کئی راتوں سے لشکر جاگتا ہے

مسافر کشتیوں میں سو رہے ہیں
ستارہ پانیوں میں جاگتا ہے

ہوا چلتی ہے بارش ہو رہی ہے
وہ ان راتوں میں اکثر جاگتا ہے

وہی کروٹ ہے اب تک ہر شکن میں
تری خوشبو سے بستر جاگتا ہے

میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو قیصر
کوئی خوابیدہ منظر جاگتا ہے

غلام حسین ساجد

وہاں [illegible] بھر دیا ہے، وہی بیدرد مٹی ہے
[illegible]ر مالک آج بھی اِس خاکداں کی سرد مٹی ہے

سنوارا ہے جہاں کو اک عجب ترتیب اُس نے
کہیں اُجلے ستارے ہیں کہیں کچھ زرد مٹی ہے

مرے سُود و زیاں سے کوئی نسبت ہی نہیں جس کو
مرے اپنے گھرانے کا اک ایسا فرد مٹی ہے

بکھر جاؤں گا آخر ایک دن میں جس کے سائے میں
مری تخلیق کا [illegible] بے درد مٹی ہے

دھرا ہے طاقِ نسیاں پر چراغ و آئینہ اُس نے
مگر اس [illegible] پر آج بھی کچھ زرد مٹی ہے

اگرچہ راکھ اُڑتی ہے مرے اطراف میں لیکن
مرے قدموں تلے ساجد ابھی تک سرد مٹی ہے

محمد فیروز شاہ

بھول جانے میں بہت سفاک ہو جانا کبھی
اور پھر اس آنکھ کا نمناک ہو جانا کبھی

اندرونِ جاں خس و خاشاک ہو جانا کبھی
اپنی ہستی کا اگر ادراک ہو جانا کبھی

غسل دے لینا دلِ مُردہ کو تیری یاد سے
تیرے صدقے خاک کا یوں پاک ہو جانا کبھی

زندگی کے بحر میں غرقاب ہی رہنا سدا
عشق دریا میں مگر تیراک ہو جانا کبھی

قہقہوں کی گونج رکھنا گفتگو کے درمیاں
شعر میں لہجہ مگر غمناک ہو جانا کبھی

خاک زادوں کے مسلسل خوف کا انجام ہے
ڈرتے ڈرتے ایک دم بے باک ہو جانا کبھی

اے ہمارے ہم سفر ابرِ گریزاں یاد رکھ
سرزمیں پر سایۂ افلاک ہو جانا کبھی

مناظر عاشق ہرگانوی

(آزاد غزل)

[illegible]ن آیا پنچھی گانا بھول گئے
[illegible] گئے

[illegible] صحرا صحرا اُگے ببول گلابوں میں
[illegible] بھول گئے

[illegible]باروں کی دھرتی پہ
[illegible] بسانا بھول گئے

[illegible] ساتھ سفر میں تم نے من کا دکھ نہ جانا
[illegible]بھری راتوں میں میرا ساتھ نبھانا بھول گئے

حامد سروش

محبتوں پہ بُرا وقت آ گیا تھا [illegible]
[illegible]اب کے فصل میں نفرت کا زہر اُگا تھا بہت

شگفتہ خواب، دہکتی وفا کی زنجیریں
تمہارے ساتھ مرا یہ بھی رابطہ تھا بہت

مجھے یقیں ہے کہ گھر جا کے رو پڑا ہوگا
گزشتہ شام وہ ہر بات پر ہنسا تھا بہت

میں تیرے واسطے بادل چرا کے لایا تھا
مجھے خبر تھی کہ تو دھوپ میں جلا تھا بہت

تو یوں ہوا کہ سب آگے نکل گئے اُس سے
ہر اک قدم پہ وہ رُک رُک کے سوچتا تھا بہت

میں تتلیوں کے تعاقب میں راہ بھول گیا
اگرچہ سیدھا مرے گھر کا راستہ تھا بہت

پھر اس کے بعد کناروں پہ شام اُتر آئی
[illegible] منظر گزر [illegible] تھا بہت

نسیم سحر

دل پر بھاری پتھر رکھنا پڑتا ہے
صبر کی چوکھٹ پر سر رکھنا پڑتا ہے
پھول بچھائے جاتے ہیں جب راہوں میں
پاؤں سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے
اور کوئی بستی [illegible] روشن کرنی ہو
اپنا اُفق [illegible] رکھنا پڑتا ہے
[illegible] ف سے بچنے کی خاطر
[illegible] رکھنا پڑتا ہے
آنے والے کل کے فیصلے کرنے میں
سامنے اک [illegible] منظر رکھنا پڑتا ہے
ورنہ سب دیواریں ہی گر جاتی ہیں
ہر گنبد میں اک در رکھنا پڑتا ہے
اک ایسے منظر شہر میں زندہ رہنے کو
آنکھوں میں اک منظر رکھنا پڑتا ہے
جن کے سفر صحراؤں کے ہوتے ہیں انہیں
اپنا ظرف سمندر رکھنا پڑتا ہے
سنگ زادوں کے شہر میں رہنا بھی ہے نسیم
اور شیشے کا پیکر رکھنا پڑتا ہے

گو خاک سے بڑھ کے کچھ نہیں میں
فرزند ہوں [illegible] زمیں میں
رکھتے تو ہو طاق پر مجھے تم
اَٹ جاؤں نہ گرد میں کہیں میں
درکار ہے جس کو خود تحفظ
اک ایسے مکاں کا ہوں مکیں میں
لوگوں کے جہاں قدم پڑے ہیں
کس طرح رکھوں وہاں جبیں میں
کہتا نہیں بیٹھنے کو بھی [illegible]
کہنے کو ہوں دل میں جاگزیں میں
جو شہر تھا میرے دم سے آباد
اس شہر میں اب کہیں نہیں میں
سونپوں کسے اپنی پونجی راشد
اوروں کا تو بن گیا امیں میں

حسن عباس رضا

[illegible]رابطوں کے درمیاں سے اک کہانی گم ہو گئی
یوں لگا جیسے اچانک زندگی گم ہو گئی

[illegible] جس اک ماں کی دعا تھی جیب میں
عمر کے میلے میں پہنچے تو وہی گم ہو گئی

صبح کی پہلی [illegible] بجے
رات کے پچھلے پہر [illegible] روشنی کم ہو گئی

[illegible] روشنا، پتہ کیسے چلے
[illegible] وہ ڈائری گم ہو گئی

[illegible]ے گھر کا نشاں کیا ڈھونڈتے
[illegible] ہی گھر کی گلی گم ہو گئی

جس میں اپنی خواہشوں کی ناؤ بہتی تھی رضا
[illegible] کے کالے پانیوں میں وہ ندی گم ہو گئی

[illegible]باس رضوی

[illegible] جائے
[illegible] لے جائے

وہ ایک لمحۂ موجود آ بھی جائے کہ جو
کبھو [illegible] خامشی سے سہے جائے

فضا میں زہر ہے اور دل میں ولولے ہیں بہت
خدا کرے کوئی ہم سے یہ بال و پر لے جائے

یہ کس گمان میں ہیں راہروانِ کوچۂ شوق
کہ راہبر نہ سہی خاکِ رہگزر لے جائے

کوئی تو ہو جو ہم ایسوں کی دستگیری کرے
بلندیوں کی طلب ہو تو دار پر لے جائے

یہ سرخ سرخ لہو آج کل فراواں ہے
جو چاہے آئے یہاں اور جام بھر لے جائے

بشیر سیفی

ہائیکو

[illegible] کی پُر ہجوم سڑکوں پر
[illegible]یرے افکار کھو گئے ایسے
جیسے میلے کی بھیڑ میں بچہ

○

شام گلیوں میں رقص کرتی ہے
رات گھر سے ابھی نہیں نکلی
روشنی گیت گا رہی ہے ابھی

تم نے محسوس تو کیا ہوگا
سرد موسم کے زرد سائے میں
شام اکثر اُداس ہوتی ہے

○

بارشوں کا ابھی کہاں موسم
میرے جذبوں کی موت پر شاید
ابر پاروں کی آنکھ چھلکی ہے

○

میں ہواؤں کے دوش پر سیفی
غم سمندر عبور کر جاؤں
ساتھ اپنا اگر میسر ہو

اظہر ادیب

ہائیکو

[illegible]رد کی خاردار جھاڑی پر
زندگی ہے ردائے بوسیدہ

اس اندھیرے کے دشتِ وحشت میں
جانے کس سمت ہم نکل جائیں
تیرا چہرہ اگر طلوع نہ ہو

○

سبز رُت ہو کہ زرد موسم ہو
دل میں کانٹے سے چبھتے رہتے ہیں
ایک خوشبو گلے ملی تھی کبھی

○

میں نے جس کو ہتھیلیوں پہ لکھا
ریت پر لکھ گیا ہے وہ مجھ کو
کوئی شکوہ نہیں بگولوں سے

○

جس کی مٹھی میں ہیں رُتیں اُس نے
جانے کیا کہہ دیا ہے دھرتی سے
پھول بوئیں تو خار اُگتے ہیں

زاہد سعید زاہد

رات کے تابوت میں جب چاند دفنایا گیا
شب زدوں کے سر پہ گویا باپ کا سایہ گیا

آدمی الجھا رہا [illegible]
خواہشوں [illegible] آسماں اس قدر پھیلایا گیا

میرے آنگن میں تھی پہلے ہی بہت کم روشنی
اک دیا تھا جس کے گھر میں [illegible]

معرکہ آرا میں ہوتا کس سے اور کس کے لیے
جب صفِ اعدا میں میرا اپنا ماں جایا گیا

وہ جنہیں تجھ سے گلہ ہے دوریوں کا آج تک
میری ہر اک سانس میں شامل انہیں پایا گیا

کھوٹا سکہ [illegible] کھوٹا ہی رہا بازار میں
دونوں جانب سے اگرچہ اس کو چمکایا گیا

نصیر احمد ناصر

درد کے پیلے گلابوں کی تھکن باقی رہی
جاگتی آنکھوں میں خوابوں کی تھکن باقی رہی

پانیوں کا جسم سہلاتی رہی پُروا مگر
ٹوٹتے بنتے حبابوں کی تھکن باقی رہی

دید کی آسودگی میں کرن سیپے دیکھتا
درمیاں کتنے حجابوں کی تھکن باقی رہی

فلسفہ سارے کتابوں میں الجھ کر رہ گئے
درس گاہوں میں نصابوں کی تھکن باقی رہی

بارشیں ہوتی رہیں ناصرؔ سمندر کی طرف
ریگ زاروں میں سرابوں کی تھکن باقی رہی

منوّر ہاشمی

لوٹ کر وہ آ نہیں سکتا کبھی سو یا نہیں
اس لیے جاتے ہوئے میں نے اسے روکا نہیں

حاصلِ احساس ہے اک عمر کی تشنہ لبی
ابر کا ٹکڑا ابھی کوئی شجر پہ برسا نہیں

اس طرف بھی انتہا اور اُس طرف بھی انتہا
وہ بھی کم ہنستا نہیں اور میں بھی کم ہنستا نہیں

میرا ذوقِ شعر ہے ممنونِ اخلاصِ نظر
کوئی فن پارہ مرا معیار سے گرتا نہیں

لفظ کا کوئی ستارہ سوچ کا جگنو کوئی
آج بھی ظلمت گہِ احساس میں چمکا نہیں

مجھ سے میرے ربط کا اظہار لفظوں میں کہاں
میں نے اپنے آپ کو بھی اس قدر چاہا نہیں

روشنی لے کر منوّر میں گیا کس کس کے گھر
غیر ہو یا کوئی اپنا یہ کبھی دیکھا نہیں

علی اعظم بخاری

لاکھ چاہا نہ کبھی حدِ خطر سے نکلا
زندگی بھر نہ وہ جنگل کے اثر سے نکلا

دُور تک پھیلا ہوا سامنے صحرا اُس کے
ابر اوڑھے ہوئے وہ شہرِ شرر سے نکلا

طاق چہرہ پہ سجائے ہوئے آنکھوں کے چراغ
روشنی بانٹتا وہ اندھے نگر سے نکلا

وحشتِ بے مہر کے جنگل سے میں نکلا نہ کبھی
جانے کس ساعتِ منحوس میں گھر سے نکلا

ریت ساحل پہ مسافر نہ اترتے دیکھے
سب نے دیکھا کہ سفینہ تو بھنور سے نکلا

اب نہیں شہ کے زر و مال کی حاجت اس کو
موت کا تاج وہ پہنے ہوئے گھر سے نکلا

آشیاں چھوڑ کے جاتا نہ پرندہ اعظم
پیڑ سے روتا ہوا سانپ کے ڈر سے نکلا

اب جی کی باتیں

وجیہہ الدین احمد

صلاح الدین احمد جب باپ بنے تو عمر اکیس برس تھی۔ غالباً کم عمری کے پیشِ نظر بچوں نے 'ابا جی' کو گھٹا کر 'اب جی' بنا لیا۔ اسی نام سے میں ان کی قبر پر یاد کے چند دیئے روشن کروں گا۔

(۱)

کفِ بادگیر میں نشیمن سازی کا خس نہ تھا۔ جوں ہی چار تنکے ہاتھ آئے تو طلبِ نکہت و کشادگی میں زنجیر پا کو ہم سفر بنائے کشمیر چل دیے۔ سائبان ڈال کر التزامِ نان و نمک کا ارادہ تھا۔ اجنبیوں کی سکونت کے خلاف ریاستی قانون توقع سے زیادہ خاردار نکلا۔ کشمیر پہ پسپائی اندوختہ لٹایا اور لاہور لوٹ آئے۔ کہتے تھے کہ جب شہر کے دروازے میں داخل ہوئے تو ایک قصیدہ خوانِ لاہور کا مصرع پڑھا ۔ ؎ دگر بہار بیا مرا بہار توئی۔

بادِ خنک اور ابرِ پُرنم کی ہوس مشرقی کہستانِ پنجاب کی سمت بھی لے گئی۔ دھرم شالے کی بستی کفر آثار تو تھی لیکن زم زم کی کمی زمزمۂ آبشار نے پوری کر دی۔ بصد شوق و تعجیل رہائشی قطعۂ زمین خریدا گیا لیکن خاتونِ خانہ کے گوشۂ خاطر میں نہ سمایا۔ نقشہ دیکھ کر فرمایا : "نحوست کی مار، یہ تو شیر دم ہے، اگاڑی پچھاڑی سے چوڑی۔ ایسی زمینیں تو مالکوں کو کھا جاتی ہیں۔" آشیاں گاہ آغوشِ کشا چھوڑنا پڑی۔

میں نے اب جی سے پوچھا کہ آپ کو اشجار و ازہار کی کیا کشش تھی جو کوبکو بھٹکتے رہے ؟ کہا۔ "آدمی کا جغرافیہ خوش منظر ہونا چاہیئے۔ اگر جغرافیہ بدنما ہو تو بینائی بدنمائی کی عادی ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی تاریخ کے داغ دھونا بھول جاتا ہے۔"

(۲)

اب جی نے بیشتر پدرانہ ذمہ داریاں والدہ پر ڈال دی تھیں لیکن ایک قلم دان نظام ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ رزقِ روح کی فراہمی۔ کہتے تھے کہ گھر میں اچھی کتابوں کی موجودگی گھر کو آلودگی سے پاک رکھتی ہے۔ جیسے ہی میں اور بہن "پھول" پڑھنے کے قابل ہوئے مجلّہ "مخزن" کی منتخب نظم و نثر سے ہماری شناسائی کرائی گئی۔ بلوغت میں بھی "مخزن" کے محاسن اور اس کا ادبی مقام موضوعِ گفتگو رہے۔

اب جی کہتے تھے کہ پنجاب میں ضیائے اُردو کی شمع برداری کا فریضہ اس چار یاری نے ادا کیا جس کے ارکان شیخ عبدالقادر کے ارادت مند تھے اور "مخزن" کے متوسل۔ چار یاری میں شمولیت کمالِ عبارت آرائی یا سخن طرازی سے مشروط نہ تھی۔ جو مسند کا مستحق نہ ہو اس کے لیے حاشیۂ قالین حاضر تھا
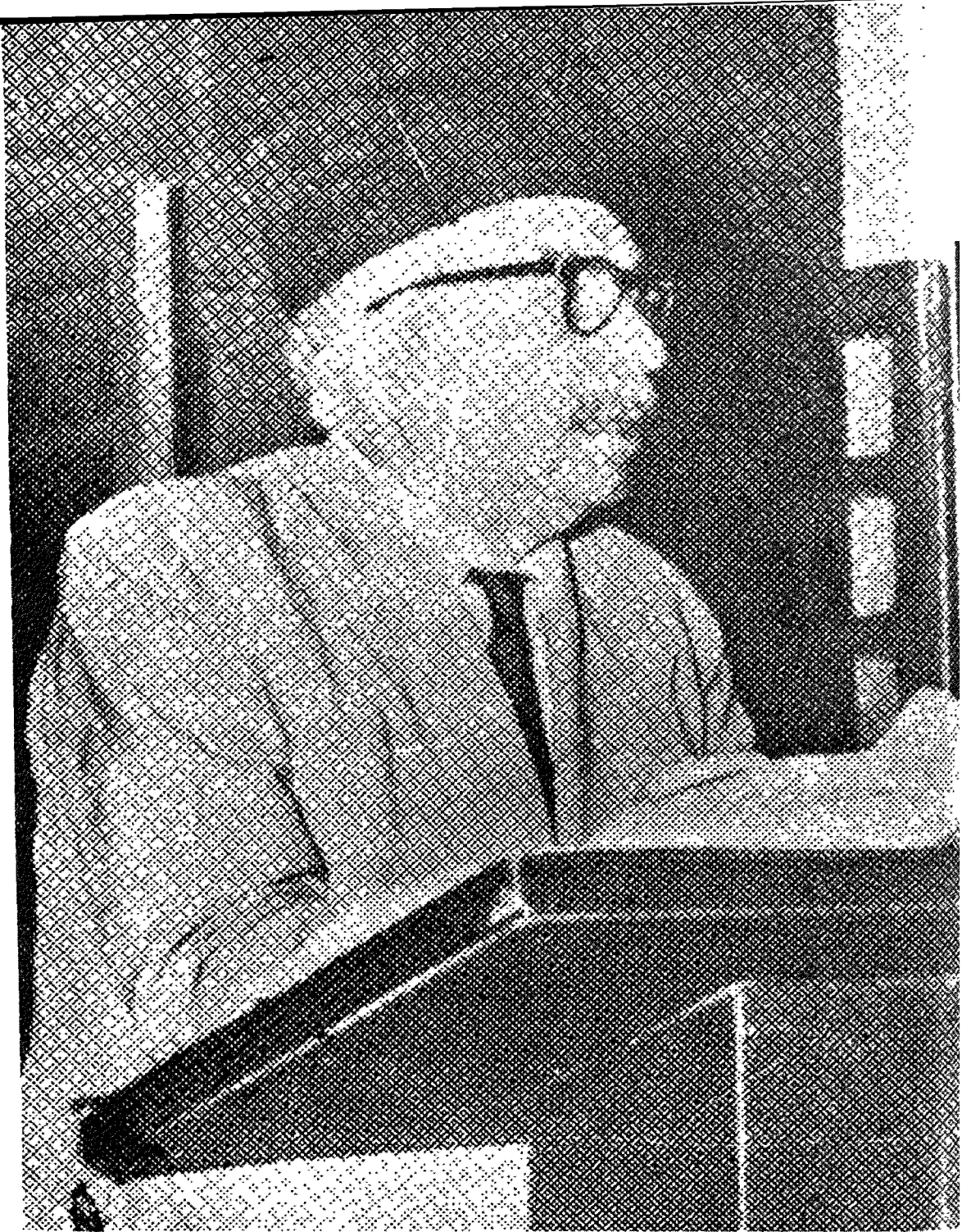
مولانا صلاح الدین احمد

الارض للہ

مولانا صلاح الدین احمد

اے مسافر! یہ مقامِ مقدس جہاں تیرے قدم آج پہنچے ہیں ایک پوری قوم کے اس عہدِ واثق کی یادگار ہے جو اس نے اپنے فطری حق یعنی آزادی کا اس کے حصول کے لیے اپنے پروردگار سے، اپنے قائد سے، اور اپنے آپ سے کیا تھا۔ اس قوم نے اپنے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سرزمینِ پاک پر پھر سے اس کی بادشاہت کا علم لہرائے گی، اس نے اپنے قائد کو یقین دلایا تھا کہ منزلِ مقصود کی راہ میں اس کے قدموں میں کبھی لغزش نہیں آئے گی اور اس نے اپنی پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ یہ عزمِ صمیم کیا تھا کہ وہ آزادی کی نعمتِ عظمیٰ حاصل کرنے کے لیے کسی اقدامِ راست سے اجتناب اور کسی ایثارِ صادق سے دریغ نہیں کرے گی اور پھر خداوندِ ارض و سما کے فضل بے حساب سے سات برس کے عرصۂ قلیل میں وہ مملکتِ جلیلہ واقعی عالمِ وجود میں آ گئی جس کا خواب شاعرِ مشرق نے دیکھا تھا اور جس کی نشاندہی حکیم الامت نے فرمائی تھی اور وہ میثاقِ ربانی پورا ہو کر رہا کہ ۔

انّ الارض یرثھا عبادی الصٰلحون

(تحقیق اس زمین کی وراثت ہمارے انہیں بندوں کے حصے میں آئے گی جو اس کی صلاحیت رکھیں گے)

اے زائر! یہ ایوانِ حکمت یہ نشانِ صلاحیت اس بلدہ فرح نہاد کے قلب میں قائم ہے۔ جسے خود اس ارضِ پاک کے دل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس کی فضا آج بھی ہجویریؒ کی روحانیت، غزنوی کی صلابت، عالمگیر کی سطوت، جہانگیر کی عدالت اور نورجہاں کی ثقافت کے عناصرِ نایاب سے معمور ہے۔ اسی فضا میں شیرِ بنگال کی گرج گونجی، اسی فضا میں قائدِ اعظم کے استقلال نے الفاظ کا جامہ پہنا اور اسی فضا نے ان فرزندانِ توحید کے نعرہ ہائے تکبیر کو جذب و قبول کیا جو اس خطۂ پاک میں نوائے اسلام بلند کرنے کے لیے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے آئے تھے ۔ اور اپنے ساتھ دامنِ ہمالیہ اور ساحلِ مالابار اور وادیٔ گنگ و جمن اور سرزمینِ دکن کی آرزو ہائے بے تاب بھی لائے تھے ۔

اے نسیمِ شمال! کہ فرغانہ و سمرقند کے لالہ زاروں سے آتی ہے جب تو یہاں سے گزرے اور مشرق و جنوب کا رُخ کرے تو ہمارے بوستانوں سے پھولوں کی وہ چند پتیاں لے جائیو جن کا رنگ ہمارے خونِ جگر اور خوشبو ہمارے مشامِ جان سے مستعار ہے اور انہیں ان شہداء کے بے نام و نشان مزاروں پر بکھیر دیجیو جنہوں نے ہماری نجات اور سرخروئی کی خاطر اپنے آپ کو خاک و خون میں ملا کر حیاتِ جاودانی پائی۔ پھر جب تو وہاں سے ذرا آگے بڑھے تو ہمارا سلام اور تشکرِ بے پایاں ہمارے ان سپاہیوں کو پہنچا دیجیو جو ہماری جنگِ آزادی میں ہمارے دوش بدوش اور قدم بہ قدم معرکہ آرا ہوئے اور جن کی شرکت نے ہمارے قدموں کو ثبات بخشا اور جن کی قربانیاں ہماری کامرانی کا باعث بنیں ۔

اے خداوندِ ذوالجلال! اس مملکتِ پاک کو جو تیرے نام کی سربلندی اور تیرے آئین کے نفاذ و استقلال کے لیے قائم کی گئی ہے اپنی برکت عطا فرما اور اپنے دریائے رحمت کی موج ہائے بے شمار سے اسے ہمیشہ ہمیشہ تک شاداب رکھ اور ہمیں توفیق عنایت کر کہ ہم اپنے آپ کو تیری عنایات کا اہل ثابت کر سکیں اور تیرے آخری پیغام کو دنیا کے انتہائی کناروں تک پہنچا دیں ۔

(عطیہ ــــ جناب غلام رسول ازہر)

اور بیتدی یا محض تُک بند کو بھی دعوت تھی کہ کسی استاد کے کفشِ زرفشاں سے فیض جوئی کرتا رہے۔

اب جی کی نظر میں دورِ مخزن کا ادیب محض ادب ساز نہیں تھا، وہ ادیب پرور بھی تھا۔ اس نے ادب کو شہرت اور سرفرازی کا وسیلہ نہیں بنایا، محض ایک سعیٔ خود کشائی سمجھا جو گرد و پیش اظہار کے جوابی شگوفے کھلا سکے۔ اس مجلس آرا اور مستقدی کرشمہ سازی کا مقصد تحصیلِ تحسین نہ تھا بلکہ ہم فکر اور ہم کار حلقے کی وسعت۔ یہی کاوشِ چراغاں صوفیائے کرام کا شعار تھی۔ اسی نیت سے بیبیاں محلے میں سوزن کاری کی نمائش کرتی ہیں اور دوستوں کو شوقیہ باغبانی کے نمونے دکھائے جاتے ہیں۔

تحریکِ مخزن کے صحبتی پہلو کی ایک جھلک مجھے اوراقِ مخزن میں نظر آئی۔ اگست ۱۹۰۱ء اور جون ۱۹۰۳ء کے شماروں کو دیکھا تو میاں شاہ دین ہمایوں کے یہ اشعار ملے۔

؎	ناظر بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے	ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو
اور ؎	اعجازؔ: دیکھو تو سہی یاں کیا سماں ہے آج	نیرنگؔ: آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
	اقبالؔ: تیری سحر بیانی کہاں ہے آج	ناظرؔ: کماں فکر سے مار ایک دو خدنگ

اب جی نے مخزن گروپ کے دوامی عطیات بھی گنوائے۔ پہلا تھا موضوعاتِ سخن میں ندرت اور نئی وسعت۔ شاعرِ مخزن نے اس ناتون کی دل جوئی کا بھی خیال رکھا جسے آئینے میں "پہلا سفید بال" نظر آیا۔ ع جو خام خرد کہلاتی تھی پختہ سر کہلائے گی۔ مخزن سے پہلے نظیرؔ کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو مشاہدے کی ایسی نازک تتلیاں پکڑ سکے۔ دوسرا نمایاں کام یہ تھا کہ نفسِ بیان کے مقابلے میں اندازِ بیان کی اہمیت سے تغافل نہ کیا۔ افسوس کہ ہم دوسری روایت پر کاربند نہ رہ سکے اور تن آسانی کے عادی ہو گئے۔

مخزن کے ادبی پس منظر میں نہایت ثقہ، سنجیدہ اور بامقصد تخلیق کی روایت تھی: سرسیدؔ کی مرکوز اصلاحی کاوشیں، حالیؔ کی پُرسوز خود بینی اور جہاں بینی، شبلیؔ کی عرق ریز صنم تراشی۔ ان اکابر کی تصنیفات محض لطف اندوزی کے لیے پڑھنا آسان نہیں۔ نذیرؔ احمد کی چابک دست روزمرہ نگاری عبارت کا لطف تو دوبالا کر سکتی تھی لیکن مولوی صاحب کا مستقل موضوع تھا معاش کوشی کے مسوّک و مصلّا کی اہمیت۔ بالعکس، مخزن کے قاری کو شادماں خوش وقتی کا سبق دیا جاتا تھا۔ اس سے کہا جاتا تھا کہ رگِ سنگ سے شرر نکالنے کے بجائے ہنستے پھول نکال، خود ان سے کھیل اور دوسروں پر اُچھال۔ اس لحاظ سے مخزن نو عمری میں ادبی ذوق کی تربیت کا بہتر معمول تھا۔ کاش اب جی کے انتخاب کا وسیع تر تعلیمی استعمال کیا جاتا۔

(۳)

مخزن پر یقیناً شیخ عبدالقادر کے مزاج کا پرتو بھی پڑا ہوگا لیکن شیخ تھے کس رنگ کے آدمی؟ اب جی کہتے تھے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیے غالبؔ نے کہا کہ "ہرچہ بینند بہ عنوانِ تماشا بینند"۔ انہوں نے شیخ صاحب کو شیخِ شوخ کا لقب بھی دیا لیکن مجھے ان کے تیکھے پن کا اندازہ بہت دیر سے ہوا جب شیخ صاحب تقریباً اسی برس کے بوڑھے تھے۔ پہلی اور آخری ملاقات کا خاکہ حاضر ہے۔ بیان میں لفظی [illegible] تو ہوگا لیکن معنوی نہیں۔

میں شلجم کے اچار کا دونا ہاتھ میں تھامے گلی کے نکڑ پہ کھڑا تھا۔ اسی گلی میں دادا جان کا قدامت آثار مکان تھا۔ ایک خوش لباس مقطع سفید ریش میری جانب بڑھا۔ جوں ہی میں نے اقبال کیا کہ "صلاح میاں" کا لڑکا ہوں باتوں کی چڑیاں چہکنے لگیں۔ "میں صورت دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ آنکھوں میں وہی وحشت اور آوارگی۔ بابا ابھی گھر نہیں آئے؟ خیر کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے ساتھ کچھ دیر بیٹھوں گا اور گھر کی سیر کروں گا۔ گھبراؤ نہیں، مجھے اچار کا کوئی شوق

نہیں۔ چالیس برس پہلے مَیں یہاں آیا کرتا تھا جب تمہارے تایا ضیاؔ کالج میں پڑھتے تھے۔ اس سے پہلے تمہارے دادا سے سبق پڑھنے اور قمچیاں کھانے آیا کرتا تھا۔ صبیؔ تو نو پولیس کی وردی پہن چور پکڑتے رہتے۔ مَیں وکیل بن کر چوروں کی جیبیں کاٹتا رہا۔ ارے یہ کیا؟ یہ سکھوں کا گُردوارہ کب بن گیا؟ لو تین خدا ایک گلی میں آ بسے۔ ایک ادھر مسجد میں، دوسرا مندر میں براجمان، تیسرا بندر بانٹ کا پردھان۔ تمہارے لیے سُنہری موقع ہے۔ تینوں سے بھلائی کے سبق لو اور بلا جاتا رہے دین بنا لو کسی اکبر بادشاہ کے ہاتھ بیچ دینا۔ بڑا انعام پاؤ گے۔ لو تمہارا مولوی باڑہ بھی آگیا۔ دروازے پر جو چوبی نقش کاری دیکھتے ہو یہ بھیرے کا کام ہے۔ ایسا کام کرنے والے اب سر کھپ گئے۔ تبھی تو دروازے پر یتیمی برستی ہے۔ سیڑھیوں کی جگہ جو یہ ڈھلوان بنی ہے اسے کیا کہتے ہیں؟ تمہاری دادی اسے گئو گھاٹ کہتی تھیں اور دادا گھوڑا گھاٹ۔ انسانی چھینٹے تو دونوں کے مشترک تھے پر حیوانی کیوں الگ الگ تھے؟ ان ہی کے چڑھنے کو یہ ڈھلوان بنائی گئی تھی۔ یہ چھوٹی اینٹ والی دیواریں تو مغلیہ زمانے کی ہیں، بڑی اینٹ ان کمروں میں لگی ہے جو شنشاہ کے لگ بھگ تمہارے دادا نے ڈلوائے تھے۔ بھلا بڑی اینٹ بنانے میں انگریز کی کیا حکمت تھی؟ ہندوستان کو جتانے کے لیے کہ میری اینٹ تمہارے پتھر سے بڑی ہے۔ خبردار جو میری گوراگی وکٹوریا کر تا کا۔ تمہارا پُختہ صحن مجھے اچھا نہیں لگا۔ بھئی یہاں تو اکھاڑا تھا جس میں غلام بھیک (نیرنگ)، ضیاؔ، جوگندر، اقبالؔ، اور ان کے یار کُشتی لڑا کرتے تھے۔ اقبالؔ کی توندی کو مَیں نے کئی بار چت ہوتے دیکھا۔ سامنے والی بیٹھک میں لڑکے پڑھتے تھے۔ امتحان کے دنوں میں یہیں چٹائی پر سو بھی جاتے تھے۔ اپنے فرشی حقّے کے لیے اقبالؔ سوتوں کی جیب سے رومال نکال چلم سُلگاتا تھا۔ واہ فرشی حقّے کی کیا بات ہے۔ اسی لیے تو "نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی" اور حقّے کا ایک جُز ساز ہے اور دوسرا سوز۔ بھلا جو حُقّہ نہ پیے وہ شاعری کیسے کر سکتا ہے؟"

عظمتوں کی توڑ پھوڑ دم بھر کے لیے رُکی تو مَیں نے سوچا کہ میرے باپ اور اس کے ممدوح میں کتنا بُعد ہے؟ کیا یہ فرقِ طبائع کا ہے یا رنگِ زمانہ کا؟ کیا زمانہ کی زندہ دلی بہار کی طرح پلٹتی ہے؟ یا غبار کی طرح رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے؟

(۴)

یارانِ مخزن کے جو نام میاں شاہ دین ہمایوںؔ کے مذکورہ اشعار میں آئے ہیں اُن میں ایک نام خوشی محمد ناظرؔ کا ہے۔ خورد سالی میں مجھے ان شُستہ شائستہ سپید سری کا دیدار نصیب ہوا۔ اُنہوں نے پُوچھا کہ تم باپ کے ساتھ کشمیر گئے تھے تو وہاں کیا دیکھا؟ دیوارِ نسیاں میں قیامِ کشمیر کا بس ایک روزن روشن تھا۔ درخت سے چمکیلا دھاری دار سانپ گرا اور میرے پاؤں میں بل کھانے لگا۔ مَیں نے جواب دیا "سانپ"۔ ناظرؔ صاحب نے فرمایا "تم جنت کے شیطانی سانپ سے تو مل آئے، میرے ہاں بھُوت نہ آئے۔ مَیں جنت کا داروغہ ہوں، "رضوانِ کشمیر"۔ مجھ سے اپنی مشہور نظم "جوگی" سُنی اور انعام میں کشمیری سیب عطا کیے۔

پنجاب پروردہ شعر و انشا میں کشمیر کا ایک خاص مقام تھا اور بوئے کشمیر کرشن چندر اور منٹوؔ کے افسانوں تک خیمہ زن رہی۔ آزادؔ نے دریالودور پر انگریزی نظم کے مقابلے میں "آبِ گنگ" لکھی اور الفاظ میں پتھروں پر پانی گرنے کا ساز سُنا دیا۔ اقبالؔ نے کشمیر کی "دخترکِ برہمنے، لالہ رُخے سمن برے" کی یاد دلائی اور حکم دیا کہ خیز و بہ کاشمر برو۔ ناظرؔ صاحب تو کشمیری گو ساکنِ کشمیر تھے مناظرِ کشمیر کو کیسے نظر انداز کرتے۔ بھُوت پر ایک نظم لکھ کر ابّ جی کو بھجوائی جو "ادبی دنیا" میں چھپی اور غالباً ان کی آخری کاوش تھی۔ نظم ہر لحاظ سے منظّم تھی لیکن شاید چُہل کے طور پر تُک بندی کا ایک شگوفہ بھی چھوڑ دیا۔ ؎

چلتی ہے روز بادِ بہاری بھُوت میں   کھائے انار دانہ کُمہاری بھُوت میں

میری حرف گیری ابّ جی کو ناگوار گزری۔ فرمایا کہ بڑوں کے خُردے کو تبرّک جانو اور ان کے سہو کو سند!

(۵)

اب جی کے مسرت ترین ایام وہ دس سال تھے جو انہوں نے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک ایک ایسی آبادی میں گزارے جسے دیکھ کر فانی نے کہا ہوگا۔ یہ بستی بسا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے۔

ایک مہم جو انجمن نے ارادہ کیا کہ گوروں کی شکارگاہ کا نام ماڈل ٹاؤن رکھ کر باغبانی خارستان کا تجربہ کیا جائے۔ نخلِ نہالی کے ایک مالی اب جی تھے۔ بے سروسامانی کا عالم۔ ہرنوں اور انسانوں کی جائے آب خوری مشترک۔ راہزن ایسے حریص کہ اب جی کئی بار رخت و رکب یعنی سوٹ اور سائیکل سے سبک بار ہوئے۔

اسلو ایک کھلونا جو محض صوری اور صوتی اعتبار سے پستول تھا۔ معالج ڈاکٹر غلام جیلانی کی کتاب "مخزن حکمت" مدرّس مادرِ مہربان جن کے طفیل یہ خط غلط، معنی غلط، انشا غلط، املا غلط — والدہ کی خردمندی مُصر تھی کہ لاہور لوٹ جائیں لیکن اب جی کا یہ حال کہ بہ کنم زنجیرِ پائے خویشتن دامانِ صحرا را۔ زنجیرِ تو رفیقانِ تعمیر سے رشتہ وفا تھا۔ کبھی بجلی گھر کے مسائل حل کرتے، کبھی عمالِ آب پاشی کی نگہداشت، کبھی بس سروس کی تنظیم۔ جب بنیادی وسائل بود و باش مہیا ہو گئے تو عزیزوں میں سے خسر، بڑے بھائی اور بیوہ بھاوج کو کھینچ لائے اور دوستوں میں منصور احمد (مدیر ادبی دنیا) اور حامد علی خان (معاون مدیر ہمایوں) کو۔ حفیظ جالندھری اور پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کے دیوان خانے مجالس شعر و ادب کے مراکز قرار پائے۔ پنڈت جی صرف و نحو کے دقیقہ بیں اور عقدہ کشائے عالم تھے۔ کبھی کلمہ "سنہ" کی لسانی تاریخ بیان فرمائی اور کبھی اشارات تجنیس کے تضادات کو واضح کیا۔ پنڈت جی کا پوتا رام موہن میرا ہم سبق دادا کے کتب خانے سے جان صاحب اور جرکین کا کلام چرا کر اسکول میں مشتہر کرتا تھا۔ یہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔

بسا اوقات اب جی ماڈل ٹاؤن سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ مکان کے مکینوں کی وفاداری کے لیے لازم ہے کہ خشت پر انگلیوں کے نشان موجود ہوں اور گل میں جبینوں کا عرق۔ یہ اصول ملک پر بھی اتنا ہی حاوی ہے جتنا شہر اور رہائشی قصبہ پر۔

(۶)

"ادبی دنیا" منصور احمد مرحوم کی معاش، مصروفیت اور خوشنودی کے لیے خریدا گیا تھا۔ اب جی کا مختصر اشتہاری کاروبار اخراجات کا کفیل تھا منصور احمد کم و بیش تین برس "ادبی دنیا" کے دامِ کم دانہ میں اسیر رہ کر خالق سے جا ملے۔ مدیرانہ فرائض اب جی نے سنبھال لیے۔

منصور احمد کے ایامِ ادارت میں "ادبی دنیا" کے بیشتر صفحات تحقیقی اور معلوماتی مضامین کے لیے وقف تھے اور افسانوی ادب تراجم تک محدود۔ نو مشقوں کی پیش کش منصور صاحب کے اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترتی تھی اور شہرت یافتہ افسانہ نویس کا معاوضہ ادا کرنے کے وسائل نہ تھے۔ منشی پریم چند کے افسانے کا ہدیہ ۱۹۳۵ء میں ایک تولہ سونے کی اشرفی دیا گیا۔

افسانوی اور شعری ادب میں جدید اسالیب کا اجرا اب جی کا سرمایۂ افتخار تھا۔ افسانہ کے معماروں کی ایک خاصی طویل قطار ہے جسے اب جی کے عہدِ ادارت میں روشناسی یا وسیع تر شہرت حاصل ہوئی۔ محمد علی ردولوی، محمد حسن عسکری (جو نقاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے) ابنِ سعید (حسن عسکری) عصمت چغتائی ممتاز مفتی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، رام لعل، علی عباس حسینی، دیوندر ستیارتھی، فیاض محمود، اشفاق احمد، ڈاکٹر صلاح الدین اکبر اور دیگر اصحاب۔ بعض کے اوّلین افسانوی مجموعوں کے تعارف اب جی نے لکھے منٹو اور قرۃ العین "ادبی دنیا" کے معاون نہیں تھے لیکن ان کی فن کارانہ صلاحیت ان تبصروں میں نمایاں کی گئی جو "ادبی دنیا" میں ہر ماہ شائع ہوتے تھے۔ شاعری میں اب جی کا ذوق نسبتاً روایتی تھا گو میرا جی نے تجرباتی نظم کی بساط پر ن۔ م۔ راشد، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مقبول حسین احمد پوری، سلام مچھلی شہری، تصدق حسین خالد، عظیم قریشی،

اور مہدی علی خان جیسی شخصیتوں کو مدعو کیا۔ فراق گورکھپوری بھی روشِ نو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور چند ایسی غزلیں "ادبی دنیا" کے لیے لکھ گئے جن کا مزاج فارسی تھا لیکن زبان فارسی یا عربی الفاظ سے معرّا۔ میراجی نے جب قدیم اور غیر ملکی شعری تخلیقات کے منظوم ترجمے اور جائزے شائع کیے تو جدت آفرینی نے نیا تنوّع پایا۔ میراجی کی جانشینی وزیر آغا کو "ادبی دنیا" کے دورِ آخر میں ملی۔ "ادبی دنیا" کی میانہ روی اور وضعِ احتیاط تند نویسی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن شریر بار تلمیح نوائی کی ایک مثال مجھے یاد ہے۔ شعرِ شبلی کو تازگی عطا کرنے والی عطیہ فیضی نے علامہ کی یک طرفہ نوازشات کی پردہ کشائی اس انداز سے کر دی کہ "ہو گئے ہم رو مہ تماشائی۔"

(۷)

کسی نے کہا کہ اردو کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ یہ تاثیر کی زبان ہے، تفہیم کی نہیں۔ بہلانے پھسلانے، اکسانے، رُلانے کے لیے بنائی گئی ہے ہمیں چاہیے کہ وہی کام اردو سے لیں کہ جس میں دروغ گوئی کی کچھ آمیزش ہو، جیسے خوشامد، خطابت، صحافت، وکالت، یہ سُن کر اب جی سرسید کا رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند نکال لائے۔ کہا کہ حق گوئی کی نپی تلی اور کھری کھری اردو یہاں پاؤ گے۔ آثار الصنادید کے اسی مصنف نے یادِ رفتگاں تازہ کرنے کے لیے موروثی ملمّع سازی کے کمال بھی دکھائے لیکن بادۂ حق کی سرجوشی نے ملمّع پگھلا دیا۔

اب جی سرسید کے معتقد بھی تھے اور مقلّد بھی۔ اعتقاد ان کے مضمون "سرسید پر ایک نظر" سے ظاہر ہے جو "حیاتِ جاوید" کی طباعتِ نو کی مینت بنا۔ تقلید کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے اردو پروری کے کام کو ریاستی اعانت کے بغیر جاری رکھا، بلکہ مضر سمجھ کر پیش کش سے استفادہ نہ کیا۔

سرسید کو وہ ایسا سپہ سالار کہتے تھے کہ جس کے ایک ہاتھ میں برہنہ تیغِ عمل ہو اور دوسرے میں ایسی دُور بین جو ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کر سکے۔ دُور بین گیر ہاتھ تو شاہ ولی اللہ اور ان کے والد شاہ عبدالرحیم کے بھی تھے جنہوں نے جان لیا کہ مسندِ تیموری پر ایک زرہ پوش اور بکتر بند نعش محکّم ہے۔ مجدّدِ سرہند نے تو گورو ارجن کو اس وقت "ملعون گورو ندوال" کہہ دیا جب اُفقِ زمانہ پر سکھوں کی اسلام دشمنی کی گرد بھی نہ اُٹھی تھی۔ پر یہ بزرگ محض اربابِ بینش و دانش تھے۔ اصحابِ دست و بازو میں نامور ی محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد نے پائی جن کی ہنگامہ زا تحریر اور ہجوم خیز خطابت نے ہواؤں کے رُخ بدل دیئے پر انہیں نہ جہتِ منزل کی خبر تھی اور نہ نشیب و فرازِ راہ گزر کا اندازہ۔ سرسید وہ ذاتِ واحد تھے جسے خضر کے قالب میں سکندر کہا جا سکتا ہے اور سکندر کے قالب میں خضر۔ اس تلمیح کے بعد اب جی نے اکبر کا مصرع پڑھا۔ ؎ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے۔" پھر کہا کہ سید کام اس لیے کر گیا کہ اس نے وقت کا زیاں نہ جھوٹ سے اُلجھنے میں کیا اور نہ سچ کو سچ منوانے میں۔ دونوں مشغلے افزائشِ انا کے حیلے ہیں۔

سرسید احمد خاں کے "نیچری" رجحانات کا بھی ذکر آیا۔ فرمایا کہ سید کی منطق ایک سادہ دُہرے کار عبارت میں واضح کی گئی ہے (زاہد و فلاسفر کی کہانی)۔ ایک طرف ہے متلوّن اور بے قانون بادشاہ، لگا ہے بہ سلامے می رنجد و گاہے بہ دشنامے خلعت می بخشد۔ اس کے مقابلے میں ہے وہ بادشاہ جو سوچ سمجھ کر قانون بناتا ہے اور کوئی ایسا حکم نازل نہیں کرتا جو معروف قانون سے ماورا یا مخالف ہو۔ الٰہیات میں سرسید نے دوسرے بادشاہ کو پہلے پر ترجیح دی۔ یہی مسلک معتزلہ کا تھا جن کو کسی نے کافر نہیں قرار دیا۔ اسی ترجیح کی بنا پر سرسید نے بالا دستیِ قانون کا نعرہ سیاست میں بھی لگایا اور صحافت پر غیر قانونی بندشوں کو ہدف بنایا۔ ؎ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔

(۸)

۱۹۳۶ء کی ایک دوپہر مجھے یاد ہے جب اب جی کے نام ڈاکیہ ایک پوسٹ کارڈ لایا۔ عبارت انگریزی تھی اور لکھنے والے کے دستخط تھے،

ہائیکو میں فکری وحدت کا مسئلہ

ڈاکٹر پرویز پروازی

[illegible] ہاں ہائیکو کے جو تجربات ہو رہے ہیں ان میں اور جاپان کے ہائیکو میں بظاہر کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ ہمارے ہاں جو صورت پیدا ہو رہی ہے اس کے مطابق تین مصرعوں کی ہر نظم پر ہائیکو کا عنوان چسپاں کیا جا رہا ہے۔ آخر ثلاثی کے عنوان میں کیا خرابی ہے؟

اس سلسلے میں پہلا جواز تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہائیکو ایک نیا نام ہے۔ اور ہر نئی صنفِ سخن، نئے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دوسرا جواز یہ نظر آتا ہے کہ ہمارے ہاں تین مصرعوں میں مکمل بات کہنے کی روایت موجود ہے۔ ثلاثی ہو یا پنجابی ماہیا۔ دونوں اصناف بنیادی طور پر تین مصرعی ہیں اس لیے بھی ہائیکو کی ظاہری ہیئت کی مماثلت نئے لکھنے والوں کو جاذب نظر آئی ہے۔ مسئلہ صرف فکری وحدت کا ہے، کیونکہ جاپان کے ہائیکو میں بظاہر اس ربط کا فقدان ہے جو ہمارے ہاں تین مصرعی نظم یا ثلاثی یا ماہیے میں موجود ہے۔ اس لیے فکری وحدت کے وجود یا عدم وجود کے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے جاپانی تہذیب، جاپانی شاعری اور خاص طور سے جاپانی ہائیکو کی تاریخ میں دُور تک جھانکنا پڑے گا! 'ہائیکو' بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے اس کی ایمائیت اس سے کہیں زیادہ ہے ــــ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ!

ہائیکو کے قدیم اساتذہ باشو، بسون، اِسّا، کی کاکو، کیتو، موکودو، اونیتسورا، اُوشے نارو، سائیو، سیھو، سب کے سب ہائیکو کی اس ہیئت پر متفق رہے ہیں کہ ہائیکو ۵۔۷۔۵ صوتی ارکان پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اور ان [illegible] ارکان کے علاوہ ہائیکو میں موسم کی تخصیص بھی ہونی چاہیے۔

مَیں مثال کے طور پر ان اساتذہ کے ہائیکو درج کرتا ہوں:

[illegible] گا۔ کا ئی
[illegible]
یا ما بی ۔ کا نا

کا نے ۔ کی اے تے
ہا نا نو کا ورا شُو کو
یو نو بے کا نا

اُونچے کے شگوفے
اتنا بڑا سا سورج
[illegible]
(باشو)

سمندر کی گھنٹیاں خاموش
مگر پھولوں کی مہک کشادہ
شام
(باشو)

ایم۔ کے گاندھی کو لکھا تھا کہ آپ نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں آزاد ہندوستان میں بقائے اُردو کی نسبت اپنا مؤقف بیان کروں جس کی آپ اشاعت کریں گے۔ واضح ہو کہ اُردو کا مستقبل مسلمانوں کے فرقے کا نجی معاملہ ہے اور اگر وہ اس زبان میں لکھنا پڑھنا چاہیں تو ان پر کوئی پابندی مناسب نہ ہوگی۔ البتہ قومی سطح پر فوقیت ہندی یا ہندوستانی کو حاصل ہوگی جو دیوناگری حروف میں لکھی جانے والی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ کسی اخبار میں یہ خط اے بی کے تبصرے کے ساتھ شائع ہوا۔ تبصرہ نگار کا استدلال تھا کہ اگر گاندھی جی کے مؤقف کو تسلیم کیا گیا تو نقصان مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا ہوگا۔ مسلمان تو تاریخِ ہند کے اس ہزار سالہ عہد کو فراموش نہیں کریں گے جس نے وہم و تعصب کے جالے صاف کیے، فکری اُفق کو وسعت بخشی اور علوم و فنون کو تازگی و تنوع سے شناسا کیا۔ البتہ اُردو کے مٹ جانے سے ہندو حافظے کی سلیٹ صاف ہو جائے گی۔ وہ زقند لگا کر تہذیب کے ایسے مظلم تہہ خانوں میں جا بسیں گے جہاں کسی شعاعِ نور کا گزر نہ ہو۔

پچیس برس بعد ایک زمانہ آیا کہ اے بی کے اپنے صوبے میں اُردو کو جلا وطن کرنے کے منصوبے بننے لگے۔ اب بھی اُردو کے دفاع میں کھڑے ہوتے تو ان کی آبرو و عافیت خطرے میں پڑ گئی۔ میں نے جاننا چاہا کہ کیا اُردو سے اے بی کی وابستگی محض جذباتی ہے یا فکری اور پائیدار۔

اے بی نے واضح کیا، اُردو کی حمایت کی اصل غرض و غایت کو نہیں سمجھا جاتا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم نے اُردو کو قومی زبان تسلیم کر لیا ہے اس لیے اُردو کو دوسری زبان پر فوقیت و فضیلت حاصل ہو گئی۔ اگر ہم بنگالی کو قومی زبان قرار دے دیتے تب بھی میں اُردو کی بقا اور ترقی کے لیے لڑتا۔ اور اگر پاکستان میں فارسی کو وہی مرتبہ حاصل ہوتا جو اسے ۱۸۳۴ء سے پہلے تھا تو مجھے اُردو کا مستقبل پریشان نہ کرتا۔ آج اُردو کا مسئلہ اس لیے اہم ہے کہ ہم ماضی کی آب رسانی کے محتاج ہیں، روایات کا ریختہ وآمیختہ ہیں، اپنا تشخص تاریخ کے آئینہ میں تلاش کرتے ہیں۔ افریقی مستعار زبانوں میں بھی بخوبی اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ انہیں ابھی لسانی خزائن کی قومی ذخیرہ اندوزی کرنی ہے۔ ہمیں یہ خطرہ درپیش ہے کہ اگر زبان لُٹ گئی تو تاریخ بھی مٹ جائے گی۔ اس لیے مجھے اُردو کے زوال میں خود شناسی کا بحران نظر آتا ہے۔ یہی بحران ۱۸۳۴ء کے بعد آیا تھا جب اُردو، ہندی اور انگریزی کی جگہ بنانے کے لیے فارسی کو دھکیلا گیا تھا۔ آج اُردو ہی فارسی اور عربی کے ان دفینوں تک رسائی کا قریب ترین راستہ ہے جو ہماری تہذیبی میراث ہیں اور ہمارے منزلِ نشان ہیں۔ یہ توسط بھی ٹوٹ گیا تو ہم ماضی باختہ ہو کر حال مست ہو جائیں گے۔ ہم سے خوب و زشت کے آزمودہ اور مقبول میزان چھن جائیں گے جب پس منظر میں رفتگاں کی قد آدم تصاویر نہ نظر آئیں گی تو ہر بونا کہے گا کہ میں جالوت ہوں۔ وہ فراست مفقود ہو جائے گی جو کارواں کو سراب اور دلدل سے خبردار رکھتی ہے۔ سر سیّد تو ایک صدی پہلے کہہ گئے تھے اُردو کُشی مسلمانوں کو عقل و روح کی توانائی سے محروم کرنے کا وسیلہ ہے اور اب ہم خود اپنی آشیاں سوزی پر آمادہ ہیں، میں کیوں نہ احتجاج کروں؟ یہ آشیاں میرا بھی ہے۔

میں اے بی کو یہ مشورہ نہ دے سکا کہ وہ مخالفت کے پیشِ نظر اپنے مؤقف کو معتدل کر لیں۔

(۹)

ادب، صحافت اور سیاست کے زندہ اور کافذی معجون ہماری تاریخ کی غذا رہے ہیں۔ یہ معزز روایت سر سیّد کے تہذیب الاخلاق سے شروع ہو کر مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد و کامریڈ، ابوالکلام آزاد کے البلاغ، ظفر علی خاں کے زمیندار سے گزرتی ہوئی شورش کاشمیری کے چٹان تک جا پہنچتی ہے۔ معجون کا ایک عنصر کبھی دوسرے اجزائے ترکیبی پر غالب آ جاتا تھا لیکن توازن کی مثالیں بھی نایاب نہیں۔ مثلاً مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ وہ سیاسی شخصیت تھے یا ادبی یا صحافتی۔

اے بی نے جوانی کی پہلی منزل میں تینوں مناظر کی مختصر سی سیر کر لی۔ ادبی، سیاسی اور صحافتی۔

دورانِ تعلیم منصور احمد مرحوم کی شراکت سے ماہنامہ "خیالستان" کا اجرا کیا۔ اب یہ دستیاب نہیں لیکن میں نے بچپن میں ایک شمارہ دیکھا تھا جس میں مجھے ایک گنجے آدمی کی تصویر نظر آئی۔ شبیہہ کے نیچے جلی انگریزی حروف میں تحریر تھا ماسٹر عبدالرحمٰن۔ میں نے پوچھا کہ یہ گنجا کیا آپ کا ماسٹر تھا۔ کہا کہ ایک طرح کا ماسٹر ہی تھا۔ اس کا نام ہے شیکسپیئر۔ نیچے لکھا ہوا نام مصور کا ہے۔ اب یہ چغتائی کے نام سے مشہور ہے اور دوسری طرح کی تصویریں بناتا ہے۔ شاید چھ سات شمارے شائع ہوئے اور آئندہ پندرہ سولہ برس اب جی نے کسی ادبی کام کو ہاتھ نہ لگایا۔ اگر منصور ادبی دنیا کی خریداری کا منصوبہ نہ بناتے اور دورانِ ادارت فوت نہ ہو جاتے تو اب جی کی شخصیت کا ادبی جوہر منظرِ عام پر نہ آتا۔

بی۔ اے کی سند لیے بغیر کالج چھوڑ دیا اور قومی سیاست کے کارزار میں قدم رکھا۔ سیاست سے زُود بیزاری خاندان کے لیے باعثِ حیرت و مسرت تھی۔ والدہ نے بتایا۔ "میں تو ڈرتی تھی کہ عمر بھر چلہ کشی کریں گے پر سال بھر میں ٹھیک ٹھاک ہو گئے"۔ چرخہ کاتنا والدہ کی نظر میں طریقتِ گاندھی کا چلہ تھا۔

عمر بھر سیاست سے کنارہ کش رہنے کے بعد وفات سے کچھ عرصہ پہلے رگِ سیاست پھڑکی جو غالباً عسکری صدرِ مملکت سے ناطلب روبروئی کا اضطراری اثر تھا۔ مارشل لا کے عین شباب میں عسکری انانیت پر ضرب کو بہت شہرت ملی۔ کسی نے کہا کہ یہ تو ایوبی دَور کا صلاح الدین ہے۔ ایوب خان کی بوکھلاہٹ کو دیکھ کر انجمن حمایتِ اسلام نے حملے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا جو تُند تر تھا۔

اگر زندہ رہتے تو کیا مارشل لا دوم و سوم سے بھی نبرد آزما ہوتے؟ یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن میرے برادرِ نسبتی ملک غلام جیلانی اثر پذیر ہوئے۔ ملک صاحب اتنی بار جیل گئے کہ گھر میں ان کا نام جیلانی سے بگڑ کر "جیل آنی" پڑ گیا۔

اب جی کا صحافتی تجربہ مختصر اور مایوس کن ثابت ہوا۔ "ریاست" کے مدیر دیوان سنگھ مفتون تو اب جی کی قابلیت پر مفتون تھے لیکن وہ اخبار کے اخلاقی معیار کو صحافتی معیار کے برابر اُونچا رکھنے سے قاصر رہے۔

ادب اور سیاست کا ربطِ باہم زیرِ بحث آیا۔ اب جی نے کہا کہ ادیب کے لیے سیاست سے دُوری بھی مشکل ہے اور قربت بھی۔ اس کی باطنی دروں آشنائی اسے ماحول کا درد شناس بناتی ہے۔ وہ ناانصافی اور پامالیٔ اقدار کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور قرینۂ اظہار آواز کو موثر بنا دیتا ہے۔ لیکن جب شعلہ بدست ہجوم ایک بے چہرہ عفریت کی صورت ادیب کے سامنے آتا ہے تب ادیب کو ہجوم کی بے قابو، بے ثمر اور بسا اوقات جہاں سوز توانائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گوشۂ عزلت کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اس طرح ادیب کی زندگی فرار و پیکار کے تذبذب میں گزرتی ہے۔ میں نے ہجوم کا عفریت تو نوجوانی میں دیکھ لیا اور محمد علی جناحؒ نے محمد علی جوہر کو ہجوم کی سرشتِ تخریب سے آگاہ بھی کر دیا تھا (ناگپور ۱۹۱۸ء) گو وہ خود بعد میں ہجوم سے مفاہمت پر مجبور ہو گئے۔

میں نے اب جی کو ایک مغربی فلسفی کا قول سُنایا "ہجوم باطل ہے" کہا اس صداقت کی گواہ تاریخ ہے۔ رضیہ سلطانہ کو جامع مسجد دلّی کے نمازی ہجوم نے دینی اور عسکری مخالفت کے باوجود تخت پر بٹھا دیا۔ پھر جب سلطانہ پہ بُرا وقت آیا تو ہجوم غائب۔ ہجوم کی آقائی بھی محض خود فریبی ہے۔ چہرۂ موج کا آبلہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں موج سوار ہوں۔ سیاست سے کنارہ کشی میری ہجوم گریزی ہے۔ پر جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے دلدلیتی ٹاٹ پر بیٹھے نعرہ لگا دیا کہ اللہ سے ڈرو۔

میرا خیال ہے کہ غلام جیلانی نے آخری بات سُن لی تھی۔ اس نے اسلام آباد میں مارشل لا سوم کے خلاف "شاندار" جلوس نکالا جس میں فردِ واحد ہاتھ میں نعرہ بردار تختہ اُٹھائے چل رہا تھا۔

(۱۰)

ایک بار میں ماتمی جلسے میں شریک ہوا۔ ماتم تھا سردار بھگت سنگھ کا جس نے سیاسی قتل کے الزام میں پھانسی پائی اور شہید مشہور ہوا۔ اس جلسے میں شہادت کی عظمت پر نظمیں پڑھی گئیں اور آخر میں ہزار ڈیڑھ ہزار مرد اور عورتیں گا رہے تھے۔ ؎ دیکھیے اب زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔ لڑکپن کا یہ تاثر میرے دل میں بھگت سنگھ اور اس جیسے تمام انقلاب پسند شہیدوں کی عزت بٹھا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں بھگت پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ دیکھ کر بولے کہ اگر تمہاری نظر میں بھگت واجب التعظیم شہید تھا تو ان سب سکھوں کی عزت کیوں نہیں کرتے جو ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے قتل کی کوشش یا سزا میں قتل ہوئے تھے۔ وہ بھی تو بزعمِ خود اپنی قومی شمع کے پروانے تھے، خالصہ نامو سکے جاں نثار۔

معلوم ہوا کہ اب جی قاتل کی شہادت کو غیر منطقی سمجھتے ہیں، چاہے قتل کا محرک کچھ بھی ہو۔ کہا کہ جب ایک آدمی دوسرے کو انسانی یا قومی یا خاندانی غیرت کے نام پر مار دیتا ہے تو وہ دنیا کے کسی آدمی کو اپنا بھائی نہیں کہہ سکتا۔ اس کا پوری انسانیت سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قابیل تو اپنی تنہائی کے زخم چھپائے صحرا میں بھاگ گیا تھا۔ جو ہاتھ غیر پر اُٹھ کر انسانیت سے کٹ جائے وہ کسی اپنے پر بھی اُٹھ سکتا ہے اور بار بار اُٹھتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادوں پر اب جی کا خاندان چار پانچ مرتبہ معدوم ہو چلا تھا۔ انہیں یہ بات کہنے کا حق بھی تھا۔

(۱۱)

شفقِ شام کے پھیلتے سایوں میں بیٹھا ہوا آدمی شفقِ صبح سے نکلے ہوئے پورے دن کو نظروں میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ آخری ایام میں اپنے مکان کے سبزہ صحن میں بیٹھے اب جی بھی یہی کام کرتے تھے۔ میں گزرا تو بلا کر پوچھا۔ وجود کے معنی جانتے ہو، کبھی اس لفظ پر غور کیا ہے؟ اس کے لغوی معنی ہیں پایا جانا۔ وجد بصورتِ فعل ہے کچھ پانا۔ اس اصل سے نکلنے والی فروع کو دیکھو۔ وجدان، ایجاد، وَجد، واجد، یعنی جو پائے یا جو پایا جائے۔

یہ سب نفس کی بیروں خرامی کے انداز ہیں، حصارِ ذات سے نکلنے کے راستے۔ یہی سوچ کر غالب نے کہا تھا: ؎

خاکِ وجودِ ماست بخونِ جگر خمیر رنگینیٔ قماشِ غبارِ خودیم ما

میں خوش ہوں کہ جو کچھ میں نے پایا خونِ جگر بہا کر پایا کسی کا دست نگر نہ ہوا۔ جنہیں چاہا انہیں بھی اپنی ذات کے نہاں خانے سے نکالا۔ ؎ خاکِ کوئے یار می جوئیم طلب گارِ خودیم ـــ اللہ کا شکر ہے دست گیری کی نوبت نہ آئی۔ تنکے کے لیے بھی سماجت نہ کرنی پڑی۔

اس گفتگو کے چند روز بعد جب فوت ہوئے تو ہاتھ میں ایک مقالہ تھا جو کسی مجلس میں پڑھنے جا رہے تھے۔ رستہ چلتے اپنے ہی قدموں میں گرے اور جان دے دی۔

؎ چوں شمع بود منزلِ ما زیرِ پائے ما از پا نشستہ ایم بہ منزل رسیدہ ایم

(غنی کشمیری)

اب مجھ سے لوگ کہتے ہیں کہ اپنے اب جی کی باتیں سناؤ۔ میں کیا کہوں؟ میں تو کوزہ ہوں، کوزہ گر کا نقشِ گنگ۔ زیادہ کہوں تو سلف نما خود فروش کہلاؤں ـــ لیکن جس کی طبع روشن میرے لیے چراغِ خانہ بنی اس نے اور شمعیں بھی جلائیں۔ اب جی کے فرزندانِ معنوی میں وزیر آغا اور ان کے رفقا بفضلِ خدا حیات ہیں جو اب جی کے ترکے میں سے زکوٰۃ نکال رہے ہیں۔ ان کے کام میں برکت ہو۔

انور سدید

مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی صحافت

مولانا صلاح الدین احمد کا ذکر آئے تو ذہن سب سے پہلے رسالہ "ادبی دُنیا" کی طرف جاتا ہے۔ بلاشبہ "ادبی دنیا" مولانا صلاح الدین کے ادبی نظریات کا نقیب تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ اس رسالے کو فروغِ ادب کے ایک موثر وسیلے کی حیثیت حاصل تھی۔ "ادبی دُنیا" کا ذکر آئے تو ذہن کے اُفق پر رسائل کی وہ تابندہ کہکشاں پھیل جاتی ہے جس کی جگمگاہٹ میں ساقی، نیرنگِ خیال، عالمگیر، شاہکار ـــــ ادبِ لطیف، ہمایوں، زمانہ اور معارف جیسے ممتاز ادبی پرچے شامل تھے۔ یہ وہ دَور تھا جب ادیب کے بجائے تخلیق کو اہمیت دی جاتی تھی اور مدیر اپنے شناخوانوں کا حلقہ بنانے کے بجائے لکھنے والوں کے دلوں میں شعلۂ تخلیق فروزاں رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس زمانے میں ادبی دُنیا میں سیاست نے قہر بپا نہیں کیا تھا۔ ادب تخلیق کرنا زندگی کی بامعنی سرگرمی اور ادیب کا وظیفۂ حیات اور وسیلۂ تسکین تھا۔ یہ رویّہ جہاں بھی نظر آتا ادبی رسالے کا مدیر بلا تمیزِ مذہب و ملت اسے پروان چڑھاتا اور ادب کا نوطلوع ستارہ کچھ عرصے کے بعد ادبی اُفق پر قطبی ستارہ بن کر سمت نمائی کرنے لگتا۔

مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ "ادبی دُنیا" کا شمار بھی چند ایسے ہی رسائل میں ہوتا تھا جن کا اساسی مقصد اُردو زبان و ادب کا فروغ، نئے رجحانات کی ترویج و اشاعت، مختلف اصنافِ ادب میں فکر و نظر کی جوئے تازہ کا تعارف، روایت کی اہمیت کا اعتراف اور اس کی صحت مند توسیع تھا۔ مولانا ادبی رسالہ کو محض مضامینِ نظم و نثر کا مجموعہ تصوّر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے نزدیک ادبی رسالہ قوم کی فکری، نظری، معاشرتی، تہذیبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا آئینہ تھا اور وہ اس سے پورے معاشرے کے عمل اور ردِ عمل کو منعکس کرنے کا کام لیتے تھے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے جس دَور میں جنم لیا وہ قومی تحریکوں کے فروغ کا دَور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد انگریز برِصغیر پر اپنا تسلط مستحکم کر چکے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے متحدہ قومیت کا تصوّر ابھار کر ہندوستان کی مختلف قوموں کے خوابِ آزادی کی تعبیر عمل میں لانے کے لیے اتحاد کی تحریک بپا کر رکھی تھی۔ سر سیّد احمد خان اگرچہ دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے لیکن ان کی تحریک عمل اور ردّ عمل کی زد پر تھی اور اس کے اثرات بعض لوگوں کے نزدیک شیریں نہیں تھے۔ لاہور سے رسالہ "مخزن" جاری ہو چکا تھا اور علامہ اقبال کی نظموں کی گونج پورے برِصغیر میں سنائی دے رہی تھی۔ مسلم لیگ اگرچہ معرضِ وجود میں آ چکی تھی لیکن اس

کی آواز ابھی خواص تک محدود تھی۔ اس دور میں مسلمانوں میں شیخ عبدالقادر، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، آغا حشر کاشمیری، حسرت موہانی اور ظفر علی خان جیسے ادبا پیدا ہوئے جنہوں نے نشاۃ ثانیہ کو قریب تر لانے کے لیے مشعل برداروں کا فریضہ سرانجام دیا اور وطن عزیز سے تاریکی، جہالت اور مفلسی کو دور کرنے اور جدیت پسندی آزادی فکر و عمل اور اسلامی اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ ادبا محض تخلیق کار ہی نہیں تھے بلکہ صاحب نظر اور صاحب کردار بھی تھے۔ انہوں نے دردمند قوم کا فریضہ سرانجام دیا اور مصلح قوم کے طور پر بھی انہیں تسلیم کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر نے قوم کی حقیقی راہنمائی کے لیے صحافت کے خارزار میں بھی قدم رکھا اور پھر فکری، تنقیدی اور تخلیقی مضامین سے قوم کی ذہنی آبیاری کی سعی کی۔ مولانا صلاح الدین احمد ادیبوں کے اسی قافلے کے ایک سرکردہ رکن تھے اور وہ بھی صحافت کو اصلاح قوم میں ایک اہم وسیلہ تصور کرتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں مارشل لا لگا اور جلیانوالہ باغ میں انسانیت کی تذلیل کھلے بندوں کی گئی تو مولانا کے دل میں بغاوت کا پہلا شعلہ بیدار ہوا۔ انہوں نے نہ صرف لاہور کے فوجی حاکم کرنل فرینک جانسن کے حکم کی نافرمانی کی اور لاہور سے باہر چلے گئے بلکہ انگریزوں کی قائم کردہ پنجاب یونیورسٹی سے ڈگری لینے سے بھی انکار کر دیا۔ انہوں نے بی اے کی ڈگری بریڈلا ہال میں قائم کی گئی نیشنل یونیورسٹی سے حاصل کی اور زندگی میں کبھی سرکاری ملازمت کا خیال تک نہیں کیا حالانکہ اس کے مواقع بھی پیدا ہوئے اور انہیں ترغیب بھی دی گئی۔ اس دور میں وہ مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خان سے بے حد متاثر تھے اور ادبی صحافت سے انہیں اتنا لگاؤ پیدا ہو چکا تھا کہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی "نخلستان" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور یہ اتنا اہم شمار ہوا کہ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی نظمیں بھی اس پرچے میں شائع ہوئیں۔

مولانا صلاح الدین احمد "کامریڈ" میں کام کرنے کے لیے دہلی گئے لیکن "کامریڈ" ان دنوں نامساعد اقتصادی حالات سے دوچار تھا۔ اس لیے "کامریڈ" مولانا کا کفیل نہ بن سکا اور وہ واپس لاہور آ گئے تاہم انہوں نے عوام کی تہذیبی تربیت کا جو خواب دیکھا تھا اسے ادبی صحافت کے ذریعے روبہ تعبیر کرنے سے کبھی غافل نہ ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد جب مولانا تاجور نجیب آبادی کا رسالہ "ادبی دنیا" خسارے کا شکار ہو گیا تو اسے مولانا صلاح الدین احمد نے خرید لیا۔

"ادبی دنیا" کے مدیر مولانا کے ایک عزیز دوست منصور احمد مقرر کیے گئے۔ "ادبی دنیا" درحقیقت انہیں کے لیے خریدا گیا تھا۔ منصور احمد ایک جان لیوا مرض میں مبتلا تھے۔ وہ چونکہ شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے اس لیے مولانا نے بیماری سے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے انہیں تخلیق و اشاعتِ ادب میں وقت صرف کرنے کی راہ دکھا دی تھی۔ "ادبی دنیا" کا یہ دور منصور احمد کے تراجم کی وجہ سے بہت تابندہ نظر آتا ہے اور "ادبی دنیا" کی تاریخی حیثیت کی وجہ ہی سے منصور احمد کا نام بھی دوام ابد حاصل کر چکا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں منصور احمد وفات پا گئے تو "ادبی دنیا" مولانا کی ادارت میں شائع ہونے لگا اور یہ ان کی وفات کے سانحے تک (۱۹۶۴ء) جاری رہا۔ اس تمام عرصے میں جن بزرگوں نے ان کی ادارتی اعانت کی ان میں حفیظ ہوشیارپوری، ڈاکٹر عاشق بٹالوی، میراجی، قیوم نظر اور ڈاکٹر وزیر آغا کے اسمائے گرامی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد "ادبی دنیا" کی ادارت محمد عبداللہ قریشی کو تفویض ہوئی لیکن وہ مولانا صلاح الدین احمد کے معیارِ ادب کو برقرار نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۷۴ء میں "ادبی دنیا" بند کر دیا گیا۔

مولانا صلاح الدین احمد کی ادارت "ادبی دنیا" کے پانچ مختلف المیعاد ادوار پر مشتمل ہے۔ ان ادوار کا ادبی تجزیہ اس حقیقت کو

بالخصوص سامنے لاتا ہے کہ "ادبی دُنیا" قدیم اور جدید ادب کا سنگم تھا۔ روایت کی طرف اس کی مراجعت مثبت اور جدیدیت کی طرف اس کی پیش قدمی صحت مند تھی۔ "ادبی دُنیا" نے ہر اس نئے تجربے کا خیر مقدم کیا جس سے روایت و قدر کو گزند پہنچائے بغیر خیال کو تحرک یا ہیئت کو تنوع مل سکتا تھا۔ مولانا کے ادبی مزاج کی تشکیل و ترتیب میں مشرق کے کلاسیکی ادب نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ محمد حسین آزاد، نذیر احمد دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، محمد علی ردولوی اور مرزا محمد سعید ان کے محبوب مصنفین میں سے تھے اور ان ادبا کی جمالیاتی قدروں کو انہوں نے ہمیشہ حرزِ جاں بنائے رکھا۔ دوسری طرف حرکت و حرارت اور طغیانی و تموج کی افزائش میں ان کے راہنما علامہ اقبال اور ظفر علی خان تھے۔ زندگی کو کشادہ نظری سے برتنے، سائنسی انداز میں دیکھنے اور مغربی علوم نو سے استفادہ کا رجحان انہوں نے سر سید احمد خان اور شیخ عبدالقادر سے اکتساب کیا تھا۔ ان سب کے امتزاج نے نہ صرف مولانا صلاح الدین احمد کی مجموعی شخصیت مرتب کی بلکہ اسی سے رسالہ "ادبی دُنیا" کا مزاجِ ادب بھی متعین ہوا۔ چنانچہ "ادبی دُنیا" کا ایک رُخ ہمیشہ کلاسکیت کی طرف منعطف رہا اور عرشی امرتسری، اثر صہبائی، قاضی سلطان پوری یا محمد علی ردولوی کی کوئی چیز اشاعت کے لیے مل جاتی تو مولانا صلاح الدین احمد کھل اُٹھتے اور اپنی مسرت کا اظہار ہمیشہ یہ کہہ کر کرتے کہ

"ان کی اشاعت سے ادبی دُنیا کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

"ادبی دُنیا" کا دوسرا رُخ ہمیشہ جدیدیت کی طرف رہا اور اس نے نہ صرف کرشن چندر، ممتاز مفتی اور راجندر سنگھ بیدی جیسے نئے افسانہ نگاروں کو متعارف کرایا بلکہ میراجی، قیوم نظر اور یوسف ظفر کے نئی نظم کے تجربوں کا خیر مقدم بھی "ادبی دُنیا" ہی میں کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس دَور میں جدیدیت کے جتنے تازہ جھونکے بھی آئے ان میں سے بیشتر کی طرف پہلی محبت کی نظر "ادبی دُنیا" نے ہی اُٹھائی۔

مولانا صلاح الدین احمد کا یہ اقدام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے تجدد کی رَو کو تیز تر کرنے کے لیے ہر دَور میں نوجوان ادبا کو "ادبی دُنیا" میں شریکِ ادارت کیا۔ مولانا کا مقصد ان نوجوانوں کی ادبی تربیت بھی تھا اور ان کی حوصلہ افزائی لیکن اس سے بھی بڑا مقصد یہ تھا کہ ادب کو چند ایسے تازہ دم مشعل بردار میسّر آجائیں جو ادب کی خدمت ایثار اور استغنا سے سرانجام دے سکیں۔ اس بلند مقصد کے پیشِ نظر "ادبی دُنیا" نے جن نوجوانوں کی صحافتی تربیت کی ان میں پہلے دَور میں منصور احمد، دوسرے دَور میں میراجی اور آخری دَور میں وزیر آغا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر دو اصحاب زیادہ دیر زندہ نہ رہے لیکن وزیر آغا اُردو ادب میں مولانا صلاح الدین احمد کے سلسلۂ ادب ہی کی توسیع ہیں اور ان کا رسالہ "اوراق" نہ صرف ان کی یاد میں شائع ہوتا ہے بلکہ ان کے متعین کردہ نصب العینِ ادب کے حصول میں ہی کوشاں ہے۔

منصور احمد بنیادی طور پر نثر نگار اور وسیع المطالعہ ادیب تھے۔ انگریزی زبان و ادب پر انہیں پوری دسترس حاصل تھی۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسانی سے اُردو کا لباس پہنانے پر قادر تھے۔ "ادبی دُنیا" کے دَورِ اوّل میں انہوں نے مغرب کے بہت سے افسانوں کو پہلی دفعہ اُردو داں طبقے سے متعارف کرایا۔ میراجی مزاجاً اور طبعاً نہ صرف شاعر تھے بلکہ انہیں شاعری کا فن ورثے میں بھی ملا تھا۔ ان کی تعلیم ادھوری تھی لیکن ان کا راہنما ان کا ذوق تھا۔ محبت کی ناکامی نے انہیں مشرق اور مغرب کی شاعری کے مطالعۂ فراواں میں گم کر دیا تھا اور وہ جب ادب کے اس بحرِ ذخار سے نکلے تو ان کے دونوں ہاتھ موتیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میراجی کا مستقل قیام دفتر "ادبی دُنیا" تھا اور مولانا صلاح الدین احمد نے میراجی کو "ادبی دُنیا" میں یہ موتی لٹانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس دَور میں اگرچہ تصدق حسین خالد، اور

ن م ۔ راشد نئی نظم کو متعارف کرا چکے تھے اور غزل کے فروغِ عام میں جدید نظم کے لیے بھی راہ ہموار ہونے لگی تھی تاہم اس کی تفہیم اور ابلاغ کی صورت میراجی نے "ادبی دُنیا" ہی میں پیدا کی۔ میراجی کے تنقیدی مضامین، مشرقی اور مغربی شعرا کے مطالعے، نظموں کے تجزیے اور تجزیے اسی دَور کی یادگار ہیں اور "ادبی دُنیا" اس دَور میں مشرق اور مغرب کا سنگم نظر آتا ہے۔

"ادبی دُنیا" کے آخری دَور میں مولانا نے وزیر آغا کو شریک مدیر کے طور پر متعارف کرایا۔ اس دَور میں نہ صرف نئی نظم کی تحریک کو طغیان و تموّج حاصل ہوا بلکہ سب سے زیادہ اہمیت سنئے سوال کو دی گئی اور بحث و تنقید کا رُخ اختلافِ فکر و نظر کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس وقت پاکستان تخلیقِ نو کی منزل سے گزر رہا تھا اور اُلجھے ہوئے مسائلِ ادب سے دوچار تھا۔ "ادبی دُنیا" نے مخالفانہ نقطۂ نظر و تدبر و توازن سے سُلجھنے کی طرح ڈالی اور خرد افروزی کی تحریک کو فروغ دیا۔ علی عباس جلال پوری، صفی الدین صدیقی، پروفیسر محمد اسلم، ریاض، عارف عبدالمتین اور عرش صدیقی نے اس دَور میں "ادبی دُنیا" میں جو مضامین لکھے یہ سب نزاعی موضوعات کو صحت مند انداز میں پیش کرنے کی مثالیں ہیں۔ نئی اصناف میں سے "ادبی دُنیا" نے انشائیہ کی سرپرستی کی اور اسے متعارف کرانے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ انشائیہ کے فن پر پہلی سیر حاصل بحث جس میں غلام جیلانی اصغر، نظیر صدیقی اور وزیر آغا نے حصہ لیا "ادبی دُنیا" کے صفحات پر ہی منعقد ہوئی اور اس کی بازگشت اب بھی سُنی جاتی ہے۔

اُردو کی ادبی صحافت میں مولانا صلاح الدین احمد کی منفرد عطا یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے جوہرِ قابل کو تلاش کرنے، اسے پہچاننے اور پھر اسے مناسب و موزوں طریقے سے متعارف کرانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ منصور احمد، میراجی اور وزیر آغا کی ادبی تربیت کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولانا کا فیض معدودے چند نوجوانوں کے لیے مخصوص تھا۔ "ادبی دُنیا" تو ایک چشمۂ صافی کی طرح تھا جس کی طرف ادب کے پیاسے بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے اور مولانا کی ذاتِ گرامی ایک فیض رساں کی تھی کہ سیراب بھی کرتے تھے اور طمانیتِ قلب و نظر بھی عطا کرتے تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، شمس آغا، پرتھوی ناتھ شرما، بلونت سنگھ، سیدہ حنا، قدرت اللہ شہاب، جاوید جعفری، آغا بابر، داؤد رہبر، اشفاق احمد اور اَن گنت دوسرے ادبا جو مطلعِ ادب پر اب آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی پہلی تخلیقی کاوش "ادبی دُنیا" میں شائع ہوئی اور اسے مولانا صلاح الدین احمد کے سُرخ قلم نے پورے کمالِ فن سے سرخرو کیا تھا۔ آغا محمد باقر نے لکھا ہے کہ

"مولانا صلاح الدین احمد کے فیض سے "ادبی دُنیا" کا دفتر ادیبوں کی تہذیب و تربیت کا ادارہ بنا رہا۔ ان میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ادبی مذاق رکھنے والے خود بخود ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور پھر چند دن کی تربیت پاکر ادیبِ کامل کہلاتے تھے۔"

اس ضمن میں آغا محمد باقر مرحوم یہ واقعہ بھی سُنایا کرتے تھے کہ

ایک دن ایک صاحب آئے۔ انہوں نے اپنا لکھا ہوا افسانہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا نے افسانہ رکھ لیا اور فرمایا "تین چار دن بعد تشریف لائیے۔ میں اسے ذرا پڑھ لوں۔" ایک روز میں شام کے وقت مولانا کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ وہ تشریف لائے۔ فرمایا "میں نے آپ کا افسانہ پڑھ لیا ہے۔ خوب لکھا ہے۔ پھر کسی دن ہم دونوں بیٹھ کر اس پر بات چیت کریں گے۔" چار پانچ دن کے بعد دیکھا کہ وہ صاحب بیٹھے ہیں اور مولانا انہیں افسانے پر دو دو گھنٹے سے

لیکچر دے رہے ہیں۔ جب شام کے سات بجے تو فرمایا ـــــ "اب کل سہی!" معلوم ہوا کہ آج صرف یہ گفتگو تھی کہ افسانہ کیا ہے؟" اور کل کا موضوع ہوگا "آپ کا افسانہ!"

آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ

"اس دن سیر کا موضوع بھی یہی رہا۔ میں نے عرض کیا "مولانا! مجھے افسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن آج جس قدر آپ کی تقریر سُنی اس سے میرا دماغ روشن ہوگیا ہے۔ لیکن میری ایک گزارش ہے کہ جب ان صاحب کا افسانہ آپ کے معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا تو آپ نے اپنے دو گھنٹے کیوں ضائع کیے ـــ فرمایا" ان کے افسانے میں ایسی خوبیاں ہیں جو ان کے بہترین افسانہ نگار بننے کا پتہ دیتی ہیں۔ میں جہاں کہیں جوہرِ قابل پاتا ہوں اس کی قدر کرتا ہوں۔ پھر بہت سے افسانہ نگاروں کے نام لیے اور فرمایا کہ یہ سب "ادبی دُنیا" کے تربیت یافتہ ہیں اور آج افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ان کا شمار ہے۔"

اس واقعے کو عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مولانا نئے ادیب کو ردّی کی ٹوکری کی نذر نہیں کرتے تھے۔ انہیں یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ جب نووارد اپنی جگہ کسی دوسرے پرچے میں تلاش کرلے تو اسے ردّی کی ٹوکری سے نکال کر دوبارہ اپنے پرچے میں سجا دیا جائے تاکہ نیا ادیب عمر بھر احسان سے مغلوب رہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوبِ حیات میں احسان جتانے کا رویّہ موجود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر فن پارے کی تحسین اس فراوانی سے کرتے کہ لکھنے والے کا اعتماد بڑھ جاتا اور اس کی تخلیقات کا گراف مائل بہ ارتقا ہونے لگتا۔ یہ واقعہ بلونت سنگھ نے لکھا ہے کہ ان کے پہلے افسانے پر "ادبی دُنیا" کی "بزمِ ادب" میں مولانا نے جو تعارفی شذرہ لکھا وہ اتنا تحسین آمیز تھا کہ اسے پڑھ کر ان کا خون سیروں بڑھ گیا۔ اُنہوں نے اندازہ لگایا کہ مولانا نے اس شذرے میں تمام کلماتِ توصیفی استعمال کر ڈالے ہیں اور مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ لیکن جب ان کا دوسرا افسانہ شائع ہوا تو بلونت سنگھ حیران رہ گئے۔ مولانا نے اس کا تعارف جس انداز میں کرایا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ توصیفی تھا۔ بلونت سنگھ نے لکھا ہے کہ جس افسانے پر مولانا داد نہیں دیتے تو وہ افسانہ ہماری اپنی نظر سے گر جاتا تھا اور مولانا سے داد حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنی تخلیق پر سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ افسانہ چھپتا تو خیبر سے راس کماری تک اس کی دُھوم مچ جاتی۔

مدیر اور ادیب کے درمیان اس قسم کا رابطہ قائم کرنا اور پھر اسے احسان جتائے بغیر نباہنا مولانا صلاح الدین احمد کی صحافت کا وصفِ خاص ہے۔ افسوس کہ ان کی وفات کے بعد مدیر اور مصنّف کے درمیان یہ رابطہ کمزور ہوگیا۔ مدیر ایک ایسا ادبی آمر بن گیا ہے جو لکھنے والوں کو نہ صرف حقیر سمجھتا ہے بلکہ بعض اوقات اپنے حواریوں سے مصنّف کی گوشمالی بھی مکتوبات کے حصّے میں کروا دیتا ہے۔

مَیں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ "ادبی دُنیا" مولانا صلاح الدین احمد کے نظریات کا نقیب بھی تھا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ نظریات کے اظہار میں اُنہوں نے اپنی ذات یا انا کو نمایاں ہونے کی کبھی اجازت نہیں دی اور "ادبی دُنیا" کو ذاتی شہرت اور نمود و نمائش کا وسیلہ نہیں بننے دیا۔ بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ ان کا نام ہمیشہ مضمون کے آخر میں درج ہوتا تھا اور وہ بھی صرف اس لیے کہ یہ ضابطے کی مجبوری تھی۔ ورنہ اکثر و بیشتر وہ اپنا نام "مدیر ادبی دُنیا" لکھ کر ہی چلا لیتے تھے۔ موضوعِ بحث میں ان کا زاویۂ نظر ہمیشہ اجتماعی اور معروضی ہوتا تھا اور بات اتنے انکسار سے کرتے تھے کہ اگر آواز ذرا سی اُونچی بھی ہوئی تو خیمۂ افلاک پھٹ جائے گا۔ بلاشبہ وہ بات "جمع متکلم" میں کرتے تھے لیکن فروتنی اور سیر نظری ان کی تحریر کے داخلی مزاج میں شامل ہوتی تھی اور "جمع متکلم" میں بھی لکھتے تھے تو یوں محسوس ہوتا جیسے آسمان سے

خلیل جبران کی آواز آرہی ہے۔ یہ آواز نرم، لطیف اور پُرسکون ہوتی لیکن اس میں کمزوری کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کے نظریات غیر متزلزل تھے اور وہ اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ اُردو کو قومی زبان بنانے اور اس کے نفاذ کے مسئلہ پر، حقی ادب اور آفاقی ادب کے موضوع پر۔ رائٹرز گلڈ کے قیام اور ادیب کی پیغمبری کے سوال پر۔ مشرقی اخلاقیات اور بعض ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فحاشی پر اُنہوں نے "بزمِ ادب" میں شذرہ یا کہنے کی باتیں لکھیں تو اُنہوں نے اپنا موقف پوری قوت اور توانائی سے پیش کیا اور پھر اس سے سرِمو انحراف نہیں کیا اور کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

مولانا صلاح الدین احمد ادبی صحافت میں صداقتِ اظہار اور آزادیٔ فکر کے علمبردار تھے۔ انہوں نے "ادبی دُنیا" کے وسیلے سے فن کی کلیسانہ رفعت اور کاریگری کی پیشہ ورانہ بلندی میں تمیز پیدا کی اور "دو پیسے کا کام" کرنے کے بجائے ہمیشہ ادب کی تخلیق سے اپنی روح کو سرشار کیا۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے ادیب کو جغرافیائی، سیاسی اور ملّی حدود کو عبور کرکے انسانیت کی اعلیٰ قدروں تک پہنچنے کی ترغیب دی۔

موجودہ دَور کے بعض ادبا قول وفعل کے تضاد کی زد میں آکر اعلیٰ ظرفی کی مسند سے گر گئے ہیں اور ادب پر جتھہ بازی، دشنام طرازی اور دربارداری نے "ایڈز" کی طرح حملہ کر دیا ہے تو مجھے مولانا صلاح الدین احمد بے اختیار یاد آرہے ہیں۔

مولانا صلاح الدّین احمد

وزیر آغا

آج سے کم و بیش بیس سال پہلے ۔۔ جون کے مہینے میں ، مولانا صلاح الدین احمد ہم سے رخصت ہوئے تھے ۔ اُن کی وفات ایک ایسا سانحہ تھا جس سے لاہور شہر اپنی بنیادوں تک ہل گیا تھا ، وجہ یہ کہ وہ لاہور کا دل ، اس کی روح ، اس کا بدن تھے ۔ وہ جب لاہور کے فٹ پاتھوں پر پیدل چلتے تو ان کے قدموں کی چاپ لاہور کے دل کی دھڑکن بن جاتی اور سارا شہر ان کی ذات کے بطون میں سانس لینے لگتا ۔ ظاہر ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو لحظہ بھر کے لیے لاہور والوں کو محسوس ہوا جیسے خود ان کا سانس رُک گیا ہو یا دل کی دھڑکن تھم گئی ہو ۔ یہی وجہ تھی کہ جب مولانا فوت ہوئے تو لاہور والوں بالخصوص لاہور کے اخباروں نے بڑے گہرے غم کا اظہار کیا ۔ ہفتوں بلکہ مہینوں اخبارات نے مولانا کی شخصیت ، ان کی زندگی ، ان کی ادبی اور علمی یافت ، ان کی مدیرانہ صلاحیت غرضیکہ ان کی پوری ذات کو شہ سُرخیوں کے ساتھ موضوع بنایا ۔ یوں لگتا تھا جیسے لاہور نے مولانا کی وفات کو ایک بہت بڑا قومی نقصان ہی نہیں شخصی نقصان بھی گردانا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی ۔ مگر پھر آہستہ آہستہ نیاز مندانِ لاہور کی روایتی بے نیازی نے اپنے دائرۂ عمل کو کشادہ کرنا شروع کیا تا آنکہ وہ فضا پر پوری طرح غالب آگئی اور چند ہی برسوں میں اہلِ لاہور اس بات ہی کو بھول گئے کہ کسی زمانے میں ان کا بھی ایک دل ہوتا تھا جو ان کی خوشیوں ، دُکھوں اور خطروں کی ہلکی سی لرزش تک کو محسوس کر کے دھڑک اٹھتا تھا اور ان کی تحویل میں ایک زبان بھی تھی جو کلمۂ حق کہنے پر قادر تھی اور ان کی ایک آواز بھی تھی جو ضمیر کی آواز بن کر لاہور کی گلیوں اور بازاروں اور پارکوں میں گونجتی تھی ۔

مگر آواز سے ایک طویل عرصہ تک بے نیاز رہنا ممکن نہیں ہوتا اور زود یا بدیر اس کی بازیابی کا عمل شروع ہو جاتا ہے ۔ ویسے بھی جب ایک نسل دوسری نسل کی جگہ لیتی ہے تو وہ بالعموم سابقہ نسل سے متصادم ہوتی ہے مگر ان دو نسلوں کے بعد آنے والی تیسری نسل از سرِ نو پہلی نسل سے ایک نیا تعلقِ خاطر قائم کرتی ہے ۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے کہ باپ اور بیٹے کا رشتہ اتنا مستحکم نہیں ہوتا جتنا دادا اور پوتا کا! پوتا دراصل وہ تیسری نسل ہے جو دادا کو از سرِ نو دریافت کرتی ہے ۔ مولانا کے معاملے میں بالکل یہی کچھ ہوا کہ ان کے فوراً بعد آنے والی نسل نے ان سے بے اعتنائی اور بے نیازی برتی مگر اس کے بعد آنے والی نسل اب ان سے دوبارہ متعارف ہو رہی ہے ۔

جس طرح زمین کے بطن میں مستور اس کی بے پناہ قوت آتش فشاں پہاڑوں کے ذریعے اپنا لاوا اگلتی ہے بالکل اسی طرح ہر معاشرہ اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بعض شخصیتوں کو بروئے کار لاتا ہے ۔ ایسی شخصیتیں اپنے معاشرے کی آواز ، اس کا ضمیر ، اس کی تخلیقیت کی مظہر بن جاتی ہیں ۔ مولانا صلاح الدین احمد ایک ایسی ہی شخصیت تھے ۔ اُنہوں نے نہ صرف اپنی قوم کے خوابوں اور محرومیوں کو زبان عطا کی بلکہ علمی اور ادبی معاملات میں بھی انہوں نے اُس بے مثال

باشو کے ان دونوں ہائیکو میں کا۔ نا کے الفاظ اضافی ہیں، بے معنی الفاظ، مگر انہیں مہمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جاپانی صوتی اثرات کے تحت الفاظ بے معنی ہونے کے باوجود اپنے اندر معنویت رکھتے ہیں جیسے ہم لوگ جاوتا ، ہے نا کہہ دیتے ہیں [illegible] کے صوتی ارکان ہائیکو کا حصہ ہیں۔ آخری رکن چونکہ عام طور سے سرکنی اور چونکا دینے والا اور اکثر صورتوں میں اسم ظرف یا مکان یا کیفیت کا غماض ہوتا ہے اس لیے اس کے صوتی ارکان کو پورا کرنے کے لیے کا۔ نا کے صوتی ارکان بڑھا دیتے ہیں۔ مگر ترجمہ میں یہ الفاظ حذف ہو جاتے ہیں۔ یا تو جناب عبدالعزیز خالد کی طرح ہائیکو سیدھے سادے شعر میں ترجمہ [illegible]

[illegible] کی خوشبو سے یکسر [illegible]

[illegible] بات کے راستہ پہ ظہور آفتاب [illegible]

مگر ایسی صورت میں دقت یہ ہے کہ باشو کے دوسرے محولہ بالا ہائیکو کا ترجمہ مشکل ہو جائے گا۔ لفظی ترجمہ یوں ہوگا :

مندر کی گھنٹیوں کی آواز خاموش (ہوتی جا رہی ہے)

پھولوں کی خوشبو [illegible]

[illegible] شام (کا۔ نا)

[illegible] کو سیدھا جانے تو آخری مصرعہ ہمارے ہاں صرف "شام" ہی رہ جائے گا۔ جس پر ہمارے ہاں عدم وحدت کا الزام دھرا جاتا ہے۔ کا۔ نا کے دو بے معنی صوتی ارکان کی معنویت ہمارے ہاں منتقل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ہائیکو کا تیسرا "مصرعہ" (اگر اسے مصرعہ کہنا جائز ہے) جامد ہو کر رہ گیا ہے

پھر اور مثال [illegible] ہو سکے۔

[illegible] تے تو نا کی
توکی واہساگو نی
ادمی نائیتی

چاول کا پیلہ
مگر تو بنے میں فی الوقت فقط
ادمی نائیتی کا پھول

اس ہائیکو کا لفظی ترجمہ بھی یوں ہوگا :

[illegible] (خیرات کے لیے بھی) نہیں
[illegible] وقت میں تو نبہ یا کشکول میں
ادمی نائیشی !

ادمی نائیشی، نہایت نازک پھول ہوتا تھا اس کا لفظی ترجمہ "کنوارا پھول" کرتے تھے۔ یہ کھانے کے کام تو بہر حال نہیں آ سکتا تھا۔ اس "ہائیکو" میں اس وقت تک کوئی معنویت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کے سماجی پس منظر سے آگاہی نہ ہو۔ باشو کا عہد، چاول کی شدید قلت کا عہد تھا۔ باشو خود راہب تھا اور راہب ہونے کے ناطے سے اس کے کھانے کی ذمہ داری مندر یا مندر کے ارد گرد رہنے والوں پر عاید رہتی تھی۔ طریق یہ تھا کہ راہب اپنا تو نبہ (کدو کے چھلکے سے بنا ہوا کشکول) اپنے حجرہ کے باہر رکھ دیتا تھا۔ عقیدت مند اس میں کچھ دانے چاول کے ڈال جاتے تھے جو راہب کی غذا کے لیے کفالت کرتے تھے۔ ایک صبح یہ ہوا کہ تو نبہ میں چاولوں کی بجائے ادمی نائیتی کا پھول پڑا تھا۔ اس پس منظر میں قحط زدگی، رہبانیت اور کنوارے پھول کی موجودگی سے اس ہائیکو میں بے پناہ معنویت بیدار ہو جاتی ہے۔ اگر یہ پس منظر علیحدہ ہو جائے تو ہائیکو کی معنویت

دانائی کا برملا اظہار کیا جو ہر معاشرے کے لعاق ہیں، جذبات کی ساری تندی کے باوجود کسی نہ کسی صورت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً سماجی سطح پر انہوں نے شخصی آزادی کے تقدس کا بار بار احساس دلایا اور ادبی سطح پر انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جب ادیب کو نظریے کا تابع مہمل کر دیا جائے تو یہ بات ادب کے لیے حد درجہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نظریے کی افادیت اور اس کی اثر پذیری کے تو یقیناً قائل تھے مگر وہ کہتے تھے کہ نظریہ جزو بدن بن کر از خود ادب میں منعکس ہو تو بات بنے گی ورنہ وہ ادب کی خود روائی اور بے ساختگی کو بری طرح مجروح کر دے گا۔ گویا عام زندگی کے علاوہ ادب کے معاملات میں بھی مولانا منافقت کی روش کو ناپسند کرتے تھے اور ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لینے والے ادیبوں کو اس خلوص سے تہی گردانتے تھے جس پر فن کی صداقت اور ابدیت کا تمام تر دار و مدار ہے۔

مگر مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تھی کہ اسے محض ادب کے حوالے سے سمجھنا مشکل ہے۔ وہ روشنی کا ایک ایسا مینار تھے جو حال ہی کو منور نہیں کرتا بلکہ ماضی کو روشنی میں لانے کے علاوہ مستقبل کو بھی اپنے نورانی دھاگوں میں جکڑ لینے کی سکت رکھتا ہے۔ مجھے مولانا کے ساتھ پورے بیس برس تک رہنے کا موقع ملا اور میں یہ سارا عرصہ ان کی شخصیت سے پھوٹنے والی روشنی کو سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا مگر آج محسوس ہوتا ہے کہ میں تو اس روشنی سے صرف چند کرنیں ہی سمیٹ سکا۔ پھر بھی میں نے مولانا سے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً ایک یہ بات کہ انسان کا سارا دکھ مستقبل کی جانب ہی سے آتا ہے۔ وہ کہتے کہ ماضی کے واقعات میں سے انسان صرف اچھے اور خوشگوار واقعات کی یادوں ہی کو اپنے سینے سے چمٹائے رکھتا ہے اور دکھ دینے والے واقعات کو بھلا دیتا ہے۔ اسی لیے انسان کو گزرا ہوا زمانہ ہمیشہ اچھا لگتا ہے اور وہ اسے جنتِ گم گشتہ کا نام دیتا ہے۔ مگر مستقبل خطرات سے اٹا ہوا ہے۔ ہر آہٹ پر انسان کا دل لرز اٹھتا ہے۔ جانے غیب سے کیا شے برآمد ہو۔ جانے کل کیا ہوگا۔ ہزاروں لاکھوں فرضی خطرات مستقبل ہی کے بطون میں جنم لیتے ہیں۔ مولانا کہتے کہ اصل زندگی تو حال کا یہ لرزتا ڈولتا ہوا لمحہ ہے جو ابھی تھا اور اب کہاں ہے! میں تو اس لمحے ہی کا پرستار ہوں اور آنے والے زمانے کے خطرات کو پرِ کاہ سے بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا کہتے: میری زندگی تو پرندے کی طرح ہے جو طلوعِ آفتاب کے ساتھ دن کی روزی کے لیے تگ و دو کا آغاز کرتا ہے اور جب سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنے پَر چھاڑ کر کسی پیڑ کی شاخ پر آ بیٹھتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ان دنوں مولانا کی اس بات سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی تھی جس میں پرندے کو ننھے مزدور کا نام دیا تھا۔ یہی اس نظم کا عنوان بھی تھا۔ نظم کا پہلا شعر تھا ؂

شب گزری اور سورج نکلا ہو گیا عالم بقعۂ نور
سوئے تارے، جاگے پنچھی، وہ قیدی تھے یہ مزدور

اور آخری شعر تھا

روزی دن کی آج ملے بس یہ ان کی فریاد
دہقاں کو ہے غم فردا کا، یہ اس سے آزاد

چونکہ یہ نظم مولانا کے مسلک کے عین مطابق تھی اس لیے انہیں پسند بھی بہت تھی، تاہم وہ اکثر (محض مجھے چھیڑنے کے لیے) اس کے آخری شعر میں معمولی سا تصرف کر کے اسے یوں پڑھتے تھے

روزی دن کی آج ملے بس یہ ان کی فریاد
آغا کو ہے غم فردا کا، میں اُس سے آزاد

چنانچہ وہ زندگی کے عام معاملات میں ایک مردِ آزاد کے رُوپ میں ابھرے۔ اُن کی یہ آزادہ روی ان کے ادبی مسلک میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اکثر کہتے کہ ادیب کسی نظریے، تحریک یا شخص کا تابع مہمل ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ادیب تو ہوا کے جھونکے کی طرح آزاد ہو تو فن کی تخلیق پر قادر ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ ادیب کو "ذوقِ سوختن" حاصل ہو کیونکہ یہ ذوق ہی تخلیق کا ایندھن ہے۔ مثلاً جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مولانا کا آبائی مکان اور کتب خانہ جل کر راکھ ہو گیا تو مولانا نے مسکرا کر فقط یہ شعر پڑھا ؎

دلم بسوخت، تنم سوخت، استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

آزادہ روی کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی جان اور مال کی قربانی کو بھی آزادی ہی کی طرف ایک قدم قرار دے۔ مولانا کہتے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر دھن دولت، مال اسباب، تنگ نظری، تعصّب اور جہالت کا بوجھ اُسے بتدریج پابہ زنجیر کرتا جاتا ہے حتیٰ کہ بے چارہ بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ مولانا کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور ان کا اسلوبِ حیات اس آزادی کے حصول ہی کا ایک سلسلہ تھا۔ مثلاً وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیتے چاہے باہر لُو چل رہی ہوتی یا سرد ہوا۔ گرد سے انہیں سخت نفرت تھی کہ گرد سے سانس رُکنے لگتا ہے۔ چنانچہ اگر کبھی ادب کے میدان میں گرد اُڑی اور نکتہ آفرینی پر جُملہ بازی غالب آگئی تو مولانا کو سانس رُکنے کا بڑی شدّت سے احساس ہوا۔ آزادی کی یہ خواہش ان کے لباس، گفتار اور چال سے بھی مترشح تھی۔ وہ میلوں پیدل چلتے کیونکہ بس یا تانگہ میں بیٹھ کر انہیں قید و بند کا احساس ہوتا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے بھی وہ فٹ پاتھ پر کسی قسم کی رکاوٹ کو برداشت نہ کر سکتے۔ ایک بار کسی صاحب بہادر کی موٹر کے اگلے پہیوں نے فٹ پاتھ پر قبضہ جمایا تھا۔ مولانا رُک گئے اور جب تک صاحب بہادر نے معذرت کر کے موٹر کو فٹ پاتھ سے نیچے نہ اتار لیا وہ آگے نہ بڑھے۔

مگر آزادی کے اس احساس کو وہ صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے کے آرزومند نہ تھے۔ وہ دوسروں کی آزادی کا بھی اسی طرح احترام کرتے اور یہ احترام بعض اوقات بڑی دلچسپ صورتیں اختیار کر لیتا۔ مثلاً ایک روز مَیں مولانا کے دفتر پہنچا تو دیکھا کہ بڑے انہماک سے کوئی مضمون لکھ رہے تھے اور ٹیلی فون کا ریسیور میز پر پڑا تھا۔ مضمون لکھتے لکھتے اچانک میز پر سے ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھاتے اور "واہ واہ! سبحان اللہ" کہہ کر ریسیور دوبارہ میز پر رکھ دیتے اور مضمون لکھنے لگتے۔ جب تین چار بار ایسا ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے پوچھ ہی لیا کہ مولانا یہ کیا معاملہ ہے؟ ——— ریسیور کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے۔ "مجھے ریڈیو پر آج ہی یہ مضمون پڑھنا ہے اور حکیم احمد شجاع مجھے صبح سے اپنے اشعار سُنا رہے ہیں۔ بتائیے مَیں کیا کروں!"

مولانا صلاح الدین احمد میرے بزرگ بھی تھے اور استاد بھی مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میرے دوست تھے۔ وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہیں مگر میرے لیے ان کی دوستی سدا بہار ہے۔ مَیں نے زندگی میں جب بھی خود کو تنہا محسوس کیا ہے تو مجھے ایک چاپ سی اپنے عقب میں ہمیشہ سنائی دی ہے اور مَیں جان گیا ہوں کہ یہ مولانا ہی کے قدموں کی چاپ ہے۔

کاش یہ چاپ نیاز مندانِ لاہور کو بھی سنائی دیتی!!

انجم نیازی

تری یادوں سے دل کو ماورا ہونے نہیں دیتا
میں یوں خوشبو سے خوشبو کو جدا ہونے نہیں دیتا

ترے ہنستے ہوئے لب گھول دیتے ہیں مٹھاس ان میں
مرے کانوں کو تو بے ذائقہ ہونے نہیں دیتا

مرے چاروں طرف موجود رہتا ہے افق بن کر
مجھے تو قید سے اپنی رہا ہونے نہیں دیتا

تپش محسوس ہوتی ہے تو ان کو اوڑھ لیتا ہوں
ترے بخشے ہوئے لمحے قضا ہونے نہیں دیتا

نظر آتا ہے تو ہر بار سورج کی طرح سر پہ
مجھے تو اپنی قامت سے بڑا ہونے نہیں دیتا

ترے دامن کا سایہ ہر گھڑی محسوس ہوتا ہے
مجھے تیرا تصور بے ردا ہونے نہیں دیتا

حیدر قریشی

جب تیر چل گیا تو کماں بھی نہیں رہی
لگتا تھا جیسے جسم میں جاں بھی نہیں رہی

سارے حسین بیچتے پھرتے ہیں شہر میں
جنس وفا اب ایسی گراں بھی نہیں رہی

وہ مسکرا کے پوچھتے تھے مدعائے دل
اور اپنے منہ میں جیسے زباں بھی نہیں رہی

خواہش وصالِ یار کی زندہ ہے آج بھی
لیکن یہ پہلے جیسی جواں بھی نہیں رہی

اس سے بچھڑ کے آئینہ دیکھا تو یوں لگا
ہاتھوں میں اپنے عمرِ رواں بھی نہیں رہی

شہرِ ستم گراں میں پتہ ڈھونڈیئے کہیں
شہرِ اماں میں جائے اماں بھی نہیں رہی

خواب و خیال ہو گئے اب اس کے خواب بھی
بس آگ یوں بجھی کہ دھواں بھی نہیں رہی

رسمِ وفا تو اگلے زمانوں کی بات ہے
اب اپنے بیچ رسمِ جہاں بھی نہیں رہی

حیدر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

سیما شکیب

موسم کروٹ لینے کو ہے تیز ہوا میں خنکی ہے
دل نے تیری یاد کی شال تنہا بیٹھ کے ڈھنکی ہے

ہاتھ پہ اب تک چمک رہا ہے اس کے پیراہن کا رنگ
کانوں میں آواز ابھی تک پائل کی چھن چھن کی ہے

آنچل اوٹ گھروندا لے کر کتنے طوفاں جھیل گئی
کچی شاخ سی لڑکی ہے اور پکی اپنی دھن کی ہے

روپ سنگھار تو سارا تنہائی کی دیمک چاٹ گئی
پیلے ہاتھ میں لیکن اب تک چوڑی ایک شگن کی ہے

خوشیوں کے انمول ذخیرے آخر خاک کا ڈھیر ہوئے
تیرے غم کی مثل مری جاں گیہوں کے اندر گھن کی طرح

ساغر مشہدی

زیست شب کی مچان سے اُتری
اک کرن آسمان سے اُتری

تشنگی جھیل ہو گئی پل میں،
کونج اونچی اُڑان سے اُتری،

ہٹ گیا جب ہدف نگاہوں سے
شست کھنچتی کمان سے اُتری

اُڑ گیا رنگ لالہ و گُل کا
دھوپ کچھ ایسی شان سے اُتری

پھول بھی جس کو دیکھ شرمائیں
وہ مرے دل میں مان سے اُتری

اُس کے پیکر نے لی جو انگڑائی
بوئے گُل میرے دھیان میں اُتری

نصرت چوہدری

تو نہیں تھا تو مرے گھر میں بھی کیا رکھا تھا
میں نے دروازے کو دانستہ کھلا رکھا تھا

ہو کے پاگل میرے کمرے میں ہوا آئی تھی
دل کی دیوار پہ یادوں کا دیا رکھا تھا

جب کھلی آنکھ تو خوشبو تھی میرے بستر پر
ایک پرچھائیں نے گلدان اٹھا رکھا تھا

غور سے دیکھ رہی تھی میری حیرت اس کو
شاخ نے پھول کا اک دیپ جلا رکھا تھا

کیا عجب چیز تھی نصرت میری درویشی بھی
مجھ کو تنہائی نے کمرے میں سجا رکھا تھا

صفدر صدیق رضی

دکانِ شیشہ گر یا حلقۂ آذر میں رہتے تھے
کبھی ہم آئینے میں اور کبھی پتھر میں رہتے تھے
جب آتش تھے لب و رخسار و گل میں پائے جاتے تھے
جو آب و گل ہوئے تو دستِ کوزہ گر میں رہتے تھے
کوئی تو مصلحت تھی روشنی سے لا تعلق رکھا
ہم اہلِ صبح تھے اور شام کے منظر میں رہتے تھے
شجر کو چھوڑ کر جو سایۂ دیوار میں آئے
اس آبادی میں وہ جب تک رہے اک ڈر میں رہتے تھے
ہمیں اپنی حدِ پرواز کا ادراک رہتا تھا
بہت اڑتے تھے لیکن اپنے بال و پر میں رہتے تھے
سو ہم اہلِ زمیں پر روز و شب کی گردشیں اتریں
کہ ماہ و آفتاب اس شخص کی ٹھوکر میں رہتے تھے

انجم صہبائی

جب پہاڑوں سے اُترتے بادلوں کو دیکھنا
سبز چادر سے لپٹتی کھیتیوں کو دیکھنا

دُور تک پھیلے ہوئے ہیں زمیں کے جسم پر
دھوپ اُترے تو شفق کے راستوں کو دیکھنا

جب گرے سورج اندھیری شام کی گہرائی میں
دل میں بجھتی اُس کی ان مشعلوں کو دیکھنا

رُت بدلتے ہی کہیں گئے گھونسلوں کو خیرباد
پھر مسافت پر رواں ان طائروں کو دیکھنا

یہ کرشمے ہیں پہاڑوں کی پگھلتی برف کے
بستیوں کی سمت آتے پانیوں کو دیکھنا

ریت کے ٹیلے سوا نیزے پہ سورج قہر کا
دھوپ کی شدت میں جلتے قافلوں کو دیکھنا

جس گھڑی ظاہر کرے لاوا کوئی اپنا وجود
کوہساروں کے پگھلتے پتھروں کو دیکھنا

اندھے غاروں میں کہیں انجم نئے بابوں میں
روشنی کے اس سفر میں رہبروں کو دیکھنا

شوکت راز

ادھر وہ کام کی کوئی دوا آنے نہیں دیتا
معالج خود مریضوں کو شفا آنے نہیں دیتا

مجھے ہی قید کر رکھا ہے میرے جسم میں کس نے
دریچے بند ہیں باہر صدا آنے نہیں دیتا

میں چاروں سمت سے محبوس ہوں اونچے مکانوں میں
مری جانب کوئی ٹھنڈی ہوا آنے نہیں دیتا

بڑی مدت سے لے رکھا ہے سورج کو حراست میں
اندھیروں کی طرف کوئی ضیا آنے نہیں دیتا

سفر سب کا اسی کے گھر پہ جا کے ختم ہوتا ہے
مری جانب وہ کوئی راستہ آنے نہیں دیتا

مجھے ہے سخت نفرت مانگنے سے اس لئے شوکت
لبوں پہ اپنے کوئی التجا آنے نہیں دیتا

انوار فیروز

حیرت ہے خشک بحر سی طغیانیوں میں ہوں
صحرا ہے چار سمت مگر پانیوں میں ہوں

گلہائے خشک بکھرے ہوئے ہیں زمین پر
میں گلشنِ حیات کی ویرانیوں میں ہوں

چاروں طرف ہیں آئینہ خانے مرے یہاں
کس سمت جاؤں میں ابھی حیرانیوں میں ہوں

بس ایک دائرے میں ازل سے میں قید ہوں
اب تک تمہاری یاد کی نادانیوں میں ہوں

زنجیرِ غم نے چھین لیں آزادیاں مری
محسوس ہو رہا ہے کہ زندانیوں میں ہوں

گہرائی میری فکر کا زیور بنی رہی
پاتال ندیوں کے اتھاہ پانیوں میں ہوں

دل کی طرح دھڑکتا ہوں لفظوں کے درمیاں
پر چشمِ خامہ نم ہے پریشانیوں میں ہوں

ڈھایا ہے میں نے ظلمتِ شب کی فصیل کو
انوار میں تو اپنی ہی تابانیوں میں ہوں

ساجد مرزا

جذبے تھے جس قدر وہ کبھی بیکراں ہوئے
ہم خاکداں ہوئے ہیں کبھی آسماں ہوئے

بُنتے رہے جو خواب وہ پورے کہاں ہوئے
بچوں کے ساتھ گھر کے مسائل جواں ہوئے

احسان ہم پہ بوڑھے درختوں کے کم نہ تھے
چمکی جہاں بھی دھوپ وہیں سائباں ہوئے

بے فیض ساعتوں سے امیدیں فضول ہیں
پتھر بھی راستوں کے کبھی کہکشاں ہوئے؟

انسان دوستی کے تھے بے مثل زاویے
دیوار و در کہیں، کہیں تیر و کماں ہوئے

خاموشیوں کو توڑتے آخر کہاں تلک
جب آدمی ہی بے صدا، بے در مکاں ہوئے

کشتی بھی اس کا ساتھ نہ آخر نبھا سکی
موجوں کے ساتھ ساتھ کنارے رواں ہوئے

منسوب اُن کے نام سے کیوں ہر سحر نہ ہو
ساجد جو اپنے آپ میں اک کارواں ہوئے

گلزار بخاری

خوش ہو اگر فصیل سرِ رہ گزر اُٹھے
تم تو یہ چاہتے ہو کہ رسمِ سفر اُٹھے

دریا کا اضطراب کسی جھیل میں کہاں
پانی میں ہو جمود تو کیونکر بھنور اُٹھے

تم تو درونِ خانہ رہے تم کو علم کیا
طوفان جس قدر اُٹھے بیرونِ در اُٹھے

اس کی نزاکتوں کا یہی حال ہے تو پھر
ممکن نہیں کہ شاخ سے بارِ ثمر اُٹھے

لینے گئے تھے درس جہاں سے اڑان کا
طائر اسی مقام سے بے بال و پر اُٹھے

گلزار اپنے گھر میں ہو جب نخل سایہ دار
پھر کیوں کسی کے پیڑ کی جانب نظر اُٹھے

فرحت زاہد

خاموشی کے جنگل میں آوازوں جیسا ہو
کوئی تو ہو جو منزل تک جانے کا رستہ ہو

سر پر سورج اوڑھ کے نکلوں جب بھی گھر سے مَیں
دھوپ کے ہر اک خیمے اندر تیرا سایہ ہو

خوشبو بن کر تیری یادیں سانسوں میں مل جائیں
مَیں ہی تیرے پاس رہوں تو جب بھی تنہا ہو

بادل کا مشکیزہ خالی ہو جائے لیکن
دریا کا ہر ایک مسافر پھر بھی پیاسا ہو

جیون کے سب سپنے تیرے ہو جائیں لیکن
میری آنکھ کا ایک ہی سپنا وہ بھی تیرا ہو

کٹھ پُتلی کا ناچ کہاں تک ناچیں گے ہم لوگ
اپنے بازو، اپنا چہرہ کوئی تو لایا ہو

انجم یوسف زئی

کون رت میں کیسا یہ آوازہ تھا
شاید میرے خوابوں کا خمیازہ تھا

آنکھ سمندر میں اترے تو ڈوب گئے
باہر سے تو اور ہی کچھ اندازہ تھا

آنے والا گھر پر دستک کیا دیتا
کوئی دریچہ تھا نہ کوئی دروازہ تھا

اب تو سب کچھ بکھرا بکھرا لگتا ہے
اس کے ہات میں لمحوں کا شیرازہ تھا

غم کی دھول سے اٹا ہوا تھا میں انجمؔ
اس کے چہرے پر خوشیوں کا غازہ تھا

رفیق اظہر

یاد رہی بس ایک نشانی
ناک میں تیلی گلے میں گانی

ماتھے پر گرتے بالوں نے
چومی چمکیلی پیشانی

اک صورت دیکھی دیکھی سی
ایک صدا جانی پہچانی

آج ترے وحشی سے ملے تھے
دیکھی اس کی خاک اڑانی

بول ترے کس کام آیا ہے
ان آنکھوں کا کھارا پانی

کرامت بخاری

ہے خوشبوؤں اور تتلیوں کا زمانہ
تری یادوں کو پلکوں پر سجانا

تری باتیں ملاقاتیں وہ راتیں
فقط گزرے زمانے کا فسانہ

مری تیرہ شبیوں کا، رتجگوں کا
وہی قصہ پرانا جاودانہ

وہی ہنسنے ہنسانے کے زمانے
وہی رونے رلانے کا بہانہ

بخاری زندگانی اور کیا ہے
فسانہ در فسانہ، بیکرانہ

انور جمال

خود سے ہی اگر بر سرِ پیکار ہوا تو
کون آ کے سنبھالے گا یہ مسمار ہوا تو

تم نقدِ وفا لے کے چلے ہو سرِ بازار
اس جنس کا کوئی نہ خریدار ہوا تو

بولے گا ضرور آپ کی بیداد گری پر
محفل میں کوئی مجھ سا گنہ گار ہوا تو

نفرت کے الاؤ جو بھڑکتے ہیں دلوں میں
سڑکوں پہ یہ طوفان شرربار ہوا تو

دشمن کے محاذوں کی تو پہچان ہے مجھ کو
احباب کی جانب سے کوئی وار ہوا تو

ہم حوصلۂ عرضِ طلب رکھتے ہیں لیکن
اس کے لبِ اعجاز سے انکار ہوا تو

ابہام کا شکار ہو جائے گی۔

اس ہائیکو کا حوالہ میں نے خاص طور سے اس امر کے اظہار کے لیے دیا ہے کہ 'ہائیکو' کے لیے 'قیدِ شام' بھی ایک شرط ہے۔ یعنی ۵-۷-۵ ارکان موسم کی تخصیص اور قیدِ مقام۔ اگرچہ یہ قیدِ مقام مکمل قیدِ مقام نہیں، کسی بھی سیاسی، سماجی، معاشرتی رویّے سے اس خلا کو پُر کیا جا سکتا ہے۔ اب اس 'ادبی ناتیشی' کی موجودگی سے ہم جو معنیٰ چاہیں اخذ کر لیں۔ بے چارگی، نزاکت، عقیدت، مگر ایک حقیقت بہر حال اٹل ہے کہ لیکن ازشکم نزدیک تر

[illegible] بُسون کے ہائیکو:

[illegible]
[illegible] ای نی۔کاری
ناکی۔یو کا۔[illegible]

کل کا دن بھی گیا
آج کا دن بھی گیا
گر نہیں ہیں نہ کر تجسس کی آواز

جناب عبدالعزیز خالد نے اس کا ترجمہ [illegible]:

کل کا دن بھی ختم ہوا
آنے کا دن بھی ختم ہوا
آہ بہار رُخصت ہو رہی ہے

[illegible] ترجمہ یہ ہے:

کل گزرا
آج گزرا۔ بہار [illegible]
[illegible] کا نا [illegible]

[illegible] ہائیکو میں بھی معنویت پیدا کرنے کے لیے ہمیں اپنی زبان کے بعض الفاظ زائد کرنا پڑتے ہیں۔ جناب عبدالعزیز خالد کا ترجمہ چونکہ انگریزی سے ہوا ہے اس لیے ان کے سامنے 'ناکی۔ یو کے بعد کا۔ نا' کے الفاظ موجود نہیں تھے۔ 'کا۔ نا' صرف صوتی ارکان نہیں گنتے ان کے ساتھ ایک احساس کا تعلق وابستہ نظر آتا ہے ـــــ چونکہ کرنج کی معنویت سے مترجم آگاہ نہیں تھا اس لیے سرے سے یہ لفظ ہی معدوم ہے۔

بُسون کا ہی ایک اور ہائیکو:

تے شوکو [illegible]
نیوا فومو بیتیو
ہارُو او شیمُو

ہاتھ میں اُٹھا [illegible]
باغ میں تلاش کر
[illegible] بہارِ رفتہ کو

جناب عبدالعزیز خالد کا ترجمہ:

باغیچہ میں اک آدمی [illegible]
افسوس کرے بہار کے جانے کا

رضی الدین رضی

بند گلیوں سے نکلتے راستہ کوئی نہیں
اور ہمارے پاس بھی اب معجزہ کوئی نہیں

میرے ساتھی اپنی جانب کرنے والو سوچ لو
ایسے حربوں سے کبھی بھی ہارتا کوئی نہیں

ہم جو بچھڑے ہیں تو اس میں بھی تمہارا ہاتھ ہے
چاہتوں میں میرا اپنا فیصلہ کوئی نہیں

ہاتھ پھیلانے کا میں قائل نہیں ہوں اس لیئے
بے کسی میں بھی مرے لب پر دعا کوئی نہیں

میں نے پوچھا کون میرا ساتھ دے گا جنگ میں
پہلے سوچا اور پھر سب نے کہا "کوئی نہیں"

اب تو سیلابِ بلا ان کے گھروں تک آ گیا
لیکن اس بستی میں اب بھی جاگتا کوئی نہیں

ہم تلاشِ رزق میں گھر سے نکل آئے رضی
اب ہماری واپسی کا راستہ کوئی نہیں

یہ ہجرتوں کا سفر کب محال ایسا تھا
ہمارے دل میں ہی کوئی ملال ایسا تھا

وہ پوچھتے ہیں کہ کیسا تھا وہ پری پیکر
نہیں جہان میں جس کی مثال ایسا تھا

جو اب چھوڑ دیئے ہم تو نظر ملا نہ سکے
اُس ایک شخص کے لب پر سوال ایسا تھا

ہم ایک دوسرے کو چشمِ نم سے تکتے تھے
مثالِ ہجر ہمارا وصال ایسا تھا

فقیہہِ شہر کو روندا گیا تھا گلیوں میں
عروج ختم ہوا تو زوال ایسا تھا

اکیلے ہم ہی کہاں بے نیاز تھے اس سے
رضی اُسے بھی ہمارا خیال ایسا تھا

شہناز نبی

پچھلی رُت کے ساتھی میرے اب جو واپس آنا تم
دُھوپ بھرے آنگن میں پھر سے اک شیشہ چمکانا تم

کب سے اس خاموش فضا کا بوجھ ہے میری آنکھوں پر
بانجھ مناظر میں چاہت کا رنگ نیا بھر جانا تم

ٹکڑا ٹکڑا جوڑ کے مجھ کو شکل عطا جب کرنا ہو
میرے اندر کی تنہائی میں آواز لگانا تم

میں ساحل کی ریت، سدا قدموں کے نشاں ہی گنتی ہوں
میری جانب آ نکلو تو کشتی کو ٹھہرانا تم

ٹوٹ رہی ہے اندر سے یہ عالی شان حویلی بھی
باہر دیکھ کے رنگ و روغن دھوکہ مت کھا جانا تم

برف کی وادی روز نئے سورج کا رستہ تکتی ہے
کرن سواری کو نکلو تو اس جانب بھی آنا تم

ناگ خزانوں پر پہرہ دیتے ہیں بات پرانی ہے
یادیں ہیں انمول مگر شہنازؔ انہیں بسرانا تم

بشیر آذر

اُمڈ آئی ہے کیسی سوچ طغیانی مرے اندر
لبوں کو چھُو رہا ہے خوف کا پانی مرے اندر

مرے آئینۂ دل میں یہ کیا منظر جھلکتا ہے
کہ ہر سُو پھیلتی جاتی ہے حیرانی مرے اندر

میں دریا ہوں مجھے رہ میں کہیں رُکنا نہیں آتا
کہ ہے بپھرے ہوئے طوفاں کی جولانی مرے اندر

میں گھر کی کھڑکیاں کھولوں کہ دروازوں کو واکردوں
مگر تازہ ہوا پھر بھی نہیں آتی مرے اندر

میں اپنی ذات کے کس غار میں محبوس ہوں آذرؔ
اُترتی ہی نہیں سورج کی تابانی مرے اندر

رب نواز مائل

یہ سوچنا تلک بھی ہمیشہ محال ہو
اس شہر میں کسی کو کسی کا خیال ہو

بڑھ کر جہانِ رنگ سے کچھ اور بھی تو ہو
لب تک مرے لبوں پہ یہی اک سوال ہو

لمحوں کے پر حسین سے ہوں اِک طرف یہاں
اور سامنے مِرے وہی سپنوں کا جال ہو

گذرے برس کے دُکھ ہیں نظر میں تو یہ کہوں
اب کے برس کہیں بھی نہ خوشیوں کا کال ہو

جنت نگاہ کچھ نہ سہی ہستِ شور و شر
مائل پہ حوصلہ تو مِرا کچھ بحال ہو

پنہاں

اشک بن کے نہ آنکھ سے بہنا
صورتِ زخم دُکھ میں بس رہنا

شوق تعمیرِ ذات کا عالم
خود کو ہر لمحہ توڑتے رہنا

اتنا آسان بھی نہیں شاید
زندگی کا ہر اِک ستم سہنا

مُسکرائی تو اشک چھلکے ہیں
مَیں نے سیکھا نہیں خوشی سہنا

کچھ تو ماں سے مِلا ہے ورثے میں
کچھ خریدا ہے خود بھی دُکھ گہنا

محرمِ غم نہیں کوئی پنہاں
دِل کی حالت کسی سے مت کہنا

تسلیم الٰہی زُلفی

ہوا ہے تیز تو کیا چل ذرا چلیں باہر
دیئے بغیر بھی کچھ دن رہے ہمارا گھر

کبھی کبھی مری آوارگی نے پہنچایا
حدودِ شام، سحر کے حصار سے باہر

میں در بہ در رہا اور میرے منتظر گھر میں
چراغ جلتا رہا بے شکن رہا بستر

چراغ جلنے لگے رُوح کے دریچوں میں
جب اپنا نام لکھا میں نے اُس کے ماتھے پر

عجیب عالمِ تنہائی ہے مرے گھر میں
پرندے آکے نہیں بیٹھتے درختوں پر

کسی طرح تو گذاروں یہ رات بھی زُلفی
میں اِک غزل ہی نہ لکھ دوں کسی کے پیکر پر

طارق نعیم

میں اس لیئے آنگن کا شجر کاٹ رہا تھا
اِک حبس تھا کمروں میں کہ گھر کاٹ رہا تھا

کھاتی تھیں پرندے کو اُڑانیں تو قفس میں
منقار سے خود اپنے ہی پَر کاٹ رہا تھا

لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ بنیاد غلط ہے
دیوار کو برسات کا ڈر کاٹ رہا تھا

کانٹوں سے نہیں آبلہ پائی کی شکایت
تلووں کو تو بے فیض سفر کاٹ رہا تھا

وہ خوش تھا کہ یوں میری اَنا قید تھی لیکن
دستار کو اندر سے ہی سر کاٹ رہا تھا

ہر شخص مجھے صورتِ اخبار اُٹھا کر
صفحات سے مطلب کی خبر کاٹ رہا تھا

شہکار کا ثانی ہی نہ بن جائے کوئی اور
اِس خوف سے وہ دستِ ہُنر کاٹ رہا تھا

یوں زرد ہُوا جاتا تھا ہر پیڑ کہ جیسے
شاخوں سے کوئی زرد ثمر کاٹ رہا تھا

اکرم ناصر

تجھ سے بچھڑ کے بھی نہیں مجھ سے جدا ہوا
آنکھوں سے دور جا کے وہ دل میں ہرا ہوا

سوچیں کہ جیسے ابر برستا ہو ذہن پر
یادیں کہ جیسے قافلہ رہ میں رکا ہوا

سورج کی خیر مانگتا رہتا ہوں رات بھر
جیسے پرائے دیس ہو بیٹا گیا ہوا

گھر سے چلوں تو ساتھ ہو جاسوس کی طرح
لگتا ہے دشمنوں سے ہے سایہ ملا ہوا

جانکے ہے جھریوں سے جوانی کا بانکپن
اترا ہے نقش چھوڑ کے دریا چڑھا ہوا

قمر رضا شہزاد

کسی عشق و رزق کے جال میں نہیں آئے گا
یہ فقیر اب تری چال میں نہیں آئے گا

میں منا تو لوں گا اُسے مگر وہ انا پرست
مری سمت اب کسی حال میں نہیں آئے گا

میں کہوں گا حرفِ طلب کچھ ایسے کمال سے
مرا درد میرے سوال میں نہیں آئے گا

کبھی اپنی ایک جھلک مجھے بھی نواز تو
کوئی فرق تیرے جمال میں نہیں آئے گا

یہی محنتوں کا صلہ رہا تو پھر اے خدا
مجھے لطفِ رزقِ حلال میں نہیں آئے گا

محمود اسیر

سرشتِ جاں میں بھنور کا بھنور اتارنا تھا
پھر اس کے بعد یہ خود آپ ہی سہارنا تھا

اتر گیا ہوں گھنے پانیوں کی دلدل میں
یہ سوچ کر کہ تجھے کس لئے پکارنا تھا

پھر اس کے بعد کئی رمز خود شناسی بھی
بس ایک شبنمی لہجے کا روپ دھارنا تھا

خمارِ کنجِ قفس ٹوٹنے سے یاد آیا
ترے گماں کی منزل پہ خود کو وارنا تھا

بجھا سکی نہ ہوا شامِ وقت کی قندیل
خلیجِ شب سے سحر کا کنول گزارنا تھا

سید مظفر حسین رزمی

تمہارے چشم و ابرو کا اشارا کون سمجھے گا
اٹھاتے ہو سرِ محفل جو فتنہ کون سمجھے گا

تمہاری ذات سے وابستگی پہچان ہے اپنی
تمہیں اپنا نہ سمجھو گے تو اپنا کون سمجھے گا

اگر یونہی رہی اے جانِ جاں بے چہرگی تیری
حقیقت کون جانے گا فسانہ کون سمجھے گا،

نہیں ہیں ہاں کے تیور گفتگو میں رمز خاموشی
یہ اندازِ تکلم اور یہ لہجہ کون سمجھے گا،

ہمیں اس ذات سے وابستگی کی داد دی کس نے
جو اب دل کو نہیں یہ بھی گوارا کون سمجھے گا

سمجھنے کو سبھی طرزِ سخن ان کا سمجھتے ہیں،
نگاہیں بھی کبھی ہوتی ہیں گویا کون سمجھے گا

اسی الجھن میں اپنا مدعا اب تک نہ کہہ پائے
کہ ایسا کون سمجھے گا کہ ویسا کون سمجھے گا؟

کوئی پوچھے تو ہنس کر ٹال دینا تم اسے رزمی
کہ اس آشوبِ جاں میں دل کا قصہ کون سمجھے گا

حسنین بخاری

نہ جانے زندگی کیا سفر ہے
نہ آنے کی نہ جانے کی خبر ہے

اِدھر دل میں ہزاروں خواہشیں ہیں
اُدھر مہلت بہت ہی مختصر ہے

کہیں منزل نہ رستہ روک لے پھر
وہ قسمت سے ہمارا ہم سفر ہے

ذرا نم چاہیے اس کی نمو کو
ہر اک دانے میں پوشیدہ شجر ہے

جسے سمجھے ہو تم حسنینؔ منزل
نہیں منزل، وہ آغازِ سفر ہے

احسن کشمیری

اُن کی آنکھوں میں نمی اچھی لگی
اپنی یہ دیوانگی اچھی لگی

صبح کی پہلی کرن اچھی لگی!
روشنی کی خامشی اچھی لگی

گاؤں کی اک سانوری اچھی لگی
ہم کو اس کی سادگی اچھی لگی

سائے دو اک دوسرے میں کھو گئے
مسکراتی چاندنی اچھی لگی

چاندنی شب بھر گریزاں ہی رہی
اپنے دل کی بے بسی اچھی لگی

جانتا ہوں ریزگی انجام ہے
پھر بھی یہ شیشہ گری اچھی لگی

آج جی چاہا کہ خود کو چوم لوں
اس کو میری شاعری اچھی لگی

ارشاد متین

اُڑ گئے زخمی پرندے آسمانوں کی طرف
تیر واپس آ گئے خالی کمانوں کی طرف

جذبے ہیں جن کا مقدر، پھر نہ دیکھیں وہ طیور
ایک لمحے کو پلٹ کر آشیانوں کی طرف

ان میں پوشیدہ ہیں گزرے وقت کے سب کرب
کھول کر اوراق دیکھو داستانوں کی طرف

پھر غبار آلودہ چہرے، آئینہ خانے بنے
وقت نے لوٹا دیا بیتے زمانوں کی طرف

جب بھی نادیدہ مصائب میں گھری خلقِ خدا
آہ بھر کر دیکھتی ہے آسمانوں کی طرف

ناخدا ہیں سر بہ زانو یا خدا رُخ پھیر دے
سر پھری، پاگل ہوا کا بادبانوں کی طرف

قافلے جب بھی چلے گردِ سفر میں کھو گئے
راستے حسرت سے دیکھیں پاسبانوں کی طرف

سر پہ سورج کا الاؤ نیچے ہے تپتی زمیں
کیسے پہنچے جسم لرزاں سائبانوں کی طرف

شہر کی پختہ چھتوں پر جب ہوئی بارش متینؔ
آ گئی موجِ بلا، کچے مکانوں کی طرف

حسنین اصغر تمیمؔ

ایسے عالم میں تجھے، مجھ سے شکایت کیسی
سر ہی جب جھک گیا پھر رسمِ عداوت کیسی

تیری رگ رگ میں ہے جب دربدری کا نشہ
پھر یہ احساسِ انا کیا ہے، ندامت کیسی

صرف اک شخص کی باتوں کا بھرم رکھا ہے
اپنے ہی شہر سے ورنہ مری ہجرت کیسی

جب مداوائے غمِ ہجر کا امکاں ہی نہیں
پھر بھلا میرے بکھر جانے پہ حیرت کیسی

اے طلسمِ رہِ مقتل مری آنکھیں مجھے دے
قتل ہونا مرا ورثہ ہے تو وحشت کیسی

شفیق آصف

... کٹاؤ کیسا ہے،
آنسوؤں کا بہاؤ کیسا ہے،

... بستے ہیں قریۂ غم میں
حال اپنا سناؤ کیسا ہے

... اتنے انا کے داعی تھے
اس کی جانب جھکاؤ کیسا ہے

... کے کھا کر فریب اُس کا ہوں
... نے اُس سے لگاؤ کیسا ہے

سارے جذبے جھلس گئے آصف
میرے اندر الاؤ کیسا ہے!

یشب تمنا

مجھے تم سے تمہیں مجھ سے گلہ ہو
دلوں کے درمیاں کچھ فاصلہ ہو

وہ آنکھوں کی چمک تھی یا کہ جگنو
کوئی پلکوں پہ جیسے اُڑ رہا ہو،

دمِ رخصت نہیں دیکھا پلٹ کر
بہت ممکن ہے وہ بھی دیکھتا ہو

اُسے تم نے یشب چاہا بہت تھا
بہت ممکن ہے اب وہ سوچتا ہو

استاد اور شاگرد (دوسری قسط)

ملازم الثقلین نقوی

جس خوف کی فضا کا میں نے ذکر کیا ہے، اُس کا فسانہ ، اور بڑی حد تک میں خود ہوں یعنی میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوا ہوں اور نتیجتہً بہت بُزدل ہوں ۔ ڈنڈے سے مجھے اُس وقت بھی بہت ڈر لگتا تھا اور اب بھی بہت ڈر لگتا ہے ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں آج تک جرأت و ہمت کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں دکھا سکا ۔

میں اپنی بساط کے مطابق گھر کا کام پورا کر کے لاتا ، آموختہ بھی یاد کرتا ، پھر بھی کبھی کبھار ڈنڈا آشنا ضرور ہونا پڑتا ۔ یعنی سال میں ایک دو مرتبہ مثلاً شرارت ایک آدھ کرتا اور ڈنڈا بلا تمیزِ شریر و شریف سب پر برس جاتا ۔ میرے کچھ ساتھی ڈنڈے کو شیرِ مادر سمجھتے تھے اور میرے جیسے بزدلوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے ۔ پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک آخر تک ڈنڈا سر پر لٹکتا رہا ۔

کاش اسکول کی دُنیا سے ڈنڈا خارج ہو سکتا اور "مولا بخش" کی جگہ کسی "رحیم بخش" کو یہ اعزاز مل جاتا ۔ یہ "رحیم بخش" وہ "زمزمۂ محبت" ہے جو ادیب (اُستاد) کے درس میں ہوتا ہے ۔ نظیری کے شعر کے مطابق جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ، اگر درسِ ادیب زمزمۂ محبت بن جائے تو مدرسے سے بھاگنے والا بچہ جمعہ کو بھی مدرسے میں پڑھنے کے لیے آ جائے ۔ نظیری نے اس بچے کو "طفلِ گریز پا" کہا ہے ۔ تعلیمی نفسیات کی انگریزی کتابوں میں اسے TRUANT CHILD کا نام دیا گیا ہے ۔ آج کل تعلیمی نفسیات کی جو اُردو کتابیں ترجمتی اداروں میں رائج ہیں ، اُن میں اس بے چارے کو بھگوڑا بچہ کہا جاتا ہے یعنی ABSCONDER CHILD گویا بچے کو مجرموں کی صف میں لانے کا ذمے دار یہ ڈنڈا بھی ہے اور یہ ترجمہ بھی میں اس مضمون کی وساطت سے شعبۂ تعلیم کے کارپردازان سے گزارش کروں گا کہ وہ "طفلِ گریز پا" کی ترکیب کو تعلیمی نفسیات کی اصطلاحات میں شامل کر لیں ۔ اور ڈنڈے کو نصاب سے خارج کر دیں ۔

اگر ڈنڈے کو کتابوں کے نصاب میں داخل کر دیا جائے تو شاید سید وارث شاہ کے قول کے مطابق "بگڑوں تگڑوں" کا کچھ مداوا ہو سکے ، جن کا یہ پیر ہے ۔ یوں کلاشنکوف کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے جو اس کی بھی پیر ہے ۔

یاد نگاری کا ایک بڑا عیب یہ ہے کہ انشائیے کی طرح بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس ناقۂ بے زمام کو سیدھی ڈگر پر لانا مشکل ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ اب مجھے بھی گریز کا کوئی راستہ نہیں مل رہا ، سوائے اس کے کہ "آمدم بر سرِ مطلب" کا سہارا لے کر گیوں کہ ڈی ۔ بی ہائی اسکول دیپالپور (حال ضلع اوکاڑہ) میں پہنچتے ہی ڈنڈے کا خوف یوں میرے دل سے نکل گیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں

اگر ماسٹر امر سنگھ صاحب کی انصاف پسندی چار عدد ضرب بید کا تقاضا نہ کرتی تو میں کہتا کہ دیپالپور کے تین سالوں میں میں نے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے ۔ "گینیز ریکارڈ بک" میں محفوظ ہو جانا چاہیئے ۔

یہ ریکارڈ صرف اس وجہ سے قائم ہوا کہ میرے والدِ محترم اسی اسکول میں اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے ۔ اُن کے سبب "ڈنڈا" میرا لحاظ کرتا تھا اور معمولی غلطیوں سے درگزر فرما دیتا تھا ۔ پڑھائی میں جو کمی تھی ، وہ میں نے چھ مہینوں کے اندر اندر پوری کر لی تھی ۔ کچھ اتفاق یہ بھی ہوا کہ آٹھویں جماعت میں قابلیت کے اعتبار سے کوئی لڑکا مجھ سے زیادہ بلند قامت بھی نہیں تھا ۔ شروع شروع میں ہنس راج کی انگریزی مجھ سے بہتر تھی حالانکہ قدبُت کے لحاظ سے وہ مجھ سے بلکہ ساری کلاس سے کہتر تھا اور ہم اُسے محبت سے "مینڈا" کہہ کر پکارتے تھے کہ اس میں "ہنس" والی کوئی بات نہیں تھی ۔

جب آٹھویں جماعت کا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا تو انگریزی میں میرے نمبر بہت کم آئے ۔ پرچہ ملا تو میں رو پڑا ۔ انگریزی ہمیں ایک نہایت ہی شفیق اور بے ضرر قسم کے سکھ ماسٹر نرنجن سنگھ صاحب پڑھایا کرتے تھے ۔

وہ کہنے لگے "کاکا ! رونے سے کام نہیں چلے گا ۔ محنت کرو گے تو اچھے نمبر آیا کریں گے ۔"

میں نے یونہی کہہ دیا کہ میرے اتنے کم نمبر تو نہیں آنے چاہئیں تھے ۔

وہ سمجھے کہ میں نے اُن کی دیانت پر شک کیا ہے ۔

فرمانے لگے "تُو ماسٹر امیر شاہ کا بیٹا ہے ورنہ اس گستاخی پر میں تیرا مغدود (مغز) پھے کنڈا (پچکا دیتا) ۔ تجھے میں نے رعایتی نمبر دے کر پاس کیا ہے ۔"

میں پہلے رو رہا تھا ، اب رونا بھول کر تھر تھر کانپنے لگا ۔

شام کو وہ ہمارے گھر آ دھمکے تو میرا خون ہی خشک ہو گیا ۔

کہنے لگے "کاکا ! ذرا اپنا انگریزی کا پرچہ تو لاؤ ۔"

تب والد صاحب کی موجودگی میں انہوں نے میری انگریزی کا وہ تیا پانچا کیا کہ میں پھر رونے لگا ۔ انہوں نے دلاسا دینے کے لیے میرے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا تو یوں لگا کہ مغز اب پچکا کہ پچکا ۔

میری خوش قسمتی تھی کہ والدِ مرحوم نے منشی فاضل کرنے کے بعد انگریزی میں امتحان دے کر میٹرک پاس کر لیا تھا اور اس میں فسٹ ڈویژن کے نمبر حاصل کیے تھے ۔ انہوں نے آٹھویں جماعت کی انگریزی کی کتاب مجھے کچھ اس طرح سے پڑھائی کہ میں از خود انگریزی کے سادہ سادہ فقرے لکھنے پر قادر ہو گیا ۔ نوماہی امتحان میں انگریزی سمیت ہر مضمون میں اوّل آیا تو میری لیاقت کی دھوم مچ گئی ۔ چنانچہ مڈل اسکول امتحان کے لیے جو چار پانچ لڑکے منتخب ہوئے ، اُن میں میرا نام سرِ فہرست تھا ۔ اس اثنا میں ماسٹر نرنجن سنگھ تبدیل ہو گئے تھے اور اُن کی جگہ ماسٹر امر سنگھ ہمیں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے تھے ۔ انہیں واقعی انگریزی آتی تھی اور پیریڈ میں اتنا پڑھا دیتے تھے کہ اوور ٹائم کلاس لینے کی ضرورت نہیں تھی تاہم انہیں سو فی صد نتیجہ دکھانے کا نہایت احسن "خبط" تھا ۔ یوں بھی اُن دنوں اچھا نتیجہ دکھانے پر اُستادوں کی کم از کم زبانی کلامی خاصی قدر افزائی ہوتی تھی ۔ آج یہ بھی مفقود ہے ۔ وظیفے کے امتحان میں جانے والے طالب علموں کو وہ اوور ٹائم دیا کرتے تھے اور اس کا قطعاً کوئی معاوضہ طلب نہ کرتے تھے ۔ میں ایک دن اس کلاس میں دیر سے پہنچا تو انہوں نے وہ چار تاریخی ڈنڈے لگائے جن کا میں ذکر کر چکا ہوں ۔ میں نے والد صاحب

سے کہا کہ میں آئندہ اوور ٹائم پڑھنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ والد صاحب نے ماسٹر امر سنگھ جی سے معذرت کر لی اور میری جان چھوٹی باقی لڑکے پڑھتے رہے۔

مڈل اسکول امتحان میں میں نے اپنے ساتھیوں سے زیادہ نمبر لیے اور ضلع منٹگمری (حال ساہی وال و اوکاڑہ) کے دیہاتی حلقے کے طلبا میں اوّل آیا تاہم کسی وجہ سے وظیفہ نہ ملا۔

ماسٹر امر سنگھ جی کہا کرتے تھے "بچو! اوور ٹائم پڑھ لیتے تو وظیفہ ضرور آجاتا۔"

اس واقعے سے پانچ چھ سال بعد فیروز پور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن پر ایک دن علی الصبح اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اُن دنوں فیروز پور چھاؤنی میں ملازم تھا۔ اسٹیشن سے قریب ہی میری رہائش تھی۔ صبح دفتر جانے سے پہلے کبھی کبھار میں پلیٹ فارم پر سیر کرنے کو آیا کرتا تھا۔ ایک دن پلیٹ فارم پر بچھے ایک بینچ کے پاس سے گزرا تو وہاں بیٹھے ایک شخص نے میرا نام پکارا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک نہایت ہی پریشان مُو اور دراز ریش سکھ بینچ پر سے اُٹھا اور میری طرف بڑھا۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تو وہ خوفناک سکھ مجھے کندھوں سے پکڑ کر کہنے لگا۔

"ارے کاکا! مجھے پہچانا نہیں۔"

میں نے ڈری سہمی آواز میں کہا "جی نہیں۔"

"میں ماسٹر امر سنگھ ہوں۔"

اُن کے کہنے کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی سمٹی سمٹائی بانکی سی داڑھی اور نہایت مہارت سے بندھی پگڑی کے نیچے چھپے ہوئے بالوں والے ماسٹر امر سنگھ ہیں کہ جو کبھی مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ میرا ہونقوں کی طرح کھلا منہ دیکھ کر مُسکرائے اور کہا "میں نے کیس اور داڑھی کھول رکھے ہیں۔ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے؟"

میں نے اپنے کوائف بتائے تو کہنے لگے "بچو! اوور ٹائم پڑھ لیتے تو تمہارا وظیفہ ضرور آجاتا، پھر تم ایف اے کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکتے۔"

تھوڑا سا سوچنے کے بعد اُن کا مطلب میری سمجھ میں آیا یعنی ایک بار وظیفے کا چسکا لگ جاتا تو میٹرک میں بھی وظیفہ لیتا اور انٹر میں بھی۔ اس طرح اپنا تعلیمی خرچ آپ ادا کر کے کالج میں پڑھتا رہتا۔

پھر کہنے لگے "چلو کوئی بات نہیں، آئندہ خیال رکھنا۔"

"آئندہ خیال رکھنا۔" کا واقعی کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ بعد ازاں پرائیویٹ طور پر جو بی۔ اے، ایم۔ اے کیے، وہ اپنے "اوور ٹائم" ہی میں پڑھ کر کیے گویا ماسٹر امر سنگھ جی کا مشورہ قطعی بے معنی نہیں تھا اگرچہ وظیفہ آج تک نہیں ملا۔

آٹھویں جماعت میں اُردو اور فارسی میں نے اپنے والدِ مرحوم سے پڑھی۔ یہ میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ چند ناگزیر حالات کی وجہ سے والدہ محترمہ گاؤں میں رہنے پر مجبور تھیں۔ آٹھویں نویں اور دسویں کے تین سالوں میں میرے والد میری ماں بھی تھے اور باپ بھی۔ صبح نماز کے بعد وہ مجھے ناظرہ قرآن پڑھاتے، ظہر کی نماز کے بعد انگریزی۔ بچوں کی جن ضروریات کا خیال مائیں رکھتی ہیں، اب اُن کا خیال میرے والدِ مرحوم کو رکھنا پڑتا تھا۔ کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو اُسے سی دیتے، بٹن ٹوٹ جاتا تو ٹانک دیتے۔ روٹی ہاتھ سے پکا کر کھلاتے تھے۔ ان کے اس رول میں میرے لیے کوئی اجنبیت نہیں تھی البتہ جب میں اُن کے پیریڈ میں پہلی بار بیٹھا تو ایک عجیب سی کیفیت مجھ پہ طاری رہی۔ پندرہ سولہ ہم جماعتوں

کی موجودگی میں انہیں اُستاد کی حیثیت سے قبول کرنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی۔ میں ایک نہایت تکلیف دہ ذہنی خلفشار سے گزرا اور سارا سال اسی کیفیت میں بیتا۔

مولوی سید ممتاز علی کی مرتبہ "خیابانِ اُردو" میں افسانے بھی تھے اور غزلیں بھی۔ مومن کی "ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے" والی غزل بھی اسی کتاب میں شامل تھی۔ اب مجھے یاد نہیں آرہا کہ والدِ مرحوم نے اس کی تشریح کس انداز میں کی ہوگی اور میں نے اُس سے کیا تاثر لیا۔ پروفیسر جادو ناتھ سرکار کی تاریخی تحقیق کا ایک ترجمہ بھی شاملِ نصاب تھا جس میں اُنہوں نے "نورجہاں اور جہانگیر" کے عشق کو تاریخی شواہد کی روشنی میں قصہ کہانی قرار دیا تھا لیکن ضمناً یہ قصہ بھی بیان کر دیا تھا۔ غالباً کبوتروں کے اُڑنے والا خوبصورت ایپی سوڈ EPISODE بھی اس میں موجود تھا۔ یہ بھی اُن سے پڑھا۔

والدِ محترم افسانے کی درس و تدریس میں بہت لطف پیدا کرتے تھے۔ منشی پریم چند کا افسانہ "پنچایت" بذاتہٖ دلچسپ نہیں۔ اور آٹھویں جماعت کے طلبا کے لیے خاصا مشکل بھی ہے لیکن انہوں نے اسے اس قدر خوبصورتی سے پڑھایا کہ عجیبی سے عجیبی لڑکوں نے بھی اسے سراہا اور میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے (جذبے کی شدت میں میں اکثر اس کیفیت سے گزرتا ہوں، جسم میں جھنجھناہٹ سی پیدا ہوتی ہے اور روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں)۔ اس ریڈنگ کے بعد افسانے کی تشریح و توضیح میں انہیں بہت محنت کرنی پڑی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب میں نے افسانہ لکھنا شروع کیا، تو والدِ محترم نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔

میں افسانے کے ساتھ اپنا جو "رابطہ" لکھنا چاہتا ہوں، اُس میں مفصّل بیان کروں گا کہ والد صاحب کی افسانوی قرأت اور اپنی زندگی کے حالات کے افسانوی بیان نے میرے ذوقِ افسانہ کو کیسے بیدار کیا اور مہمیز لگائی۔

میں نے والدِ مرحوم کو کبھی کسی لڑکے کو بید کی سزا دیتے نہیں دیکھا، زیادہ سے زیادہ کان کھینچتے تھے، ایک ہندو لڑکے سوہن لال کی طبیعت میں خاصا مزاح تھا۔ اُس نے والد صاحب سے کئی بار کہا کہ مجھے کم از کم ایک ڈنڈا ضرور لگا دیجئے کہ اس کی برکت سے میں دوسرے اساتذہ کے ڈنڈوں سے بچا رہوں۔

ہندو اور مسلمان دونوں طلبا والد صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں میں اُستاد کا عزت کا جذبہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ والد صاحب بازار سے گزرتے تو اُن کے ہندو شاگرد جو اب دکانداری کرتے تھے اُٹھ اُٹھ کر انہیں تعظیم دیتے تھے۔ ایک طرّہ دار پگڑی والے طرحدار نوجوان نے گھوڑے سے اُتر کر اُن کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا تو میں نے پوچھا "یہ کون تھا؟" فرمایا "میرا ایک پرانا ہندو شاگرد ہے اور گاؤں کا زمیندار ہے۔" گاؤں کا نام حافظے سے محو ہوگیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے یعنی ۱۹۲۷ء میں لوگ استاد کی عزت کرتے تھے لیکن والدِ محترم اُن اساتذہ میں سے تھے کہ جو اپنی شرافت، حُسنِ اخلاق اور قناعت و استغنا کی بنا پر لوگوں کو عزیز تھے۔

نویں جماعت میں میرے اُردو اور فارسی کے اُستاد حمید اللہ خان مرحوم تحصیل نگینہ، ضلع نجیب آباد کے پٹھان تھے۔ چھوٹے قد کے دُبلے پتلے آدمی تھے بلکہ منحنی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے قدم اُٹھا کر تیز تیز چلتے تھے، پھر بھی بظاہر سُست رفتار ہمراہیوں سے بھی پیچھے رہ جاتے تھے۔ شیروانی اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں سُبک سی چھڑی ضرور رکھتے تھے۔ سر پر دوپلی ٹوپی۔ دیپالپور میں اُردو بولنے والے دو چار آدمی اور بھی تھے لیکن اُن کی وضع قطع پر پنجابی چھاپ لگ چکی تھی مثلاً میرے ہم جماعت اور میرے دوست میر عماد حسین زیدی

تو باہر پنجابی بولتے تھے اور گھر میں اُردو ۔ اُن کے چچا میر تقی حیدر زیدی کی زبان میں اُردو زیادہ تھی اور پنجابی کم لیکن دونوں کا ملاپ ہو چکا تھا اور اُن کی اُردو سُن کر مجھے تو بہت لطف آتا تھا۔ اُن کے لباس میں بھی شیروانی اور شلوار کا ملاپ بھی ہو چکا تھا لیکن خان حمید اللہ مرحوم نے اپنی وضع ترک نہ کی تھی۔ شین کاف سے درست لہجے میں اُردو بولتے تھے۔ اُن کی تقریر میں بہت تکلف تھا۔ اُردو روزمرّہ اور محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لفظوں، ترکیبوں اور عبارات کی تشریح و توضیح میں اُنہیں کمال حاصل تھا یعنی زباندانی کی حد تک اُن کی تدریس نہایت موثر تھی لیکن 'ادب' سے انہیں زیادہ شغف نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں، "پنجاب میں اُردو" کے بظاہر خشک موضوع پر تحقیق کی داد دینے والے ڈاکٹر محمود شیرانی نے میٹرک نویں دسویں کے لیے اُردو کا نصاب مرتّب کیا تو اُسے اُردو ادب کی ایک دلچسپ ANTHOLOGY بنا دیا۔ اس کا نام بھی کتنا موزوں تھا یعنی 'سرمایۂ اُردو"۔ اس کے حصّۂ نثر میں داستان بھی تھی اور افسانہ بھی۔ اُستادِ گرامی حمید اللہ خان داستان اور افسانے میں سے یوں گزر گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں یعنی میرے ذوقِ افسانہ کو مزید کوئی مہمیز نہ لگی۔ مولانا الطاف حسین حالی کے مضمون "محاورہ اور روزمرّہ کا فرق" کو اُنہوں نے جتنی دلچسپی سے پڑھایا، اتنی ہی اُکتاہٹ سے ہم نے پڑھا۔

مضمون لکھواتے تو ایک فہرست محاوروں کی ضرور لکھواتے کہ انہیں مضمون میں مناسب مقامات پر استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ مَیں کسی مضمون میں 'ادب' برتنے کی کوشش کرتا تو اس کی تحسین نہ کرتے۔ "چاندنی رات کا منظر" میں مَیں نے کچھ زیادہ ہی ادبیت دکھائی تو بہت ناراض ہوئے۔ کہتے تھے کہ صحیح زبان لکھو اور روزمرّہ و محاورہ کا خیال رکھو، بات اُن کی بھی ٹھیک تھی۔ صحیح زبان پہلے اور ادب بعد میں آتا ہے لیکن بے چارہ پنجابی اس صلاحیت کے باوجود کہ یو پی کے بعد سب سے زیادہ اُردو شناس بھی ہے اور اُردو کا عاشق بھی، پھر بھی روزمرّہ اور محاورے کی غلطی نہ کرے تو اُسے پنجابی کون کہے۔ ۱۹۲۸ اور ۱۹۲۹ء میں روزمرّہ اور محاورہ کی جو غلطیاں مَیں نویں اور دسویں میں کرتا تھا، وہی اب بھی کرتا ہوں اور جن غلطیوں کی اصلاح پر استادِ محترم زور دیتے تھے، اُنہیں کی درستی مَیں بھی اُستاد کے طور پر اپنے شاگردوں سے کرواتا رہا اور نثر نگار کے طور پر وہی غلطیاں خود کرتا رہا اور انشاءاللہ کرتا رہوں گا۔

عبدالقادر، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد اور سعادت حسن منٹو جیسے پنجابی ادیب تو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں کہ اہلِ زبان بھی ان کا "پانی بھریں"۔

اور اس دور کی اُردو نثر میں پنجابی لب و لہجہ اور محاورہ جس بے سلیقگی سے ٹھونسا جا رہا ہے، اُسے خان حمید اللہ مرحوم پڑھ لیتے تو شدّتِ غم میں غش کھا جاتے، خاص طور پر ٹی۔ وی کے اُردو ڈرامے کو دیکھ کر تو وہ واصل بالحق ہو جاتے تاہم کبھی کبھار وہ اپنی اُردو میں پنجابی کا کوئی لفظ بھی استعمال کر جاتے تو لہجے کی اجنبیت بہت مزا دیتی۔ لڑکے فرمائش کرکے کچھ پنجابی الفاظ اُن کی زبان سے ادا کرواتے تو بہت لطف آتا مثلاً 'مدّھر' (پیٹ) کو وہ "ڈھیڈ" کہتے۔

شعر کی تشریح اچھی کرتے لیکن شعر فہمی کا ذوق پیدا نہ کرتے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار

جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو مَیں

مَیں اب تک حیران ہوں کہ "اپنی خبر" کی تشریح پر وہ دیر تک متذبذب کیوں رہے اور پھر یہ اصلاح کیوں کروائی کہ "اپنی" کی جگہ "اس کی" لکھ لو۔ اب شعر کے معنی اتنے صاف ہو گئے کہ سردار وزیر سنگھ کی سمجھ میں بھی آ گئے اور اُس نے اس کا بہت لطف اٹھایا اور سر ہلا کر داد دی۔ اتفاق سے

اپنی کتاب پر جو اصلاح میں نے کی تھی، وہ والد صاحب نے اتفاقاً دیکھ لی اور چونک گئے۔ فرمانے لگے "یہ لفظ تم نے بدلا ہے؟" میں نے کہا "نہیں جی! خاں صاحب نے بدلوایا ہے۔"

وہ پہلے تو خاموش رہے۔ پھر کہا کہ پہلا لفظ ہی ٹھیک ہے۔ بعد میں اس شعر کی جو تشریح انہوں نے کی، وہ میری سمجھ میں آگئی اور میں نے بہت لطف اُٹھایا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ خاں صاحب نجیب آبادی پٹھان تھے۔ جب غصے میں آتے تو آتش بیاں ہو جاتے۔ یُوں بہت کم سزا دیتے تھے لیکن غصے کے عالم میں چھڑی سے خوب کام لیتے۔ عام طور پر ہنڈی شرارت پر نہیں غصہ آتا تھا لیکن جماعت کے کمرے کی عام فضا ڈر یا گھٹن کی نہیں ہوتی تھی۔ تعداد بہت کم تھی، اس لیے ہر لڑکے کے مزاج سے خوب واقف تھے۔

سردی کے موسم میں باہر دھوپ میں کلاس لیتے۔ کُرسی پر اُکڑوں بیٹھ جاتے اور کہتے "یاد کرو۔ میں ابھی سبق سُنوں گا۔" سردیوں کی دھوپ بہت خواب آور ہوتی ہے۔ ذرا سکون ہو تو آنکھیں خود بخود مُندھ جاتی ہیں۔ خاں صاحب کی آنکھیں ذرا بوجھل ہوتیں، تو لڑکے ایک دوسرے سے چُہلیں شروع کر دیتے۔ جماعت میں سب سے کم سِن لڑکا روشن لال تھا اور شرارتی بھی بہت تھا۔ ایسی چُٹکی بھرتا کر چیخ نکل جاتی۔ ایک دن میں نے اس کی شرارت کا جواب شرارت سے دیا اور اُس کی "اُف" نکل گئی تو خاں صاحب کی نیم وا آنکھیں کُھل گئیں۔

ذرا توقف کے بعد کہنے لگے "اب تو میر صاحب بھی بھینی بھینی شرارتیں کرنے لگے ہیں" وہ مجھے "میر صاحب" کہا کرتے تھے۔

ابھی میں پوری طرح شرمندہ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اُنہوں نے آنکھیں پھر موند لیں۔

خاں صاحب کی طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ وزیر سنگھ کے ساتھ کبھی کبھار کوئی چٹکلہ چل جاتا تھا۔ وہ بھی تُرت جواب دیتا تھا لیکن آدابِ شاگردی کو ملحوظ رکھ کر۔ وہ ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول دیپالپور کا قدیم ترین طالب علم تھا۔ تقریباً پانچ سال سے دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ عمر میں اکیس بائیس سال سے کیا کم ہوگا لیکن ابھی "لڑکپن" کی منزل میں تھا اور اس سے نکلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مونا سکھ تھا۔ نہ داڑھی، نہ کیس۔ قلعہ تارا سنگھ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چھریرے بدن کا نہایت گورا چٹا خوبصورت نوجوان تھا۔ اسکول کبھی کبھار آتا تھا۔ وہ بھی مدگھوڑے کی گھمّی پر سوار ہو کر۔ اس دن وہ صبح کی حمد و مناجات کہلاتا۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا

باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جمال تیرا

یہ "حمد" اب بھی میرے کان میں رَس گھول رہی ہے۔

ایک بار تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ اُردو کی کلاس میں بھی حاضر ہوا۔ خاں صاحب اُسے کچھ نصیحت کرنا چاہتے تھے کہ وہ بول اُٹھا "جناب! ان دنوں آپ کی صحت پہلے سے کہیں بہتر نظر آتی ہے۔"

"اپنے! تو کیا سمجھتا ہے ہمیں۔ روزانہ ایک سیر دُودھ کی بالائی سے ناشتا کرتے ہیں۔"

"اوہ! ایک سیر دودھ کی بالائی!" اُس نے جھوٹ موٹ حیرت کا اظہار کرنے کے لیے "اوہ" کو بہت لمبا کھینچا تو پوری کلاس چونک گئی۔

"ہاں! پورے ایک سیر دُودھ کی بالائی ...... دودھ تو بچے پی لیتے ہیں اور بالائی ہم چٹ کر جاتے ہیں ... ذرا ڈھیٹ بن کر۔"

لڑکے ہنس پڑے لیکن وزیر سنگھ بھونچکا سا رہ گیا۔

تو باہر پنجابی بولتے تھے اور گھر میں اُردو۔ اُن کے چچا میر تقی حیدر زیدی کی زبان میں اُردو زیادہ تھی اور پنجابی کم لیکن دونوں کا ملاپ ہو چکا تھا اور اُن کی اُردو سُن کر مجھے تو بہت لطف آتا تھا۔ اُن کے لباس میں بھی شیروانی اور شلوار کا ملاپ بھی ہو چکا تھا لیکن خان حمید اللہ مرحوم نے اپنی وضع ترک نہ کی تھی۔ شین کاف سے درست لہجے میں اُردو بولتے تھے۔ اُن کی تقریر میں بہت لُطف تھا۔ اُردو روزمرّہ اور محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لفظوں، ترکیبوں اور عبارت کی تشریح و توضیح میں اُنہیں کمال حاصل تھا یعنی زباندانی کی حد تک اُن کی تدریس نہایت موثر تھی لیکن 'ادب' سے انہیں زیادہ شغف نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں، "پنجاب میں اُردو" کے بظاہر خشک موضوع پر تحقیق کی داد دینے والے ڈاکٹر محمود شیرانی نے جب نویں دسویں کے لیے اُردو کا نصاب مرتّب کیا تو اُسے اُردو ادب کی ایک دلچسپ ANTHOLOGY بنا دیا۔ اس کا نام بھی کتنا موزوں تھا یعنی "سرمایۂ اُردو"۔ اس کے حصّہ نثر میں داستان بھی تھی اور افسانہ بھی۔ اُستادِ گرامی حمید اللہ خان داستان اور افسانے میں سے یوں گزر گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں یعنی میرے ذوقِ افسانہ کو مزید کوئی مہمیز نہ لگی۔ مولانا الطاف حسین حالی کے مضمون "محاورہ اور روزمرّہ کا فرق" کو اُنہوں نے جتنی دلچسپی سے پڑھایا اُتنی ہی اُکتاہٹ سے ہم نے پڑھا۔

مضمون لکھواتے تو ایک فہرست محاوروں کی ضرور لکھواتے کہ انہیں مضمون میں مناسب مقامات پر استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ مَیں کسی مضمون میں 'ادب' برتنے کی کوشش کرتا تو اس کی تحسین نہ کرتے۔ "چاندنی رات کا منظر" میں مَیں نے کچھ زیادہ ہی ادبیت دکھائی تو بہت ناراض ہوئے۔ کہتے تھے کہ صحیح زبان لکھو اور روزمرّہ و محاورہ کا خیال رکھو۔ بات اُن کی بھی ٹھیک تھی۔ صحیح زبان پہلے اور ادب بعد میں آتا ہے لیکن بے چارہ پنجابی اس صلاحیت کے باوجود کہ یُوپی کے بعد سب سے زیادہ اُردو شناس بھی ہے اور اُردو کا عاشق بھی، پھر بھی روزمرّہ اور محاورے کی غلطی نہ کرے تو اُسے پنجابی کون کہے۔ ۱۹۲۸ اور ۱۹۲۹ء میں روزمرّہ اور محاورہ کی جو غلطیاں مَیں نویں اور دسویں میں کرتا تھا، وہی اب بھی کرتا ہوں اور جن غلطیوں کی اصلاح پر استادِ محترم زور دیتے تھے، اُنہیں کی دُرستی میں بھی اُستاد کے طور پر اپنے شاگردوں سے کرواتا رہا اور نثر نگار کے طور پر وہی غلطیاں خود کرتا رہا اور انشاءاللہ کرتا رہوں گا۔

عبدالقادر، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد اور سعادت حسن منٹو جیسے پنجابی ادیب تو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں کہ اہلِ زبان بھی ان کا "پانی بھریں"۔

اور اس دَور کی اُردو نثر میں پنجابی لب و لہجہ اور محاورہ جس بے سلیقگی سے ٹھونسا جا رہا ہے، اُسے خان حمید اللہ مرحوم پڑھ لیتے تو شدّتِ غم میں غش کھا جاتے۔ خاص طور پر ٹی۔ وی کے اُردو ڈرامے کو دیکھ کر تو وہ واصل بالحق ہو جاتے تاہم کبھی کبھار وہ اپنی اُردو میں پنجابی کا کوئی لفظ بھی استعمال کر جاتے تو لہجے کی اجنبیت بہت مزا دیتی۔ لڑکے فرمائش کر کے کچھ پنجابی الفاظ اُن کی زبان سے ادا کرواتے تو بہت لطف آتا مثلاً "ڈِڈھ (پیٹ) کو وہ "ڈھیڈ" کہتے۔

شعر کی تشریح اچھی کرتے لیکن شعر فہمی کا ذوق پیدا نہ کرتے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

مَیں اب تک حیران ہوں کہ "اپنی خبر" کی تشریح پر وہ دیر تک متذبذب کیوں رہے اور پھر یہ اصلاح کیوں کروائی کہ "اپنی" کی جگہ "اس کی" لکھ لو۔ اب شعر کے معنی اتنے صاف ہو گئے کہ سردار منظور سنگھ کی سمجھ میں بھی آ گئے اور اُس نے اس کا بہت لطف اُٹھایا اور سر ہلا کر داد دی۔ اتفاق سے

اپنی کتاب پر جو اصلاح میں نے کی تھی، وہ والد صاحب نے اتفاقاً دیکھ لی اور چونک گئے۔ فرمانے لگے "یہ لفظ تم نے بدلا ہے؟" میں نے کہا "نہیں جی! خاں صاحب نے بدلوایا ہے۔"

وہ پہلے تو خاموش رہے۔ پھر کہا کہ پہلا لفظ ہی ٹھیک ہے۔ بعد میں اس شعر کی جو تشریح اُنھوں نے کی، وہ میری سمجھ میں آگئی اور میں نے بہت لطف اُٹھایا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ خاں صاحب نجیب آبادی پٹھان تھے۔ جب غصے میں آتے تو آتشِ بجاں ہو جاتے۔ یُوں بہت کم سزا دیتے تھے لیکن غصے کے عالم میں چھڑی سے خوب کام لیتے۔ عام طور پر بھونڈی شرارت پر انہیں غصہ آتا تھا لیکن جماعت کے کمرے کی عام فضا ڈر یا گھٹن کی نہیں ہوتی تھی۔ تعداد بہت کم تھی، اس لیے ہر لڑکے کے مزاج سے خوب واقف تھے۔

سردی کے موسم میں باہر دھوپ میں کلاس لیتے۔ کُرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور کہتے "یاد کرو۔ میں ابھی سبق سُنوں گا۔" سردیوں کی دھوپ بہت خواب آور ہوتی ہے۔ ذرا سکون ہو تو آنکھیں خود بخود مُندھ جاتی ہیں۔ خاں صاحب کی آنکھیں ذرا بوجھل ہوتیں، تو لڑکے ایک دوسرے سے چُہلیں شروع کر دیتے۔ جماعت میں سب سے کم سن لڑکا روشن لال تھا اور شرارتی بھی بہت تھا۔ ایسی چُٹکی بھرتا کہ چیخ نکل جاتی۔ ایک دن میں نے اس کی شرارت کا جواب شرارت سے دیا اور اُس کی 'اُف' نکل گئی تو خاں صاحب کی نیم وا آنکھیں کُھل گئیں۔

ذرا توقف کے بعد کہنے لگے "اب تو میر صاحب بھی بھینی بھینی شرارتیں کرنے لگے ہیں۔" وہ مجھے 'میر صاحب' کہا کرتے تھے۔ ابھی میں پوری طرح شرمندہ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اُنھوں نے آنکھیں پھر موندھ لیں۔

خاں صاحب کی طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ وزیر سنگھ کے ساتھ کبھی کبھار کوئی چٹکلہ چل جاتا تھا۔ وہ بھی تُرت جواب دیتا تھا لیکن آدابِ شاگردی کو ملحوظ رکھ کر۔ وہ ڈی۔ بی ہائی اسکول دیپالپور کا قدیم ترین طالب علم تھا۔ تقریباً پانچ سال سے دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ عمر میں اکیس بائیس سال سے کیا کم ہوگا لیکن ابھی "لڑکپن" کی منزل میں تھا اور اس سے نکلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ موٹا سکھ تھا۔ نہ داڑھی، نہ کیس۔ قلعہ تارا سنگھ کے ایک بہت بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چھریرے بدن کا نہایت گورا چٹا خوبصورت نوجوان تھا۔ اسکول کبھی کبھار آتا تھا۔ وہ بھی وہ گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر۔ اس دن وہ صبح کی حمد و مناجات کہلاتا۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا

باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جمال تیرا

یہ 'حمد' اب بھی میرے کان میں رَس گھول رہی ہے۔

ایک بار تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ اُردو کی کلاس میں بھی حاضر ہوا۔ خاں صاحب اُسے کچھ نصیحت کرنا چاہتے تھے کہ وہ بول اُٹھا "جناب! ان دنوں آپ کی صحت پہلے سے کہیں بہتر نظر آتی ہے۔"

"ایسے! تو کیا سمجھتا ہے ہمیں۔ روزانہ ایک سیر دُودھ کی بالائی سے ناشتا کرتے ہیں۔"

"اوہ! ایک سیر دودھ کی بالائی!" اُس نے جھُوٹ مُوٹ حیرت کا اظہار کرنے کے لیے 'اوہ' کو بہت لمبا کھینچا تو پوری کلاس چونک گئی۔

"ہاں! ہاں ایک سیر دُودھ کی بالائی . . . . . . دودھ تو بچے پی لیتے ہیں اور بالائی ہم چٹ کر جاتے ہیں . . . . ذرا ڈھیٹ بن کر۔" لڑکے ہنس پڑے لیکن وزیر سنگھ بھونچکا سا رہ گیا۔

اُن کے ہاں روزانہ منوں دودھ کی بالائی اُترتی ہوگی اور خاں صاحب ایک سیر دودھ کی بالائی سے بچوں کو محروم رکھ کر کتنا شرمندہ ہو رہے تھے۔

شرمندہ تو وزیر سنگھ کو ہونا چاہیئے تھا اور وہ ہوا بھی۔

یہ آج سے پورے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔

الحمد للہ ٹیوشن کا فیشن عام ہونے کی وجہ سے آج کے اُستاد کی توفیق میں ڈیڑھ گنا اضافہ ضرور ہوگیا ہے یعنی وہ ایک سیر کی بجائے ڈیڑھ لیٹر دودھ روزانہ خرید سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں آدھ لیٹر پانی ہوتا ہے اور دودھ پر بالائی آتی ہی نہیں۔

اور اُسے ڈھیٹ بن کر بچوں کا حق نہیں مارنا پڑتا۔

آج کے زمانے میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دیگر کھیل تماشے عام ہونے کی وجہ سے محفل آرائی بہت کم ہوگئی ہے۔ چنانچہ گفتگو میں جو لذت تھی، اُس سے آج کا پڑھا لکھا آدمی محروم ہوگیا ہے۔ دیپالپور میں اکثر دوپہر کے بعد شام تک ہمارے ہاں محفل لگتی تھی جس میں خاں صاحب بھی شریک ہوتے اور "مہندو" بھی جو ان پڑھ تھا لیکن اسے پڑھے لکھے لوگوں کے پاس بیٹھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ذات کا نائی تھا لیکن نہایت "بے زبانی"۔ اس محفل میں سیاسی گفتگو بھی ہوتی اور علمی و ادبی موضوعات بھی زیرِ بحث آتے۔ مہندو کا اصل نام محمد بخش تھا۔ وہ سیاست پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ غالباً احراری تھا اور ایک دوبار قیدو بند کی لذت بھی چکھ چکا تھا۔ سیاسی گفتگو میں وہ ضرور حصّہ لیتا لیکن دوسرے موضوعات پر لب بستہ رہتا۔ خاں صاحب کا دل پسند موضوع مذہب تھا اور مناظرے سے اُنہیں بہت دل بستگی تھی۔ مناظرہ بھی کوئی بُری چیز نہیں بشرطیکہ اس میں مجادلے کا رنگ پیدا نہ ہو۔ خاں صاحب بڑے زبردست سُنّی تھے اور میرے والدِ محترم نہایت معتدل شیعہ۔ ان سے بحث ہوتی تو اس میں منطقی اور عقلی پلّہ بھاری رہتا لیکن جونہی اس بحث میں میرے ایک نوجوان اُستاد خاں راغب حسین بھی شریک ہوتے تو مناظرے کا رنگ بدل جاتا۔ وہ غالی شیعہ تھے۔ دونوں غصّے میں آجاتے تاہم والد صاحب ماڈریٹر کا فریضہ نہایت خوبی سے ادا کرتے اور "تُو تُو مَیں مَیں" کی منزل بھی نہ آتی۔ مجھے اور میرے کزن ناظر حسین بخاری کو اس بحث میں بہت مزہ آتا لیکن ہم غیر جانبدار سامع نہیں تھے۔ غیر جانبداری کا مظاہرہ صرف "مہندو" کی پُر اسرار خاموشی میں ہوتا۔ پوری بحث کے دوران اُس کی لبوں پر لٹکی مونچھوں میں ایک طنزیہ ہنسی پھنسی پھنسی سی رہتی۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہوا کہ وہ شیعہ ہے یا سُنّی۔

اگلے روز خاں صاحب اپنے پیریڈ میں بحث کی تکمیل کرتے اور ایسے ایسے براہینِ قاطعہ سے کام لیتے کہ اُن کی بجائے ہمیں دانتوں پسینہ آجاتا۔ پندرہ سولہ لڑکوں کی جماعت میں ہم صرف تین مسلمان تھے، عماد، ناظر اور مَیں اور تینوں اتفاق سے سیّد بھی تھے اور شیعہ بھی۔ لیکن آفرین ہے ہم پر کہ ہم اُستادِ محترم کے سامنے ذرہ بھر لب کشائی کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ اُن پر ہمیں غُصّہ بھی نہ آتا کہ یہ احترامِ اُستاد کے منافی تھا البتہ شرم ضرور آتی تھی کہ ہندو لڑکے کیا کہیں گے۔

عجیب بات تھی کہ خاں صاحب کی طبیعت میں "ہندو مُسلم" تعصب نام کو نہ تھا!

ہنس راج آریہ سماجی ہندو تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خان صاحب سناتن دھرمی مسلمان ہیں اور تم شیعہ مسلمانوں کے آریہ سماجی ہو۔

اُن دنوں دیپالپور میں سناتن دھرمی ہندوؤں اور آریہ سماجیوں میں ایک مناظرہ ہوا جو تین دن جاری رہا۔ خاں صاحب اس کے ہر سیشن میں موجود نظر آئے۔ مناظرہ تھا بھی بہت دلچسپ۔ پولیس کے مسلمان انسپکٹر اس کے منصف مقرر ہوئے تھے۔ مقررین نے

ایک دوسرے کے خلاف نہایت زہریلی تقریریں کیں کہ طنز و مزاح کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہا۔ اس کے باوجود کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ ایک آریہ سماجی مناظر مہاشا منسا رام مجھے اب تک یاد ہے کہ نہایت پُرلطف تقریر کرتا تھا۔ خود بھی ہنستا تھا اور دوسروں کو بھی ہنساتا تھا اور ہنساتے ہنساتے مدِمقابل کو رُلا بھی دیتا تھا۔ اتنی گہری چوٹیں کرتا تھا کہ مزہ آجاتا تھا۔ ہندوؤں کی دیو مالا میں ایک دیوتا گنیش جی مہاراج ہیں کہ ہاتھی کی شکل کے ہیں اور سواری چوہے پر کرتے ہیں۔ مہاشا منسا رام نے مدِمقابل کو مخاطب کر کے کہا "پنڈت جی! گنیش جی مہاراج چوہے پر سوار ہوں اور سامنے سے بلی آجائے تو وہ کون سے بِل میں گھستے ہوں گے؟"

مدِمقابل نے جو دہلوی لب و لہجے میں نہایت شُستہ و رفتہ اُردو بولتے تھے، بھناکر نہایت نامناسب جواب دیا تھا لیکن احترام کے ساتھ۔ مَیں اس جواب کو یہاں لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

خاں صاحب اس مناظرے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ دیپالپور میں ایسا ہی ایک مناظرہ شیعہ سُنی مسلمانوں میں ہونا چاہیئے۔ اب پتہ نہیں کہ اس مناظرے کے زیرِ اثر یا اپنے کسی کام کے لیے قصبے کے ایک معزز زرگر حاجی محمد رمضان کی دُکان پر گئے اور اُن سے مناظرے میں اُلجھ گئے۔ حاجی صاحب نہایت پُرجوش شیعہ تھے اور کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے مناظرے کے آداب، باریکیوں، نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں تھے۔ تن و توش میں خاں صاحب اور حاجی صاحب کا وہی تناسب تھا جو ممولے اور شاہباز میں ہوتا ہے۔ اگرچہ حاجی صاحب غصے میں بہت کم آتے تھے لیکن جب ممولا بار بار شاہباز پر جھپٹ رہا ہو تو اُس بے چارے کو بھی اپنا دفاع کرنا ہی پڑتا ہے۔ زچ ہو کر شاہباز نے ممولے کا جو حال کیا ہوگا، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

والد صاحب نے فرمایا "خاں صاحب! آپ نے محمد رمضان کو بھی امیر شاہ سمجھ لیا ہوگا۔ مناظرہ کرنے سے پہلے اپنے مدِمقابل کا تن و توش تو دیکھ لیا کریں۔" پھر والد صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کے لکھے ہوئے ایک قصے کا حوالہ دیا کہ ایک رئیس کو پہلوانوں کی سرپرستی کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اکھاڑے میں ایک ولایتی (کابلی پٹھان) بھی آگیا۔ رئیس نے پوچھا "خان! کشتی لڑو گے؟"

اُس نے کہا "لڑے گا...... کیوں نہیں لڑے گا!"

رئیس نے دریافت کیا "کس سے؟"

اُس نے اکھاڑے میں اُترے ہوئے پہلوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "سب سے؟" رئیس ہنس پڑا لیکن اکھاڑے کا اُستاد پہلوان اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "حضور! دیکھ لیجئے! یہ راجرس چاقو اور قصاب کے بُغدے میں مقابلہ ہوگا۔"

رئیس نہ مانا۔ کابلی نے اکھاڑے میں اُتر کر کہا "آجاؤ!"

تب سبھی کو ہونے چمٹ گئے اور اُس نے ایک ایک کا کچومر نکال دیا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی روایت کے مطابق، اُن میں سے ایک پہلوان اب تک خون تھوکتا ہے اور دوسرا کُب لیے پھرتا ہے۔

خاں صاحب بھی کمر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے اُن دنوں ذرا جُھک کر چلتے تھے۔

خاں صاحب کا "شیعہ سُنی" اختلاف محض مناظرے کی حد تک تھا۔ اس میں ذاتی پرخاش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ہم سے محبت کرتے تھے اور ہم اُن کے احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ میرے والدِ محترم سے اُنہیں بہت اُنس تھا۔ والد صاحب بیمار ہوتے تو گھر سے پرہیزی کھانا پکوا کر لاتے۔ یُوں بھی گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی، ہمارا حصّہ ضرور دے کر آتے۔ وہی بڑے اور پھلکیاں تو

اب بھی یاد ہیں کہ اُن کے ہاں سے اکثر آیا کرتی تھیں ۔ والد صاحب نے حاجی محمد رمضان مرحوم سے معافی منگوائی تو بہت خوش ہوئے، ایسے لوگ اب دُنیا میں ناپید ہو چکے ہیں !

وہ اپنی طرز کے آدمی تھے اور یہی انفرادیت انسان کو زندہ بھی رکھتی ہے !

نویں دسویں میں ہمیں انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر چودھری مہدی حسن پڑھایا کرتے تھے، وہ سُوٹ پہنتے اور سر پر کلاہ دار پگڑی باندھتے ۔ یہ لباس جاگیرداری کی علامت تھا اور اب بھی ہے ۔ سر سکندر حیات اور اُن کے بعد خضر حیات یہی لباس پہنتے تھے ۔

اساتذہ میں میں نے مسٹر مترا اور چودھری مہدی حسن کو اس لباس میں دیکھا ۔ دونوں کو یہ لباس خوب سجتا تھا ۔ چودھری مہدی حسن تحصیل ریواڑی ضلع حصار (ہریانہ) کے ایک اچھے خاصے زمیندار بھی تھے ۔ شاید سر چھوٹو رام کا بھی اُسی ضلعے سے تعلق تھا ۔ میرے والد مرحوم بتایا کرتے تھے کہ چودھری صاحب کے والد بچپن میں فوت ہو گئے تھے ۔ کچھ زمین ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھی اور کچھ پر رشتہ داروں نے قبضہ کر لیا تھا ۔ چودھری صاحب کو اپنی زمین واگزار کرانے میں ایک عرصہ مقدمہ بازی کرنا پڑی تھی جس پر بہت خرچ اُٹھا تھا ۔ چنانچہ کُفایت شعاری ان کی طبیعت کا ایک جُز بن گئی تھی ۔ اس کے باوجود اچھا لباس پہنتے اور ٹھسّے سے ہیڈ ماسٹری کرتے ۔

اسکول کے خزانے سے کئی فنڈ ہوتے ہیں مثلاً ریڈ کراس، میڈیکل فنڈ اور یونین فنڈ وغیرہ ۔ ان پر کڑی نگرانی رکھتے ۔ مجال ہے کہ ایک پیسہ بھی فضول خرچ ہو جائے ۔ اسکول کے کچھ اُستاد اُن سے ناراض رہتے کہ اُن کی دیانت پر شک کیا جاتا تھا ۔ اور قصبے کے سیاستدان لیڈر قسم کے لوگ بھی اُنہیں اچھا نہ جانتے کہ وہ اپنی ہیڈ ماسٹری میں کسی کو شریک نہ کرتے ۔ یہ لوگ تحصیلدار اور تھانیدار کے سامنے تو رکوع میں چلے جاتے ہیں لیکن اُستاد کے سامنے اتنا اکڑتے ہیں کہ اُن کا سر آسمان سے جا ٹکراتا ہے ۔ چودھری مہدی حسن ایسے لیڈروں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے اور اسکول کے انتظامی معاملات میں اُن کی دخل اندازی کو بزور باز رکھتے تھے ۔

دیپالپور کے قصبے میں دو افسر اہمیت رکھتے تھے ۔ تحصیلدار اور تھانیدار ۔ باقی محکموں کے سربراہ مثلاً انسپکٹر زراعت یا انسپکٹر کوآپریٹو سوسائٹیز وقتاً فوقتاً اُن کے گھر جا کر حاضری دیتے تھے ۔ چودھری صاحب اس سے اجتناب کرتے ۔ ایسے "سر پُر غرور" کو ہر جگہ اور ہر زمانے میں "بے دماغی" کی سزا ملتی رہی ہے ۔ اُن کے خلاف جھُوٹی درخواستوں کا ایک سلسلہ بندھا رہتا ۔ محکمۂ تعلیم وہ واحد محکمہ ہے جو اپنے ماتحت کا دفاع نہیں کرتا اور اس کے افسر انکوائری کرنے میں بہت لذت لیتے ہیں ۔ چنانچہ چودھری مہدی حسن آئے دن ان انکوائریوں کی زد میں رہتے اور حالت یہاں تک پہنچی تھی کہ اُن کے خلاف کوئی انکوائری نہ ہو رہی ہوتی، تو وہ بہت بدمزہ رہتے ۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ملتان ڈویژن کا ایک نہایت متعصب انسپکٹر کاہن چند کھنہ، اپنے سے بھی زیادہ متعصب ڈپٹی انسپکٹر ہرش چندر بالی کے ساتھ اُن کی انکوائری کرنے اچانک اسکول میں وارد ہوا ۔ چودھری صاحب مرحوم ہمیں انگریزی پڑھا رہے تھے کہ چپڑاسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں آکر اطلاع دی "جناب ! بب .... بب .... بڑا صاحب آیا ہے ۔"

چودھری صاحب ہنس کر بولے "اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے ۔ چلو میں آتا ہوں ۔" اُنہوں نے نہایت اطمینان سے اُس پیراگراف کے آخری فقروں کا ترجمہ کیا جو وہ پڑھا رہے تھے ۔ کتاب بند کی، میز سے پگڑی اُٹھا کر سر پر سلیقے سے جمائی ۔ اور نہایت تمکنت سے کمرے سے باہر نکلے ۔

بعد کا قصّہ مجھے والد صاحب کی زبانی معلوم ہوا ۔

آخری مصرعہ میں جب تک مناسب الفاظ کا اضافہ نہ کیا جائے ابلاغ مکمل نہیں ہوتا۔ مثلاً

بہار کی بارش ہو رہی ہے
بہار کی بارش آگئی ہے
یہ بارش بہار کی بارش ہے

مگر درست اُتو اور فاختہ کا مکالمہ اپنی ذات میں بڑا مکمل مکالمہ ہے۔ ایسا FABLE جس کے ساتھ ان گنت امکانات وابستہ کیے جا سکتے ہیں۔

اِسّا کا ہی ایک اور ہائیکو :

یُری کی تو کے تے — برف کے پگھلتے ہی
مُورا اِپّائی نو — گلیاں کوچے بھر گئے
کودومو۔ کا۔ نا۔ — بچے !

اس ہائیکو میں کودومو کا لفظی مطلب بچے ہے، مگر تیسرے مصرعہ کو بامعنی بنانے کے لیے کسی نہ کسی لفظ کی ضرورت ہے۔ "بچوں سے" کیا جائے تو یہ ضرورت کسی نہ کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ کا۔ نا۔ کے الفاظ یہاں بھی موجود ہیں ان کے نہ ہونے سے ہائیکو کے آخری ۵ رکن ادھورے رہ جاتے ہیں۔

ان تمام مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جاپان کے کلاسیکی ہائیکو میں ابلاغ کی ساری ذمہ داری اس فضا پر عائد ہوتی تھی جس فضا میں وہ ہائیکو کہا جاتا تھا۔ شعر کی فضا ہمیشہ شعری تجربہ کے پس منظر سے اُجاگر ہوتی ہے، بہار کی ساری معنویت بہار کے احساس اور شعری تجربہ کی نزاکت پر منحصر ہے ورنہ اُتو کی تیوری تو قائم رہتی ہے۔ بارش بہار کی ہو یا سرما کی اُتو کے ذہن پر نہیں برستی !

اب کچھ مثالیں جدید ہائیکو سے۔ جدید ہائیکو نگاروں میں شیکی، سوسیکی، کیوشی، ہیکی گودو، کیجو، ریونو سُوکے، داکو تسو، ہوسائی، سیوو شُوآوشی، [illegible] ایشی، فوسو ری، یوشا کُتا، ہاکیو، سے سینسوئی، شوسن، ساں کی، کاکیو اور تووتا کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان کے ہاں ہائیکو کے نت نئے تجربات، ہیئتی، غیر ہیئتی، معنوی غیر معنوی سب ہی موجود ہیں۔ شیکی سے بات شروع کرتا ہوں :

یاما۔ نو۔ یو۔ یا — پہاڑی گرم چشمہ
ہادا کا۔ نو۔ رُوتے — ننگے جسموں پر
امانو۔ گاوا — کہکشاں

کوشو، کھوردو سو — مکڑی کو مسلنے
آتو نو سابیشی کی — کے بعد تنہائی
یو سامو۔ کا۔ — ٹھنڈی رات

جدید ہائیکو تک بھی کا۔ نا کی آوازیں اسی طرح روایت کے سہارے چلی آتی ہیں۔

کیجو کا ہائیکو :

چودھری صاحب اپنے دفتر میں پہنچے تو انسپکٹر اُن کی کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میز کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
انسپکٹر نے کہا "پلیز سِٹ ڈاؤن!"
انہوں نے کہا۔ "نو سَر! جب آپ نے میری کُرسی پر قبضہ جما لیا ہے، تو مَیں اس سے یہ مطلب لیتا ہوں کہ مَیں اس وقت ہیڈ ماسٹر نہیں، ایک ملزم ہوں اور ملزم کو کٹہرے میں کھڑا رہنا چاہیئے۔"
انسپکٹر نے درخواستوں کا ایک پلندہ میز پر اُن کی طرف کھسکا دیا۔ چودھری صاحب نے درخواستیں پڑھ کر اپنی وکالت ایسی مدلّل انگریزی میں کی کہ انگلینڈ ریٹرنڈ کمنتہ اُن کا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ سارے کیس رفع دفع ہو گئے تو انسپکٹر نے اُٹھ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور کُرسی چھوڑ کر کہا۔ "ویل چودھری! اس کُرسی کے حق دار تمہی ہو۔"

مَیں نے چودھری مہدی حسن مرحوم سے خود داری کا سبق تو سیکھا لیکن اُس پر عمل کرنا مشکل محسوس ہوا۔ وہ سمجھوتے کے قائل نہیں تھے اور میرے جیسے لوگ قدم قدم پر سمجھوتہ کرتے ہیں، اور اسے 'لچک' کا نام دیتے ہیں۔ استادِ محترم کی 'خود داری' میں لچک نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے بادشاہوں کی مانند کبھی گالی پر خلعت عطا کرتے اور کبھی سلام سے بھی چڑ جاتے تھے۔ وہم بھی اُن کی طبیعت میں بہت تھا۔ خود ہنستے تھے اور کلاس کو ہنساتے تھے لیکن بعض اوقات ہنستے ہنستے ناراض ہو جاتے تھے۔ مجھے اس کا ایک تجربہ ہوا۔ ایک بار مَیں اُن کی ایک بات پر کچھ زیادہ ہی ہنسا تو اس کی شکایت والدِ مرحوم سے کی۔ مَیں اتنا ڈر گیا کہ وہ کلاس میں کوئی لطیفہ کہتے تو مَیں بالکل نہ ہنستا۔ اس کی شکایت بھی اُنھوں نے والدِ مرحوم سے کی کہ میر صاحب اب بہت ہی سیریس ہو گئے ہیں۔ وہ بھی خاں صاحب کی طرح مجھے 'میر صاحب' کہتے تھے۔

انگریزی وہ بہت اچھی پڑھاتے تھے۔ اُس زمانے میں انگریزی کے کورس کی کتابیں بھی بہت مُشکل تھیں۔ ایک کتاب کا نام AN EASY PATH TO ENGLISH PROSE تھا۔ واقعی انگریزی نثر کی منزل تک پہنچنے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی آسان راستہ نہیں تھا کہ جو مونٹ ایورسٹ کی چوٹی پر سے گزرتا ہو، پڑھانے والے کو دانتوں پسینہ آجاتا اور پڑھنے والے کے تو چھکے چھوٹ جاتے۔ اکثر مضمون تو اتنے مُشکل تھے کہ عام طالب علموں کے سر پر سے گزر جاتے۔ ہماری کلاس کے مانیٹر سید عمّاد حسین زیدی جو دسویں تک پہنچتے پہنچتے اٹھارہ انیس سال کے ہو گئے تھے، اس کتاب سے بہت نالاں تھے۔
چودھری صاحب ایک مشکل پیرا پڑھانے کے بعد اُن سے پوچھتے "ارے بڈّھے! کچھ آیا سمجھ میں؟"
وہ 'نہ' میں سر ہلاتے، تو کہتے "تجھے تو پاگل خانے بھیجنا پڑے گا۔"
وہ کہتا "جناب! کیا پاگل خانے میں مجھے آپ سے بہتر اُستاد مل جائے گا؟"
اگر چودھری صاحب اس حاضر جوابی کا مُسکرا کر جواب دیتے تو ہم بھی ہنس دیتے ورنہ چُپ رہتے۔
اس کتاب کی وساطت سے ڈکنز اور تھیکرے سے آشنائی ہوئی۔ "پارکنسنز سیلیکشن آف انگلش ورس" نظموں کی کتاب تھی اور نثر سے کہیں زیادہ آسان۔ اس کی کئی نظمیں بغیر کسی کوشش کے یاد ہو جایا کرتی تھیں۔ نثر کی ایک اور کتاب کا نام غالباً "مدر انڈیا" تھا اور اس کے مصنف کا نام "مینو مسانی" تھا۔ اس کتاب میں سے جو سوال آتا تھا، اُس کا متبادل کوئی ایسا سوال ہوتا تھا جو آسان ہوتا۔ عام طور پر اس کتاب کو پڑھانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا لیکن اُستادِ محترم نے یہ کتاب بھی بڑے جذبے سے پڑھائی۔ اگرچہ اس کتاب میں انگریز کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی تھی تاہم اِسے

پڑھ کر "ہندوستان" سے محبت کا جذبہ پروان چڑھتا تھا۔ اس کی انگریزی آسان اور دل نشیں تھی۔ کاش کوئی انگریزی داں آج اس قسم کی کتاب لکھے کہ جس سے "مدرِ پاکستان" سے محبت کا جذبہ اُستوار ہو۔

چوہدری مہدی حسن نہایت وسیع النظر اُستاد تھے۔ وہ طالب علم کی ہمہ جہتی تربیت کے قائل تھے۔ اسکولوں میں جتنی بھی غیر نصابی سرگرمیاں ممکن ہیں، اُن کا اہتمام کرتے تھے مثلاً سکاؤٹنگ، پی۔ ٹی، شام کے کیمپ، تقاریر کے مقابلے اور زائد مطالعہ۔ زائد مطالعہ سے مُراد ہے نصاب کے علاوہ کتابوں کا پڑھنا۔ ٹائم ٹیبل میں روزانہ یا ہفتے میں تین بار ایک پیریڈ زائد مطالعے کے لیے مختص تھا۔ اسکول کی لائبریری سے "نیٹ" کی صورت میں کتابیں ملتیں جو نہایت مختصر ہوتیں۔ جماعت کا مانیٹر کتابیں لاتا اور لڑکوں میں تقسیم کرتا۔ کبھی اُردو کی اور کبھی انگریزی کی۔ ایک اُستاد صاحب اس پیریڈ کی باقاعدہ نگرانی کرتے اور لڑکے اُن سے مشکلات حل کرا لیتے۔ ہفتے میں ایک دو بار "گرنڈگ" کے ایک نہایت رُعب دار بیٹری کے ریڈیو سے تعلیمی پروگرام نشر ہوتا۔ اسکول میں ہال نہیں تھا۔ اس لیے لڑکے باہر پُختہ صحن میں بیٹھ جاتے اور یہ پروگرام سُنتے۔ اس زمانے کے ریڈیو سے "چیں چیں چوں چوں" عام نشر ہوتی تھی اور کام کی بات سُننے کے لیے کانوں پر بہت زور دینا پڑتا تھا۔ پروگرام ختم ہونے سے پہلے پہلے بیٹری ڈاؤن ہو جاتی۔ پھر یوں لگتا گویا دُور بہت دُور سمندر میں کٹ کر لب لہریں اُٹھ رہی ہیں اور اُن کا شور کانوں میں رَس گھول رہا ہو۔ اس پیریڈ میں میرے تخیل کو پرواز کے بہت سے مواقع نصیب ہوتے تھے یعنی مجھے سمندروں، پہاڑوں، ریگستانوں، بیابانوں، جنگلوں اور ویرانوں کی سیر کے نہایت سنہری مواقع ملتے تھے۔ آواز سے تصویر تک پہنچنے کے نادر لمحے اب تو نایاب ہو گئے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے جو قابلِ توجہ ہے!

ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول دیپالپور کی ڈبیا سی عمارت میں مشکل سے اتنے کمرے تھے کہ اُن میں دو اڑھائی سو طالب علم سما سکتے۔ پانچویں جماعت کے طالب علم باہر برگد کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے۔ سردی کا موسم ہوتا تو دھوپ میں ٹاٹ بچھ جاتے۔ ڈبیا سی عمارت کے اندر پختہ صحن تھا۔ یہاں بھی کوئی نہ کوئی کلاس لگتی تھی، اس کے باوجود ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک چھوٹا سا کمرہ ریڈنگ روم کے طور پر مختص کیا ہوا تھا۔ مَیں نے اس کمرے میں بچوں کے رسالے پڑھے اور یہیں ہمایوں، ادبی دنیا، عالمگیر اور شاہکار سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ تفریح میں کافی لڑکے یہاں موجود ہوتے۔ چودھری صاحب کبھی کبھار آتے اور لڑکوں کو رسالوں میں منہمک دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

چودھری صاحب اُن اساتذہ کے زمرے میں شامل تھے جو اپنے شاگردوں کے دل پر اپنی یاد کا کوئی نہ کوئی نقش ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

اَب مَیں اپنے دو اساتذہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایک برہمن تھے اور دوسرے شیخ۔ پنڈت چمن لال ہمیں تاریخ جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ اَب پتہ نہیں کہ وہ حیات ہیں یا آن جہانی ہو چکے ہیں۔ اُن سے آخری ملاقات ۱۹۴۷ء کے آغاز میں اوکاڑہ میں لاریوں کے اڈہ پر ہوئی۔ مَیں نے اُنہیں جُھک کر تعظیم دی۔ اُنہوں نے میری پُشت پر تھپکی دی جس کا کیف اب تک رُوح کے کسی گوشے میں محفوظ ہے۔ مَیں اُن دنوں بی۔ ٹی کر کے اوکاڑہ کے قریب موضع "بابا بالا" میں انگریزی کا اُستاد لگ چکا تھا۔ والدِ محترم بھی اسی اسکول میں اُردو، فارسی پڑھاتے تھے اور یہ اُن کی ملازمت کا آخری سال تھا۔ یہ جان کر خوش ہوئے کہ مَیں نے بی ٹی کر لی ہے لیکن کہا کہ کاکا! اس پیشے سے تمہیں محرومی کے سوا کیا ملے گا۔ "تمہیں کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی تو ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔ مَیں نے اعتراف کیا تو بولے "وہی رنگین دوپٹوں والے مضمون۔" مَیں ہنس پڑا تو وہ بھی مُسکرانے لگے۔

مَیں نے دسویں جماعت میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "ایک میلہ" دیپالپور میں کھتہ ہندوؤں کے ایک بزرگ "بابا لالو جسرا"

کی یادگار تھی۔ یہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا جس میں کمتر ذات کے ہندو اپنے بچوں کا مونڈن کرتے تھے۔ میں نے اس میلے کا نقشہ کھینچا اور اُس میں لال پیلے اور نیلے دوپٹوں کی جو لہر بہر ہوتی، اُسے میں نے 'قوسِ قزح' سے تشبیہہ دی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ مضمون پنڈت جی نے کیسے پڑھ لیا۔ انہوں نے والدِ محترم سے کہا کہ اس رجحان کو بر وقت روکنا ضروری ہے ورنہ کاکا زندگی میں پنپ نہیں سکے گا۔ پھر اس تشبیہہ میں نہیں آوارہ خیالی کی جھلک بھی نظر آئی اور پھر ہندو قوم کی توہین بھی کہ جن کی بہو بیٹیوں کے دوپٹوں کی سرِ بازار تشہیر ہوئی تھی لیکن اس کا ذکر صرف ہیں مسطور ہوا تھا۔ خان حمید اللہ خاں صاحب نے یہ فقرہ سُرخ روشنائی سے قلم زد کر دیا تھا۔

میں نے کہا "جناب! افسانے میں کبھی کبھار کسی رنگین دوپٹے کا ذکر تو آ ہی جاتا ہے۔"

اس پر وہ مسکرائے تھے۔ کہنے لگے "کاکا جی! شاہ جی کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ پنڈت جی پر پرماتما نے بہت کرم کیا ہے۔"

میں اس پیغام کا فوری طور پر مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔ جُوں کا تُوں والد صاحب کو پہنچا دیا۔ وہ مسکرائے تو میں نے پوچھا "اس سے پنڈت جی کی کیا مُراد تھی؟" کہنے لگے "پنڈت جی ویدانتی ہیں اور کرشن بھگتی میں انہیں بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ اُن کا مطلب تھا کہ روحانی سفر میں انہوں نے اپنی منزل پا لی ہے۔"

تب مجھے یاد آیا کہ میرے والد اور پنڈت جی کبھی کبھار روحانیت پر بات چیت کیا کرتے تھے جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سوامی رام تیرتھ کے انگریزی لیکچروں کا ایک مجموعہ پنڈت جی نے میرے والدِ مرحوم کو دیا تھا اور 'گیتا بھگوت' کا اُردو ترجمہ بھی۔ والد صاحب مجھے کہا کرتے تھے کہ سوامی جی کے لیکچر پڑھو۔ دیکھو کتنی سادہ اور خوبصورت انگریزی لکھی ہے۔ دسویں میں مجھے اتنی انگریزی کہاں آتی تھی کہ میں سوامی جی کے لیکچروں سے محظوظ ہو سکتا۔ بلاشبہ نہایت سادہ انگریزی تھی لیکن مطالب اتنے گہرے تھے کہ اُن تک میری رسائی نہیں ہو سکتی تھی البتہ دیباچے میں اُن کی مختصر زندگی کے جو محیّر العقول حالات لکھے تھے، انہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شاید اس لیے کہ ان میں افسانہ و افسوں کی پُر اسرار فضا چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

پنڈت جی کرشن بھگت تھے۔ جس طرح درویش حالتِ وجد میں ناچتے ہیں، اسی طرح میں نے پنڈت جی کو ایک محفل میں چمٹا بجا کر ناچتے دیکھا تھا۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں کھڑتالیں تھیں اور وہ بھی ناچ رہا تھا۔ پنڈت جی اس والہانہ انداز میں رقص کرتے تھے کہ میرا اپنا جی چاہا کہ میں بھی حلقے میں کود جاؤں اور ناچنے لگوں۔ درویشوں کو ناچتے دیکھ کر بارہا مجھ پر یہ کیفیت وارد ہوئی ہے۔ سلسلۂ مولویہ میں بھی رقص اُن کی عبادت کا ایک فعّال جزو ہے۔ سناتن دھرمی ہندوؤں میں پنڈت جی کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ بازار میں نکلتے تو ہندو دکاندار اُٹھ اُٹھ کر انہیں تعظیم دیتے۔ ہندو لڑکے انہیں اپنا اُستاد ہی نہیں گورو بھی جانتے تھے سوائے ہنس راج کے کہ وہ آریہ سماجی ہونے کی وجہ سے اُن کی کرشن بھگتی کو تماشا کہتا۔

ڈپٹی انسپکٹر ہریش چندر بالی نے پنڈت جی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر انہیں تعظیم دی تو ہم بہت حیران ہوئے تھے۔

پنڈت جی کا پسندیدہ مضمون تاریخ جغرافیہ تھا۔ اس میں وہ بہت طاق تھے۔ خاص طور پر ہندوؤں کی قدیم تاریخ پر انہیں بے پناہ عبور حاصل تھا۔ چونکہ نہایت راسخ العقیدہ ہندو تھے، اس لیے تعلیم و تدریس کے دوران میں جہاں جہاں انہیں موقع ملتا نہایت خوش اسلوبی سے اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے۔ اگرچہ پندرہ سولہ کی جماعت میں ہم تین مسلمان بھی تھے، لیکن پنڈت جی ہندوؤں کے زمانۂ شجاعت کی تاریخ بیان کرتے وقت ہندو قوم کی عظمتِ رفتہ میں یوں کھو جاتے کہ ہمارے وجود کا انہیں احساس بھی نہ رہتا۔ جہاں تک رامائن اور مہابھارت کا تعلق تھا، ہم

ان کی طلاقتِ لسانی سے بہت محظوظ ہوتے۔ رام چندر جی اور کرشن مہاراج کا جو کردار ان کہانیوں میں بیان ہوا ہے، اُس میں ایک خاص قسم کی عظمت ہے۔ میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کیا معلوم وہ اپنے زمانے کے پیغمبر ہوں اور بعد میں اُن کی تعلیم مسخ ہو گئی ہو۔ رامائن اور مہابھارت سے جو اخلاقی نتائج اخذ ہوتے تھے، اُن سے بھی کسی مسلمان کو کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔

چندر گپت موریہ سے ہرش وردھن تک کی تاریخ بھی نہایت دلچسپ تھی۔ چندر گپت موریہ کے عہد کی ایک نامکمل جھلک سیلوکس کے یونانی سفیر میگستھینیز کی یادداشتوں کے چند اوراق سے ملتی ہے جو خوش قسمتی سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ پنڈت جی نے شاید یہ اوراق بالتفصیل پڑھے تھے یا اُن کے تخیل میں پراچین بھارت کی کوئی تصویر بسی ہوئی تھی یا اُن کے لفظوں میں کوئی ایسا جادو تھا کہ ماضی کے آثارِ قدیمہ متحرک و زندہ ہو جاتے۔ چندر گپت موریہ نے پاٹلی پتر کا شہر آباد کیا تھا جسے آج کل پٹنہ کہتے ہیں۔ پاٹلی پتر کے کھنڈر شاید اب بھی پٹنہ میں موجود ہیں۔ پنڈت جی بتایا کرتے تھے کہ اس شہر کے گرد جو فصیل تھی، وہ اٹھارہ میل لمبی تھی اور اُس پر چھ رتھ ساتھ ساتھ دوڑ سکتے تھے۔ پاٹلی پتر کے بازاروں میں اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھوے سے کھوا چھلتا۔ ہر پیشے سے منسوب الگ بازار تھا۔ اُس کے رنواس میں سکندر کے ایک جانشین جنرل سیلوکس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

لیکن جب سلاطین دہلی کی تاریخ پڑھانے لگے تو ہم قدم قدم پر چونکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت ہمیشہ تلوار سے ہوتی ہے اور تلوار ظالم و مظلوم میں کم ہی امتیاز کرتی ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حاکم سے محکوم نفرت ضرور کرتا ہے لیکن جس زمانے میں ہم پنڈت جی سے تاریخ پڑھ رہے تھے، ہم سب انگریز کے محکوم تھے اور جلیانوالہ باغ میں انگریز کی توپ نے ہندو مسلم میں کوئی تمیز روا نہ رکھی تھی تاہم پنڈت جی نے کبھی انگریز کی مذمت نہیں کی تھی۔ جن مسلمان سلاطین کی وہ مذمت کرتے تھے، اُن کی تو ہڈیاں بھی راکھ بن چکی تھیں اور اُن کی ناخلف اولاد قعرِ مذلت میں گری ہوئی تھی۔

پنڈت جی کی تقریر سے ہمیں یہ غلط تاثر ملتا کہ ہندوستان کے جتنے پاٹلی پتر، موہنجوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا تھے، اُن سب کی تباہی و بربادی کے ذمے دار مسلمان سلاطین تھے جو جہاں گئے آگ اور تلوار لے کر گئے۔ اُن کی تلوار ہندوؤں کے لہو میں تیرتی رہی اور آگ مندروں کو خاکِ سیاہ بناتی رہی اور اُن کی جگہ مسجدیں تعمیر ہوتی رہیں۔ قطب صاحب کی لاٹھ اصل میں راجہ بکرماجیت نے کھڑی کی تھی اور مسجد قوت الاسلام کسی مندر کے پرانے کھنڈر پر تعمیر ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کو "جینیو" (زنار) کے ڈھیر لگا کر انہیں جلانے کا جنون تھا حالانکہ اُس کے مورثِ اعلیٰ تیمور نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تھا، تو کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے ہوئے ہندو مسلم کی تفریق روا نہ رکھی تھی۔ جو تاریخ کی کتاب ہمیں پنڈت جی نے لگوائی تھی، اُس میں جینیو اُتارنے، کا کوئی واقعہ درج نہیں تھا اور اس کا مصنف لالہ ہنس راج چڈہ تھا۔

شہنشاہ اکبر کی وہ بہت تعریف کرتے تھے لیکن اُن کا ہیرو رانا پرتاب تھا۔ شیواجی مرہٹہ کو وہ ہندوستان کا نجات دہندہ سمجھتے تھے پانی پت کی تیسری جنگ تک پہنچتے پہنچتے اُن کا سارا جوش و خروش ختم ہو جاتا تھا۔ یہ نہ بتاتے کہ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹہ پیشوا دونوں لڑ بھڑ کر تباہ ہو گئے اور انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔

ایک ماہرِ فن اُستاد کی تعلیم دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ سکھایا گیا تھا کہ اُستاد کی کسی بات کی تردید نہ کرو بلکہ بلا چون و چرا دل سے تسلیم کرلو۔ چنانچہ ہم چونکتے ضرور تھے لیکن مجال ہے کہ احتجاج کا ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالتے ہوں۔ ہندو لڑکے کبھی کبھار کوئی ایسی بات ضرور کر جاتے کہ جس کا جواب ہمیں دینا پڑتا۔

نویں دسویں جماعتوں میں مَیں ہر امتحان میں اور ہر مضمون میں اوّل آیا کرتا تھا حتیٰ کہ تاریخ جغرافیے میں بھی کوئی ہندو لڑکا میرے برابر نمبر نہ لے سکتا تھا۔ پنڈت جی دل کھول کر میری تعریف کرتے اور ہندو لڑکوں کو لعنت ملامت بھی کرتے۔ پرچہ جانچتے وقت چاہتے تو میرے نمبر کم کئے بغیر کسی ہندو لڑکے کو زیادہ نمبر دے سکتے تھے۔ تاریخ جغرافیہ میں تو ایسا ممکن بھی تھا لیکن پنڈت جی ایسا نہ کرتے۔ مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اپنے اِن مرحوم صاحبان نہ لگاؤ اور جھکاؤ کے باوجود اُن کے اندر کا اُستاد کورپٹ (CORRUPT) نہیں ہوا تھا۔ یہ اُن کی عظمت تھی جس کا مَیں دل سے معترف ہوں اور اسے مَیں نے اپنے لیے ایک درخشاں مثال قرار دیا تھا۔

اس کے باوجود اُستاد کے رویّے میں غیر جانبداری کی جو روح ہونی چاہیئے، وہ پنڈت جی کے ہاں مفقود تھی۔ اُستاد اگر ایک فرقے، مذہب یا نظریے کا مبلّغ یا پرچارک بن جائے تو اُسے متعصّب کہنا ہی پڑتا ہے۔ یہ تعصّب میرے والدِ مرحوم میں قطعاً نہیں تھا حالانکہ وہ اپنے دین پر اس سختی سے کاربند تھے کہ ہندوؤں کے ہاتھ کی بنی ہوئی یا پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ بے تعصّبی کی روح چوہدری مہدی حسن کے نقطۂ نظر اور عمل میں بھی جاری وساری تھی۔ آج تک کسی ہندو اُستاد نے اُن کے خلاف مذہبی جانبداری کا الزام نہیں لگایا تھا۔ بلکہ جس انکوائری کا مَیں پہلے ذکر کر چکا ہوں، اس میں پنڈت جی نے اُن کے حق میں گواہی دی تھی اور دو مسلمان اساتذہ نے اُن کے خلاف شہادت دی تھی۔

اور شیخ صاحب مرحوم کی ذات تو بے تعصّبی کا نقطۂ معراج تھی۔ درویشی و بے نیازی اُن کے مزاج کا طرّۂ امتیاز تھا۔ درویشی ان معنوں میں کہ انہیں نہ صلے کی پروا تھی نہ ستائش کی تمنا۔ ظاہری رکھ رکھاؤ کے تو وہ قطعاً قائل نہیں تھے۔ لباس کے معاملے میں اُن کی بے نیازی حد سے گزر چکی تھی۔ ریاضی اور سائنس پڑھاتے تھے۔ تیزاب کے چھینٹوں سے اُن کے لباس میں ننھے ننھے سوراخ ہو جاتے تھے۔ بے پروائی ایسی کہ ایپرن بھی نہیں بنوایا تھا۔ نیا لباس پہنتے تو کچھ اپنے آپ کو بے آرام سا محسوس کرتے اور جب تک اُس لباس میں دو چار سوراخ نہ ہو جاتے، وہ چین محسوس نہ کرتے۔ اس سلسلے میں مَیں اُن کی جو تصویر دیکھ رہا ہوں (خیالی) اس میں وہ بوسکی کی قمیص اور لٹھے کی شلوار پہنے کھڑے ہیں، چہرے پر دو دن کی شیو کے کھونٹ اس لیے نظر آ رہے ہیں کہ ان میں بقولِ غالب "چیونٹیوں کے انڈے" زیادہ ہیں۔ چہرے کا رنگ گہرا سانولا ہے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے۔ یہ لباس نیا ہے، دو چار دن بعد چھلنی ہو جائے گا۔

شیخ صاحب کے مزاج میں "عوامیت" اتنی تھی کہ موچی کی دکان پر جوتیاں گنٹھواتے تو اُکڑوں بیٹھ کر بلا تکلّف اس کی "حقّڑی" کی نَے منہ میں لے لیتے۔ اس کی پروا نہ کرتے کہ کون پاس سے گزر رہا ہے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر چوہدری مہدی حسن مرحوم کو شیخ صاحب کی ملامتی انداز کی یہ درویشی پسند نہیں تھی بلکہ اس سے بہت نالاں تھے۔

اُس زمانے میں ٹیوشن کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ ممکن ہے کہ شہروں میں ہو لیکن دیپالپور کا قصبہ اس لعنت سے پاک تھا۔ جن طالب علموں کو کچھ پوچھنا ہوتا، وہ بلا تکلّف اُستاد کے دروازے پر جا سوالی بنتے یعنی پیاسا کنوئیں کے پاس چل کر جاتا۔ شیخ صاحب بھی ٹیوشن نہیں پڑھاتے تھے البتہ ازراہِ غریب پروری ایک طالب علم کو اس کے گھر جا کر پڑھاتے تھے یعنی کنواں خود پیاسے کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس طالب علم کا نام مجھے یاد نہیں۔ اُس کا عُرف لوٹا تھا۔ لوٹے کا گھر ہمارے راستے میں پڑتا تھا۔ گھر کیا تھا، ایک کوٹھڑی تھی کہ جسے کلبۂ تاریک کہنا بجا ہے کہ دن کو بھی وہاں شب کی سیاہی کا سماں تھا۔ صبح ہو یا شام، شام ہو یا عشا اس کوٹھڑی میں ایک مدھم سا دیا جلتا رہتا جو سیاہی کو اُجالے میں بدلنے سے قاصر تھا اور کڑوے تیل کی بُو گلی کو ہمہ وقت معطّر رکھتی۔ کوٹھڑی کے اندر ٹین کے نہایت ہی بوسیدہ پیپوں اور مٹّی کے مرتبان نما نہایت گندے برتنوں کو ایک ایسی ترتیب سے رکھا ہوا تھا کہ اس سے دکان کا ایلوژن ILLUSION بھی بڑی مشکل سے ذہن میں قائم ہوتا ہے۔

کبھی کبھار کوئی بچہ گلی میں کھڑا نظر آتا جو پیسے دو پیسے کا گاہک ہوتا تب یقین ہوتا کہ اس کوٹھڑی میں لوٹے کے والدِ گرامی کی دکان ہے وہ کوٹھڑی کی دہلیز پر بیٹھا ہوتا، آدھا اندر، آدھا باہر۔ اتنا میلا چیکٹ آدمی میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ اب پتہ نہیں کہ اس کوٹھڑی کے پیچھے کوئی اور کوٹھڑی بھی تھی کہ جہاں لوٹا اور اُس کے والد سوتے تھے یا یہی کوٹھڑی اُن کا بیڈ روم بھی تھی اور ڈرائنگ روم بھی مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ اُن کا پچن اسی کوٹھڑی میں تھا۔ گرمیوں کے موسم میں دہلیز سے باہر گلی میں پانی کا ایک مٹکا رکھا ہوتا اور اُس پر دستے والا ٹین کا مگ بھی۔ آتا جاتا آدمی اس سے پانی پیتا اور اُنہیں دعائیں دیتا۔ اس "سبیل" نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ دل غنی ہو تو بے مائگی اور بے نوائی بھی بندے کو خدمتِ خلق سے نہیں روک سکتی!

جب ہم (یعنی میرے کزن ناظر حسین بخاری اور میں) گراؤنڈ سے کھیل کر لوٹتے تو دیکھتے کہ دہلیز سے ذرا باہر ایک ننھے سے مونڈھے پر شیخ صاحب بیٹھے ہیں اور دہلیز سے ذرا اندر لوٹا بیٹھا ہے جو دیے کی روشنی میں سلیٹ پر سوال نکال رہا ہے۔ لوٹے کا باپ ایک کونے میں بوریا بچھائے بیٹھا ہے اور حقہ تھامے ہوئے ہے کہ جس کی نے شیخ صاحب کے منہ میں ہے اور وہ دھواں اُڑا کر کہہ رہے ہیں "اوئے بھتنی کے! تجھے یہ سوال کتنی بار سمجھاؤں! اس لوٹا سے سر میں جو مغز ہے، کبھی اُسے بھی تو استعمال کر لیا کرو۔"

"اوئے بھتنی کے!" شیخ صاحب کا تکیۂ کلام تھا۔ اس سے کسی کی تادیب یا توہین مقصود نہیں تھی۔ دن میں پچاس بار بھی وہ ہمیں "اوئے بھتنی کے!" کہہ کر پکارتے تو غصہ آتا، نہ ہمارے کان پر جوں رینگتی۔ اس میں وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، دوست دشمن، امیر غریب، افسر ماتحت کسی کی پروا نہ کرتے۔ میرا خیال ہے کہ روا روی میں وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی "اوئے بھتنی کے" کہہ کر خطاب کر چکے ہوں گے ورنہ وہ اُن کے اتنے مخالف نہ ہوتے کیونکہ اُن کی مخاصمت میں افسری سے زیادہ شخصی پہلو غالب نظر آتا تھا۔

کمرۂ جماعت میں اُن کا نظم و ضبط بہت کمزور تھا۔ وہ بورڈ پر سوال حل کر رہے ہوتے اور ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہوتے۔ کبھی کبھار وہ ہم سے مخاطب ہو کر پوچھتے "اوئے بھتنی کے! اس کے بعد کون سا سٹیپ لکھوں؟" ہم آئیں بائیں شائیں کر جاتے تو وہ جسے چاہتے، کان سے پکڑ کر بورڈ تک لے جاتے اور جب تک وہ یہ نہ کہہ دے کہ مجھے سوال آگیا ہے، اُس کا کان نہ چھوڑتے۔ عام طور پر جماعت کا واحد سکھ لڑکا (وزیر سنگھ) اُن کے قابو میں آجاتا۔ وہ نہایت قوی الجثہ تھا لیکن بھینس کی طرح پالتو۔ سی سی بھی کرتا رہا اور ہنستا بھی رہتا۔ کہا کرتا تھا کہ جب تک شیخ جی میرا کان نہیں مروڑتے، مجھے سوال بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

اصل میں حساب یا الجبرے کا سوال حل کرتے وقت یا جیومیٹری کا کوئی مسئلہ پڑھاتے وقت وہ ہمیں اپنے ساتھ شریک نہیں کرتے تھے۔ وہ خود بہت ذہین تھے اور ہماری ذہانت پر بھی اُنہیں کوئی شبہ نہیں تھا ——————

—————— برسوں کی تدریس کے بعد حساب اور الجبرے کے سوالات اور جیومیٹری کے مسئلے اور مشقیں اُنہیں ازبر ہو گئی تھیں۔ ہم ابھی امورِ معلومہ کی منزل میں ہوتے کہ وہ بورڈ پر Q.E.D لکھ چکے ہوتے۔

فنِ تدریس میں پنڈت جی اُن سے کہیں بہتر تھے؛ لیکن وہ قدم قدم پر ہمیں محسوس کراتے کہ وہ ہندو ہیں۔ اس کے برعکس شیخ صاحب مرحوم کا ذہن قطعی طور پر سیکولر (SECULAR) تھا۔ یوں وہ اُتنے ہی مسلمان تھے جتنا ایک عام مسلمان کو ہونا چاہیے۔ انہیں شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ الجبرا مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اگر معلوم تھا تو اُنہوں نے کبھی اس فخر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُدھر پنڈت جی کو ذرا سی گنجائش بھی ملتی تو وہ حساب کے ساتھ الجبرے کی ایجاد کا سہرا بھی کسی ہندو کے سر باندھ دیتے جیسا کہ اُس زمانے میں ایک ہندو اخبار نے یہ لکھا تھا کہ ——

ارجن ناتن" جنگِ مہا بھارت کے ہیرو "ارجن" نے بسایا تھا۔ اس کے جواب میں چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) نے لکھا تھا کہ "چلی کا ٹک" مسلمانوں کے مشہور ہیرو "شیخ چلی" نے آباد کیا تھا۔

اب میں اپنے ایک ایسے اُستاد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے اسکولوں میں استاد کا درجہ ہی نہیں دیا جاتا یعنی اُسے پی۔ٹی ماسٹر کہہ کر ٹرخا دیا جاتا ہے حالانکہ وہ ہیڈ ماسٹر کا دستِ راست ہوتا ہے۔ اسکول کے نظم و ضبط کا انحصار اُسی کی ذات پر ہوتا ہے۔ اکثر ہیڈ ماسٹر ان کے استعمال کے اختیارات اُسے ڈیلی گیٹ کر دیتے ہیں۔ ڈی۔بی۔ہائی اسکول دیپالپور کے پی۔ٹی ماسٹر شیخ نور دین تھے جنہیں لڑکے مولوی جی کہا کرتے تھے حالانکہ مولویوں والی کوئی بات اُن میں نہیں تھی۔ میں نے جب اُنہیں آخری بار دیکھا تو وہ پچھتر سال کے تھے اور چہرہ صفاچٹ یعنی داڑھی اور مونچھ سے محروم۔ وہ پی۔ٹی ماسٹر ہونے کے علاوہ اسکول کے کلرک تھے اور اس پوسٹ کے لیے زیادہ فٹ تھے لیکن یہ اُن کا ثانوی فریضہ تھا جسے وہ نہایت احسن طور پر بجا لاتے تھے۔ یوں وہ نہایت اچھے ڈرل ماسٹر بھی تھے۔ ڈمبل ڈرل اور جھنڈی ڈرل میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اسکول میں بینڈ بھی تھا اور بینڈ ماسٹر ندارد۔ خود بینڈ بجانا نہیں جانتے تھے لیکن اس روایت کو قائم رکھا ہوا تھا۔ جانے والے لڑکے آنے والوں کو بانسری اور ڈھول بجانا سکھا دیتے تھے۔ بینڈ میں سائڈ ڈرم (ڈھولک) بجانا بہت مشکل ہوتا ہے——— دریسنگھ اس کا ماہر تھا لیکن اب اُسے سائڈ ڈرم بجاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ چنانچہ میں نے اُس سے سائڈ ڈرم سیکھ لیا اور تقریباً دو سال بڑے ٹھسّے سے بجایا۔ جب میں دسویں میں تھا تو مولوی صاحب میری منت سماجت میں لگے رہتے کہ جانے سے پہلے کسی لڑکے کو سکھا دوں چنانچہ میں اپنی بڑی اہمیت محسوس کرنے لگا تھا۔ یوں دو لڑکوں کو میں نے سکھا دیا تھا۔

وہ عجیب پی۔ٹی آئی تھے کہ جن کا لڑکوں پہ کوئی رُعب نہیں تھا۔ سزا بھی دیتے تو نہایت بے دلی سے۔ ظاہر ہے کہ اس کا لڑکوں پر کیا اثر ہوتا۔ اصل میں وہ بہت نرم دل انسان تھے۔ خاصے عیال دار تھے لیکن دل کے سخی تھے۔ تنگی تُرشی سے گزارہ کرتے لیکن کسی غریب طالب علم کی امداد بھی کر دیتے۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد وہ بڑے شیخ صاحب کے گھر چلے جاتے اور دونوں شیخ صاحب شطرنج کھیلنے میں اتنے محو ہو جاتے کہ دُنیا و مافیہا کو بھول جاتے۔ بڑے شیخ صاحب اُن دنوں رنڈوے تھے۔ اُنہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا لیکن شیخ نور دین کا چھوٹا سا بیٹا اُنہیں ڈھونڈتا ہوا بڑے شیخ صاحب کے ہاں آ نکلتا تو اُنہیں احساس ہوتا کہ میرا گھر بھی ہے۔ اُستانی جی نے کئی بار والدِ محترم کو شکایت بھجوائی تھی کہ اُنہیں سمجھا دیجیے۔ وہ سمجھا دیا کرتے تھے۔

آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے شیخ نور دین صاحب کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے میرے والد صاحب کی وفات پر تعزیت کی تھی۔ ضمناً یہ بھی بتایا تھا کہ سکول کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد اُنہوں نے کچہری میں عرضی نویسی شروع کر دی ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ زندگی میں فراغت کس چیز کا نام ہے۔

آج سے دس سال پہلے میں اپنے ماموں زاد بھائی شوکت حسین نقوی سے ملنے اوکاڑہ گیا تو ایک دن صبح صبح دیپالپور چلا گیا۔ کچہری کے قریب بس سے اُترا اور سیدھا کچہری جا پہنچا۔ اُستادِ محترم مولوی نور دین صاحب کے چھپّر تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ فرش پر دری بچھائے بیٹھے تھے اور سامنے چوکی رکھی تھی۔ مولوی صاحب چوکی پہ کاغذ رکھ کر عرضی لکھ رہے تھے۔ ایک بینچ پہ دو دیہاتی بیٹھے تھے۔ میں بھی اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ عرضی لکھتے لکھتے نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور ایک عرصے تک دیکھتے رہے۔ میں خاموش رہا تو کہنے لگے

"تو تھکے تو نہیں ؟" میں ان کے پاس دری پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور رونے لگے۔ "کاکا! تیرے والد سید امیر شاہ مجھے بہت عزیز جانتے تھے۔ دعا کرتے تھے نور دین! تجھے تو خوشنویس ہونا چاہیئے۔ میں خوشنویس تو نہ بنا، عرضی نویس بن گیا۔" وہ عرضی جو ان کی میز پر پڑی تھی، خوشنویسی کا ایک شہ پارہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے موتی پروئے ہوں۔ عرضی نویسوں کا شکستہ مشہور ہے کہ جسے یا تو عرضی نویس پڑھ سکتے ہیں یا دراصل باقی نویس اور سیاہ نویس وغیرہ۔ میں نے کہا "قبلہ! آپ عرضی نویس نہیں، خوشنویس ہیں۔"

(جاری ہے)

تخت سنگھ

جشنِ تسکینِ جاں مناؤ

جو کچھ بھی دل میں بھرا ہوا ہے
اسے اسی وقت اوندھا کر کے
انڈیل دو تم
کہ خالی پن کے لطیف احساس میں بھی
جینا ہی اک مزا ہے
در آ رہا ہے جو کچھ بھی ادراک کی حدوں میں
اسے پکڑ کر حدوں سے باہر
دھکیل دو تم
حسِ باطن سے مخلصی میں بھی
لطف اپنا ہی ذائقہ ہے

ہو سکے اپنے بس میں رکھو جفاکشی کی
ل کو تم
کچھ نہ کرنے کی کیفیت کا
در بھی
لذیذ و پُر لطف تجربہ ہے

جب اونگھتی سوچ خالی خالی ہو
آپ ہی آپ آنکھوں آنکھوں میں
میٹھا میٹھا سا مسکراؤ
لبوں کی لرزش کے ساز پر
کوئی دھیما دھیما سا گیت گاؤ
ہر ایک موئے بدن سے
چھینٹے مہک کے آکاش تک اڑاؤ
کہیں نہ جاگ اٹھیں
نیند سے زندگی کے گھاؤ
مزے سے چپ چاپ
جشنِ تسکینِ جاں مناؤ!

بلراج کومل

ایک تماشا، ایک قِصّہ

آج شہرِ ناروا کی بھیڑ میں
ایک عورت
حادثے میں ہو گئی ہے جاں بحق
لاش لاوارث پڑی ہے
اس کو گھیرے میں لئے جو لوگ ہیں
سب تماشائی ہیں، اس کا کوئی بھی اپنا نہیں

ایک ہی ہے اس کا کاندھا
بدنما سے گوشت میں لپٹا ہوا
رہ گذر پر اک عجب انداز سے
جو لڑھکتا جا رہا تھا، وہ اپاہج
رک گیا ہے پاس اس کے،
دیکھتا ہے، نوچتا ہے بال، سینہ پیٹتا ہے، چیختا ہے
"جوشِ رنجش میں
زمانہ ہو گیا
مَیں نے کہا تھا
اپنی بوڑھی ماں سے مَیں نے ہی کہا تھا
تجھ کو موت آئے گی جب تو
مَیں نہیں دوں گا تجھے کاندھا
تُو میری ماں نہیں ہے، ماں نہیں ہے،
غیر آئے
آخری اس کے سفر میں
اپنے کاندھوں پر جب اس کو لے گئے تھے
ایک پل میں ہو گیا محروم کاندھے سے مَیں سب کے سامنے
مَیں ادھورا ہو گیا
مَیں اپاہج ہو گیا
یہ جو لاوارث پڑی ہے یہ بھی کوئی
ماں ہے، اب مَیں دوں تو کاندھا اپنا کیسے اس کو دوں"
دیکھتا ہے۔ نوچتا ہے بال، سینہ پیٹتا ہے، چیختا ہے
ایک خاکہ، ایک چہرہ، یہ اپاہج، یہ ادھورا آدمی
اجنبی سے شور میں
اِک تماشا بن گیا
ایک قِصّہ بن گیا!

احمد ظفر

آشوبِ سفر

کتابِ زیست کے اُڑتے ہوئے ورق ہیں حسیں
شجر شجر پہ نگینے سے جگمگاتے ہوئے
جو تراشتے لمحوں میں گل بدوش زمیں
حیات ایک سمندر ہو جیسے خوشبو کا
سفینۂ شبِ امکاں میں پاس آتا ہوا
سفر سفر کے تحیّر میں ساحلِ تسکیں

سحر ہوئی تو پرندوں کے پَر کُھلے ایسے
فضا میں پھیل گئے پیرہن کوئی رنگیں
سخن سخن میں ملا عکسِ چشمۂ شیریں
کسی نے ہاتھ جو رکھے ہیں میری آنکھوں پر
برس گئے ہیں فضاؤں میں چاہتوں کے نگیں
پگھلتے موم کا سُورج پہن رہا ہے لباس
تو پیکرِ غمِ ہستی میں کوئی خندہ جبیں
بُلا رہا ہے مجھے یاد آرہا ہے مجھے
گزرتے ہجر کے موسم میں کوئی دل کے قریں

عبارتوں کا وہی حُسن ہے وہی تیور
کہ وقت کے کسی تالاب میں بطیں جیسے،
کہیں دلوں میں اُترتا ہوا رمِ آہو
نہ جانے کیوں مجھے اکثر خیال آتا ہے
یہی ہے جنتِ ارضی یہی ہے خلدِ بریں
مگر وہ ایک تصور کہ جس سے دل ہے غمیں
وہ کون ہے جو سمندر میں زہر گھول گیا ؟
وہ کون ہے جسے حُسنِ ازل قبول نہیں ؟

کرشن ادیب

ٹرنک کال

دل وہ اُجڑا مکان تھا جس میں
صبح آتی تھی، شام غم لے کر
شام آتی تھی، لے کے تنہائی
ٹوٹے پھوٹے تھے بام و در جس کے
کھو چکے تھے، تمام زیبائی
کوئی مہماں، اِدھر نہیں آتا
کوئی کرتا نہیں، پذیرائی

دُور نیلے سمندروں سے پرے
دفعتاً، خواب کے جزیروں سے
تیری، آواز اس طرح آئی
ابر برسا ہو جیسے صحرا پر
پھول کھلتے ہوں لے کے انگڑائی

تیرا لہجہ، کھنکتے ساغر سا
جس میں شامل ہے تیری رعنائی
شہد گھلنے لگا ہے کانوں میں
دُور گونجی ہو جیسے شہنائی

دل یہ سُونا مکان تھا کل تک
اِس میں رونق پلٹ کے پھر آئی
ریزہ ریزہ بکھر گیا ہے سکوت
ٹکڑے ٹکڑے ہے آج تنہائی!

تبسم کاشمیری

وہ موسم پھر سے آئے ہیں

ہم بھول گئے تھے جو موسم
وہ موسم پھر سے آئے ہیں
اب برف نہیں تالابوں پر
اب نیلے نیلے سائے ہیں
اِک ہاتھ گلابی ریشم پر
اِک ہاتھ ہوا کے ہاتھوں پر
اِک ہونٹ
ہوا کے ہونٹوں پر
اک سانس،
ہوا کے سانسوں پر
اب برف نہیں تالابوں پر
اب ہنس نہیں تازہ پانی پر
ہم بھول گئے تھے جو موسم
وہ موسم پھر سے آئے ہیں

دارچینی کی شراب

ساحلوں کی شام
اور لیموں کی خوشبو شجر پر
اِک نشہ ہے موسموں کا
دُھند بھرا اشجار پر
مغربی تالاب، بادل،
پھول، رات
پی رہے ہیں
دارچینی کی شراب!!

تبسم کاشمیری

کچھ منظر پھر آباد کرو

یاد کرو وہ برف کے پھول
یاد کرو وہ پیڑ وہ جنگل
اور جنگل کی گہری رات
یاد کرو شب کا سناٹا
سناٹے میں کھلنے والا
رات کا پہلا اجلا پھول
رات کے اجلے پھول کی خوشبو
رات کے اجلے پھول کا رنگ
یاد کرو اک بحر کا ساحل
اور ساحل پہ پیلی دھوپ
ساحل پہ گرتے کچھ سائے
کچھ چہرے
کچھ آوازیں
یاد کرو کچھ یاد کرو
اس آنکھ کے صحرا کے اوپر
کچھ منظر پھر آباد کرو

بہار کا چاند

چاند بہار کا چمک رہا ہے
جھیل کے اجلے پانی پر
تالابوں میں برف ہے پگھلی
سرخ ہوا میں شور مچا
اور باغوں میں خوشبو پھیلی
آلوچے کے پتوں کی
پنچھی گھر کو واپس آئے
شام کے نیلے منظر میں
سرخ ہوا کے چہرے پر ہے
رس یہ کس کے ہونٹوں کا
چاند بہار کا چمک رہا ہے
جھیل کے اجلے پانی پر

شبنم مناروی

چاند تارا

تعلّقِ جسم و جاں کے درمیاں خوشبو کا رشتہ ہے
اِن آنکھوں سے اُن آنکھوں تک ہزاروں رنگ پھیلے ہیں
اِن ہونٹوں سے اُن ہونٹوں تک بڑی سادا بہاریں ہیں
ہوا کی تُند لہروں پہ پرندے آرزوؤں کے
جواں جسموں کے ہر اِک انگ سے رِستی ہوئی خوشبو
یہ سارے سلسلے ملتے ہیں آکر ایک سنگم پہ
وہی دیوار میرے تیرے درمیاں مدّت سے حائل ہے
سمے کی جھیل میں حالات کے پتھر گرانے سے
ہزاروں دائرے بنتے ہیں بن کر مٹتے رہتے ہیں
مگر چھوٹا سا اِک کنکر جو گھر میں آکے گرتا ہے
کسی آتش فشاں کی آگ کا بہروپ بھرتا ہے
حدوں سے سرحدوں تک ناتواں جسموں کے سائے ہیں
زمیں سے آسماں تک گرد کے طوفان چھائے ہیں
نہ جانے کتنی دیواریں زمیں سے اُگنے والی ہیں
مگر پھر بھی یہ دل بے چین ہے محسوس کرتا ہے
کوئی آواز چُپکے سے بہت نزدیک آجائے
کوئی جھونکا ہوا کا خواب سے تجسیم پا جائے
بہت ویران ہیں یہ زندگی کی بے کراں راہیں
سُہانا خواب کوئی جسم کے پردے پہ چھا جائے
لہو بھی اک حقیقت ہے، طلب بھی اک صداقت ہے
یہ تنہائی بھی ورثہ ہیں ازل سے ہم نے پائی ہے
مگر ان سب خلاؤں میں کہیں اک چاند تارا ہے

عزیز تمنائی

وصیت

غور سے دیکھو، مجھے پہچانو!
یادوں کی چتا میں
کس کا روپ
راکھ کی چنگاریوں میں بھی اُجاگر تھا
دھوئیں کے دائروں میں بھی
فروزاں تھا، امر تھا!

تم نے سمجھا تھا
کہ اک مدت کی بھول
جھونک دے گی
آنکھ میں
سارے زمانے کی وہ دھول
جس کا ......
[illegible]
اگر تم نے دیکھا نہیں، تم نے سُونگھا نہیں، تم نے سوچا نہیں ہے
تو پھر ایک شب
جب سکوتِ مسلسل ہو، خوابیدہ لمحے ہوں، ہر سُو اُداسی کی چادر تنی ہو
ہوس گیر سوچوں کے زرتاب رنگوں سے نظریں چُرا کر
مرے پاس آنا ———.
مجھے دیکھنا ———.

راج کھیتی

ازلی خوف

تیز ہوا کے
اِک جھونکے سے
کانپ کانپ جاتی ہے
مدھم مدھم، جلتے ہوئے
ننھے سے دیئے کی
دھیمی ہلکی لَو
مَیں بھی سوچنے لگتا ہوں

یہ دل

کبھی یہ قرب ...

... کے ...

. ہر

. یں بادل برستے ہیں

کہیں مینا ترستے ہیں

کہیں دل کے سمندر میں

کوئی بے آب جلتا ہے

ہماری نیند سے باہر

کہیں خوشبو پھول کھلتے ہیں

کہیں ہم روز ملتے ہیں

کہیں سب زخم سلتے ہیں

ہماری نیند سے باہر

کہیں اک بام روشن ہے

کہیں اک باب جلتا ہے

کہیں پنہاں، کہیں ظاہر

ہماری نیند سے باہر

... سے ہیں

... مشکل ہے

... کہیں جل ہے

کہیں ... جلتا ہے

انور جمال

ہجر زدہ موسم کی ایک شام

کبھی تم نے سوچوں کے رنگوں کو سُونگھا، کبھی تم نے جذبوں کی مہکار دیکھی
کبھی تم نے شبنم کی بوندوں پہ سُورج کی کرنوں کی بے باک یلغار دیکھی
کبھی تم نے خاموش آنکھوں میں بُجھتے چراغوں کو سوچا کہ کیا ماجرا ہے
کبھی یہ سفر تم نے طے کر کے دیکھا کہ ہونٹوں کے ساحل سے دل کے سمندر کا کیا فاصلہ ہے
کبھی آشیانوں سے آندھی میں گرتے پرندوں کو دیکھا
سِسکتے ہیں جو کرب کی لحد میں ایسے زندوں کو دیکھا
کبھی چیختی سنسناتی ہواؤں کی آوازِ ماتم سُنی ہے
کبھی تم نے صحرا کے تنہا شجر کی بھی فریادِ پیہم سُنی ہے
کبھی تم نے غم سے سُلگتے ہوئے نرم لمحات سے گفتگو کی
بدن کے بیابانِ تاریک میں روشنی کے عزادار کی جستجو کی
کبھی زندگی کے معانی بھی سمجھے
کبھی خامشی کی کہانی بھی سمجھے
اگر تم نے دیکھا نہیں، تم نے سُونگھا نہیں، تم نے سوچا نہیں ہے
تو پھر ایک شب
جب سکوتِ مسلسل ہو، خوابیدہ لمحے ہوں، ہر سُو اُداسی کی چادر تنی ہو
ہوس گیر سوچوں کے زرتاب رنگوں سے نظریں چُرا کر
مرے پاس آنا ———.
مجھے دیکھنا ———.

نصیر احمد ناصر

نیند سے باہر گرا خواب

ہماری نیند سے باہر
کہیں اک خواب جلتا ہے
کہیں آنسو چمکتے ہیں
کہیں مہتاب جلتا ہے

ہماری نیند سے باہر
کہیں سورج نکلتا ہے
کہیں کالی کلوٹی رات پھرتی ہے
کہیں چھپ کر دیا کوئی
پسِ محراب جلتا ہے

ہماری نیند سے باہر
کہیں بادل برستے ہیں
کہیں نینا ترستے ہیں
کہیں دل کے سمندر میں
کوئی بے آب جلتا ہے

ہماری نیند سے باہر
کہیں اُجلے پرندے ہیں
کہیں خونی درندے ہیں
کہیں یادوں کا جنگل ہے
کہیں صحرا، کہیں جل ہے
کہیں برفاب جلتا ہے

ہماری نیند سے باہر
کہیں دو پھول کھلتے ہیں
کہیں ہم روز ملتے ہیں
کہیں سب زخم سلتے ہیں

ہماری نیند سے باہر
کہیں اک بام روشن ہے
کہیں اک باب جلتا ہے
کہیں پنہاں، کہیں ظاہر
ہماری نیند سے باہر
کہیں اک خواب جلتا ہے ..

انور زاہدی

بکھرتے رنگوں کی نظم

کہیں ساحل پہ بچھے ریت کے ذرّوں میں چاندی کی جگہ
اِک آنے والے وقت کی آواز کھوجیں گے
ہَوا کے سنگ بادل کوہساروں پر کھڑے دیودار
کے جنگل میں ناچیں گے
مُخنک سایوں میں جھینگر راگ گائیں گے
حسیں گُلدُم اُڑے گی شاخ سے
اور سبز اندھیاروں میں سُورج کی کرن
بادل کے کونے میں سے جھانکے گی
پہاڑی پر سے گرتی دھار جھرنے کی
پڑے گی جیسے پتھر پر دُھویں کا رُوپ دھارے گی
کرن اس دھار سے مِل کر گلے
قوسِ قزح کے رنگ وارے گی
ہَوا کے دوش پہ بکھری مہک پھُولوں کی آئے گی
کسی ریسٹ ہاؤس میں بیدار ہو جائے گی صبح
جب اپنے بستر میں اٹھا کر بازوؤں کو
دلرُبا انداز میں
تُم دیکھ کر مجھ کو ذرا انگڑائی سی لوگی

مَیں اُس دم تُم سے پُوچھوں گا
کہ کیا اس سے حسیں دن خواب سے پہلے بھی کبھی دیکھا
یہ سُن کر تُم ہنسو گی
اور فلک جیسی تمہاری نیلگوں آنکھوں میں
دن کا چاندنا ہو گا
بہت نیچے کہیں وادی کے گاؤں میں
اُچھلتا، جھُومتا چشمہ

پانی سے بھر جاتے ہیں فصلیں شاداب اور زندگی بھرپور۔ کیوشو اور اوکی ناوا کے میدانی علاقوں میں گرمی اپنا قہر دکھاتی ہے، مگر ہونشو میں موسم معتدل رہتا ہے اگرچہ سمندر کے قریبی علاقوں میں حبس کی وجہ سے درجۂ حرارت بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہوکائیدو کے علاقہ میں جو برفانی علاقہ سمجھا جاتا ہے گرما کی اپنی بہار ہوتی ہے۔

بہار۔ جاپان میں ایک خاص سمت میں سفر کرتی ہے۔ گرم علاقوں میں جب سردی کا زور ٹوٹنے لگتا ہے اور چیری کے پھول نکلنا شروع ہوتے ہیں تو بہار کا سفر شروع ہوتا ہے اور اتنے سلسلہ بندی سے بہار آتی ہے کہ محسوس کرنے والے یقیناً [illegible] لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رات کو [illegible] کو چیری کے درخت پر کچھ بھی نہیں تھا۔ صبح کو اٹھ کر دیکھا تو درخت شگوفوں سے لدا ہوا تھا گویا بہار کا بے نام قافلہ چپکے سے اتر آتا ہے اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سفر جاری رکھتا ہے یہ سفر 'ساکورا' کا سفر کہلاتا ہے۔ 'ساکورا' چیری کے پھولوں کو کہتے ہیں۔ اس کا اپنا ایک کیف [illegible] اور ہی تیور والی بات

[illegible] ہوا پیچاں اسے جیسے نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

ساکورا کی زنجیر، ذہنوں کو اسیر کرتی جاتی ہے۔ بہار کی علامت کے طور پر ساکورا کے علاوہ آڑو کے شگوفے، کنول کے پھول، پرندوں کی چہکار [illegible] کتنے ہی مظاہر ہیں جو بہار کا نقارہ بجاتے اور قرنا پھونکتے ہیں۔

خزاں، پت جھڑ کے علاوہ موسیقی کے عمل کا نام ہے۔ میپل کے پتے گلابی رنگ اوڑھنے لگتے ہیں تو زرد پتوں کی زردی اور اداسی موسیقی کے عمل کی توانائی میں ضم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے جاپان میں خزاں کی ہوا کے علاوہ موسیقی کے عمل کو خزاں کی علامت سمجھا گیا ہے۔ زندگی کے اس دور میں جسے خزاں کہتے ہیں انسانی فطرت کی دونوں کیفیتیں نمو پذیر ہوتی ہیں۔ اختلاط، زوال اور کمزوری مگر اس کے ساتھ ہی خوب صورتی، حسن اور تنہائی بھی۔ "آکی - نو - کازے" یعنی خزاں کی ہوا بہت ہی عمومی علامت ہے اس کی ایمائیت یہ ہے کہ یہ ہوا دروازہ پر دستک دے کر اسے اس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ بہار گزر چکی اور اب سرما کی آمد آمد ہے۔ درمیانی وقفہ، بہار اور برف کا درمیانی عرصہ، زندگی کا بہترین عرصہ ہے۔

سرما، برف، یخ بستگی، کہر اور واماندگی کا عرصہ ہے، سرما کے موسم میں زندگی اپنی ہما ہمی سے ہٹ کر خول میں سمٹ جاتی ہے، اپنے خول میں سمٹ جانے (HYBERNATION) کا یہ عرصہ، انسانی ذہن کو اپنے دائرہ میں سکیڑ کر، تفکر کا محرک بنا دیتا ہے۔ سرما کی علامت، فطرت کے خلاف انسان کی جدوجہد کی علامت ہے۔ وہ پہاڑ جو مہیب ہیں برف سے اٹ کر انسان کے لیے ناقابلِ تسخیر بن جاتے ہیں مگر انسان انہیں تسخیر کر کے ہی رہتا ہے۔

یوشینو یاما' ایسا پہاڑ ہے جس کی وادیاں برف سے اٹی رہتی ہیں مگر اس کے پار دوسری وادی ساکورا سے بھری پڑی ہوتی ہے۔ یہ علامت [illegible] کی علامت بن جاتی ہے۔ انسانی جدوجہد، اوپر اور اوپر اور آگے، پھر بہار، ساکورا ہی ساکورا۔

سرما کا چاند، سرما کا ایک اور نمائندہ ہے، ایسی چاندنی جو اپنی خنکی کے باوجود بڑی مہربان اور پُرخلوص چاندنی ہے۔ چاند، برف، تنہائی یہ تینوں علامتیں زین کی خاص علامتیں ہیں۔

ہمارے ہاں غریب کی جوانی کو سرما کی چاندنی سے تشبیہہ دی جاتی ہے کہ جس سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ مگر برف زار میں پورے چاند کی بے پناہ چاندنی کی کیفیت کچھ اور ہی مزا رکھتی ہے۔ زین راہب سیوٹے (۱۱۷۳-۱۲۳۲) کی تین نظمیں:

اڑاتا کف، مچاتا شور مثل آدمِ وحشی رواں ہوگا
کہیں پھر لوگ گیلی ریت سے سونے کے ذرّوں کو
الگ کرنے کی کہنہ خواہشوں کی دُھن الاپیں گے
گھروں کی چمنیوں سے دوپہر کو رُوح کی مانند
خاموشی سے نکلے گا دھواں
کسی کے گھر میں ڈھولک پر
سُہانے آنے والے ریشمی دِن ناچ اُٹھیں گے
تھکا ماندہ گمشتا ڈاکیہ تھیلے سے اک نامہ نکالے گا
اور اک دَر کھول کر نازک حنائی ہاتھ
اُس خط کو سنبھالیں گے
دھڑک اُٹھے گا دِل یک دَم
ہوا میں چھوڑ کے رنگ اپنے تتلی جھُوم اُٹھے گی
رُوپہلے نقرئی ذرّے چھُپے دریا کی ریتی میں
اُمڈتی لہر ساحل چُوم کر پھر چھوڑ جائے گی،
خطوں کو بانٹتا وہ ڈاکیہ
پھر دیر میں دیہات کی چھوٹی سڑک کے موڑ پر ہوگا
جہاں لکڑی کے اونچے پُل کے نیچے سے
اُبلتا شور کرتا کف اُڑاتا

پانیوں کا ایک ریلا بہہ چکا ہوگا
کسی رتیلے ساحل کی طرف اَن دیکھی دُنیا میں
جہاں پتھر بنے عہدِ گذشتہ کے بھلائے جا چکے راہرو
گُم گشتہ زمانے کا نشاں ہوں گے

احمد رئیس

نظم

کہا یہ کس نے
کہ روشنی کا
وجود باقی نہ اب رہے گا
کہیں جہاں میں،

جہاں جہاں بھی
دیئے ہیں روشن
وہاں اندھیرے کا راج ہوگا
فلک پہ تارے ہوئے فروزاں
تو اُن کو کالے دراز ہتھیلوں میں
بند کر کے
کسی بھی دریا میں پھینک دیں گے
جو چاند چمکا،
تو اُس کا سب نور چھین لیں گے
کہا یہ کس نے
کہ اب اندھیرے کی حکمرانی ہے
اور تا بہ ابد رہے گی

وہ دیکھو،
سورج نکل رہا ہے
زمین سونا اُگل رہی ہے!!

نوید جمیل

میرا ہاتھ، جنگل

دیکھوں جب بھی ان ہاتھوں کی
ٹیڑھی اور ادھوری شاخیں
سوچوں اور کھو جاؤں
سوچ رہا ہوں
یوں ہی جیون کے رستے میں
ہولے ہولے چلتے چلتے
ٹیڑھی اور ادھوری شاخیں
دل کا نوشتہ بن جاتی ہیں
سوچتے سوچتے کھو جاتا ہوں
ڈر لگتا ہے جس کو میں نے پیار کیا ہے
وہ بھی کہیں ان ٹیڑھی اور ادھوری شاخوں
کے جنگل میں ڈوب نہ جائے
وہ شاخیں جو ہولے ہولے چلتے چلتے
دل کا نوشتہ بن جاتی ہیں
وہ شاخیں کہیں اُس کو، مجھ سے
چھین کے دُوری کے صحرا میں قید نہ کر دیں
اور ہم دونوں صحرا کی تھاہ نہ پائیں
/راہ نہ پائیں/

فَسِیرُو فَیَنظُرُو

پرتو روہیلہ

اے خدا پلیز ابھی تو میں صرف سترّہ سال کا ہوں :

لوس اینجلس ٹائمز میں کبھی کبھی ایک نیوز آئیٹم " اے خدا پلیز ابھی تو میں صرف سترہ سال کا ہوں " کے عنوان کے تحت چھپتا ہے ۔ اس کو نیوز آئیٹم بھی پورے طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس میں نیوز آئیٹم سے زیادہ لکھنے والے کے خیالات ہوتے ہیں ۔ بہر حال اس معاشرے میں کہ لہٰذا ایک مشینی معاشرہ ہے اور زندگی کے اکثر کام یہاں ایک بے حس میکانکی عمل سے بڑھ کر نہیں آج کا یہ کالم پڑھ کر احساس ہوا کہ اس میکانکی زندگی میں بھی یہاں کا بیدار دماغ جذبات کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی گوشہ نکال لیتا ہے ۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں بھی اجتماعی افادیت کا پہلو نمایاں اور پُر اثر ہو ۔ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ کالڈول ۔ اڈاہیو میں دو نوجوان کہ جو دو ماہ بعد گریجویٹ ہونے والے تھے کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے ۔ یہ واقعہ کالڈول کے چھوٹے سے قصبہ کے لیے بڑا جانکاہ تھا ۔ چنانچہ کسی خیر خواہ وطن نے اخبار کو خط لکھا کہ مقررہ عنوان کے تحت اس واقعے کے پس منظر میں کچھ لکھا جائے ۔ مرنے والے تو مر چکے ۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ اشاعت شدہ عبارت کسی اور کے لیے درسِ عبرت ہو ۔ چنانچہ اخبار لکھتا ہے ۔

" جس دن میرا انتقال ہوا وہ دوسرے دنوں کی طرح ہی ایک عام سا دن تھا ۔ میں حسبِ معمول تھکا ہوا کالج سے آیا تو میں نے کتابیں میز پر پٹخیں اور بھاگتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا ۔ وہاں سے تازہ دم ہو کر نکلا تو ممی بھی کام سے واپس آ چکی تھیں ۔ میں نے ممی سے کہا آج میں ڈیٹ پر جا رہا ہوں ممی مجھے اپنی کار دے دو ۔ ممی نے خلافِ معمول گاڑی کی چابیاں میری طرف پھینکتے ہوئے کہا ٹھیک ہے لیکن گاڑی احتیاط سے چلانا ۔ ایک تو ثریا سے ملنے کا خیال دوسرے پھر اپنی گاڑی ۔ میرے ایکسائٹمنٹ کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا ۔ پھر یہ خیال مستزاد کہ کل بھی چھٹی ہے ۔ مجھے ایک ایسی آزادی کا احساس تھا جو رُوح میں سرایت کر چکی ہو ۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا ۔

میں ثریا سے ملنے کے خیالات میں مدہوش جا رہا تھا کہ یکدم کوئی دھماکہ ہوا میں نہیں سمجھ سکتا تھا کیوں اور کیسے ۔ میں گاڑی تیز چلا رہا تھا ۔ یا میں نے موڑ غلط کاٹا کیا ہوا کچھ معلوم نہیں ۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ مجھے کچھ لوگ کار سے باہر کھینچ کر نکال رہے

تھے تو میرے تمام جسم پر شیشے ہی شیشے تھے اور میری آنکھ نہیں کھلتی تھی - پھر کسی نے میرے جسم پر ایک چادر ڈال دی اور مجھے ایک لکڑی کی لمبی سی دراز میں رکھ دیا - یہاں پر میرے گھر والوں کو میری شناخت کرنی تھی ۔ میں نے ممی اور ڈیڈ کو پریشانی کے عالم میں اپنی طرف آتے دیکھا ایک پولیس والے نے میرے چہرے سے چادر ہٹائی تو میری ماں مجھ سے ہائے میرے بیٹے کہہ کر چمٹ گئی ۔ اور میرے باپ نے جو یکدم بہت بوڑھا معلوم ہو رہا تھا اس پولیس والے سے کہا " ہاں یہ میرا بیٹا ہے " پھر میرا جنازہ ہوا - یہ ایک اور غیر طبعی، خارق العادت تجربہ تھا - میرے سارے عزیز ایک ایک کر کے میرے پاس سے گزرتے - ان میں سے اکثر رو رہے تھے - ثریا بھی آئی - اس نے سسکیاں لیتے ہوئے میرا ہاتھ چوما اور دوسروں کی طرح آگے بڑھ گئی - اس وقت میرا جی چاہتا تھا کاش مجھے کوئی جگا دے، یہ کیسی سنگین بے حسی مجھ پر طاری ہے کہ ثریا میرا ہاتھ چوم رہی ہے اور میرے ہاتھ میں جنبش نہیں ہے، ممی اور ڈیڈ تو بالکل بکھر چکے تھے - ان کو تو دیکھا نہیں جاتا تھا - میرے بھائی بہن بھی بالکل ماؤف الذہن معلوم ہو رہے تھے اور مجھے یہ سارا ماحول انتہائی غیر حقیقی سا لگ رہا تھا - اور جب لوگ مجھے دفن کرنے لگے تو میں نے چلانا شروع کیا - خدا کے واسطے مجھے دفن نہ کرو - میں مردہ نہیں ہوں - ابھی تو میرے سامنے میری ساری زندگی پڑی ہے - میں ہنسنا چاہتا ہوں، میں اس آسمان تلے دوڑنا بھاگنا چاہتا ہوں - میں گانا ناچنا چاہتا ہوں - مجھے ٹھنڈی مٹی میں دفن نہ کرو - میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آئندہ انتہائی احتیاط سے گاڑی چلاؤں گا - خدا کے لیے مجھے ایک موقع تو اور دو - اے خدا، پلیز - ابھی تو میں صرف سترہ سال کا ہوں -"

گڈریا آتا ہے حلوا کھاتا ہے اور چل دیتا ہے :

دیکھا آپ نے امریکیوں نے اپنی مشینی زندگی میں بھی جذبات کے اظہار کے لیے کوئی پہلو نکال لیا ہے اور اس میں بھی اجتماعی منفعت مد نظر ہے - یہاں بھی جب میں اپنے ملک کی ٹریفک پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہی افراتفری اور انتشار نظر آتا ہے جو ہماری سیاست میں - کسی نے صحیح کہا ہے کہ اگر کسی قوم کے مزاج کو جاننا چاہتے ہو تو اس کے کسی شہر میں چوک پر کھڑے ہو جاؤ اور گزرتی ہوئی ٹریفک کو دیکھو تم سب کچھ معلوم ہو جائے گا - تو آج ہماری قوم کا مزاج بے اصولی، قانون شکنی اور قواعد کی خلاف ورزی ہے - ہر روز صبح کا اخبار آپ کو ایسے حادثوں کی جانکاہ خبر دیتا ہے جس میں یکبارگی بیسیوں افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور اگر بس کا ڈرائیور خود مرنے والوں میں نہیں ہوتا تو لامحالہ بھاگ جاتا ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری بے حس قوم نے اس کا کیا مداوا کیا - میری بے حس قوم ہر سال لاکھوں کاریں، ٹرک اور بسیں تو امپورٹ کرتی ہے لیکن اس درآمد سے جو منطقی نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے لیے کیا اس نے کوئی پیش از وقت منصوبہ بندی کی ہے - اپنی نئی پود کے ڈرائیونگ اسکول کھولے ہیں - ٹریفک کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی ہیں - اپنی سڑکوں کو مشینوں کی اس یلغار کے لیے کیا ہے - سڑک پر بسوں کے رکنے اور سواریاں بٹھانے کے لیے مناسب اسٹاپ بنائے ہیں - عوام کی ٹریفک تعلیم کے لیے کس قسم کی SUSTAINED PUBLICITY کی ہے - کچھ بھی تو نہیں کیا - مجھے اپنے ملک کی ٹریفک کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بھیڑوں کا ایک گلہ جس کو گڈریا سڑک پر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے - ہر نئے اقتدار کی آمد پر ہمیں امید ہوتی ہے کہ اب گڈریا آگیا ہے اب یہ بھیڑیں صحیح رخ کر لیں گی، اب ان میں نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا - اور اس طرح ہم ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مرنے سے بچا لیں گے جو بغیر اپنا پارٹ ادا کیے اس سٹیج

ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن گڈریا آتا ہے ملوا کھاتا ہے اور کچھ مدت بعد اپنا ڈنڈا سونٹا اٹھاتا ہے اور کھانے سے بچا ہوا ملوا باندھتا ہے اور چل دیتا ہے۔ پاکستان کی ٹریفک کا انتشار بدستور وہیں رہتا ہے جہاں تھا بلکہ کچھ مدت گزر جانے کی وجہ سے سوا ہو جاتا ہے ۔

میں اور ممی کل صبح برٹش ایئرویز سے روانہ ہو رہے ہیں :

اور میچ اتنا بور اتنا بور کہ میں نے ساری زندگی میں ومبلڈن کا فائنل اتنا بور نہیں دیکھا۔ کورز کی طرف سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا ۔ چھ ایک، چھ ایک، چھ دو پر ہار گیا۔ ابھی میچ ختم ہونے ہی والا تھا کہ پرویز کے کمرے میں علی کا فون آیا۔ پنڈی سے بول رہا تھا کہ رہا تھا کل یعنی نو جولائی کو میں اور ممی برٹش ایئرویز سے روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وزارتِ صحت سے جو کاغذات ان کو ملنا تھے وہ مل گئے یا نہیں، تو اس نے بتایا کہ ان کے پاس کوئی کاغذات نہیں۔ میں نے ذرا پریشانی سے جس کی وجہ سے شاید میرے لہجے میں تلخی بھی آگئی تھی اس سے کہا کہ بغیر ان ضروری کاغذات کے تفریح تو ہو سکتی ہے لیکن ممی کا میڈیکل چیک اپ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شیرازی صاحب سے پھر بات کرو اور مجھے بتاؤ۔ میں نے علی سے کہا کہ میں اپنے کمرے میں انتظار کروں گا۔ میرا دماغ سخت اپ سیٹ تھا۔ میں نے اس کو اور ثروت کو سب کچھ سمجھا آیا تھا۔ شیرازی صاحب کو ہر بات بتادی تھی۔ وزارتِ صحت کے متعلقہ افسروں سے آمنا سامنا کرایا تھا۔ اور ان کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ دو چار دن میں ساری کاروائی مکمل ہو جائے گی ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک ہیجان تھا۔ نجانے علی اور ثروت کس مشکل سے دوچار ہوں۔ بالآخر ڈیڑھ گھنٹے کے بعد علی کا پھر فون آیا۔ کہا کہ اس نے شیرازی صاحب سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہے، کاغذات ڈپلومیٹک بیگ میں ایمبسی پہنچ جائیں گے۔ معلوم ہوتا تھا ماں بیٹے دونوں ریٹرن ٹکٹ خرید چکے ہیں۔ ویزا لے لیا ہے اور ذہنی طور پر امریکہ آنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ان حالات میں میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا تھا کہ آجاؤ۔ جس وقت علی فون کر رہا تھا پاکستان میں رات کے بارہ بجے تھے اور صبح آٹھ بجے برٹش ایئرویز سے ان کی فلائٹ تھی۔ ادھر میں نے علی سے یہ بھی کہہ دیا کہ میں ناصر خان کو لندن فون کر دوں گا وہ تمہیں ایئر پورٹ پر لے لیں گے۔ اب ناصر خان کو فون کرتا ہوں تو کوئی اٹھاتا نہیں ہے۔ بڑی دیر کے بعد خیال آیا کہ آج تو اتوار ہے اور ان کا اسٹور تو بند ہوگا۔ یہ نمبر تو اسٹور کا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ان کے گھر کا نیا نمبر کہیں لکھا تھا۔ وہ نمبر ملتا نہیں تھا۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ لندن سے چلتے وقت میں نے ان کے گھر کا نمبر ڈائری پر لکھا تھا۔ ڈائری پر لکھا ہوا ایک نمبر ملایا تو پتہ چلا کہ وہ کسی عابدی صاحب کا گھر تھا۔ پھر ڈائری کو الٹنا پلٹنا شروع کیا تو نمبر بالآخر مل گیا۔ پتہ بھی پورا لکھا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کیا وہاں سے بھی کوئی اٹھاتا نہ تھا۔ بار بار یہ خیال بھی آتا کہ دیکھو یہ فون بھی کیا نعمت ہے۔ میں کتنے ہزار میل دور بیٹھا لندن بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں بالکل اس طرح جیسے کوئی لوکل کال کرتا ہے۔ بالآخر زمانی نے فون اٹھایا۔ ان کی آواز کان میں پڑی تو جان میں جان آئی۔ انہیں سب کچھ بتایا اور جب فون بند کیا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہیں اطلاع ہوگئی ورنہ علی اور ثروت لندن ایئر پورٹ پر کیا کرتے ۔

لیکچر پروفیسر گلیزاکوس کا :

دس جولائی سے اکنومکس کے کچھ لیکچر شروع ہونے تھے۔ پڑھانے والے تھے پروفیسر گلیزاکوس۔ چھریرے جسم کے لانبے قد کے آدمی۔

نیر جہاں ہی ہمارا ملجا و ماوا تھیں :

اس دیارِ غیر میں نیر جہاں ہی ہمارا ملجا اور ماوا تھیں ۔ سارے حالات سے مَیں نے ان کو مطلع کیا تو ایک دن شام کو وہ صہبا اور مجید کو لے کر آ پہنچیں ۔ مجید نے آتے ہی اس ڈیکیوام کلینر سے کہ جو یہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے اپارٹمنٹ کا فرش صاف کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے ہر صفاف (میرے خیال سے طباغ کے وزن پر صفاف بھی ایک لفظ بن سکتا ہے) کی طرح فرش کو ایسا چمکا دیا کہ گویا کبھی اس پر کسی نے پیر بھی نہیں رکھا تھا ۔ صہبا اور نیر جہاں نے گھر گرہستی کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی چیزیں مختلف جگہوں پر رکھنا شروع کر دیں ۔ دیگچیاں ، پیالے ، پیالیاں ، کفگیر کانٹے ، چمچے ، چادریں ، تولیے ، تکیے ، غلاف وغیرہ اور مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا سامان مختلف الماریوں میں اپنی اپنی جگہ اس طرح سما گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا ۔

ڈویژن آف اسٹس مکمل ہوگیا :

اسی شام مجاہد کمرہ نمبر ۲۶۳ میں منتقل ہو گئے ۔ مَیں نے خود بھی ان کا سامان ان کے کمرے تک پہنچا دیا ۔ میری کوشش یہی تھی کہ ہم نے جتنی چیزیں مشترکہ خریدی ہیں ان میں سے اکثر ان کو دے دوں ممکن ہے اس طرح ان کی طبیعت پُرسکون ہو ۔ اسی لیے مَیں نے ان کے سامان میں چینی کا پیکٹ اور کارن فلیکس کا ڈبہ بھی رکھ دیا تھا لیکن اس خیال سے کہ انہیں صبح کے وقت ناشتہ یہیں کرنا تھا انہوں نے یہ دونوں چیزیں دوبارہ نکال کر میز پر رکھ دیں ۔ ویسے یہ اقدام سیر چشمی کی ذیل میں بھی آتا تھا ۔ لیکن اس ڈرامے کا ڈراپ سین بہت ہی نفیس تھا ۔ چلتے وقت جب مجاہد نے وہ تین کیلے جو کھانے کی میز پر رکھے تھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اُٹھا لیے تو مَیں نے وہ تین ناشپاتیاں بھی جو رہ گئی تھیں ان کے حوالے کرنی چاہیں لیکن ان کی سیر چشمی نے ساری ناشپاتیاں لینا گوارا نہ کیا بلکہ ان میں سے صرف ایک اٹھالی اور اس طرح ہند و پاک کا یہ ڈویژن آف اسٹس بغیر حیل و حجت کے بالآخر مکمل ہوگیا ۔

علی اور ثروت کا روانہ ہونا لوس اینجلس کے لیے :

اسی شام علی کا فون آیا کہ وہ کل سہ پہر دو بجے لوس اینجلس کے لیے چل رہے ہیں ۔ ممتاز خان کے لڑکے ارشد نے تفصیل بتائی ۔ فلائٹ نمبر ۱۰۵ برانیف ایرلائن ۔ جہاز کی آمد تقریباً ساڑھے چھ بجے شام ہوگی ۔ بس اس وقت سے یہ فکر ہوگئی کہ اب ثروت کو لے کر کس طرح آؤں ۔ مجید کو فون کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ مصروف ہوگا ۔ متبادل ذریعہ کی تلاش میں وحید خان کے لڑکے فیصل کو فون کرنا چاہا لیکن معلوم ہوا غسل خانے میں ہے ، کوئی لئیقہ بول رہی تھی اس نے بتایا مَیں فیصل کی کزن ہوں ۔ اس کو مَیں نے یہ پیغام دیا کہ باہر آنے پر اس سے کہے مجھے فون کرے لیکن شام تک کوئی فون نہ آیا تو بالآخر پھر نیر جہاں کو فون کیا ۔ صہبا سے بات ہوئی ۔ اس نے بھی بتایا کہ وہ مصروف ہوگی لیکن اس نے کہا کہ وہ اس کا انتظام کر کے فون کرے گی ۔ دل کو کسی گھڑی چین نہیں آتا تھا ۔ رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا کہ مَیں لوگوں پر اس قدر انحصار کرنے کا عادی کیوں ہوں ، کیوں نہ خود بس سے اکیلا جاؤں اور ان کو لے کر ٹیکسی سے سیدھا واپس آجاؤں ۔ لیکن طبیعت میں کچھ ایسی کاہلی در آئی ہے کہ نکالے نہیں نکلتی ۔ ساری آزادہ روی ختم ہو چکی ہے ۔ ایک خاص زندگی کے اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ اس سے ذرا مختلف حالات ہوں تو

طبیعت برداشت نہیں کرتی۔ ممکن ہے بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا ہو۔ بہرحال رات کو گیارہ بجے کے قریب جب نماز پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ بمشکل سلام پھیرا تھا کہ نیّر جہاں نے فون پر سارا پروگرام بتایا۔ پروگرام یہ تھا کہ جمعہ کی وجہ سے چونکہ جعفری کی چھٹی جلدی ہو جائے گی اس لیے وہ ساڑھے بارہ کے قریب آ کر مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں شام تک ان کے ساتھ ان کے گھر پہ رہوں گا۔
شام کو وہ میرے ساتھ ثروت کو لینے چلے جائیں گے۔ ان کے گھر سے ایئرپورٹ صرف دو منٹ کی ڈرائیو ہے۔ جب میں نے ریسیور رکھا تو خدا کا شکر ہر ہر سانس سے خود بخود نکل رہا تھا۔

کوشش ایک ضیافت کی :

صبح حسبِ معمول انسٹی ٹیوٹ جانے کے لیے تیار ہوا۔ لیکن عین اس وقت جب سب لوگ جا رہے تھے مجھے خیال آیا کہ واپس آ کر کھانا پکانا اور پھر جعفری کے ساتھ جانا —— یہ وقت پر ممکن نہ ہو گا اس لیے میں نے پرویز کو پیغام دیا کہ ڈائرکٹر کو بتا دے کہ میں آج اپنی خانم کو لینے ایئرپورٹ جا رہا ہوں اس لیے آج کلاس میں نہ آسکوں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد مجھے اس کی ضیافت پر بڑی خوشی ہوئی۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد ثروت اور ملی سے ملاقات ہونی تھی۔ مجھ پر میزبانی کے کچھ فرائض بھی عائد ہوتے تھے۔ لاکھ مسافرت سہی۔ پھر بھی جی چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے ان کے لیے اچھا سا کھانا تیار کروں۔ لیکن اس خواہش کی تکمیل میں میری حالت درمیدانِ طباخی حائل تھی۔ اگرچہ اس عرصے میں کہ مجاہد کے ساتھ گزارا تھا سالن پکانے کے مبادیات سے ضرور شناسائی ہو گئی تھی لیکن وہ علم اس حد تک نہیں تھا کہ ایک اچھا کھانا پکانے میں مددگار ثابت ہوتا۔ پھر بھی میں نے اپنی دانست میں ایک اچھا سا سالن پکانے کی کوشش کی۔ ہمارے ملک میں تو مرغ بہت بڑی ضیافت ہے لیکن جب سے پولٹری فارم کے مرغ بازار میں آئے ہیں میں تو مرغ کی صحیح لذت کو ترس گیا ہوں۔ اب مرغ کا گوشت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے انسان روئی کھا رہا ہو۔ ثروت کو بھی اس سے کچھ اسی قسم کی چڑ ہے۔ لہٰذا میں نے سب سے آسان اور لذیذ چیز آلو قیمے کا سوچا۔ بھاگا بھاگا ۳۲ مارکٹ گیا۔ وہاں سے ایک کلو قیمہ لیا۔ دو کلو آلو لیے۔ تیس سنٹ کی ہری مرچیں لیں۔ اور واپسی میں حلال مارکٹ سے شامی روٹیاں لیتا ہوا آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک سالن بالکل تیار تھا۔ اگرچہ بے مشقی اور اناڑی پن سے یہ حماقت سرزد ہوئی تھی کہ آلو اور قیمہ دیگچی میں اس قدر بھر دیا تھا کہ اس میں کفگیر نہیں چلتا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے تیسے آلو قیمہ بہترین پک گیا تھا۔ اور میں اپنی پہلی [illegible] کوشش پر بہت خوش تھا۔ کپڑے بدل کر اور ایک پیالی کافی پی کر میں ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جعفری کے انتظار میں اپنی بلڈنگ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

جیسے کوئی تشنہ کام لبِ جو پہنچ جائے :

جعفری کے گھر سے شام ساڑھے پانچ بجے ایئرپورٹ کے لیے نکلے۔ ٹھیک چھ بجے ثروت اور ملی سے ملاقات ہوئی۔ جیسے بھٹکے ہوئے کو راستہ مل جائے، جیسے کوئی تشنہ کام لبِ جو پہنچ جائے، جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل جائے۔ بس ایسے ہی لگا۔

سوار ہونا بون ونچر کے لفٹ میں :

پورٹ او کال سے واپس ہوئے تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ دن اب بھی پہاڑ کی صورت کھڑا تھا۔ لہٰذا پروگرام یہ بنا کہ جائے

پی کر ڈاؤن ٹاؤن کی سیر کی جائے ۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہم پانچوں جعفری کی کار میں اندرونِ شہر کی ویران و سنسان سڑکوں پر رواں دواں تھے ڈاؤن ٹاؤن کا صحیح ترجمہ پشاوری پس منظر میں اندرون شہر ہوگا ۔ اندرونِ شہر کی طرح یہ بھی تجارت کا مرکز ہے ۔ اسی کی طرح یہاں پر بھی بھیڑ بھڑکا ہوتا ہے ۔ اور ٹریفک کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بندہ بشر کار اندر لے جانے سے ڈرتا ہے ۔ بمپر ٹو بمپر کی ترکیب یہاں کی ٹریفک کے لیے ہی بنی ہے لیکن یہی ڈاؤن ٹاؤن آج اتوار کی وجہ سے ویران و سنسان پڑا ہوا تھا ۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا ۔ ایک ہُو حق کا عالم تھا ۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ ڈاؤن ٹاؤن کا یہ سناٹا بھی خاصے کی چیز ہے ۔ جس نے اس کی گہما گہمی دیکھی ہے اس کو اس سناٹے کا تجربہ بھی کرنا چاہیئے ۔ اس سناٹے میں چاروں طرف کی فلک نما اور آسمان بوس عمارتیں اور بھی مہیب نظر آنے لگتی ہیں اور انسان کو اپنے حقیر ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا ہے ۔ کار سے سامنے کی عمارتوں کے لفٹ اُوپر جاتے اور نیچے آتے نظر آرہے تھے اور ان بلندیوں سے ایک لمحے کے لیے خوف کا احساس ہوتا تھا ۔ جعفری نے کہا کہ یہاں آئے ہیں تو آپ کو بون ونچر کی سیر کراتے چلیں کہ ڈاؤن ٹاؤن کا سب سے مشہور ہوٹل ہے ۔ یہ بتیس منزل کی عمارت ہے ۔ ہم جیسے مُفتیوں کے لیے یہاں کی خاص چیز اس کے ایلیویٹرز ELEVATORS ہیں جو دیواروں کے اندر بند ہونے کی بجائے سڑک کی طرف سامنے سے کھلے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے صرف شفاف پلاسٹک کی چادریں لگی ہوئی ہیں ۔ ہم سب ان ایلیویٹرز پر اس ہوٹل کی بتیس ویں منزل تک گئے ۔ اس میں سے ہمیں سارا لوس اینجلس نظر آرہا تھا ۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ ثروت کی طبیعت نہ بگڑ جائے کہ لفٹ سے یوں ہی اس کا دم گھٹتا ہے ۔ لیکن ثروت ٹھیک ٹھاک رہی بلکہ خوف پہلی بار مجھے محسوس ہوا ۔ اس لفٹ میں اُوپر جاتے ہوئے خیال آیا کہ ہمیں سڑک سے جو لفٹ اُوپر جاتے اور نیچے آتے نظر آرہے ہیں وہ یہی تھے ۔ اب اگر ایک منزل آپ پندرہ فٹ کی رکھیں ۔ تو ہم تقریباً پونے پانچ سو فٹ کی بلندی پر تھے ۔ لیکن اس ہوٹل کے سامنے ایک دوسری عمارت تھی کہ جو انگریزی محاورے کے بقول HEAD AND SHOULDERS ABOVE تھی اور اس ہوٹل کے سامنے گردن اکڑائے کھڑی تھی ۔

بیٹی امریکہ میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی :

کھانا کھا کر رات گیارہ بجے کے قریب جب ہم سب سنٹا مونیکا سے واپس آرہے تھے اور فری وے پر لوس اینجلس کی فلک بوس عمارتیں بُقعۂ نور بنی ہمارے دائیں ہاتھ نظر آرہی تھیں اور بائیں ہاتھ کوئی اور بستی روشنی سے جگمگا رہی تھی اور ایسا لگتا تھا گویا سارا آسمان زمین پر اُتر آیا ہو تو ثروت نے انتہائی سنجیدگی سے صہبا عرف حسینہ معین سے پوچھا " بیٹی امریکہ میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی ۔ ان کے دریاؤں میں پانی ہمیشہ حساب سے بہتا ہے ؟ ثروت کے اس ریمارک نے گو تھوڑی دیر کے لیے ہم سب کو کافی محظوظ کیا لیکن اب تک تو صرف سر ہی میں درد ہو رہا تھا اس ریمارک نے جگر میں بھی نشتر چبھو دیا ۔

یہ زلزلہ نہیں اخبار ہے :

لوس اینجلس میں سب سے زیادہ مقبول اخبار لوس اینجلس ٹائمز ہی تھا سو وہی ہمارے ہاں بھی آیا کرتا ۔ جب شروع شروع میں ہم اپنے اس اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئے تو ایک صبح مَیں نے فجر کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا ہی تھا کہ مجھے کسی شے کے گرنے کی آواز آئی ۔ مَیں نے فوراً کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ ایک خوبصورت جوان قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ نکلتا ہوا چنگیزی مونچھوں کے ساتھ ٹائٹس لباس میں باہر صحن میں کھڑا

باروں کے بنڈل نیچے میں رکھے ایک ایک بنڈل مختلف مکینوں کو ان کی مختلف منزلوں تک پھینک کر پہنچا رہا ہے اور بنڈل چونکہ چار پانچ
رے کم نہیں اس لیے جب کبھی نشانہ چوک جاتا تو اخبار درمیانی منزلوں سے ٹکراتا ہوا واپس صحن میں آگرتا ہے۔ اور یہ دھمک بالکل آن
ارجی کی شلوار جیتنی ہوتی ہے جس میں اتفاق سے ایک دن وہ خود بھی موجود تھے اور وہ زمین پر گر گئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ہم اس آواز سے آشنا
نے جب ہمارے اپارٹمنٹ کی سامنے کی کھڑکیاں ہلتیں اور کمرہ کے فرش میں ہلکا سا ارتعاش ہوتا اور ثروت چونکتی ہرنی کی طرح گردن کھڑی
اس میں تو ان کے شکوک رفع کرنے کو کہتا ڈرو نہیں۔ یہ زلزلہ نہیں۔ اخبار ہے۔ یا کبھی اوپر چھت پر دھڑام سے کسی کے گرنے کی آواز آتی
ثروت فوراً ہمدردی کے جذبے سے سرشار منہ کھولے دروازے کی طرف لپکتیں تو میں کہتا پریشان نہ ہو یہ اخبار ہے۔ ایک دن کا اخبار
طور پر سنڈے ایڈیشن ہمارے ہاں کے مہینے بھر کے اخباروں سے زائد ہوتا تھا۔ چار دن کے اخبار اتنے ہوتے تھے کہ ان سے مونڈھا بن
تا تھا۔ ایک دن ہمارے کمرے میں بہت سے لوگ آگئے۔ بیٹھنے کو کرسیاں کم تھیں تو اخباروں کے اس ڈھیر پر مجھے بیٹھنا پڑا اور میں
محسوس کیا کہ میں بالکل اس طرح آرام سے بیٹھا تھا جیسے بچپن میں باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھتا تھا۔ ثروت جب کبھی پرانے اخباروں
کے بنڈل اٹھا کر نیچے کوڑے میں پھینکتیں تو مجھ سے یہ ضرور کہتیں۔ یہاں چھان بورے والا کوئی نہیں آتا۔ ردی کوئی نہیں خریدتا۔ ہائے اللہ
اروں کی کیا ناقدری ہے۔ ڈھیروں کے ڈھیر اخبار آتے ہیں کوئی پڑھتا ہی نہیں اور یونہی کوڑے میں پھینک دیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت تھی۔
پڑوسی ایک امریکی لڑکا تھا اسے بی سی ٹیلیویژن میں سپورٹس کارسپانڈنٹ تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے اکثر اخباروں کا ڈھیر لگا
تا۔ اور ان اخباروں کو اٹھایا جاتا تو صرف گاربیج میں پھینکنے کے لیے۔

بچوں کی شہادت کے قوانین :

آج کا اخبار پڑھنے کو لیٹا تو ایک خاص مضمون پر نظر پڑی کہ امریکی عدالتیں آج کل اس موضوع پر سوچ رہی ہیں کہ بچوں کے ساتھ بدعملی
بچوں کی شہادت کے قوانین کیا ہونے چاہییں۔ صفائی کے وکلا نے بچوں کی جرح کو یک قلم محذوف کر دینے کے خلاف سخت آواز اٹھائی
۔ ان کا کہنا ہے کہ بچوں میں خیال آرائی کی قوت بے انتہا ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر اس جگہ جہاں ان کو ذرا سی بھی اہمیت کا احساس ہو وہ ایسی
ی گھڑ سکتے ہیں کہ جو ان کو وقتی طور پر اہمیت تو دے لیکن حقیقت سے قطعی بعید ہو۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کی شہادت
طرح ہو اور اس شہادت پر جرح کس طرح کی جائے۔ اس بات پر ہر شخص متفق نظر آتا ہے کہ بچوں کی شہادت ——
ی طور پر اس طرح شدت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تکرار کے لحاظ سے بھی نہیں ہو سکتی جیسی بالغوں کی ہوا کرتی ہے۔ چونکہ عام شہادت اور
پر جرح سے تو بڑے بڑے بالغ سیانے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بچے تو پھر بچے ہیں۔ اس لیے بعض لوگوں نے جن میں سماجی کارکن بھی شامل ہیں
ریقہ تجویز کیا ہے کہ بچے کی شہادت وڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کی جائے اس طرح کہ ملزم بچے کے سامنے نہ ہو بلکہ بچے کے سامنے اور ساتھ اس کی
ہو یا کوئی ایسا شخص جس پر بچے کو پورا اعتماد ہو اور جس سے بچہ شرماتا یا جھجکتا نہ ہو۔ یہ ساری شہادت ایک شارٹ سرکٹ ٹیلیویژن
دوسرے کمرے میں ملزم کے سامنے پیش کی جائے اور ملزم سے اس پر صفائی کے لیے کہا جائے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس طریقے سے بچے
بار ایک ہی بات کے دہرانے سے جس میں ان کی بھول اور بیان کی تبدیلی کا امکان بھی شامل ہے بچ جائیں گے اور بغیر کسی تکلیف یا
شانی کے بہت سے حقائق من و عن بیان کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور جب اس شہادت پر جرح کا وقت آئے تو وہ بھی اسی
رت سے کی جا سکتی ہے۔ ابھی تک اس طریقِ فکر کو قومی سطح پر کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے چونکہ ابھی تک اس قسم کی بدعملی کے جتنے

مقدمات بھی ہوئے ہیں وہ ابتدائی عدالتوں ہی میں ملزم کے اقرار پر فیصل ہو گئے ہیں اور اپیل میں نہیں گئے۔ لیکن پھر بھی تقریباً چھ ریاستوں نے بشمولیت کیلی فورنیا کے وڈیو ٹیپ کا طریقۂ کار بچوں کی شہادت کے لیے اختیار کر لیا ہے ۔

مَیں پاکستانیوں سے انگریزی سیکھوں گی :

مسٹر ہوم نے صبح صبح آ کر خبر دی کہ آج کی لکچرر ایک خاتون ہیں جن کا نام ہے ڈاکٹر مک کاون MC COWEN ۔ خاتون نے ــــــ
برنس ایڈ منسٹریشن میں ڈاکٹریٹ کی ہے آج کل یو سی ایل اے میں پروفیسر ہیں ۔ یہ خاتون آپ کو صرف صبح کے تین پیریڈز میں دفتری اور
مکاسبانہ ابلاغ کے متعلق بتائیں گی ۔ یہ خاتون چونکہ اپنے علمی تجربہ کی وجہ سے بڑی محترم تصور کی جاتی ہیں اس لیے اُمید کی جاتی ہے کہ آپ لوگ
بھی ان کا ویسا ہی احترام کریں گے جس کی کہ وہ حقدار ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد جیمس ہوم ان خاتون کو لیے پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ یہ ایک حبشی خاتون
تھیں سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ۔ عمر تقریباً پچپن اور ساٹھ کے درمیان ۔ قد پانچ فٹ آٹھ نو انچ کے قریب ۔ بال بڑے سٹائل سے بنے
ہوئے ۔ گہری سرخ لپ اسٹک لگائے ۔ آنکھوں پر باریک سنہری فریم کی قیمتی عینک کہ جو بائی فوکل نظر آتی تھی ۔ نقش البتہ کلیتاً حبشی نہ
تھے ۔ ناک کھڑی ہوئی ستواں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ موصوفہ بڑی مزاجدار چیز ہیں ۔ رنگت البتہ خالص آبنوسی اور وہ بھی چمکتی ہوئی ۔ پشت دست
اور ہتھیلی میں بالکل لیل و نہار کا تفاوت ۔ ہاتھوں سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ جسم کی صفائی درکنار ہاتھ کی صفائی کی بہت قائل ہیں ۔ غرض جیمس
کی تمہید نے ساری کلاس کو غیر ضروری طور پر معمول سے زیادہ ہی چوکنا کر دیا تھا ۔ ہم سب اچھے بچوں کی طرح ہمہ تن گوش ہو کر ان کی طرف متوجہ
ہوگئے ۔ ڈاکٹر کاون نے جو بات شروع کی تو جُملے کی ترکیب سے ۔ اور وہ بھی آواز کے بڑے اونچے پچ PITCH پر جُملہ بہت لمبا نہیں ہونا چاہیئے
اس میں موٹے موٹے نا آشنا مشکل الفاظ نہیں ہونا چاہییں ۔ جو بات آپ کو کہنی ہے اس کو بغیر گھمائے پھرائے ڈھانکے اور لپیٹے سیدھی بات
کہنی چاہیئے اور جب بات مکمل ہو جائے تو کمیونیکیشن ختم کر دینی چاہیئے وغیرہ ۔ تھوڑی دیر تک تو ہم سب اس الف بے کو برداشت کرتے رہے
لیکن آدھے گھنٹے کے بعد اس پرائمری کلاس کے سبق نے بالکل حلق سے نیچے اُترنے سے انکار کر دیا ۔ مَیں نے دیکھا کلاس میں مختلف گوشوں میں
کسمساہٹ ہو رہی ہے ۔ بے چینی پھیل رہی ہے ۔ یہ وہ گوشے تھے کہ جو کبھی انگریزوں کی نو آبادیاں کہلاتے تھے ۔ بنگلہ دیش ، پاکستان ،
احتجاج ۔ احتجاج ۔ احتجاج لیکن شب دیگ پر کپڑا لگا ہوا تھا ۔ ابھی ڈھکن جما ہوا تھا ۔ اسٹیم STEAM اندر اندر ہی رہی تھی ۔ تا آنکہ موصوفہ
نے کچھ ٹائپ شدہ کاغذات کلاس میں تقسیم کیے جن کا عنوان تھا اچھی مراسلت کے بنیادی نکات ۔ جب کاغذات سارے بٹ گئے تو آپ
نے ایک نکتہ کر کے اس کی وضاحت شروع کر دی ۔ جب وہ اس نکتہ پر پہنچیں کہ اچھی مراسلت میں کوئی SLANG نہیں ہونا چاہیئے ۔ اس وقت
تک شاید برٹش نو آبادیات کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا ۔ مجاہد نے خانم کو روک کر کہا کہ سلینگ کی کیا تعریف ہے ۔ پہلے تو اس کا تعین ہو
پھر یہ معلوم ہو سکے کہ کون سا لفظ سلینگ یا کرختداری ہے ۔ اور کون سا قلعہ معلیٰ کا ۔ ڈاکٹر مک کاون نے انتہائی معصومیت سے لفظ سلینگ
کی یوں تعریف کی کہ یہ وہ لفظ ہے جو عام طور پر عوام النّاس سڑکوں پر بولتے ہیں ۔ ان کی تعریف میں دو لفظ قابلِ توجہ تھے ، کامن مین اور روڈ ۔
ابھی انہوں نے یہ تعریف مکمل کی نہیں تھی کہ مَیں نے ان کی ٹانگ پکڑی ۔ بی بی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آپ
کامن مین کا تصور کیا ہے ۔ ساتھ ہی مَیں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ آپ روڈ سائڈ کسے کہتی ہیں ۔ مَیں نے اپنے نکتے کی وضاحت کے لیے کہا
مَیں یہ وضاحت اس لیے چاہ رہا ہوں کہ ہم بظاہر ایک بڑے مفروضے پر کام کر رہے ہیں اور وہ مفروضہ یہ ہے کہ دفتر میں جو اشخاص اس

- چاند!

نیلی پہاڑیوں کے چکیلے اُفق کے پار
اُتر جاؤں گا،
کیا تم میرے ساتھ نہیں آؤ گے

...سے نُور کی کرنیں
...پھوٹ کر نکل رہی ہیں

...یہ روشنی تمہاری ہے یا میری

اے چکیلے، چکیلے
اے چکیلے، چکیلے، چکیلے
چکیلے، چکیلے، اے چکیلے!
چکیلے، اے چکیلے
چاند!

ہونشو میں شیزوکا کا علاقہ جس میں فیوجی یاما واقع ہے۔ چاروں موسموں میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ موسموں کی ایمائی کیفیت درحقیقت یہاں منکشف ہوتی ہے جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے جھیل بیوا اور اس کے قریب کیوٹو کا قدیم دارالحکومت، نارا کا پرانا عظیم مندر، ایسے کی عظیم عبادت گاہ۔ ہونشو کی تمام تر رعنائیاں ان مظاہر میں نظر آتی ہیں۔ موسموں کی علامت گہری مذہبی علامت ہے جس کے جلو میں بے پناہ کیفیتیں ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں۔

جاپان کے چار قابلِ دید مقامات، امانو ہاشی داتے، آکی نو میا جیما، ماتسو شیما اور ماؤنٹ فیوجی۔ چاروں، چاروں موسموں کے مظاہر ہیں۔ امانو ہاشی داتے سمندر کے قرب میں پہاڑوں کے درمیان قدرت کا عجیب مظہر ہے۔ درختوں سے لدا پھندا ایک ٹکڑا دُور تک سمندر میں چلا گیا ہے اور اس نے دو دُور افتادہ جزیروں کو ملا دیا ہے۔ اسی لیے اسے ہاشی یعنی پل کہتے ہیں۔ گرما کے موسم میں یہاں بے پناہ حسن ہوتا ہے۔ آکی نو میا جیما جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، خزاں میں اپنی بہار دکھاتا ہے۔ میا جیما جزیرہ ہے ننھا سا چھوٹا سا اس میں خزاں ڈیرے ڈالتی ہے تو گویا فطرت کا حُسن بے پردا بے حجاب ہو جاتا ہے۔

فیوجی یاما کی برف پوش چوٹی ہر موسم میں انسان کی سربلندی کا نشان ہے اور صنوبر کے درختوں سے لدا ہوا ماتسو شیما، اپنی قدرتی آب گاہوں، رستوں، تفریح گاہوں کی وجہ سے انسان کے لیے قدرت کا عطیہ ہے۔ یہ چاروں قابلِ دید مقامات چاروں موسموں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ کیڑے مکوڑے، چڑیاں، پرندے، جھینگر، یہ تمام حقیر مخلوق بھی قادرِ مطلق کی خلاقی کا ایک تحفہ ہے۔ رینگتی ہوئی چیونٹی، جال بنتی ہوئی مکڑی

متعلق ہیں، کاتب اور مکتوب الیہ دونوں وہ "کامن مین" نہیں ہیں۔ اور چونکہ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ مراسلت دفاتر میں کام کرنے والے
دونوں کے درمیان ہو رہی ہے اس لیے یہ مفروضہ غلط ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی یہ مفروضہ صحیح ہے اور واقعی مراسلت کے یہ اصول دفاتر
کے خواص کے لیے ہیں تو یہ موضوع ہی سرے سے غلط ہے اور اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں پہلی تو یہ کہ عام دفاتر میں کام کرنے والے عوام الناس
نہیں بلکہ خواص الناس ہیں تو آج تک ان کے لیے کوئی علیحدہ زبان نہیں بنی کہ خواص کی مراسلت کے لیے مخصوص ہو۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک
لفظ روڈ سائڈ بھی استعمال کیا ہے نہ معلوم آپ کے ذہن میں اس کا کیا تصور ہے۔ وہ سڑک کہ جو آپ کے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے ان الفاظ
کو جنم دیتی ہے کہ دفتری مراسلت کے لیے قابل قبول نہیں لیکن وہ سڑک جو میرے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے ان الفاظ کو جنم نہیں دیتی۔ تو محترم
خاتون انتہائی ادب سے میں ان معروضات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا کہ موضوعِ سخن کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ میں نے بات ختم کی تو
کلاس میں ماضی کی برٹش نوآبادیات میں ایک فاتحانہ سکوت کے ساتھ ہلکی ہلکی مسکراہٹیں بھی پھیل رہی تھیں اور ڈاکٹر کارن اپنے سنہرے چشمے
کے شیشے کو ٹشو پیپر سے صاف کر رہی تھیں۔ ان کو اس عمل میں مزید چند لمحے لگے اور پھر انہوں نے زبانِ بے زبانی میں کہنا شروع کیا "میرا مطلب
سلینگ سے وہ الفاظ ہیں کہ جو کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ معاشرے کے ایک نچلے طبقے میں بولے جاتے ہیں۔ ابھی موصوفہ نے جملہ ختم
نہیں کیا تھا کہ مجاہد نے آن دبوچا " میڈم آپ موضوعِ زیرِ بحث کو خواہ مخواہ غیر متعلق الفاظ استعمال کر کے اُلجھائے دے رہی ہیں اب بھلا
دفتری مراسلت میں ادبی زبان تھوڑی استعمال کی جاتی ہے۔ آپ کا خط نہیں ملا۔ اس کے لیے دفتری مراسلت میں ہم کہیں یہ نہیں کہتے کہ
تمہارا محبت نامہ نہ ملنے کی وجہ سے جی جان سے اور جان جی سے بیزار ہے۔ چونکہ ہر مراسلت کا بالعموم اور دفتری مراسلت کا بالخصوص مقصد
ابلاغ کے سوا کچھ نہیں اس لیے اگر کوئی سلینگ کسی خاص معنی کا اچھی طرح ابلاغ کرتا ہے تو اس کو اس شریعت سے نکال باہر کرنا سراسر کج فہمی
اور کم عقلی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں پر میں نے بھی مجاہد کی تائید میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ سلینگ وہ الفاظ ہیں کہ جو کسی خاص جگہ کسی
خاص طبقے میں اور کسی خاص وقت خاص مطالب کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ الفاظ مقصد کے ابلاغ میں صحیح طور پر ممد و مددگار ہیں تو میں سمجھتا ہوں
کہ ان کا استعمال جائز ہی نہیں بلکہ انتہائی ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سلینگ کے اندر جو ابلاغ کی شدت ہوتی ہے وہ دوسرے عام الفاظ
میں نہیں ہوتی۔ اب ڈاکٹر کارن زچ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک آخری مدافعانہ حربہ استعمال کیا اور کہنے لگیں حضرات آپ لوگ خود
صاحبِ اختیار ہیں۔ اپنے اپنے ملکوں میں اہم عہدوں پر ہیں آپ چاہیں تو اپنے ملک میں اپنی دفتری زبان میں سلینگ استعمال کیا کریں۔
ہم ہر صورت اپنی دفتری مراسلت ہی میں نہیں اپنی تعلیمی زبان میں بھی سلینگ استعمال نہیں کرتے۔ موصوفہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ
میں نے ان کو پکڑ لیا اور میں نے کہا محترمہ یہ ٹائپ شدہ کاغذات جو آپ نے ہمیں دیے ہیں ان ہی میں نہیں بلکہ آپ کی نصاب کی کتابوں میں بھی
کافی سلینگ ہوتے ہیں جو آپ کے دعوے کو جھٹلاتے ہیں اور یہ کہہ کر میں نے لفظ O.K کے بارے میں ان سے وضاحت چاہی۔ میں نے
پوچھا بتائیے یہ سلینگ ہے یا نہیں؟ آپ کے دیے ہوئے نوٹس ہی میں دو جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ لیکن دراصل یہ نیشنل ہائی وے کا سلینگ
ہے اس لیے آپ اس کو اپنی ادبی اور تعلیمی زبان میں جگہ دینے پر راضی ہو گئی ہیں لیکن اگر یہ ہارلم HARLEM کا سلینگ ہوتا تو آپ اس کو
فوراً باہر نکال دیتیں۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی سلینگ آپ کے مافی الضمیر کا صحیح طور پر
ابلاغ کر سکتا ہے یا اور مکتوب الیہ کسی خاص سلینگ کے ذریعہ بات کو بہتر سمجھ سکتا ہے تو وہ سلینگ یقیناً استعمال ہونا چاہیئے۔ مثلاً اگر آپ
سمجھتے ہیں کہ آپ کی ناراضی کا اظہار کسی فیکٹری ورکر پر DUM کے لفظ سے ہو سکتا ہے تو یقیناً اس کو یہی لفظ لکھنا چاہیئے بجائے اس کے کہ

آپ اس کو لکھیں کہ یور اپر اسٹوری از امپٹی YOUR UPPER STOREY IS EMPTY وغیرہ۔ جب کلاس ختم ہوتی تو ڈاکٹر لمڈ یہ کہتی سنی گئیں کہ میں پاکستانیوں سے انگریزی سیکھوں گی۔

امریکہ تو بڑا چھوٹا سا ملک ہے :

واقعی دُنیا بڑی مختصر ہے۔ رات تقریباً ساڑھے دس بجے تھے اور میں نمازِ عشاء کے لیے وضو کر رہا تھا بلکہ کر چکا تھا صرف پاؤں دھونے باقی تھے کہ علی خان نے کہا فون پر کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ کیتھ کیتھ سا نام بتاتی ہیں۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ یہ کیٹ بلیک KATE BLAKE تو نہیں ہے۔ لوس اینجلس پہنچنے پر اللہ کا نام لے کر ایک خط میں نے اس کے تیس سال پرانے پتے پر اس کی ماں کے نام داغ دیا تھا۔ خط میں لکھ دیا تھا کہ یہ خط جس کسی کے ہاتھ پڑے وہ براہِ مہربانی اس تک پہنچا دے۔ ثواب دارین کمائے گا۔ وضو اس مرحلے پر چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔ فون اُٹھایا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ یہ واقعی کیٹ ہی تھی۔ اس نام کے چرچے خدا بخشے دادا بھائی کے ذریعے ہمارے گھر میں آج سے تیس سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ اس کی تصویروں سے دادا بھائی کا البم ہی نہیں سارا گھر بھرا ہوا تھا۔ اس کے بیس بیس تیس تیس صفحوں کے ٹائپ شدہ خط دادا بھائی کے نام آیا کرتے تھے۔ دادا بھائی نے اپنی موت سے تقریباً دو سال پہلے مجھ سے کہ میں ان سے بہت قریب تھا کہا تھا مجھے شادی اسی لڑکی سے کرنی ہے بلکہ تصویروں کے نئے بنڈل میں کہ جو ہر خط کے ساتھ آیا کرتے تھے ایک تصویر ایسی بھی تھی جس میں کیٹ اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر میں نے دادا بھائی سے کہا تھا اس نے تو ابھی سے بیڈ روم دکھا دیا۔ یہ جملہ دادا بھائی کو پسند نہ آیا اور اُنہوں نے مجھ سے کہا خیال کرو وہ تمہاری بڑی بھاوج ہے۔ دادا بھائی کا یہ جُملہ بتاتا تھا کہ وہ اس معاملے میں کس حد تک سنجیدہ ہو گئے ہیں پھر بھائی صاحب کے دونوں بچے مینا اور گی تھے جن پر سارے گھر کی محبتیں نثار تھیں۔ سارا گھر کیا محلّے والے بھی ان صاف ستھرے خوبصورت بچّوں پر واری ہوتے تھے۔ کیٹ ان بچوں کے لیے بھی برابر تحائف بھیجا کرتی۔ مینا کا بڑا سا لنگور تو مجھے اب تک یاد ہے جس پر ڈاکخانے والوں نے شاید کسٹم ڈیوٹی کے ڈیڑھ دو سو روپے لے لیے تھے۔ گھر کے ہر فرد کے نام فرداً فرداً سلام پیام ہوتا اور ہمارا یہ چھوٹا سا مُنّا سا خاندان جیسے بنگال کے سیلابوں اور طوفانوں سے زمین کا ایک قطعہ کٹ کر پانی پر بہتا ہوا کہیں دُور نکل جائے اور اپنے ماخذ سے بے خبر کسی انجان سرزمین سے ملحق ہو جائے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالوں میں گم دُنیا و حقیقتوں سے بے پروا ہنوں اور واشنگٹن کے فاصلوں سے قطعی خالی الذہن اپنے اور دادا بھائی کے وسائل اور اس سنجوگ کے حقیقی امکانات کو خاطر میں لائے بغیر اپنی ساری محبتیں، اپنا سارا پیار اس لڑکی پر لٹانے لگا تھا۔ اس زمانے میں ہم سب کے پاس کتنا پیار تھا لٹاتے تھے اور ختم نہ ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں کئی پینٹنگز کیٹ کے ہاتھ کی لگی تھیں۔ بی خدا بخشے کس پیار سے اس کا نام لیتی تھیں۔ جیسے واقعی وہ ان کے سب سے پیارے منجھلے بیٹے کی بہو ہو۔ بچّے کیٹ کو گھر کا ایک باقاعدہ فرد سمجھتے تھے۔ ہاں اس نے تو میاں کی بھی ایک تصویر بنا کر بھیجی تھی۔ ممکن ہے اب بھی یہ پینٹنگ کہیں بھائی صاحب کے پاس ہو۔ اس قربت پر دُوری کا یہ عالم تھا کہ دادا بھائی نے کبھی اس کی آواز نہیں سُنی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سیلف ڈائلنگ پاکستان میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر بات کرنے کے لیے گھنٹوں ٹیلیفون ایکس چینج پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ تو اس زمانے میں دادا بھائی کے دل میں شاید اس سے کبھی فون پر بات کرنے کا خیال بھی نہ آیا ہو۔ لیکن دونوں دلوں میں ایک دوسرے سے ملنے کی بے پناہ خواہش تو ہوگی۔ دادا بھائی اپنی بساط کے مطابق اپنی اندرونی تصویریں

معہ بیرونی تصویروں کے بھیجا کرتے تھے۔ اس طرح کیٹ بھی اپنے آپ کو ٹکڑوں میں بانٹ کر کر بین الاقوامی قانون امیگریشن کی زد میں نہ آئے اور سفر کا خرچہ بھی تھوڑا ہو، قسط وار بھیجا کرتی تھی۔ اور اس نے تو ایک بار اپنی آواز کا ٹیپ بھی بھیجا تھا لیکن اس ٹیپ کو سننے کا بندوبست ہمارے پاس تو کیا پشاور ریڈیو اسٹیشن پر بھی نہیں تھا چنانچہ دادا بھائی اس کی آواز بھی نہیں سن سکے۔ اور یہ پیار کے جذبے یوں ہی گھٹ کر دم توڑ گئے۔ بیل پر بیٹھ کر کوئی شہزادہ آیا اور کیٹ کو لے گیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ سندھ کے کسی ہندو نے کیٹ سے شادی کر لی، دادا بھائی کی زندگی کا عظیم ترین صدمہ۔ مجھ سے ایک دن انتہائی افسردگی میں کہنے لگے میں نے اس کو لکھا ہے یو آر اے ٹرو امریکن۔ YOUARE A TRUE AMERICAN اور پھر آپا کی شادی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء ہمارے خاندان کا ایک اور عظیم سانحہ۔ میرا ملازمت پر چلا جانا اور پھر دادا بھائی کا یکدم تنہا ہو جانا۔ اور پھر اکیڈمی میں علی الصباح میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ رات بھر نہ جانے کیوں میں سو نہ سکا تھا۔ گھڑی گھڑی میرے آنسو نکلتے۔ سب گھر والے ایک ایک کر کے یاد آتے کہ ڈائرکٹر مسٹر بن MR. DUNN کا معتمد چپراسی ابراہیم میرے پاس بھاگا ہوا آیا کہ صاحب نے بلایا ہے۔ نجانے کون سی طاقت تھی جس نے مجھے بتایا کہ مسٹر بن مجھے یہ بتائیں گے کہ میرا بھائی مر چکا ہے اور واقعی یہی ہوا۔ دادا بھائی نے قینچی لے کر زندگی کے ٹیپ کو بیچ سے کاٹ دیا۔ بس ہم نے آخری بار کیٹ کے متعلق تب ہی سوچا تھا۔ اس واقعے کو اب پورے چھبیس سال ہو چکے ہیں اور آج میں کیٹ کی آواز فون پر سن رہا ہوں۔ یہ آواز امریکہ ہی سے آ رہی ہے اور میں بھی امریکہ میں ہوں۔ اور وہ فون پر رو رہی ہے، اپنی صفائی پیش کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے مختار خدا کے واسطے میری بات پر یقین کرو معتصم کی موت میں میرا کوئی قصور نہیں۔ خدارا مجھے مجرم نہ گردانو۔ میں اس زمانے میں ایک ناسمجھ لڑکی تھی۔ دنیا میں اکیلی تھی میرا کوئی سہارا نہ تھا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو، بتاؤ تم لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو۔ اور میں ریسیور ہاتھ میں لیے سوچ رہا ہوں واقعی دنیا اتنی بڑی نہیں جتنی کہ نظر آتی ہے اور اس لحاظ سے امریکہ تو بہت ہی چھوٹا سا ملک ہے۔

اعجاز فاروقی

(۱)

سرگذشت

مرا دل شیشۂ شفاف تھا
اک آبگینہ تھا
سرورِ بےخودی کا
تابِ نظارہ، جمالِ ہمنشیں کا
کیف و کم کیا
نہ پردہ درمیاں حائل
نہ آمیزش دوئی کی تھی
مگر سرِ نہاں
اک بے قراری، اک تپیدن،
گردشِ پیہم
کہ جس میں برقِ رفتاری کی سُرعت تھی
سکوں کا ہو گماں جس پہ

(۲)

یہ شیشہ
جب یہ زنگارِ انا سے مَس ہوا
تو آئینہ بن کر ہوا تابان و درخشندہ
کہ جس میں ہر طرف میں ہی تھا اپنا ہمنشیں
ہمدم بھی میں خود ہی، ندیم دوست بھی خود ہی
یہ زنگارِ انا
جس نے کیا آئینے کو صیقل
جلا دی میری تصویرِ دل
میرے عکس میں سارے ہی عالم کو سمیٹا
وہ عجب تھا نشۂ پندارِ آئینہ

(۳)

زمانے کی تنی قوسوں سے
میرے آئینے پہ تیر برسے ہیں
کہ جن کی گرمیٔ رفتار سے آئینہ شعلہ زن
مرا چہرہ بنا منظر نقوشِ سر بریدہ کا
یہ زنگارِ انا ٹوٹے ہوئے تاروں کی چمک

(۴)

مگر وہ نُور کی بارش
جو میرے آئینے کے زنگ کو دھو کر
اسے پھر شیشۂ شفاف و تابندہ بناتی جائے
تا نقوشِ سر بریدہ مطلعِ انوار بن جائیں

اعجاز فاروقی

ناقابلِ شکست

(۱)

خزاں آئی
تو پتّے زرد رُو ہو کر سُلگنے لگ گئے
چُبھتی ہوئی ٹھنڈی ہواؤں سے یہ کہتے تھے
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے خونِ گرم
تم اپنے تخریبی پلوں سے چراغِ زندگی کیسے بجھاؤ گی

(۲)

خزاں کے ہاتھ میں گرزِ اجل تھا
جس کو وہ ہر سُو گھماتی جا رہی تھی
اور کہتی تھی
کہ برفوں کی سفیدی میں کبھی چمکا ہے
خونِ گرم کا یہ قرمزی جامہ!

(۳)

مگر پتّا
کہ شوخ و تُند خو تھا
زندگی کرنے کی خواہش میں سراپا جذبۂ کامل
اپنی گلناری میں سرخوش تھا
بھلا وہ برف کی یلغار سے کیسے دبک جاتا
چہک کر یوں کہا اس نے
مرے گرنے میں بھی آوازِ سازِ زندگی کی ہے
مَیں برفوں کی تہوں کے نیچے پانی میں چلا جاؤں گا
پانی زندگی ہے!

رشید نثار

غیریت کی دوسری صورت

میں کیا تھا
بس اک بے ردا
چند مڑیوں میں سویا ہوا ایک لمحہ
زمیں سے چمٹ کر ابھی جس نے
لب وا کیئے تھے نہ پلکیں اٹھائیں
نہ دل سے کسی ڈر کی کنڈی ہلائی
مگر دوسرا پل مجھے اپنی باہوں میں لے کر
پہاڑوں کے پیچھے کہیں لے گیا تھا
جہاں سنگِ لرزاں، مجسّم چٹانیں، درختوں کے
بُت اور
سکوتِ ازل کی صداکاریاں تھیں

میں خاموش تھا
اور زباں میرے سینے میں چھپ کر کہیں دم بخود تھی
مری آنکھ سوچوں کی گٹھڑی میں چپ چاپ جلنے
سلگنے لگی تھی

بہت شانتی تھی
مگر خوف کی ایک میلی سی چادر
مرے سر پہ آکر قناتِ سیہ کی ندا بن گئی تھی

وہ پل جو مجھے ساتھ لایا جدا ہو گیا تھا
اکیلا میں اپنی صداؤں کے جنگل میں بیٹھا
فقط رو رہا تھا
مرے پاس گھر تھا نہ کوئی گلی تھی
بہت سی چٹانوں کی تپتی زمیں تھی
میں برفاب تپتی زمیں کا پڑوسی
اسی ایک لمحے جو بدھ بن کے آیا
وہی ہمسفر تھا، مرے جوگ کا ہم نشاں تھا
اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں کہیں کھو گیا،
مگر وہ کہاں تھا

میں برفاب جوگی
چٹانوں کی تپتی زمیں کا پڑوسی
فقط اپنے ہونے کی مالا گلے میں پہنے
جفاکار لمحے کے نیزے پہ اٹکا ہوا تھا،

یں نیز سے اُترا
چٹانوں کی تپتی زمیں،
زماؤں کی برفاب میں جم گئی تھی
ری آنکھ سوچوں کی گٹھڑی سے باہر جُھک کر
ہواؤں کے ہاتھوں کی تالی کو سُن کر اچانک کُھلی تھی،

مرا دل دھڑکتا، بہت بولتا تھا،
یں خوش تھا کہ میں شانتی کا نگر چھوڑ آیا ۔
یں اب گفتگو بھی کروں گا
صداؤں کی مالا بُنوں گا
مُجھے مرے پاؤں
صداؤں کی بستی میں جب لے کے آئے
واں رنگ میرے نہیں تھے
وہاں بھی نہیں تھی
بس اِک پَل نے جادو کیا تھا
کہ نسلوں کے آگے خلیجیں پڑی تھیں

مرے پاؤں چل کر وہیں رُک گئے تھے
کہ آگے تو کوہِ ندا تھا
اِسے پار کرتا تو پھر میں چٹانوں کی بستی میں
برفاب ہوتا
اگر لوٹ جاتا تو لمحہ مرا ساتھ پھر چھوڑ جاتا
اُسے میں کہاں ڈھونڈتا
کہ میں اب یہاں خود کو پھر ڈھونڈنے کے لئے
آ گیا ہوں
مقفّل کواڑوں پہ دھنک کے کتنے نشاں
مِل رہے ہیں۔

اجل

نہ جانے کدھر سے کہاں سے
لپک کر وہ آئے
مجھے
راہ میں چلتے چلتے دبوچے
عدالت میں
بزمِ طرب میں
گلی میں یا پھر
مجھ کو میرے ہی گھر میں پچھاڑے
ازل سے
میں اس کا شناسا ہوں لیکن
مجھے اپنے ہمراہ
پل بھر میں لے کر نکل جائے گی
اور پھر اس کی پرچھائیاں
دیر تک
مکڑیوں کی طرح رینگتی ہی رہیں گی

برگِ نمو

صبح سے
سورج کی کرنیں ہیں مقید ابر میں
روشنی مجروح ہے
ساعتِ رفتہ کی قبریں ہیں فلک پر یا
خلاؤں میں معلق ہیں دعاؤں کے حروف
بن گیا ہے وقت گویا
اک شکستہ آئینہ
کرچیوں میں جس کی
آتا ہے نظر
نارسائی کا شجر
آئینہ سچا ہے
کل
سوختہ شاخوں سے ابھرے گی حیات
سبز ہے برگِ نمو
روشنی کی دیر ہے

فیاض تحسین

میرے حوالوں کی تجسیم ممکن نہیں

مجھے میرے آثار میں ڈھونڈتے ہو!
عجائب گھروں میں،
شکستہ زمانوں کی بے آب تیغوں،
زرہ بکتروں میں
مجھے ڈھونڈتے ہو
مجھے جن حوالوں سے تم جانتے ہو
وہ صدیوں پہ پھیلی ہوئی دُھول میں اَٹ چکے ہیں
اُنہیں مقبروں، معبدوں، خانقاہوں پہ
جلتی اگر بتیوں کے دُھوئیں میں
کہاں ڈھونڈتے ہو؟
سیہ طاقچوں میں بھڑکتے چراغوں کی لَو سے
مرا راستہ پوچھتے ہو
مجھے ڈھونڈنا ہے
تو گھوڑوں کے ٹاپوں میں
تیغوں کی جھنکار،
توپوں کی آوازمیں مجھ کو ڈھونڈو
مجھے میرے زندہ حوالوں میں ڈھونڈو
عجائب گھروں میں لٹکتی ثقافت سے
میرا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے
کہ میرے حوالوں کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

یٰسین افضال

تار کا پنجرا

گیٹ سے باہر نکلنے کی اسے ضد پر
اجازت مل گئی تھی
اپنی خواہش کے مطابق میرے بیٹے نے
پرندوں کے بھرے میلے میں جا کر
تار کے پنجرے میں ڈلوائے
بٹیر اک ساتھ ڈھیروں
دوسرے پنجرے میں
فربہ نسل تیتر ڈھیر سارے
دل چہک اٹھا تھا اس کا
باجرے کے ڈھیر میں
رکھ دیتا پنجروں کو
کبھی بارش میں نہلاتا
دکھاتا دھوپ باہر کی
جو سوتا وہ تو سرہانے انہیں رکھتا
کبھی پانی کو ترساتا وہ دن دن بھر
کبھی اپنا بھی کھانا ان کو دے دیتا
کبھی پنجرے کے باہر سارے دانے پھینک کر
ان کو ستانے کے مزے لیتا
کبھی پالی ہوئی بلی کے آگے
رکھ کے پنجرا کھلکھلاتا

باجرے کے ڈھیر میں بے چارہ اک دن
ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا
پسلیوں کے ننھے پنجرے کے اندر
پھڑ پھڑا کر رہ گیا تھا
اس کا پنچھی
جانے کیسا حبس دم تھا
پنجروں کے مخروطی تاروں میں
نظر آنے لگے تھے
خون چونچوں اور پنجوں کے منقش
باری باری اس کے تیتر مر رہے تھے
زخمی کر ڈالے تھے اپنے سر بٹیروں نے
عجب تھا گرم موسم!

اس نے آخر
مدتوں سے بھوکی
اس پالی ہوئی بلی کے آگے
جال سے تاروں کے
دونوں بند پنجرے کھول ڈالے!

زاہدہ صدیقی

۱۹۸۷ء کی آخری نظم

اے میرے خدا!
وہ کیا دن تھے
جب ہم ماں باپ کے سائے میں
سکھ بانٹنے والی چھاؤں میں
مِل جُل کے بیٹھا کرتے تھے
دُکھ سُکھ کی باتیں کرتے تھے
اور سال کی آخری ساعت کو
ماں باپ کی دُعا کے سائے میں
رُخصت کر کے
نئے آنے والے سال کا سواگت کرتے تھے
اور شفقت کے انمول خزانے
ڈال کے اپنی جھولی میں
اک عہدِ وفا بھی کرتے تھے ـــــ
ان لمحوں میں وہ ہم سب کو
جینے کے ڈھنگ سکھاتے تھے
اور اپنے جیون کی سب ایسی باتیں یاد دلاتے تھے
جو ہم کو حوصلہ دیتی تھیں

اے میرے خدا!
پھر سال کی آخری ساعت آنے والی ہے
میں اس کو رُخصت کیسے کروں
جس ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کے میں
جانے والی ساعت کو رُخصت کرتی تھی
اور آنے والی ساعت کا جی جان سے سواگت کرتی تھی
وہ جا بھی چکی،

اور اس کی جگہ اب تپتی دھوپ نے اپنے
ڈیرے جما بھی لئے
اس عالم میں
جب میرے سارے رگ و پے میں کانٹے ہی
کانٹے چبھتے ہیں
اور میری یکسر سوکھی زباں کچھ بھی کہنے سے عاجز ہے
دل کا خالی کشکول لئے چُپ چاپ کھڑی
مَیں سوچتی ہوں
جب دُکھ سُکھ کی باتیں سُننے والے ہی نہیں
بے لوث دُعاؤں سے جھولی بھرنے والے
ہی سر پہ نہیں
مَیں جانے والے سال کو رُخصت کیسے کروں
اور آنے والے سال کا سواگت کیسے کروں

حفیظ صدیقی

جنوری ۱۹۸۷ء کی ایک رات

دفعتاً جب روشنی بجھنے لگے اور چار جانب تیرگی
چھانے لگے
بُلبلوں کے چہچہانے کی صدا کونجوں کی کرلاہٹ
میں ڈھل جانے لگے
خوبصورت تتلیاں غائب ہوں اور ان کی بجائے
سانپ لہرانے لگیں
آرزوؤں کے کنول کھلنے سے بھی پہلے ہی مرجھانے لگیں
وقت تھم جائے طبائع آنے والے منحوس لمحے سے گھبرانے
لگیں،
اور دلوں کی تہہ سے بھی نکلی ہوئی ساری دعائیں
رائیگاں جانے لگیں

اے خدائے لم یزل!
اس جانگسل لمحے کے خونیں کرب سے مجھ کو بچا!
اے خدائے لم یزل!
اس جانگسل لمحے کے خونیں کرب سے مجھ کو بچا!

غلام حسین ساجد

ایک پراگندہ نظم

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں اُجلے آسمانوں پر
اور اُن کی راکھ سے اِس خاک کی تزئین ہوتی ہے
کہ جیسے آئینے میں عکس پڑتا ہو جہانِ غیب کی
طیّب زمینوں کا

کبھی موسم بدلنے میں اگر تاخیر ہو جائے
تو مَیں حیراں نہیں ہوتا
کہ ترتیبِ جہاں کا ایک لمحے میں بدل جانا
بہت آساں نہیں ہوتا
خصوصاً خاک پر یہ رنگینیِ خلقت
(کہ ہم خود بھی اُسی کا ایک حصّہ ہیں)
کبھی اپنے معیّن راستے سے ہٹ نہیں سکتی
اطبّا ٹھیک کہتے ہیں
پُرانی عادتیں زنجیرِ ہستی کا اِک ایسا جُزو ہوتی ہیں
جنہیں خود سے الگ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے

کہیں اُجلی فضاؤں میں
ستارے راکھ ہونے میں
ہمیشہ کی طرح مصروف ہیں اب بھی
اور اُن کی آنچ سے تنویر بڑھتی ہے مرے دل کی

مگر اے کاش!
میں اس سلسلے کو چند لمحوں کے لیے تبدیل کر سکتا
کہ مجھ کو آسمانی نعمتیں اچھی نہیں لگتیں
مَیں اپنے باپ دادا کی طرح ضیق النفس میں
مُبتلا ہوں

مجھے ترتیبِ دُنیا کو اُلٹنے کی اجازت ہو
تو یہ اُجلے ستارے خاک سے اس طرح اُٹھ جائیں
کہ اک لمحے کو ان پر بھی تنفّس بار ہو جائے
حیات و موت اُن پر بھی
مرے اور میرے آبا کی طرح دشوار ہو جائے!

ابرار احمد

موت دل سے لپٹ گئی اُس شب

ایک خوابِ ہزیمتِ دُنیا
ایک آہٹ دوامِ خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند سرمحل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی

ایک بستر، پرانی یادوں کا
اور سویا ہُوا دلِ وحشی
آہنی انگلیوں کے پنجے میں
اِک گھنی تیرگی کے رستے میں
ذائقہ بھولی بسری بارش کا
ایک سایہ، جُھکا ہوا دل پہ
دیر تک آسماں سے گرتی ہوئی
ایک مدھم صدا، دریچوں میں
ایک پُر شور سیل کی آواز
سانس کی سلوٹیں ڈبوتی ہوئی — !

کون تھا اُس سمے کے آنگن میں
جاگتی رات کو تھپکتا ہُوا
کون تھا، رات دن کے پھیرے میں
گُمشدہ دُنیاؤں سے اُبھرتا ہوا
رو رہا تھا دیارِ غربت میں
اور معدوم کے علاقے میں
اپنی آنکھوں میں ڈال کر مٹی
خواب تکتا ہُوا۔ میں بچپن کے
ایک ہنستے ہوئے گذشتہ میں !!

نظم

زمیں پیروں تلے محسوس ہوتی ہو تو
دلِ مضبوط رہتا ہے
یہ سورج چاند اور تارے
نظر ہر روشنی سے اکتسابِ نور کرتی ہے

کتابِ زندگی کا ہر صفحہ رنگین لگتا ہے
ہوا مسرور کرتی ہے
مگر خطرے کی اک گھنٹی کہیں بجتی ہی رہتی ہے
اندیشوں سے دھڑکتا دل
لرزتے پانیوں پر ڈولتے پتّے پہ اپنے پاؤں رکھتے
اسے اپنی زمیں کا نام دیتا ہے
اسی دھوکے میں رہتا ہے
اسی سے پیار کرتا ہے
کسے معلوم ہے لیکن
ذرا سی لغزشِ پا سے
یہ دُنیا کب اُلٹ جائے
توازن کب بگڑ جائے!

رضی الدین رضی

کتنے اچھے دن ہوتے تھے

کتنے اچھے دن ہوتے تھے
جب ہم خوشبو کے ساتھی تھے
کوئی ہماری آنکھوں پر ہاتھوں کو رکھ کر
پوچھتا تھا
"میں کون ہوں بوجھو؟"
اور ہم جو خوشبو کے ساتھی تھے
کہہ دیتے تھے
"تم خوشبو ہو"
خوشبو یکدم ہنس دیتی تھی
کتنے اچھے دن ہوتے تھے
کتنے اچھے دن تھے جب خوشبو کو اپنے ساتھ لیے
جگنو کا پیچھا کرتے تھے
دن رات مہکتے رہتے تھے
کبھی خوشبو خود چھپ جاتی تھی
اور کبھی ہم اس سے چھپتے تھے
یوں آنکھ مچولی رہتی تھی
ہم اُس کو ڈھونڈ کے خوش ہوتے تھے
وہ پا کے ہمیں خوش ہوتی تھی
کتنے اچھے دن ہوتے تھے
کتنے اچھے دن ہوتے تھے جب خوشبو
ہم سے پوچھتی تھی "ہم بچھڑ گئے تو کیا ہوگا؟"
ہم اُس کو بس یہ کہتے تھے
"چُپ ایسی بات نہیں کرتے"
اور خوشبو سوچ میں کھو جاتی تھی
کتنے اچھے دن ہوتے تھے

اور پھر اک دن ایسا آیا
آنکھ مچولی کھیلنے والی خوشبو کو ہم خود کھو بیٹھے
(خوشبو آخر خوشبو تھی ناں)
ہم جو خوشبو کے ساتھی تھے تنہا ٹھہرے
اب ہم گذرے دنوں کو اکثر
تنہائی میں سوچ کے بس یہ کہہ دیتے ہیں
"کتنے اچھے دن ہوتے تھے
جب ہم خوشبو کے ساتھی تھے"

علی محمد فرشی

دریائے سواں کے کنارے ایک نظم

اُسے اُلفت کے سب اسباق ازبر تھے
وہ چاہت کے سبھی رنگوں سے واقف تھی
محبت کے تقاضوں کو سمجھتی تھی
مِلن کے سب لوازم پیش کرنے کا سلیقہ جانتی تھی
جُدائی کے اذیت ناک لمحوں میں وہ لفظوں کے کبوتر بھیج دیتی تھی
اُسے رُوٹھے ہوئے دِل کو منانے کے سبھی انداز آتے تھے
وہ چاہت کے سبھی جگنو
محبت کی ہر اک تتلی
مری مُٹھی میں لا دیتی
مِرے سانسوں میں خوشبو سی جگا دیتی
مِرے صحرا بدن پر وُہ
سنہری دھُوپ کی مانند بھی کھِلتی
کبھی بدلی کی صورت بھی برستی تھی
مکمل یوں تو ہر اِک زاویے سے تھی
مگر کچّے گھڑے پر تیرنے کا
حوصلہ اُس میں نہیں تھا!

مُبین مرزا

خود کلامی

ایک بے نام محبت کہ مسلسل کب سے
اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہے۔۔۔۔۔!
تلخیٔ وقت کا دُکھ اور بڑھا دیتی ہے ــــــ
نغمۂ رُوح کی سنگت کو جِلا دیتی ہے۔۔۔۔۔۔
دل کو احساس کہ ہم دُور ہوئے!!
ہم جو سانسوں کی ہر آہٹ کبھی محسوس کیا کرتے تھے
ہم جو آنکھوں کی ہر بات کو خود جان لیا کرتے تھے
دل کو احساس کہ ہم۔۔۔۔۔۔۔۔ـــــــ!
۔۔۔۔۔ــــــــ دُوریاں بڑھتی ہی جاتی ہیں اگر اب اے دوست!
پھر یہ دل سے اُسی احساس کا رشتہ کیوں ہے
آج پھر کرب جگانے لگی کیوں تنہائی!
آج پھر دل نے وہی نام پُکارا کیوں ہے
تُو اگر ہم سے گریزاں ہے تو اتنا تو بتا!
آکے ہر شب تُو ہمیں خواب میں ملتا کیوں ہے
بعد میں ہم ــــــ کہ اُسی دُکھ کو بُھلانے کے لیے
بزمِ احساس میں پھر انجمن آرا بھی ہوئے
سُرخرو بھی ہوئے ہم اور کبھی رُسوا بھی ہوئے
لیکن اک دُکھ ــــــ کہ سدا ساتھ رہا۔۔۔۔۔۔
اُسی دُوری ــــ اُسی تنہائی کا دُکھ ـــــــ!
ایک اُداسی کہ ہے برسوں سے دل و جاں پہ محیط ـــــ!!۔۔۔۔۔

لمس معلوم نہیں کیا تھا مگر دل نے ابھی
اُسی اک لمحے کی قربت کو بھلایا بھی نہیں
پھر ہمیں شوق کی رُسوائی گوارا نہ ہوئی
کہ ترے بعد کسی اور کو چاہا بھی نہیں
خواب ایسا تھا کہ پلکوں پہ اثر چھوڑ گیا
دل نے ہر چند کوئی درد جگایا بھی نہیں
اب بھی دل سوچتا رہتا ہے وہی قربتِ معدوم اکثر
اب بھی محسوس تو ہوتی ہے ....
.... اُسی سرد سی رغبت کی جلن !
اب بھی خواہش تو اُبھرتی ہے وفا کی لیکن !!
گنبد وقت سے آواز یہ آتی ہے ہمیں !! ....
عرصۂ دل پہ سُلگتے ہوئے مہتاب کو بھی
بے نشاں ہو کے سرِ شام بکھرنا ہوگا
اس رہِ جاں کی مسافت میں یہ معلوم نہ تھا
ہر قدم درد کی منزل سے گزرنا ہوگا
جن کی ہمراہی میں دل نے کیا برسوں کا سفر
سرِ منزل ہمیں اُن سے ہی بچھڑنا ہوگا

وزیر آغا

خاک کا رزق تھا وہ!

پَو پھٹی، رات نے گھبرا کے کہا:
مَیں تو برباد ہوئی
میرا خیمہ، میری چادر، میری توقیر گئی
میں تو تاراج ہوئی!

دُور اک بانسری
اک شہد کی پیاسی مکھی
رس بھرے ہونٹوں سے
امرت بھرے پھولوں کے کناروں سے اُڑی
اور بولی:
میں تو سرشار ہوئی
گنگناتی ہوئی آواز بنی
رقص کرتی ہوئی رفتار ہوئی!

اور ——— "وہ"
شہد بھری نیند
چھلکتی ہوئی بیداری کے

دُھوپ اور سائے کے
موہوم سے سنگم پہ کہیں
سبز صدیوں سے لبالب بھرے
ساگر کے کنارے پہ رُکا
اک لرزتا ہوا شفاف سا آنسو بن کر
اپنی پلکوں سے گرا
خاک کا رزق تھا وہ
خاک ہُوا!!

"اے عظیم بُدھ!
تمہارے دل میں کیا ہے!
دل! وہ سامنے کے صنوبر کی تصویریں
سر سبز تنہا —— اور بس!"

یہ اِن کا ایک فارسی شعر ہے

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید این آواز دوست

ہائیکو کی روایت میں خاموشی کی علامت بہت عام علامت ہے۔ خاموشی، سناٹا، آواز! باشو کا ہائیکو میزو۔ نو۔ اوتو بہت ہی

تالاب پرانا | قدیم ایکے | یا
مینڈک کی جست | کو بی کومِزُو | تو بی
پانی کی آواز | میزو / نو | اوتو

اس ہائیکو میں جو بلاغت ہے وہ ساری کی ساری پانی کی آواز کی پیدا کردہ نہیں [illegible] اس کے پس منظر میں صدیوں کی تہذیب اور اس تہذیب
میں ارتعاش پیدا کرنے والے عناصر بھی شامل ہیں۔ پھر پانی کی آواز کو سننے والے بھی، نئے رجحانات کی آواز جو فرسودہ روایات کے ٹوٹنے جو بڑھیں کرنے
سے جنم لیتی ہے!

بارش

انسان کے لیے قدرت کا سب سے بڑا عطیہ۔ مگر شعروں میں اس کی معنویت بڑی گمبھیر اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ بارش، آسمان اور زمین کے درمیان
بلاواسطہ رابطہ کا نام ہے۔ ہر زمین اپنی حیثیت اور اپنے ظرف کے مطابق بارش سے مستفید ہوتی ہے۔ فارسی والوں کا مقولہ: بارش، باغوں میں پھول
اور صحراؤں میں خار و خس پیدا کرتی ہے۔

جاپان سرسبز و شاداب خطۂ زمین ہے۔ قدرت کے تمام ظاہری مظاہر اس سرزمین پر موجود ہیں۔ میدان، سطح مرتفع، پہاڑ، وادیاں، جنگل
سمندر، جھیلیں، اسی طرح ہر موسم کے پھول، کچھ موجود ہیں کچھ باہر سے آگئے ہیں۔ جاپان کے کلچر میں قدرتی حسن کا رچاؤ موجود ہے، اور جاپانی اس
حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

شنتو ازم جو جاپان کا "مذہب" ہے وہ بھی بدھ ازم اور مقامی کلچر کے انضمام سے پیدا ہوا ہے۔ جاپانی باہر کی کسی شے کو اس وقت تک
اپنے وجود کا حصہ نہیں بناتے جب تک وہ مکمل طور پر ان کی ثقافتی روح سے ہم آہنگ نہ ہو جائے۔

اس لیے بارش کا تصور بھی جاپانیوں کا اپنا تصور ہے۔ وہ بارش کی طوفانی بوقلمونیوں سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح
ترشح سے! پانی کے قطرے جو آسمان کی طرف سے آتے ہیں ان کے لیے ہر موسم کے مطابق نئی خوبصورتی کے مظہر بن کر آتے ہیں۔ اس لیے ان کی

Baldev Mirza | Buddha - My Love

XVII

Your presence here
is awesome
birds do not fly across
unless they have
circled over you
several times
a nightingale often comes
to you
scratches
your stony hand
perhaps for a rose
flies away
screaming
as if complaining
but you don't listen
you don't care
i care
i see
though helplessly
a man trapping the birds
cageing them
and
walking
away

XVIII

Buddha if you can't hear
take my ears
if you can't see
take my eyes
if you can't feel
take my heart
but i won't lend you
my feet
you will disappear
again
i want you
to stay here
here as you are
but i have to go back
into the earth
clay craves for clay

Though we are sitting
so close
to each other
yet what a distance
between us
distance of light and shade
distance of true and false
distance of vice and virtue
distance of eternal and temporal
distance of words and silence
distance of time and timelessness

how to bridge it
i don't know
i don't know
even how to save
my glass-like body
from the splinters
hurled
at me

XX

Words of my pain
rush out
words of my sorrows
flush out
as if to grasp what
i have been aspiring for
but all in vain
they simply ruffle
my brow
i prattle
i howl
i mutter
i soliloquize
fall in a reverie
cast off the skin
of words for moments
i just gaze at you
gaze at you...

بُدھ! میرا محبوب!

تیری موجودگی ہیبت طاری کرتی ہے
پنچھی
تیرے گرد کئی بار چکر لگاتے بنا
تجھے پار نہیں کرتے
اکثر ایک بُلبُل تیرے دوار آتا ہے
تیرے پتھریلے ہاتھ کو
(اپنی چونچ سے)
کُھرچتا ہے
شاید تجھ سے گلاب کا ایک پھول مانگتا ہے
مگر پھر چیختا ہوا اُڑ جاتا ہے
جیسے تجھ سے شکایت کر رہا ہو
مگر تُو
اُس (کی آواز) سُنتا ہی نہیں
تجھے اُس کی پرواہ ہی نہیں
پر نتو مجھے تو پرواہ ہے
مَیں تو دیکھتا ہوں
پر کتنی بے بسی سے دیکھتا ہوں
کہ پنچھی پکڑنے والا
پنچھیوں کو پکڑ کر پنجرے میں ڈالتا ہے
اور پھر یہ جا وہ جا!!

ہے بُدھ مہاراج!
اگر تیرے کان سُننے سے عاری ہیں
تو مجھ سے میرے کان لے لے۔
اگر تُو دیکھ نہیں سکتا
تو آ مَیں تجھے اپنے نین دے دوں
اگر تو محسوس نہیں کر سکتا
تو لے مَیں اپنا دل تجھے بھینٹ کرتا ہوں
مگر مَیں تجھے
اپنے پاؤں اُدھار نہیں دوں گا
کہیں تو ایک بار پھر
غائب نہ ہو جائے
میرا جی چاہتا ہے
تو یہیں ٹھہرا رہے
ایسے ہی جیسے تُو (کھڑا) ہے
پر مجھے تو واپس جانا ہے
دھرتی کی (کوکھ) میں
آخر، چکنی مٹی
چکنی مٹی ہی کی چاہت تو کرتی ہے!

o

(یہ کیسا انیائے ہے)
کہ ہم دونوں، ایک دوسرے کے
قریب بیٹھے ہیں
پر دونوں کے بیچ اتنا بڑا فاصلہ ہے
روشنی اور اندھیرے کا فاصلہ
بُرائی اور نیکی،
بول اور چُپ، ہمیشگی اور چل چلاؤ،
زمان اور بے زمانی کا فاصلہ!
اسے کیسے عبور کیا جائے
مجھے کچھ پتا نہیں
مجھے تو یہ بھی خبر نہیں
کہ مَیں کیسے
اپنے اس شیشے ایسے شریر کو
اُن چھینٹیوں سے بچا سکتا ہوں
جو مجھ پر بڑے زور سے پھینکی گئی ہیں

o

میرے اندر کی پیڑ
شبدوں میں ڈھل کر
باہر کو لپکتی ہے
میرا دُکھ
شبد بن کر باہر کی اور بہتا ہے
(اور یہ شبد)
اُسے پکڑنے کی ناکام کوشش میں ہیں
جس کی مَیں اچھا کرتا رہا ہوں
وہ تو بس میری بھوں پر چنٹ ڈالتے ہیں
اور مَیں بڑبڑاتا ہوں
بھیڑیے کی طرح گُرگتا ہوں
بد بداتا ہوں
خود سے باتیں کرتا ہوں
محویت میں چلا جاتا ہوں
چھن بھر کے لیے
شبدوں کی کھال اتار پھینکتا ہوں
اور پھر ٹکٹکی لگائے تجھے دیکھتا ہوں
تجھے گھورتا ہی چلا جاتا ہوں!!

رُودلف نیلسن
(ترجمہ) مسعود منوّر

سائرن کی صدا

رُودلف نیلسن

۱۹۰۱ء میں جنم لیا اور ۱۹۲۹ء میں شدید بیماری کے عالم میں وفات پائی۔ وہ ایک مزدور طبقے کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے زندگی کی جدوجہد ایک مزدور کی طرح شروع کی اور شاعری میں بھی ایک مزدور کے الم کو نظم کا موضوع بنایا۔ اُن کی شاعری میں شہر کی سڑکیں اور بجلی کی قطار روشنیاں کچھ اس خوبصورتی سے سمٹی ہیں کہ لفظوں میں زندگی کا ہیولا محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بہت کم جئے لیکن اپنی جوانی میں کسی عوامی شاعر کی طرح مقبول ہوئے۔ اپنے عہد کے انقلابیوں میں ان کی حیثیت نہایت معتبر اور مُستند تھی۔ اُن کی نظم — RIVALEN کا ترجمہ اُردو دُنیا کے لئے پیشِ خدمت ہے۔

یہ سائرن کی صدا ہے کہ درد کا سُر گم
کہ پھر سے پانچ بجے اور شام چیخ اُٹھی
وہ کارگاہ کے دَر سے ہجومِ فرہاداں
چھُٹا تو پیکرِ شیریں سبھی سے آگے تھا

خوشی سے ہاتھ ملائے بہم ہوئے ہم تُم
تو مُسکرا کے کہا تُم نے "آگئی ہوں مَیں"!
تمہارا نرم تبسّم تھکن سے زخمی تھا
حسین آنکھوں کے اطراف تھے سیہ حلقے
تمہارے ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں پہ دھرے
مَیں دیکھتا تھا کہ زخموں سے چُور ہو جاناں

مری رقیب مشینوں کا حلقۂ آہن
تمہارے جسم سے دن بھر گلاب چُنتا تھا
اُنہی کے ناز اُٹھاتے شباب بیت چلا!

محمود ہاشمی | "رنگِ حنا" سے "دشتِ بے اماں" تک

"مَیں ساز ڈھونڈتی رہی"

"شہرِ درد"

"غزالاں تم تو واقف ہو"

اور

"سازِ سخن بہانہ ہے۔"

ادا جعفری کے یہ چار شعری مجموعے، تقریباً ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۲ء تک، اُردو شاعری کے بدلتے ہوئے منظر نامے کی مثا
ہیں۔ ان شعری مجموعوں کو ہم برِصغیر کی تہذیبی اور تخلیقی تاریخ کا آئینہ تصوّر کر سکتے ہیں۔ ان چار مجموعوں میں وہ سب کچھ موجود ہے،
اس عہد کی شاعری کی شناخت ہے، تاہم ان شعری مجموعوں کی نمایاں ترین خصوصیت، وہ جدید طرز و آہنگ ہے جسے روایتی اور پژمُر
ظ کی حامل شاعری کے مقابلے میں، تازہ کار تخلیقی جہت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ادا جعفری اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے ہی روایت کی نہج سے ہٹ کر اپنی انفرادی راہ کی جستجو میں رہیں، اُنہوں نے جس سم
تخلیقی سفر شروع کیا تھا —— اُس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک دیباچے میں لکھا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے رہروانِ شوق کا ایک کارواں، جدید شاعری کا پرچم اپنے ہاتھوں میں
لے کر چلا تھا، اور ایک لڑکی تھی جو بڑے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ اس کارواں میں شریک ہوئی تھی۔ مجھے اپنی روایات
جتنی عزیز ہیں، روایتوں سے بغاوت بھی اُتنی ہی عزیز رہی ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ اپنے تخلیقی سفر میں ادا جعفری نے روایت سے انحراف، احتراز، بغاوت اور جدید آگہی سے ہم آہنگی کو اپنی بنیا
بنایا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شاعری کو کسی ایک صنف یا اسلوب تک محدود نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا آغ
نظموں سے ہوا تھا۔ آج بھی وہ جدید ترین طرز کی نظمیں لکھ رہی ہیں —— غزل سے انہوں نے اجتناب نہیں کیا، لیکن روایتی انداز
غزل سے احتراز کرتے ہوئے۔ انہوں نے اپنی غزل کو جدید تر غزل کی تازہ کار فضا سے ہم آہنگ کیا ہے۔

انہوں نے عصری اور سماجی اقدار سے اپنے شعر کو اس طرح وابستہ نہیں کیا کہ ان کی شاعری ـــــ ایک مسئلے، جلسے یا عہد کی محدود شاعری بن کر رہ جائے۔ اُن کے شعر کا ربط اُس عصری آگہی سے ہے جس میں ماضی اور مستقبل لمحۂ موجود سے وابستہ رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کی عرفِ آشام فضا میں، اور جدید سائنسی عہد کی سلگتی ہوئی برقی بھٹّیوں میں، انسانی ضمیر کے کندن کو تلاش کرنا چاہا ہے کہ یہی ضمیر ابدی قدروں اور ابدیّت کا امانت دار ہے۔

ادا جعفری کی شاعری ایک تجسّس ہے ـــــ ایک تلاش ہے ـــــ ایک ایسی کائنات کی جستجو ہے، جس کے خواب پیمبروں سے محروم عہدِ جدید کو صرف شاعر کے وسیلے سے ہی میسّر آ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں وہ کہتی ہیں۔

اور پھر مَیں نے سوچا
کہ میرے کئی رُوپ ہیں
کوئی بھی اسیری، اسیری نہیں
جو زنداں کی دیوار اُونچی ہوئی تو
مَیں پھولوں، ستاروں کی بے خواب
آنکھوں میں تھی

اور مرا شوقِ دیدار تھا
مَیں اکثر ہواؤں کے بے تاب جھونکوں میں تھی
کہ تسکینِ جاں کے لیے
قُربِ محبوب کے لمس سے آشنا ہو سکوں
اور کبھی وحشتِ دل کی خاطر
چٹانوں سے اور کوہساروں سے باتیں کروں
کہ بازارِ سُود و زیاں میں
ہمیشہ زیاں ہی نہیں
آرزو حاصلِ رائیگاں ہی نہیں
طلسمِ جہاں میں جو ظلمات کی رات تھی
مَیں وہاں
دل نشیں رسم کی روشنی میں رہی
کہ مَیں خود بھی تعبیر، اک خواب کی ہوں
کہ مَیں زندگی ہوں!

(رہائی)

بیسویں صدی کی ہولناک فضا میں زندگی کے اثبات کا یہ اعتراف ادا جعفری کے فن کی بنیادی صلابت ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ایسی کائنات کو تخلیق کیا ہے، جو انسان اور بیرونی دُنیا کے درمیان ایک بامعنی رشتے کو استوار کرتی ہے۔ لیکن اس تصادم اور اس کشمکش کو بھی نمایاں کرتی ہے جو زندگی اور کائنات کے درمیان، انسانی وجود کا المیہ ہے۔ مثلاً

صحیفۂ حیات میں، جہاں جہاں لکھی گئی
لکھی گئی، حدیثِ جاں، جراحتوں کے درمیاں
کٹھن کہاں، طویل تھا، راتوں کا سلسلہ
شروع مری نگاہ کی سچائیوں میں تھا
اس عہدِ خود سپاس کا پوچھو ہو ماجرا
مصروف آپ اپنی پذیرائیوں میں تھا
میں اندھیروں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو، مرا حوصلہ ہے کیا
مرے روز و شب بھی عجیب تھے، نہ شمار تھا نہ حساب تھا
کبھی عمر بھر کی خبر نہ تھی، کبھی ایک پل کو صدی کہا

ادا جعفری نے اپنی شاعری میں جس شعری کائنات کو تخلیق کیا ہے، اُس میں ہمارے عہد کے وہ تمام بے چہرہ سوالات موجود ہیں، جن سے آج کا انسان دوچار ہے —— ادا جعفری کو عہدِ جدید کے تخلیقی مطالبات کا بھی بھرپور احساس ہے —— وہ جانتی ہیں کہ فی زمانہ شاعری کا فریضہ خاصا اہم اور دشوار ہے۔ شاعری کا وسیلہ زبان ہے اور ہر انسان اپنی بساط کے مطابق لسانی عمل سے دوچار ہوتا ہے اور لسانی ہیئت کو ابتر بنا دیتا ہے۔ عہدِ نو میں شاعر کا پہلا فریضہ تو یہ ہے کہ اس ابتر شدہ لسانی پیرائے کو اپنے تخلیقی عمل سے گزار کر، اسے نئے سرے سے زندہ اور ہمہ گیر مفہوم کا حامل بنائے۔ دوسرے یہ کہ شاعری میں اس تخلیقی منطق کو منظم کرے جو نثری منطق کے مقابلہ میں لامحدود مفاہیم اور اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ ادا جعفری نے اپنی شاعری میں اسی معیار کو پیشِ نظر رکھا ہے، انہوں نے روایتی شاعری کے کلیشے (CLICHE) کی بجائے نئے استعارے کو جنم دیا ہے، اور مفہوم کی بازیافت کے لیے اپنے لفظ کو حال کے اُس بے انت لمحے سے وابستہ کیا ہے جو ماضی کی پژمُردہ روایت سے پاک ہے جس میں لمحۂ موجود کا اضطراب اور جس میں مستقبل کے خوابوں کی سحر نمائی ہے۔

ادا جعفری کی شاعری میں جو ذاتی سطح نمایاں ہوتی ہے اُس میں ایک ایسا تاریخی شعور اور ایسی HISTORICITY ہے جس میں گزرے ہوئے زمانے اور آنے والے زمانے، حال کے لمحے سے ہم آہنگ ہیں، اور لمحۂ موجود، ایک متحرک اور DYNAMIC کائنات ہے جس میں وقت اور خارجی زندگی کے تضادات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر بھی ایک مستحکم شعری کائنات کو تشکیل دیتے ہیں۔ مثلاً

وہ کتنی دُور رہا فیصلہ بھی اُس کا تھا
مجھے تو قُرب کے احساس نے سنبھالا تھا

یہی غبارِ شب و روز کا کمال بھی ہے   جو آنکھ دیکھ نہ پائی، وہ دل نے دیکھا تھا

خوشبو کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں تھی میں

پھر یوں ہوا کہ گردشِ دوراں تھی میں رہی

ادا جعفری اپنی شعری کائنات کو جس طرح منفرد بناتی ہیں، اور استعاراتی بیان کے ذریعہ اپنی غزل میں جو محاکاتی فضا پیدا کرتی ہیں، اُس کی مثال کے لیے صرف چند شعر:

رات آہستہ گام اُتری ہے

درد کے ماہتاب زینوں سے

تُو نے مژگاں اُٹھا کے دیکھا بھی

شہر خالی نہ تھے مکینوں سے

آشنا آشنا پیام آئے

اجنبی اجنبی زمینوں سے

ادا جعفری نے فنکارانہ چابکدستی کے حصول کے لیے ایک طویل عرصہ تک ریاضت کی ہے۔ اُن کی شاعری میں فطری نوعیت کے ایسے پیکر تخلیق ہوتے ہیں، جن میں متصادم اور متخالف قوتوں کے درمیان اشتراک و معنویت کی جستجو ہوتی ہے —— حسّی سطح پر شعر میں جمالیاتی ننگی اور شادابی کا احساس بھی ہوتا ہے، اور اس شادابی کے تناظر میں پروان چڑھنے والے تصادم، تضادات اور شوریدگی کا بھی مفہوم بیان ہو جاتا ہے —— تضادات کی اس کائنات میں معروض سے ماورا ہو کر اپنی ذات کا اعتراف، اور عدم وجود سے وجود کی شہادت —— یہ ادا جعفری کا کمال ہے۔ مثلاً

کوئی سنگِ رہ بھی چمک اُٹھا تو ستارۂ سحری کہا

مری رات بھی ترے نام تھی اُسے کس نے تیرہ شبی کہا

مرے روز و شب بھی عجیب تھے نہ شمار تھا نہ حساب تھا

کبھی عمر بھر کی خبر نہ تھی، کبھی ایک پل کو صدی کہا

کم یاب ہے خوشی تو بہانے تراش لوں

اک داستانِ فسوں سے زمانے تراش لوں

اوڑھے رہوں میں جلتی ہوئی دھوپ کی ردا

اور موسموں کے گیت سہانے تراش لوں

ادا جعفری کا فن، ایک لسانی جہاد ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں، ذات اور کائنات کے درمیان تمام تصادمات کو اس طرح سمویا ہے کہ اُن کا ہر شعر ایک نامیاتی کُل کی طرح مجسّم ہوتا ہے۔ اپنی نظموں میں انہوں نے جو طرز اختیار کیا ہے، وہ نظم نگاری کے جدید ترین اسالیب کے مطابق ہے —— غزلوں میں اُن کا اظہار لفظ کی جدلیاتی قوّت کو نمایاں کرتا ہے —— اور ہر غزل کا ہر شعر ایک

منفرد کائنات کی طرح مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے لفظوں کو جو زندگی خیز حرارت عطا کی ہے اس کا تاثر شاعری کے ایک منفرد اسلوب اور مکتبِ فکر کا غماز ہے۔ انسان کی بیرونی کائنات ان کے نزدیک ایک دشتِ بے اماں ہے۔ اس لیے وہ حقائق سے ماورا ہو کر، اپنی تخلیقی کائنات کے نئے سے نئے اُفق کی جستجو کرتی ہیں —— اور ذات کے عرفان و آگہی کے ذریعہ ایک تازہ کار شعری منزل کا احساس — وہ مقصود اور وہ منزل ہے جس تک ہم ادا جعفری کے ذریعہ پہنچ سکتے ہیں کہ یہی منزل، عہدِ جدید میں انسان کے خوابوں کی منزل ہے:

اب خلقت مجھ سے پوچھے ہے، تمہیں کیسے ساری بات ملی
کس اسم کا تم نے ورد کیا، جب تم کو ہتھیلی رات ملی
کیا دھوپ بھری دوپہروں کی بے درو دیواریں کچھ بھی نہ تھیں
تم ابھی کچی کلیوں سی، کیا صبح تمہیں سوغات ملی
یہ ہنستی بستی تنہائی، جیسے شہرِ نجاتِ ذات کہیں
کس دردنے تم کو دکھلائی، کس زخم سے کس کے ہات ملی

ادا جعفری کی شاعری اُس اسم کا ادراک ہے جو شہرِ نجاتِ ذات کی کُنجی ہے۔ گذشتہ تین چار دہائیوں کے شعری سرمایہ میں، ادا جعفری کا نام اور کلام سب سے الگ اپنا انفرادی ذائقہ رکھتا ہے، اُنہوں نے اپنی شاعری کے عنفوانی عہد میں، بہت سے سوالوں کا سامنا کیا تھا مثلاً ایک نظم میں اُنہوں نے لکھا تھا:

سوچتی ہوں کہ کوئی جادۂ تاریک ہے کیا
یہ گریبانِ تسلسل

یہ حیاتِ جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں

ادا جعفری اب اپنے تخلیقی سفر کی اُس منزل پر ہیں جہاں رنگِ حنا کا احساس، دستِ دُعا میں بدل چکا ہے اور عہدِ گذشتہ سے قائم و دائم حیاتِ جامد، ایک ایسی متحرک DYNAMIC حیات میں تبدیل ہو چکی ہے، جسے شعری انقلاب یا تخلیقی ارتقا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے تازہ مجموعہ کی ایک نظم ہے:

بھیگی بھیگی پلکوں والی
جتنی آنکھیں ہیں میری ہیں
دُکھ کی فصلیں کاٹنے والے
جتنے ہاتھ ہیں، میرے ہیں
شاخ سے ٹوٹی کچی کلیاں

شاعری میں بارش کی علامت ہر موسم کے مطابق نئی معنویت کی حامل ہوتی ہے ۔

بارش کی پھوار جو کیفیت پیدا کرتی ہے اس سے قطع نظر، جاپانی گل رلل ایکی نیبو تیسنو نے ایک بار کہا تھا اور یہ بات سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے کہ :

" پھولوں پر پانی چھڑکنا ایک طلسم ہے ۔ وہ ایک قطرہ جو پھول پر ٹپکایا جائے وہ اپنے اندر [illegible] کی وسعت اور پہاڑوں کی رفعت رکھتا [illegible] ایک قطرے سے اتنی بوقلموں مسرتیں پھوٹتی ہیں کہ انسان کو سحر زدہ کر دیتی ہیں ۔ "

[illegible] گل رلی کے باب میں اتنے لطیف جذبات موجود ہیں ان کے ہاں بارش، پانی، بلکہ پانی کے ایک ایک قطرہ میں جو معنویت پوشیدہ ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔

جاپان کے بڑے جزیروں، ہوکائیدو اور ہونشو میں بڑی کثرت سے برف باری ہوتی ہے ۔ ہونشو کا بحر جاپان والا شمالی ساحل جو سائبیریا کے عین مقابل واقع ہے، اپنی برفانی نیرنگیوں کی وجہ سے 'یوکی گونی' یعنی برف کا ملک، کہلاتا ہے ۔ برف ان لوگوں کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔ ماضی میں برف ان کے لیے سدِ راہ تھی اب ان کے لیے روزگار کے نت نئے امکانات پیدا کر رہی ہے ۔ اس سے برف کی معنویت [illegible] میں کم ہوئی نہ [illegible] اس کی ثقافتی حیثیت قائم و دائم ہے ۔

[illegible] میں فیوجی یاما جو جاپانیوں کا مقدس پہاڑ ہے، واقع ہے ۔ سب سے اونچا اور سربلند ۔ اس کی چوٹی سال کا بیشتر حصہ برف پوش رہتی ہے ۔ خوبصورت پہاڑ ہے ۔ اردگرد کی وادی میں صنعتی زندگی کی ہما ہمی کے باوجود، پھولوں کی بہتات ہے ۔ دور سے دیکھنے سے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ پہاڑ وادی کے درمیان اچانک پیدا ہو گیا ہے ۔ خوبصورت ! اس کی ساری خوبصورتی اس کی برف میں ہے ۔ برف پگھلتی ہے تو اردگرد کی پانچ خوبصورت جھیلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ گویا تقدس کا ہالہ اس پہاڑ کے قریب قریب ہی بس جاتا ہے دور نہیں جاتا ۔ [illegible] جہاں یہ پہاڑ واقع ہے فی الحقیقت اس قدر خوب صورت ہے کہ بیان سے باہر ہے ۔ پھول، پرندے، حتیٰ کہ یہاں کی گھاس بھی اپنی خوبصورتی میں بے مثال ہے ۔

برف ان تمام مظاہر کی بنیاد ہے ۔ اس لیے اگر برف، تنہائی، اداسی، خنکی، خود کلامی، خود شناسی کی خصوصیات پیدا کرتی ہے تو کوئی عجب نہیں ۔ ہمارے ہاں کے برفانی علاقوں کے لوگوں میں بھی یہی خصوصیات ملیں گی ۔ مگر فرق یہ ہے کہ جاپانی ان کیفیتوں کو ثقافتی اقدار کی حیثیت سے پہچانتے اور ان کی قدر کرتے ہیں ۔ ہمارے ہاں برف پگھل کر پانی بن جاتی ہے اور بہہ کر سمندر کی غذا بن جاتی ہے ۔ ہمارے برف میں تمام تر معنویت ہونے کے باوجود کوئی معنویت نہیں ۔

مگر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ گندھارا ثقافت کا جنم بھی تو برف کے علاقہ سے ہوا ۔ یہی تہذیب، قدموں چلتی جاپان تک گئی ۔ کہیں یہ برف ہی تو نہیں جس کی معنویت نے انہیں موہ لیا ہو ۔

[illegible] وضاحتوں کے بعد اگر جدید ہائیکو کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی معنویت کی بہت سی تہیں منکشف ہوں گی ۔ اور جاپانی ہائیکو کی کلاسیکی ہیئت کو فکری وحدت کے نقصان کے بہانے سے ترک نہیں کیا جا سکے گا ۔ ہمارے ہاں کے ہائیکو نگار اگر واقعی ' ہائیکو ' کہنے کا تجربہ کرنا چاہتے

ابھی ابھی لٹ بھی میری

دھجی دھجی آنچل بھی

کالی رات کی چادر اوڑھے

اُجلے دن کا رستہ دیکھ رہی ہوں

اپنے عہد کے وحشت بے اماں میں، زندگی کے اثبات کا یہ بے پناہ احساس ـــــ خوابوں کو حقائق کے آئینے میں سنوارنے کا یہ طور ـــــ ادا جعفری کا طورہ ہے ـــ اُن کا فن، جدید اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

اُردو ادب میں سفرنامہ

رحمان مُذنِب

علم وفن کے بحرِ ذخار کی شناوری جان جوکھوں کا کام ہے۔ جو اسے کرے اور اسی کا ہو رہے وہ پھر اپنے آپ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کی بازیافت تب ہوتی ہے جب وہ کوئی گوہرِ نایاب لے کر نمودار ہوتا ہے۔

تحقیق و تنقید اس بحرِ ذخار کی ملٹری اکسرسائیز ہے جس میں ہمہ وقت چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے۔ یہ ایسی سرگرمی ہے جو ضروری بھی ہے اور پُرخطر بھی۔ کبھی کبھی نقاد کے دل سے نکلی ہوئی بات دوسروں کو ناگوار بھی گزر سکتی ہے۔ اس کے قلم کی کوئی کشش، کوئی شوشہ کوئی نقطہ، کوئی جملہ دنگل کا سماں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کسی کی پیشانی پر بل بھی پڑ سکتے ہیں اور مقاطعے تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے۔ اگر دنگل علمی اور ادبی سطح پر رہے تو قارئین لطف اٹھاتے ہیں ورنہ بدمزگی کے سوا کچھ پلے نہیں پڑتا۔

انور سدید ایسے شناور ہیں جو سچ کے داعی ہیں۔ پانی کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ جھولے میں جو کچھ ڈال کے لاتے ہیں، اسے جانچتے پرکھتے ہیں، موتی الگ کرتے ہیں، سنگریزے الگ۔ موتی کو موتی کہتے ہیں، سنگریزے کو سنگریزہ۔ سنگریزہ کہنے سے جھگڑا کھڑا ہوتا ہے: بہرحال یہ ان کا قرینہ ہے اور اس پر وہ بشرطِ استواری قائم ہیں۔

ہر تیراک غوطہ خور نہیں ہوتا لیکن ہر غوطہ خور تیراک ہوتا ہے۔ انور سدید تیراک بھی ہیں، غوطہ خور بھی۔ کبھی سطحِ آب پر رہتے ہیں، کبھی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ سطحِ آب اور تہہِ آب میں ایک فرق ہے ؎

قعرِ دریا سلسبیل و رُوئے دریا آتش است

خوف کا دوسرا نام آتش ہے۔ کم ہی لوگ قعرِ دریا تک جاتے ہیں اور جو جاتے ہیں ان میں انور سدید شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ان کے کئی کام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اور ان کی تازہ، ضخیم اور محققانہ تالیف "اُردو ادب میں سفرنامہ" ایک ‌ ‌امی چیز ہے۔

ہزاروں سفرناموں کی تلاش و جستجو کا صبر آزما سفر، ملک کی ادھوری سدھوری لائبریریوں کے شیلفوں سے رجوع، آؤٹ آف پرنٹ کتابوں کا حصول ـــــ یہ سب کچھ حوصلہ شکن تھا لیکن اس صف شکن نے یہ کارنامہ سرانجام دے کر ہی دم لیا۔

(صف شکن اپنے لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔)

انور سدید کام شروع کرنے سے پہلے اس کے طول و عرض اور مشکلات کا اندازہ کرتے ہیں۔ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے کمر باندھتے ہیں اور پھر سوئے منزل رواں ہوتے ہیں۔ ہمت اور عزم سوا رکھتے ہیں۔ اس تالیف کے ضمن میں اُنہوں نے درویشِ خدا مست بن کر شرق و غرب کھنگالا، ملک کے مختلف گوشوں تک گئے، سرکاری لائبریریوں کے علاوہ علم دوست احباب کے خانگی کُتب خانوں سے بھی استفادہ کیا۔ اس تگ و دَو کا حال بیان کیا جائے تو وہ ایک علیحدہ سفر نامہ ہوگا۔

جس طرح چلنا پھرنا، دوڑنا روزمرّہ کا معمول ہے اس طرح سفر بھی زندگی کا معمول ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود آدمی قدیم ہے۔ آج بھی سفر اپنی تمام بوقلمونیوں، حیرت و ہراس، زحمتوں اور رحمتوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ تحریری صورت میں اس کی تاریخ کم و بیش ساڑھے تین ہزار سال پُرانی ہے۔ دُنیا کا سب سے پہلا سفر نامہ اپنی اصل حالت میں آج بھی محفوظ ہے۔ اس کی نقول مصر کے پروہت اپنے لیے، سلاطین، بیگمات، شہزادوں، شہزادیوں، امراء اور کم استطاعت لوگوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ نقول تیار کرنے کا زمانہ ۱۹۰۰ ق م اور ۹۰۰ ق م کے درمیان بتایا جاتا ہے لیکن اس کا مواد ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح بھی مصر کے طول و عرض میں موجود تھا۔ میرے پاس جو اس کا نسخہ ہے وہ ڈاکٹر سر والس بج کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس میں فرعون کے سفر آخرت کا حیرت خیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ہزاروں تصویروں، جنتروں منتروں، منہتوں کے بیانوں، جھنجٹوں اور سفر کے خطروں کے کوائف سے آراستہ دُنیا کا یہ انوکھا سفر نامہ جو کتنے ہی علوم و فنون کی طرح دین ساری (جادو) کی کوکھ سے نکلا آدمی کی اوّلیں سوچ اور ہمیشہ زندہ رہنے —— مرنے کے بعد امر ہونے کی زبردست خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس قبیل کے متعدد سفر نامے دوسری زبانوں میں بھی لکھے گئے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ احوالِ آخرت کے نام سے کشمیری بازار والوں نے پنجابی نظم میں چھاپے —— یہ سفر نامے انور سدید کے دائرۂ کار میں نہیں آتے۔ انہیں اس دُنیا کے اُردو سفر ناموں سے سروکار رہا ہے اگلی دُنیا کا حال خدا جانے —— ضرورتاً، از رہِ امتثال عربی اور فارسی کے بعض سفر ناموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اُنہوں نے جس حُسن و خوبی سے زمانہ بہ زمانہ منزل بہ منزل سفر ناموں کا نقشہ کھینچا ہے اس سے اُردو کی ادبی تاریخ نئی جہت سے مدوّن ہوگئی ہے۔ اس طرح سفر نامے کے ارتقاء کا مسئلہ بھی حل ہوگیا ہے۔

اُردو میں سفر نامہ بتدریج وقت کے تقاضوں اور زبان و بیان کے نت نئے اسلوبوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا اب محکم صنفِ ادب بن چکا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں نہایت خوبصورت سفر نامے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ محمود نظامی کے نظر نامے سے لے کر فرخندہ جالی کے سفر نامہ مُنا نامل —— گرین کارڈ تک اعلیٰ درجے کا ذخیرہ سامنے آگیا ہے۔

انور سدید کے اس بیش قدر کارنامے سے اُردو ادب کی تنقید و تشریح میں اہم اضافہ ہوا ہے۔ اُنہوں نے جس دقتِ نظر اور تفصیل سے تاریخی جائزہ مکمل کیا ہے اس سے ایک خلا پُر ہوا ہے۔

انور سدید کی سوچ اور طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ درزیں اور رخنے نہیں رہنے دیتے۔ ہر باب، ہر حصّے اور ہر ٹکڑے کو بڑی ہُنرمندی سے فنشنگ ٹچ دیتے ہیں۔ عام زبان میں یوں کہیئے کہ موضوع سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قلمی سرگرمی عبارت بھی ہے، عبادت بھی۔ پورا تولتے ہیں، ڈنڈی نہیں مارتے۔

ان کا یہ تاثر درست ہے کہ انہیں سفر نامے "میں داستان جیسی حیرت اور افسانے جیسی لذّت ملتی ہے۔ سفر نامے کا بیانیہ چونکہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے مجھے اس میں آپ بیتی کا مزہ بھی ملتا ہے"۔ جدید اُردو سفر نامہ دلفریب ادبی تخلیق ہے۔ آج طنز نگار، مزاح نگار

شاعر اور افسانہ نگار سبھی اس شعبۂ فن میں سرگرمِ عمل ملیں گے ۔

انور سدید نے اپنی تالیف کو بارش کا پہلا قطرہ کہا ہے ۔ یہ پہلا قطرہ تو ہے لیکن بھاری بھرکم ہے اور ٹپکا ہے تو سنگِ میل بن گیا ہے ۔ اس سے رہنمائی بھی ہوتی ہے اور ڈھیروں مواد بھی میسّر آتا ہے ۔ انور سدید نے ملازمت کے تقاضات کے ساتھ ساتھ علمی اور قلمی سفر جاری رکھا، گیارہ سال کی مدت کو بڑی خوش اسلوبی سے بار آور کیا ۔

سفر آدمی کی جبلّت میں داخل ہے ۔ مسافر کے لیے دُنیا عجائب خانہ ہے جسے دیکھنے کے لیے وہ بچّے کی طرح مچلتا ہے ۔ نئی سرزمیں نئے آدمی، نئی طرزِ بود و باش، نئے رسم و رواج دیکھ کر خوش ہوتا ہے ۔ ان سے ذہن میں کشادگی آتی اور تجربہ حاصل ہوتا ہے ۔

کروڑوں آدمی ہر وقت دُنیا کے مختلف امصار و اقطاع کی سیر و سیاحت میں سرگرداں ملیں گے ۔ ان کے شب و روز نئی نئی بستیوں میں بسر ہوتے ہیں ۔ بعض لوگ ہنی مون بھی اپنے گھر کی بجائے پردیس میں جا کر مناتے ہیں ۔ کشمیر اور سوئٹزرلینڈ کی وادیاں اپنے لاثانی حُسن و جمال کے باعث دُور دُور سے مسافروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں، مصر کے اہرام، عراق کے کھنڈر، اطالیہ اور یونان کے مندر، آگرے کا تاج محل، نیاگرہ کی آبشار، قدیم افریقی قبائل کے داستانی رقص، اندلس کے محلات، مسجدِ قرطبہ، آگرے کا تاج محل، لاہور کی جامع مسجد، بالی کی رقاصائیں، کافرستان کے حسین پیکر، سُندر بن اور دشت و دریا سب سیاحوں کی بے تاب نگاہوں کے دمکتے ہوئے تارے ہیں ۔ مکّے اور مدینے کے راستے ہر وقت جذبات کے تلاطم اور بہاؤ پر رہتے ہیں ۔ مسافر بے اختیار ہو جاتا ہے ۔ اضطراب کی بے پایاں حالت میں اللہ کے قدیم گھر میں حاضری دینے اور دیارِ حبیبؐ کی زیارت کے لیے اپنے آپ کھنچا چلا جاتا ہے ۔ یہ کیفیت زبان و بیان سے ماورا ہے ۔ پھر وہ لوگ بھی ہیں جو راحتِ جسم و جاں کے لیے پیرس، لندن، روما، نیویارک اور ایسے ہی شہر ہائے نگاراں کی سیاحت کرتے ہیں ۔ ہپّیوں کا زور ٹوٹ گیا ہے ورنہ یہ شُہدے ناکافی ساز و سامان کے ساتھ دیس دیس گھومتے پھرتے، بے غیرتی پھیلاتے اور اسی میں نانِ شبینہ کا بندوبست کر لیتے تھے ۔ ایک زمانے میں افغان پاوندے پرندوں کی طرح موسمی شدائد سے گھبرا کر پاکستان کا رُخ کرتے تھے ۔ سائنسدانوں کا سفر قطبین کی سمت ہوتا ہے اور اب تو ایٹم کا دور دورہ ہے ۔ خلائی سفر کا دَور بھی آغاز پذیر ہو چکا ہے ۔ الغرض سفر انسان کی بہت بڑی سرگرمی ہے ۔ یہ مشغلہ بھی ہے، ضرورت بھی اور بعض حالتوں میں فرض بھی ۔

انور سدید نے حرکت کو سفر کی بنیاد قرار دیا ہے ۔ " زندگی چونکہ خود ایک مسلسل حرکت ہے، اس لیے سفر بھی زندگی ہی کا استعارہ ہے ۔ حکمائے قدیم نے زندگی کو ایک ایسا سفر قرار دیا ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا ۔ حضرت آدمؑ کی داستانِ حیات میں شجرِ ممنوعہ کو چکھنے کا واقعہ بظاہر احکامِ ربّانی کی خلاف ورزی اور آدمؑ کی اوّلین بغاوت سے عبارت ہے تاہم اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس گناہ کی پاداش میں آدم کو جنّت سے نکل کر کرۂ ارض کی طرف مائلِ سفر ہونا پڑا ۔ چنانچہ آدمؑ کا پہلا سفر ارتقائے نسل کی طرف پہلا قدم تھا ۔ اُس وقت سے آج تک ابنِ آدم کے پاؤں سے چکّر نکل نہیں سکا ۔"

یہ چکّر نکل بھی نہ سکے گا ۔ زندگی تو کیا، زندگی کے بعد بھی چلے گا ۔ یہ تو اس وقت دم لے گا جب آدمی جنّت یا جہنّم میں پہنچے گا ۔ ہنود کے یہاں یہ چکّر آواگون کی ہیئت میں چلتا ہے ۔ کرموں کے حساب سے پھل ملتا ہے ۔ مکتی بہت مشکل ہے ۔

سفر نئی حیرت اور نئی جستجو کا ذریعہ ہے ۔ نئے تجربے کا خالق ہے ۔ یہ گلستاں اور بوستاں بن جاتا ہے ۔ سفر نہ ہو تو سعدی بھی نہ ہو ۔ ہر بہانے سفر کرنا چاہیئے ۔ دیکھیں تو ہر آدمی چلتا پھرتا سفرنامہ ہے ۔ کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا ـــــ کوئی اپنے اندر سفر کرتا ہے، کوئی

باہر، کوئی دونوں طرف۔ ذات و صفات کے انکشاف کا یہ بہت بڑا ذریعہ ہے۔

اندرونی سفر بہت مشکل ہوتا ہے۔ اصطلاحاً اسے روحانی تجربہ، مذہبی تجربہ یا صوفیانہ تجربہ کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ اتنا گمبھیر ہوتا ہے کہ آدمی آپے سے باہر ہو جاتا اور جان دے کر نجات پاتا ہے۔ حلاج منصور کا سفر اسی نوع کا تھا۔ جلوۂ یار کی تپش اس کی برداشت سے سوا تھی چنانچہ وہ جل گیا۔

انکشافِ ذات اور حقیقتِ کبریٰ کو پانے کا ایک ایسا بھی بے بدل سفر ہوا ہے جو قیامت تک اندھیروں میں آنکھوں کو چندھیانے والی نور کی لکیر کھینچتا اور ہدایت کا راستہ روشن کرتا رہے گا۔ یہ سرورِ کونینؐ کا اسریٰ اور معراج شریف تھا۔ اسی سے آپؐ کو ارفع ترین مقام حاصل ہوا اور انسان کو لازوال پیامِ فلاح ملا۔ (ایمل ورمنگھم نے اس سفر کو اپنی تالیف 'لائف آف محمدؐ' مترجم اربیل یارک میں بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ تھوڑی سی دیر کے لیے ورمنگھم کی عصبیت غائب ہو جاتی ہے۔)

سفرناموں نے قارئین کو جہاں لطف اندوز کیا ہے وہاں علم و دانش کی بیش بہا دولت بھی دی ہے۔ انور سدید نے جگہ جگہ قیمتی ٹکڑے پیش کیے ہیں جن سے ایک طرف تو سفرناموں کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں، دوسری طرف سفرنامہ نگاروں کی افتادِ طبع کو جان سکتے ہیں۔ کیسے کیسے اسلوب یکجا کیے گئے ہیں! انور سدید ہر سفرنامے کے ساتھ ساتھ جس طور اس کے خط و خال کھینچتے، جو وضاحتیں اور صراحتیں رقم کرتے ہیں ان کی بدولت نہایت لطف انگیز اور معنی خیز قابلِ مطالعہ ادبی تنقیدی لغت مرتب ہو گئی ہے۔ یہ بجا طور پر تحقیق، تاریخ اور تنقید کا قیمتی سرمایہ ہے۔

سفر میں مسافر یا سیاح کے پاؤں سب سے زیادہ ضروری اور کارآمد ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ گھوڑے، گدھے، اونٹ، بیل گاڑی اور بیلی نے صدیوں تک آدمی کی خدمت کا فریضہ ادا کیا ہے۔ ماضی میں آدمی نے پاؤں اور سواری کی مدد سے بڑے بڑے طویل فاصلے روند ڈالے۔ طالبانِ علم و فن، بزرگانِ دین اور اہلِ شوق بصیرت کو جلا دینے اور بصارت کو کشادہ کرنے کی غرض سے جان لیوا فاصلے طے کر کے دنیا بھر میں بکھری ہوئی درسگاہوں تک پہنچتے۔ وہاں کے فقہاء، محدثین، علماء، آئمہ اور متخصصین سے اکتسابِ علم کرتے۔ وقت کی بچت اور فاصلوں کی تسخیرِ مزید کے لیے پہیہ ایجاد ہوا۔

"پہیے کی ایجاد سے زندگی کے انسانی تصور میں اچانک تبدیلی آگئی تھی اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ پہیے کی ایجاد ۲۷۰۰ قبلِ مسیح مصر میں اور ۲۵۰۰ قبلِ مسیح وادیٔ سندھ میں پہنچ چکی تھی۔ میں انہی سالوں کے لگ بھگ پہیہ دار رتھوں کا استعمال عام ہو گیا تھا — اس انقلابی ایجاد نے نہ صرف زمینی فاصلوں کو محدود کر دیا بلکہ مزید ایجادیں معرضِ وجود میں لانے کے لیے بھی انسانی دماغ کو مہمیز لگائی۔"

اب فاصلوں کی تسخیر کا عمل ناقابلِ تصور حد تک آ پہنچا ہے۔ آدمی ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس طرح خلائی سفرناموں کا آغاز بھی ہو گیا ہے لیکن یہ سفرنامے انگریزی اور روسی زبان میں لکھے جا رہے ہیں۔ فی الحال اُردو دان ان کا ترجمہ کر سکتے ہیں ان کے لیے خلائی سفر ممکن نہیں۔ اربوں نوری سالوں میں پھیلی ہوئی کائنات نئے حیرت کدوں کے دروازے انسان پر کھول رہی ہے۔

انور سدید کی تالیف —— سفرناموں کی کتابیات کا یہ انوکھا، جامع اور عظیم القدر نمونہ افادیت کے اعتبار سے یکتا ہے۔ انور سدید

نے دس سال تک سفرناموں کا پہاڑ کھڑا کیا ہے۔ ایک ایک سفر کا حال جانا جانچا ہے۔ اس کے خالق کی غایتِ سفر، طرزِ فکر اور اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ ہر سفرنامے کی قدر و منزلت دریافت اور متعین کی ہے۔ ایک بات جو نقاد، محقق اور مورخ کے لیے بنیادی درجہ رکھتی ہے وہ ہے اس کا غیر جانبدار اور غیر متعصب ہونا۔ انور سدید اس معاملے میں بہت کھرے ہیں۔ انہوں نے کہیں بھی جذباتیت اور عصبیت کو روا نہیں رکھا۔ اسی وجہ سے ان کی تالیف دقیع ہے۔

عبداللہ ملک کے سفرنامے پر ان کا محاکمہ یوں ہے ــــــ

"عبداللہ ملک" نے اپنے مشاہداتِ سفر "کیوبا سے چند خطوط"، "پولینڈ ــــ ایک سفر، ایک جائزہ"، "صوفیہ سے چند خطوط" اور "ارضِ جنت ــــ سوویٹ یونین" میں پیش کیے ہیں۔ عبداللہ ملک کے اس قسم کے سفر ایک آزاد اور خود مختار سیاح کی طرح عمل میں نہیں آئے۔ ایک نامور صحافی ہونے کے ناتے ان کے بیشتر سفر بعض وفود کے رکن کی حیثیت میں طے پاتے رہے چنانچہ ان کے ہاں بھی حقائق کو صحافی کی نظر سے دیکھنے، خبر تلاش کرنے اور پھر اس سے کہانی تراشنے کا انداز نمایاں ہے۔ ان سفرناموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف ایسے ممالک کا ہی تذکرہ ملتا ہے جو عبداللہ ملک کے فکر و نظر اور جذبہ و احساس کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ملک پر اکثر اوقات ایک زائر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ سفر کو اپنی رُوح کی یاترا تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ وہ ان سفرناموں میں غیر جانبدارانہ رویّہ پیدا نہیں کرسکے اور مشاہدے پر تحسین غالب آگئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سفرنامے ایک مخصوص زاویۂ نظر ہی کو سامنے لائے ہیں اور عبداللہ ملک ایک سیاح کی بجائے مبلّغ نظر آتے ہیں اور جب وہ لکھتے ہیں کہ "میں سوویت روس کا دوست ہوں۔ اس کے نظام کا حامی ہوں" تو ان کی جانبداری واضح ہو جاتی ہے ــ

صحافی ہونے کے ناطے عبداللہ ملک نے اعداد و شمار جمع کرنے اور حالات و کوائف پر کمندیں ڈالنے کی کوشش زیادہ کی ہے اور مواد کی فراہمی کے لیے مطبوعہ کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اکثر مقامات پر عبداللہ ملک سفرنامے سے غائب ہو جاتے ہیں اور سفرنامہ معلومات کا گوشوارہ بن جاتا ہے۔ اُنہوں نے سفرنامے کو اخبار کی سطح پر لاکر اس کی ادبی حیثیت کو خاصا مجروح کیا ہے چنانچہ یہ سفرنامے کم اور معلوماتی کتابچے زیادہ نظر آتے ہیں۔"

سفرنامے کی حدود میں معلومات آتی ہیں لیکن ایسی معلومات نہیں جنہیں کتابوں سے لے کر قاری کے سر پر پٹک دیا جائے۔ سفرنامہ دفتری یا ادارتی رپورٹ نہیں ہوتی۔ یہ معلومات (خواہ اعداد و شمار ہی ہوں) فنکار کی تخلیقی کارگاہ سے گزر کر صفحۂ قرطاس پر آئیں۔ نظریے کا پرچار اخباری کالم کی طلب تو ہے، ادب کے قاری کی طلب نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سفرنامہ اپنے جمالی وصف سے قاری کے مذاقِ علم و فن کی تشفی کرسکے۔ صرف نظریے کا اکھاڑا نہیں۔ یہاں انسانوں کی بھیڑ ہے۔ ان کی آسودگیاں اور ناآسودگیاں ہیں، دُکھ سُکھ ہیں، تھیٹر اور ناچ گھر ہیں، سُرلیاں ہیں، گلی کوچے ہیں، گھر اور پارک ہیں، ان کے ہنگامے ہیں، کھلے ڈبے سے چائے لے کر اونٹنے اور روسی آمر کو پیش کرنے والی نگران خاتون کو تختۂ دار پر کھینچنے کے قصّے ہیں۔ خروشیف کے بازاری عورت کے دامِ محبت میں گرفتار ہونے اور رُوسی جرنیلوں کے لیے مقبوضہ ممالک میں قحبہ خانے کھولنے کے واقعات ہیں، سائبیریا کے لیبر کیمپوں کی دلخراش داستانیں ہیں۔ "کالا پانی" اور داغستان میں "پاڑے کی قید" ان عقوبت خانوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے ــــ قارئین یہ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں ــــــــــــ اخباروں، کتابوں، رسالوں کی

کم نہیں۔ ریڈیو بھی رات دن چلاتے اور نظریے کی تشہیر کرتے رہتے ہیں۔ گریشا گاربو کی فلم "گرینڈ ہوٹل" اور پیسٹر نک کے ناول میں بھی بعض حقائق ملتے ہیں۔ وہ بھی لوگوں کو معلوم ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ روس کے اندر کس طرح نظریے کے ——— لوگوں کے گلے میں پڑے ہیں۔ گلے گھٹ رہے ہیں، کوئی ان کا بھی حال سُنائے۔ نظریے کی مار کھانے والے بھی محتاجِ توجہ ہیں۔ اسٹیج پر ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ کردار موجود ہیں۔ ان پر جو بیت رہی ہے اور جس انسانیت سوز بستادؔ کا نقشہ کھنچ رہا ہے وہ بھی تو سامنے آئے۔ روسی مسلمانوں کے علاقے میں نظریے کی خاطر جو قتل و غارت ہوا اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ رُوسی مسلمانوں کے عزائم اور مطالبات کیا ہیں؟

رنگین عینک کی مصوّری اور چیز ہے، صداقتوں کا سفر اور چیز ہے۔

عبداللہ ملک اعلیٰ پائے کے صحافی ہیں۔ روس سے ان کی وابستگی بھی کسی سے ڈھکی چُھپی نہیں لیکن سفرنامے کے تقاضے اس وابستگی سے ماورا ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ وہ حج بھی کرنے جاتے ہیں۔ حج نامہ (حدیثِ دل) رقم بھی کرتے ہیں جو اثبات سے انکار اور تکرّرِ الحاد کی کیفیت آشکار کرتا ہے اور اُس انسان کو منظرِ عام پر لاتے ہیں جس کی رُوح مادّی نظریات کے ہجوم میں گُم ہو چکی ہے۔ یہ انسان جب اچانک اپنے مصفا ماضی سے دو چار ہوتا ہے تو بے اختیار رونے لگتا ہے لیکن جونہی مادیت غلبہ پا لیتی ہے تو جسم کا صحرا آنسوؤں کو اپنی ریت میں جذب کر لیتا ہے ——— گدازِ قلب عبداللہ ملک کی رُوح کی واردات نہیں بنتی اور وہ اس عُقدے کو حل نہیں کر پاتے کہ اُنہوں نے مسجدِ نبویؐ کے ستون پکڑ کر دعائیں کیوں مانگیں ——— عبداللہ ملک کو اپنا کاسۂ دل بھرنے کا موقع ملا تھا لیکن وہ واپس آئے تو ان کا کشکول خالی تھا اور حج کے سائنسی جواز کی تلاش میں خود ان کی شخصیت نادریافت رہی۔"

کوئی بھی تحریر جب ادیب کے قلم سے نکلے گی اور فن کے مطالبے پورا کرے گی تو اس کی ایک خاص شان ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ سفرنامہ موضوع ہی ادیب کا ہے۔ ادیب جو خارجی اور داخلی دُنیا کا مسافر ہوتا ہے، اندر اور باہر سے مواد اکٹھا کرتا ہے، اپنے مشاہدات، واقعات سانحات، واردات، تجربات اور خیالات میں اپنی سوچ اور اپنے جذبات و محسوسات کو شامل کرتا ہے۔ الفاظ اپنے آپ ٹپکتے اور تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔ بصارت اور بصیرت کا ملاپ ہوتا ہے۔ اس طرح تخلیقی کارگاہ سے برآمد ہونے پر ادب پارہ کہلاتا ہے۔ فطرت کی عطا کی ہوئی تخلیقی صلاحیت کے باوصف مشق ——— مسلسل مشق لابدی ہے۔

بہرکیف یہ بھی ایک امرِ واقع ہے کہ ہر سفرنامہ ادب پارہ نہیں بنتا۔ مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ کے سفرنامے ادب پارے نہ سہی لیکن حیرت خیز واقعات و سانحات کے مرقعے ہیں۔ ان میں وہ دُنیا ملے گی جو کبھی زندہ و تابندہ تھی، ہنگامہ خیز تھی اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے البتہ معدودے چند اس کے نوادرات اور نمونے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ آج کے اُردو سفرنامے ادب کے سنہری نقوش بن گئے ہیں۔ شوکت علی شاہ کا "اجنبی اپنے دیس میں" فرخندہ جالی کا "گرین کارڈ" اور ممو نکا کا سفرنامہ ادب پارہ نہ ہوں تو کون انہیں پڑھے گا اور کیونکر سراہے گا؟ ادب ہی سے ان کی آن قائم ہے۔

ادب حُسن افروز ہے۔ قلم کا جادو اس سے آب و تاب پاتا ہے۔

ادب بہت بڑی تہذیبی قدر ہے۔ ادیب قلم کی مدد سے خود اپنی صراحت کرتا ہے۔ سنگ و آہن کی تعمیرات اور مورتیاں، مُوقلم کے شاہکار، گھنگھروؤں کی موسیقی میں رقاصہ کے بدن سے طلوع ہونے والے زاویے، پیچ و خم اور خطوط، مغنیّہ کے گلے سے اُبلتے ابھرتے ہوئے

نغمات کی تشریح و توضیح کے لیے بھی قلم حاضر ہوتا ہے۔ یہ اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے۔ تہذیب کے ابتدائی دَور میں ادب (شاعری) رقص اور موسیقی بیک وقت تثلیث کی صورت میں رُونما ہوئے۔ رقص کو تو اُمّ الفنون کا نام دیا جاتا ہے تاہم ادب نے دونوں کی اعانت کی۔ تاریخی طور پر اس کی یاری رقص اور موسیقی کے لیے نہایت مفید اور بارور ثابت ہوئی۔ ان تینوں نے مل کر RITUAL کو جنم دیا۔ بتوں کی پوجا کی تشکیل کی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تینوں اصناف دینِ ساحری کی گرفت سے چھوٹ گئیں اور مستقلاً الگ الگ شعبے میں چلی گئیں۔

سفرنامہ آج ادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے۔ اس سے عین متصل آپ بیتی ہے۔ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں کیونکہ دونوں میں فنکار اپنے آپ کو براہِ راست پیش کرتا اور گویا ہوتا ہے۔ ایک طرح سے آپ بیتی بھی سفرنامہ ہے۔ یہ بھی ذاتی واقعات، واردات، سانحات، معاملات تجربات، محسوسات، جذبات اور نظریات کا مرقع ہے ۔ یہ سب دوسروں کے حوالے سے بھی اور اپنی ذات کے حوالے سے آتے ہیں۔ بہرحال اپنا دُکھ درد، اپنی خوشی اور غمی، اپنے احوال آپ بیتی کی اساس ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سفرنامے کا محرّک اور اس کی شرطِ اوّل سفر ہے۔ آپ بیتی میں بہلی، چھکڑی، کار، ریل گاڑی اور جہاز ہو نہ ہو، زندگی کا سفر ضروری ہوتا ہے۔ اپنے ہی ماضی اور اپنے اُوپر گزرے ہوئے روز و شب ہی سے آپ بیتی مرتب ہوتی ہے۔

دونوں میں قدرِ مشترک قلمکار کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی سفرنامہ اور آپ بیتی یکجا ہو جاتے ہیں۔ "اجنبی اپنے دیس" میں اس کی مثال ہے۔ سفرنامے میں بھی آپ بیتی کی طرح سیاح اپنی سوچ اور اپنے افکار کو دوسروں کے حالات اور واقعات سے منسلک کرتا ہے۔ دونوں کا منتہائے مقصود اپنے قلم کی گوہر افشانی ہے۔

سفرناموں کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر سفرنامہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسا مصنّف ویسا سفرنامہ۔ ایک سفرنامہ ایسا بھی ہے جو سب سے الگ ہے۔ اس میں سفر کی نوعیت اور غایت بھی سب سے مختلف ہوتی ہے۔ اسے حج نامہ کہا جاتا ہے۔ اس میں دل کے سفر کا حال ہوتا ہے۔ دل کا یہ سفر دُنیا کی پہلی مسجد، کعبے سے ہوتا ہوا دیارِ حبیبؐ تک جاتا ہے۔ پورے سفر میں آدمی اپنی ذات کی نفی کرتا ہے، اپنے آپ کو بھلا دیتا ہے۔ اللہ اور اس کے محبوبؐ کے خیالوں میں گم رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو اسے یہ مبارک سفر جلد نصیب ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی برسوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ دل کی منزل پر پہنچتا ہے تو کالے گورے اور زرد اجنبی چہروں کے ہجوم میں محبت اور اخوّت کے بے پایاں سیل کو اُمڈتا دیکھتا ہے۔ وہاں کسی کے افلاس کا پتہ چلتا ہے نہ امارت کا۔ ایک مقامِ حیرت ہوتا ہے جو دیوانہ کر دیتا ہے۔ ہر شخص خود کو ایک عالمگیر برادری کا معزز رکن سمجھتا ہے اور اپنی بین الاقوامی حیثیت پر فخر محسوس کرتا ہے۔ قلب و نظر میں فجر کی تازگی آجاتی ہے۔ وہ اس ہستی کی عظمت کا تصور کرتا ہے جس کی بدولت تمام دُنیا کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں، ایک برابر ہو جاتے ہیں۔ یہاں اللہ اور اس کے محبوبؐ ہی کو سربلندی حاصل ہوتی ہے۔ قلمکار اپنی فروتنی، کم مائیگی اور اپنے عجز کا جان و دل سے اعتراف کرتا ہے۔ وہ کتنا ہی بڑا فنکار کیوں نہ ہو، اس کی بصارت کتنی ہی کشادہ، بصیرت کتنی ہی عمیق، اڑان کتنی ہی اُونچی اور سوچ کیسی ہی پہلیں کیوں نہ ہو وہ حرم اور گنبدِ خضرا کے سامنے ہیچ ہو جاتا ہے۔ جب کوئی آبجیکٹ فنکار کی گرفت میں نہ آسکے تو پھر وہ زبان و بیان میں اس سے انصاف نہیں کر سکتا۔

حج نامے میں قلمکار جن مقامات پر جاتا ہے اس کی تاریخی حقیقت بھی بیان کرتا ہے اس طرح یہ حکایتِ شیریں سیرتِ طیبہؐ کے بعض پہلو بھی واضح کرتی ہے۔

ذوق و شوق، سوز و گداز اور قلب و نظر کا یہ سفر ایک انمول تجربہ ہوتا ہے۔ ایسا تجربہ جو کسی اور سفر سے میسّر نہیں آتا۔ اس کے نقوش اس کی ذات پر ثبت ہو جاتے، اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ بن جاتے اور اسے سدا تسکین پہنچاتے ہیں۔

انور سدید نے بجا طور پر کہا ہے ـــــ

"اس سفر میں پروانہ اپنے محبوب پر جاں نثار نہیں کرتا بلکہ قربِ محبوب سے تجدیدِ حیات کرتا ہے۔ دیارِ محبوب کی زیارت اس کے قلب و نظر کو طہارت اور ایمان کو استحکام عطا کرتی ہے۔ رُوح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کا زنگ اُتر جاتا ہے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر سامنے آجاتی ہے۔ حج کے سفرناموں میں حقیقتِ منتظر کو تارِ نظر میں پرونے کا رجحان نمایاں ہے لیکن زائر چونکہ روحانی سفر کے بعد واپس اپنے مادری وطن میں بھی آتا ہے اس لیے وہ مشاہداتِ حج کے روحانی تجربے میں دوسروں کو شامل کرنے کا خواہش مند بھی ہوتا ہے۔ حج کے بیشتر سفرنامے اسی مقصد کے پیشِ نظر لکھے گئے اور ان سے بہت سے لوگوں کو یہ سفرِ سعادت اختیار کرنے کی ترغیب بھی ملی۔"

حج کے سفرناموں کی ایک بے مثال خصوصیت ہے۔ ان میں اس لازوال، بے مثال ہستی کا ذکرِ خیر آتا ہے جس نے بچپن ہی میں کاروانی سفر کیا، پچیس سال کی عمر ہوئی تو ایسا عظیم الشان سفر کیا کہ صلے میں دُنیا کی عظیم ترین خاتون سیّدہ خدیجۃ الکبریٰؓ ملیں۔ پھر ہجرت کا سفر کیا تو اسلام کے حیرت خیز انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دُنیا کی پہلی اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔ مدینے کا ذرہ ذرہ منوّر و مطہر ہو گیا۔ یہاں کی مسجد معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز اور رُشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی ـــــ مسجد میں کچہری بھی لگتی، ہر آنے والے کو تہذیب و شائستگی بھی سکھائی جاتی ـــــ امورِ دینی و دُنیوی، امورِ داخلہ، امورِ خارجہ اور امورِ دفاع بھی سرانجام دیے جاتے۔ یہیں سے سلاطینِ زمانہ کو قبولِ اسلام کے دعوت نامے ارسال کیے گئے۔ یہیں سے اکٹھے ہو کر حضورِ اکرمؐ اپنے جیالے، اطاعت گذار، ایثار پیشہ اور صابر و شاکر صحابہؓ کو لے کر طوفانوں اور آندھیوں سے کھیلتے ہوئے، عاد و ثمود کی ہیبت ناک سلطنت کے کھنڈروں کو عبرت کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے تبوک پہنچے۔ دُنیا کا یہ سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے بڑا لانگ مارچ تھا جو قلیل مدت میں کیا گیا۔ یہ سفر سب سے بڑی ملٹری اکسرسائیز تھی۔ مسجد ہی سے جہاد کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہیں سے سرایا اور غزوات کے احکام صادر ہوئے ـــــ پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کائنات کا سفر کیا جسے معراج النبیؐ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا نادر و نایاب روحانی تجربہ تھا، ایسی عظمت اور نعمتِ خداوندی تھی جو اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اگر آدمی ایک ایک کر کے تمام ستاروں تک پہنچ جائے تب بھی اس بلندی کو نہیں چھو سکتا جو محمد عربیؐ کے زیرِ پا آئی تھی۔ اس سفر سے انسان پر فلاح و بہبود کے دروازے کھل گئے۔ عظمتِ بشر کی حد اور حقیقت بھی معلوم ہوئی۔

حج فریضہ بھی ہے، حضورؐ کی سفر پسندی کا اعتراف بھی اور سُنّت بھی۔

انور سدید نے دیگر سفرناموں کی طرح حج ناموں کا بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ فارسی اور عربی کے بعض حج ناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کے اقتباسات دیے ہیں۔ سفر کے تجربات ـــــ ماضی کی مشکلات و صعوبیات کو بیان کیا ہے۔ ان کے مطالعے سے ان لوگوں کے عزم اور ایقان کا علم ہوتا ہے جو سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر جان کی بازی لگا دیتے اور حج پر جاتے تھے۔ آج کا حج سفر کے آلام و مصائب سے مبرّا ہے۔

انور سدید نے اُردو سفرناموں سے قبل عربی اور فارسی سفرناموں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ان کی تحقیق کی رُو سے "ادب کے آثارِ قدیمہ

ظاہر کرتے ہیں کہ حج کے تحریری سفرناموں کی ابتدا ابو عبداللہ المقدسی کے "احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم" سے ہوتی ہے۔ اُنہوں نے ابن جبیر کے سفرنامے کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے جس سے مظہر ہے کہ "جدہ میں پرانے اور بلند گنبد کی عمارت بھی ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ کل بشر کی ماں حوا یہاں رہتی تھی۔" اس سے انزعمی، تہذیب کے اوّلیں مرکز کا سراغ ملتا ہے۔

نامور مورّخ اور سیاح ابن بطوطہ اور اس کے عربی سفرنامے کا تذکرہ نہایت دلچسپ ہے۔

"ابن بطوطہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ عقیدت کی فراوانی میں بھی سیاح کی آنکھ کو مُندنے کی اجازت نہیں دیتے اور حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرتے۔"

اس کے ثبوت میں ان عطر پسند خواتین کا ذکر کیا جو طواف کے لیے آتیں تو حرم مہک اُٹھتا۔ عبادت گاہوں کو خوشبوئیں بسانے، خود کو معطّر کرنے اور فضا کو پاکیزگی بخشنے کی روایت بہت پرانی ہے اور پھر خواتین کو تو عطر اور حریر و دیبا کے استعمال کی چھوٹ بھی دی گئی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے حج ناموں کا انداز یکسر مختلف ہے۔ شاہ صاحب نے "آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور مسائل فقہی کی توضیح عالمانہ شان سے کی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ ان کا مقصد صعوباتِ سفر بیان کرنا نہیں تھی بلکہ اس سفرنامے کو وسیلہ بنا کر ارشاداتِ نبویؐ کی تبلیغ اور ابلاغ ہدایت کرنا تھا۔"

حج کے سفرنامے زندگی کے انمول تجربے کا ماحصل ہوتے ہیں۔ اہلِ قلم اور اہلِ علم انہیں اپنے اپنے ارفع مقصد کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ فلاحِ دارین پیش نظر رکھتے ہیں۔

غلام الثقلین نقوی کے سفرنامے "ارضِ تمنا" میں تحیّر بھی ہے اور انکسار بھی۔ اعجازِ نظر و خیال بھی اور حُسنِ عجز و عقیدت بھی۔ اُنہوں نے بے خودی کی کیفیت کو حواسِ خمسہ سے علیحدہ ہو کر محسوس کیا اور اس بجلی کو قارئین کی رگ و پے میں دوڑانے کی کوشش بھی کی ہے۔"

انور سدید نے حج ناموں کے باب میں یکتائے روزگار اور عالم بے بدل نواب صدیق حسن خاں کے سفرنامے "رحلت الصدیق الی بیت العتیق" کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اُردو زبان و ادب کا پہلا حج نامہ ہے۔ نواب صاحب نے ۱۸۶۹ء میں سفرِ حج کیا تھا۔ موصوف بلند پایہ مصنّف تھے بیگم بھوپال ایسی قدر دان خاتون ان کی اہلیہ تھیں لہٰذا بے فکری سے علمی اور دینی کام کرتے رہے۔ ان کی چند تصانیف مجھے والد کے کتب خانے سے ترکے میں ملی تھیں۔ یہ نادر تصانیف نہایت ادنیٰ قسم کے کاغذ پر چھپی تھیں اور ناموزوں جہازی سائز پر تھیں۔ انہیں سنبھالنا اور پڑھنا خاصا مشکل تھا۔ افسوس! یہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

حج نامے کی یہی وجہِ امتیاز ہے۔ سفرِ حج آدمی کے جذبۂ خلوص اور عقیدت کو آخری حد تک سمیٹ دیتا ہے۔

سفرناموں کو جس طرح ناقدانہ جہت سے دیکھا اور پرکھا، ان کی قدر و منزلت متعیّن کی، ان کے دلچسپ اقتباسات پیش کیے، ہر باب کے شروع میں جنرل ریمارکس دیے، رجحانات کی نشاندہی کی ان کے باعث کتاب مطالعے کے لائق بھی ہوئی ہے اور وقیع بھی۔ انور سدید صاحبِ علم نقاد ہیں، مذاقِ ادب رکھتے ہیں۔ ان کی تالیف کے ذریعے قاری کبھی ادبی گل افشانی سے محظوظ ہوتا ہے اور کبھی ٹھاٹیں مارتا سفر کے بیان سے۔

حرکت جو سفر کی خالق ہے انور سدید کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک ندی سی بہتی چلی جاتی ہے، زندگی رواں دواں نظر آتی ہے — شب و روز کے تحیّر خیز رُخ، آدمی کے اولتے بدلتے پینترے اور اس کے خط و خال چشمِ تصوّر میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

سفر لا ریب زندگی ہے لیکن کبھی کبھار موت کا بہانہ بھی بن جاتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد اور چیف جسٹس کیانی کا آخری سفر حیات سفرِ آخرت بن گیا۔ دونوں حضرات صاحبِ طرز ادیب تھے اور اپنے اپنے انداز میں منفرد تھے۔ ان کے شہ پارے دل و دماغ کو تازگی اور [illegible]دگی بخشتے ہیں۔ اگر انہیں مہلت ملتی اور وہ زندگی کے آخری سفر کو لفظوں کا رُوپ دیتے تو ادب کے شعبے میں لائق صد قدر اضافہ کرتے۔

انور سدید کی تالیف سفر ناموں کا سفر نامہ ہے۔ اُنہوں نے کوئی ڈیڑھ صدی کا قدم بہ قدم، منزل بہ منزل سفر کیا ہے۔ ان کی یہ عالمانہ [او]ر محققانہ تالیف اہلِ علم و فن کے سامنے اعلیٰ معیار رکھتی ہے۔ بارش کے پہلے قطرے کے بعد دوسرے قطروں کا انتظار رہے گا۔

نقاد انور سدید کی دو تخلیقی کتابیں

آسمان میں پتنگیں	سفر میں پرندے
انشائیوں کا دوسرا مجموعہ	"دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا"
زیرِ طبع	شاعری کا مجموعہ
	حمد، نعت، غزل اور نظم

سیمانت پرکاشن، دہلی

منشا یاد، ایک منفرد افسانہ نگار

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

قیامِ پاکستان کے دس بارہ سال بعد یعنی ۱۹۶۰ء کے آس پاس بحیثیت افسانہ نگار، سامنے آنے والوں میں محمد منشا یاد اور ڈاکٹر قمر عباس ندیم کے نام میرے لیے کبھی نہ بھولنے والے نام ہیں۔ دونوں کے اوّلین افسانوی مجموعے "بند مٹھی میں جگنو" اور "شیشے کی آبرو" بیک وقت میرے مطالعے میں آئے، اور میں نے ان کے افسانوں کی اوّلین قرأت ہی پر انہیں سچا افسانہ نگار مان لیا تھا۔ اور چاہا تھا کہ ان پر کچھ لکھوں، ان کا تعارف کراؤں، اوروں کو ان کی اہمیت کا احساس دلاؤں، ان کے روشن مستقبل کی بشارت سناؤں اور معاصرانہ رشک و حسد کی بنا پر جو لوگ ان کی شہرت کا راستہ روکنا چاہتے ہیں ان کو شرمندہ کروں لیکن فسادِ خلق کے خوف سے میں ایسا نہ کر سکا، اب اس بات سے خوش ہوں کہ ان کے فن نے اپنے آپ کو، آخرکار اپنے حریفوں سے بھی منوا لیا اور آج وہ صرف یہی نہیں کہ محمد منشا یاد کی افسانہ نگاری کے قائل ہیں بلکہ اپنی پچھلی سوچ پر شرمندہ بھی ہیں۔[1]

"بند مٹھی میں جگنو" کی اشاعت ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔ چھوٹی تقطیع کے ایک سو پچھتر صفحات میں پورے بیس افسانے چھپے ہوئے تھے۔ گویا صحیح معنوں میں مختصر افسانے تھے۔ قامت میں چھوٹے اور قدر و قیمت میں بڑے۔ تبھی تو آج محمد منشا یاد کو صفِ اوّل کا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے افسانے عام اور خاص دونوں حلقوں میں بڑے چاؤ سے پڑھے جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے اپنے افسانوں میں ایسا جادو پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پڑھوائے بغیر نہیں رہتے۔ ایسا ہونا امرِ فطری ہے کہ بقول منشا یاد وہ افسانے اپنے طور پر نہیں لکھتا بلکہ افسانے اپنے آپ کو اس سے زبردستی لکھواتے ہیں۔ ظاہر ہے جو افسانے خود کو لکھوانے پر قادر ہیں، وہ خود کو بہت آسانی سے پڑھوا بھی سکتے ہیں چنانچہ نئے لکھنے والوں میں، خصوصاً ۱۹۶۰ء کے بعد منظرِ عام پر آنے والوں میں محمد منشا یاد، ایک ایسا افسانہ نگار ہے جسے اپنے سے سینئر افسانہ نگاروں کا جیسا قبولِ عام حاصل ہے لوگ بڑے ذوق و شوق سے اسے پڑھتے ہیں خوش آئند بات یہ ہے کہ منشا یاد بڑے ذوق و شوق سے برابر لکھے جا رہا ہے۔ تبھی تو

---

[1] قمر عباس ندیم اور محمد منشا یاد، دونوں، کہانی کے سفر پر ساتھ ساتھ چلے تھے۔ افسوس کہ قمر عباس کی عمر نے وفا نہ کی۔ "شیشے کی آبرو" کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "بند دروازے ہوا کے" کے نام سے عقیل صدیقی کی کوششوں سے ان کی وفات (مئی ۱۹۸۱ء) کے بعد ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔

دس سال تک منشا یاد کے چار مجموعے "بند مٹھی میں جگنو"، "ماس اور مٹی"، "خلا اندر خلا" اور "وقت سمندر" شائع ہو چکے ہیں، پانچواں زیرِ ترتیب ہے۔ اس کا سبھی سچ جانتا ہے خود افسانہ نگار کے لفظوں میں، "میں لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نہ لکھوں تو گھبراہٹ ہوتی ہے لوگوں تو چین کہاں ہے۔"

محمد منشا یاد کہانی نگار ہے اور کہانی کے بارے میں یہ بتانا کہ تخلیقی سطح پر وہ لفظوں کی گرفت میں کب اور کیسے آئی، بہت مشکل ہے وجہ یہ ہے کہ الفاظ ایک مدت تک آواز کی شکل میں، انسان کی جسدی زبان میں بند رہے ہیں اور حروف کی شکل میں بہت بعد کو سامنے آئے ہیں۔ پھر بھی کچھ کہنا ہی چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ لمحہ لمحہ گزرتے وقت کا سمندر، صدیوں کی مسافت پر محیط اور ابعاد سے بے نیاز سا طول پر سر پٹکتا تھا، تب صدیوں کے اس نہ ختم ہونے والے سفر نے، قوتِ گویائی کے طفیل دو ڈھائی ہزار سال پہلے حروف کو جنم دیا۔ حروف نے ایک مدت کے بعد، اپنے آپ کو سمیٹ کر الفاظ کا روپ دے لیا، پھر جس وقت ان لفظوں نے، اپنے دامن میں خوبصورت جذبوں، لطیف محسوسات اور رنگین دیہاتی سے با لب خیالات کی ایک دلکش دنیا سجالی تو گویا ایک کہانی، دائروں کی شکل میں گھومتے پھرتے اپنی منزل کی جستجو میں چل پڑی۔ اونچے نیچے، ناہموار، پیچ در پیچ راستوں اور پگڈنڈیوں کا یہ سفر بالآخر آج کے جدید منطقی دور تک پہنچا اور اس نئے سفر میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا عکس، انہی لفظوں کے دریچوں سے جھانکنے لگا۔

پھر اس تک جا کے، نے ایسی کہانیوں کو جنم دیا جن میں پنپتے ہوئے احساس و جذبہ کی نمو بھی ہے اور تصنع و تکلف کے بوجھ تلے دبی ہوئی سچی معاملات کی حکایتیں بھی۔ اپنی تہذیب و کلچر سے آشنائی و شناسائی کا فنکارانہ رویہ بھی ہے اور سیدھی سادی حقیقی زندگی سے بے پرواہ بے نیازانہ گزر جانے کا رویہ بھی۔ چنانچہ آج کا افسانہ اور افسانہ نگار، زندگی کی حقیقت پسندانہ مثبت قدروں کی تلاش میں بھی ہے اور اسی تلاش کو توانا و زندہ اقدار و خیالات کا جزو بنا دینے کی کوشش میں بھی۔ منشا یاد اسی تلاش اور کوشش میں سرگرداں رہنے والا ایک افسانہ نگار ہے لیکن اوروں سے بہت مختلف و منفرد۔ اس لیے کہ اس کے سچ پیار کا انداز اُسے جرأت افروز رنگ دینے کا عقیدہ۔ کہانی کے لیے مواد و کردار منتخب کرنے کی روش، موضوع کو کہانی کا روپ دینے کا ڈھنگ اور اُسے جدید افسانے کے پیکر میں ڈھالنے کا عمل اور ڈگر اپنے ہم عصر ہم سفروں سے بہت الگ ہے۔ اس انفرادی ڈگر اور چال کی خاص بات یہ ہے کہ منشا یاد زندگی کی فطری اور کھری سچائیوں کو نہایت سادگی کے ساتھ منظرِ عام پر لاتا ہے لیکن اس کی سادگی میں حسن کی جرأت آزما پُرکاری چھپی ہوتی ہے۔ یہ پُرکاری، جبر و ظلم سے پنجہ کشی، نبرد آزمائی کے ساتھ زندگی کا ایک صحت مند آدرش ہر وقت اپنے دامن میں لیے رہتی ہے گویا منشا یاد کے اندر کا آدمی جو اُس کے افسانے لکھتا ہے، ایک ایسی دنیا کا باسی ہے جہاں زندگی اپنی جملہ رعنائیوں اور کج ادائیوں کے ساتھ اس کی ہم سفر رہتی ہے۔ مثبت اور منفی دونوں قسم کی روشنی پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہر چند کہ نگاہ و امتیاز و انکشاف کے ساتھ انہیں گلے لگا کر یا ان سے آنکھ ملا کر چلنا آسان نہیں ہوتا، اس میں ایک دو نہیں کئی بہت سخت مقامات آتے ہیں لیکن منشا یاد ہے کہ سچائیوں کی روشن صلیب اُٹھائے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کوئی لاکھ آواز دے وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا، خوب جانتا ہے کہ مڑ کر دیکھا تو پتھر کا بن جائے گا۔

منشا یاد کو زندگی کی سچائیوں اور نیکیوں سے لگاؤ نہیں عشق ہے۔ اس عشق کی کرامت یہ ہے کہ وہ بناوٹوں اور غلاظتوں کے ڈھیر سے بھی زندگی کے سچ اور حسن روپ کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں گاؤں کی سیدھی سادی زندگی، سیدھے سادے کردار اور ہر قسم کی گندگی سے پاک فضائیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماحول و خیالات کی اس پاکیزگی و معصومیت کے سبب اس کی کہانیاں

بشاش، خوبصورت اور شگفتہ دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ حسرتوں کی دھوپ میں جلتے ہوئے لوگوں پر، بادل کا سایہ دار ٹکڑا بن کر رحمتوں کی بارش کر دے۔ اُس کے ہاتھ دُعا کے لیے ہمہ وقت اُٹھے رہتے ہیں اور اس کی اگر کوئی خواہش ہے تو صرف یہ کہ یہ بدصورت دُنیا، از سرِ نو معصومیت، سچائی، سادگی اور پاکیزگی کی قبا پہن لے۔ ہاتھوں میں پیار و محبت کی مہندی رچا کر اور سر پر پریت و پریم کی چُندریا ڈال کر، دُلہن بن جائے۔ منشا یاد کی سوچ کے زخم، ایسے دستِ غیب کی تلاش میں ہیں جو طبقاتی کشمکش کو ختم کر کے معاشرے کو مساویانہ سطح پر امن و آشتی کا گہوارہ بنا دے۔ وہ اس سنہرے وقت کا منتظر ہے جو اس کی بند مٹھی کے جگنو کو راہوں میں پھیل کر بھیانک اندھیروں کے سینے کو چیر کر روشنی کی لکیریں کھینچ دے۔ لیکن جب اس کی یہ آرزو صدیاں بار آور ہوتی نظر نہیں آتیں تو اُس کا مدھم اور سُریلا لب و لہجہ شعوری یا لاشعوری طور پر قدرے سخت اور احتجاجی ہو جاتا ہے۔ فکر و جذبہ دونوں میں حرکت و ارتعاش کی ایک نئی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ لہر اس کے آخری دو مجموعوں میں صاف نظر آتی ہے اور اس کا سبب ہے۔ منشا یاد دُکھے ہوئے دل کے ساتھ محسوس کر رہا ہے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ استحصالی قوتوں اور جبر و ستم کے خلاف اُس کا پُرسکون خاموش احتجاج بے اثر ثابت ہو رہا ہے۔ معاشرے میں افلاس روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پیٹ اور رُوح کی آگ، چند افراد کو چھوڑ کر سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ "راستے بند ہیں" کا "میں اور ماس اور مٹی" کا ساتو، برسوں کی جان لیوا بھوک کے سبب قاری کو بھیانک المیے کے مناظر دکھاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ میں میلے میں بکنے والے سیخ کباب، جلیبی، پھل اور بوتل کے ذائقوں سے بھی ناآشنا ہے، للچائی ہوئی نظروں سے اُن لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے جو مزے لے لے کر ذائقہ بھری چیزیں کھا اُڑا رہے ہیں۔ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی سعی رائیگاں میں "میں" کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ان چیزوں کا ذائقہ اپنے منہ میں محسوس کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ سڑک پر تیزی سے چلتا ہوا ٹرک اُسے کچلتے ہوئے گزر جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ کسی اور کے اُوپر سے گزر رہا ہے۔ ناتو، اپنے پیٹ کی بھوک کا علاج چوری سے کرتا ہے۔ بڑے بڑے گھرانوں سے صرف کھانے کی چیزیں چراتا ہے۔

"کچی پکی قبریں" میں کوڈو فقیر معاشرے کے ایک اور المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں انسانی جذبے اور محبتیں یکسر بے معنی اور بے قیمت ہیں۔ پیسے سے عزت و عصمت، نظریہ و عقیدہ اور ذات پات سب کچھ خریدے جا سکتے ہیں، کوڈو فقیر ان خریداروں سے ایک انوکھا انتقام لیتا ہے۔ رات اندھیرے میں زمیندار اور زمیندارنی کی قبروں سے اپنے والدین کی قبریں تبدیل کر دیتا ہے کہ اب اُن پر چراغ جلیں گے اور قرآن خوانی ہو گی۔ اس لیے کہ امیر و فقیر سب کی کھوپڑی اور ہڈیاں تو ایک سی ہوتی ہیں۔ اس صورت حال میں منشا یاد کے قلم کا سراپا احتجاج بن جانا حیرت انگیز نہیں، فطرت کے عین مطابق ہے۔ منشا یاد کی خواہش اور بہت جائز خواہش صرف یہ ہے کہ انسانی عظمت کو سونے چاندی یا دُنیاوی جاہ و حشمت کی کسوٹی پر نہیں بلکہ شرافتِ نفس، پاکیزگیِ احساس، خوفِ خدا اور عدل و انصاف کے معیار پر پرکھا جائے۔ اُس کی اس خواہش کی بار آوری کے آثار "اپنا گھر"، "بچھڑے ہوئے ہاتھ"، "بانجھ ہوا اور سانس" اور "اودر تام" میں بہت نمایاں ہیں اور مطالعے کے بعد قاری پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور معاشرے کے جسم پر رستے ہوئے ناسوروں اور زخموں کے لیے مرہم بن جانے پر آمادہ کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ منشا یاد اپنے افسانوں میں آسمان کے تارے توڑ لانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آس پاس کے کنکر پتھر ہی کو نجوم و جواہر بنانا جانتا ہے۔ خلا کی تسخیر کے شوق میں زمین کو چھوڑ دینے پر تیار نہیں ہے۔ وہ اپنے فکر و فن

رزمینی وزمانی ہی رکھنا چاہتا ہے اور زمین کے قضیوں کو برسرِ زمیں ہی حل کرنے کا آرزومند ہے، یہ آرزومندی، رجائیت کی چاندنی بن کر اس کے سارے افسانوں پر چھٹکی ہوئی ہے۔ اور بھوکی پیاسی مخلوق کو، ٹھنڈک اور طمانیت کا احساس دلاتی ہے۔ "خلا اندر خلا"۔ "تماشا"، "کاشی"، "مائی فُنٹ" اور "دیوارِ گریہ" سے لے کر "وقت سمندر" "اپنا اپنا کاگ"، "لوہے کا آدمی"، "بیلوں سے لپٹی ہوئی بیل"، "اگلی صف کا آدمی" اور "زوال سے پہلے" تک سب پر انسان دوستی اور احترامِ آدمیت کے احساس کی رجائی چادریں تنی ہیں۔ یہ چادریں جنہیں آپ چاہیں تو علامتوں اور استعاروں کا نام بھی دے سکتے ہیں، رنگین و لطیف تو ہیں لیکن ایسی شوخ و دبیز نہیں کہ ان کے اندر کی چیزیں نظر نہ آسکیں۔ ساری چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ اپنے دیکھنے والوں سے آنکھیں ملاتی ہیں۔ کبھی حسرت سے تکتی ہیں، کبھی بولتی ہیں، کبھی گھورتی ہیں، کبھی مسکراتی ہیں اور کبھی زہر خند سے کام لیتی ہیں غرضیکہ اپنی سچائی اور جانداری کا یقین دلاتی ہیں۔ اور منشا یاد کے افسانوں کی ارضی و نامیاتی توانائیوں پر دلالت کرتی ہیں۔

شاہین کی شاعری کا "بے نشان" آئینہ

انور سدید

شاہین نے اپنی شاعری کی دوسری کتاب "بے نشان" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

"شاعری تعلا میں جنم نہیں لیتی اور نہ یہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے اس ایک یا دو دن کا سودا ہے جب دنیا کے کام کاج نبٹانے کے لیے گھر سے باہر نکلنا لازمی نہیں ہوتا۔ یہ تو زندگی بھر کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق گوشت اور لہو سے ہوتی ہے۔ شاعر اپنے جذبات سے وجود، اشیا، مناظر اور محسوسات کے خاکوں میں نیا رنگ بھرتا ہے۔ جس کے سبب حقیقت ایک جیتی جاگتی مٹھی بھر خاک میں بدل جاتی ہے۔ مٹھی بھر خاک جو شاعر کا دل ہے۔ اس طرح ایک نئی حقیقت روپ دھارتی ہے جو اتنی ہی سچی ہوتی ہے جتنی پہلی حقیقت تھی۔"

شاہین کی شاعری پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پہلے انہوں نے اپنی زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا اور جب کرب کی کیفیت ناقابل برداشت ہوگئی تو انہوں نے اس کرب کو مجسم کرنے کے لیے شاعری اختیار کرلی۔ شاہین کے ہاں زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا عمل ہفتہ وار تعطیل کے ایک یا دو دنوں میں سرانجام نہیں پایا۔ یہ عمل ان کے ہاں اس وقت سے جاری ہے جب ان کے دماغ نے شعور کی پہلی کرن بیدار ہوتے دیکھی تھی اور آنکھ نے پھول کی نودمیدہ پتی کو دیکھ شاہین کے دل سے اس کی خوبصورتی اور رعنائی کی شہادت طلب کی تھی۔ وہ اس وقت بھی ٹکڑے ہوئے جب انہوں نے غازی پور سے ڈھاکہ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ پھر جب مشرقی پاکستان پر ابتلا کے بادل چھا گئے تو شاہین نے ایک بار پھر ڈھاکہ کے ساتھ اپنے ٹوٹنے کا عمل بھی دیکھا۔ وہ دوسری ہجرت میں اپنے ذہن و دل کے باقی ماندہ ٹکڑوں کو لے کر لاہور آگئے۔

ایک شام میں نے انہیں نیشنل بک کونسل کے جلسے میں دیکھا تو انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ کیونکہ مجھے اپنی زندگی میں جبری ہجرت کا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن میں شاہین کو پہچان نہ سکا۔ ان کی زندگی کے کچھ ٹکڑے غازی پور میں اور کچھ ڈھاکہ میں رہ گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے بتایا کہ اب وہ رزقِ حیات کی تلاش میں کینیڈا جارہے ہیں تو ان کے چہرے پر مجھے شدید کرب نظر آیا۔ یہ کرب مجھے اس تصویر میں بھی دکھائی دیا جو انہوں نے مجھے اوٹوا سے بھیجی تھی۔ میں نے ایک سوال کو لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش کی اور پوچھا "شاہین، آپ زندہ کیسے رہیں گے؟" بولے "شاعری مجھے زندہ تو نہیں رکھ سکتی لیکن مجھے سانس لینے کی مہلت ضرور دے گی۔" چنانچہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا عمل پھر جاری ہوگیا اور اب ان کی نئی کتاب میرے سامنے ہے۔ بلاشبہ وہ میرے سامنے اپنا حقیقی اور سچا باطن آشکار کررہے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاہین

اس شکستگی کے عمل سے اب بھی مسلسل گزر رہے ہیں۔ شاعری ان کی زندگی کا سانس ہے۔ اس کی تخلیق وہ اپنے گوشت اور لہو سے کرتے ہیں۔ یہ ان کے سانس لینے کی مہلت ہے اور شاید اس لیے انہوں نے اسے زندگی بھر کا عقیدہ شمار کیا ہے۔ وہ اس سے گھروں میں رنگ بھرتے ہیں، بادِ نو بہار کو بھی چلاتے ہیں۔ حقیقت سے ایک نئی حقیقت بھی پیدا کرتے ہیں اور پھر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے جو حقیقت تخلیق کی ہے وہ بھی اتنی ہی سچی ہے جتنی پہلی حقیقت سچی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غازی پور سے ڈھاکہ۔ ڈھاکہ سے لاہور اور لاہور سے آٹوا تک شاہین نے ہجرت کی تو انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بہت سے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے مسمار ہوتے دیکھا۔ محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ "شاہین کی شاعری کا بنیادی محور بے زمینی" اور "بے نشانی" کا غم ہے۔" اس کے برعکس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے شاہین کو اپنی زندگی اور اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا غم زیادہ ہے۔ بے شک انہیں "بے زمینی" اور "بے نشانی" کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس احساس کے عقب میں بھی یہ المیہ موجود ہے کہ وہ جس غیر ملکی زمین پر اب سانس لے رہے ہیں وہ نہ تو ان کی زندگی کے ٹکڑوں کو جوڑ سکتی ہے اور نہ ان کے خواب سازی کے عمل کو استوار کر سکتی ہے۔ انہیں اپنے خیالات محبوس محسوس ہوتے ہیں۔ سوچیں گرہوں کی قیدی نظر آتی ہیں اور صبح دم جب کہ وہ ندا کا بلاوا آتا ہے اور ایک نئی زنجیر سامنے نظر آتی ہے تو وہ بلبلانے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ

اب مری سوچوں میں گرہیں / اب مری سانسیں وبال / اب مری دھوپوں میں گرہیں / اب مرے سائے بھی جال
اب مرے اطراف گرہوں کا طلسم / شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح جکڑا ہوا گرہوں میں جسم

(پچھلے برس کی آخری نظم)

یہ بکھرے ہوئے جال نیلی رگوں کے / رگیں / جیسے نقشے پہ پھیلی ہوئی ندیوں کی لکیریں
رگیں میری دُنیا / رگیں میرا مستقبل / رگیں اپنے ہی خون میں تر بتر

(مصلوب)

خوں چشیدہ زبانوں سے / روحوں کے بے پیرہن / زخم کھائے ہوئے نیم جاں
سوم رس کی نشیلی گپھاؤں میں / روپوش ہوتے گئے
اور چاروں طرف / ان کے ماں جایوں کے خواب / نیزوں پہ لٹکے رہے

(سلسلے خواب کے)

شاہین کی شاعری میں دوسرا المیہ اس بات سے بھی پیدا ہوا کہ اپنی زمین سے کٹ جانے کے بعد وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ فطرت سے ان کا دائمی رشتہ کٹ گیا ہے۔ ایک کاسموپالیٹن انسان بن جانے کے باوجود اس احساس نے بھی ان کے حزن کو دبیز کر دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شاہین نے اپنے ماضی میں جو کچھ دیکھا تھا وہ اسے اپنے لوحِ دل سے مٹا نہیں سکے۔ پھر جب وہ عالمی شہری بنے اور ان کے مشاہدے میں وسعت آئی تو انہیں پوری دُنیا میں ہونے والے مظالم، ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک عام پاکستانی شاعر کی بہ نسبت شاہین نے دوہرا کرب برداشت کیا۔ انہوں نے پاکستانی شعرا کے ساتھ اپنے معاشرے کا غم برداشت کیا۔ لیکن ایک کاسموپالیٹن انسان کی حیثیت میں وہ پوری دُنیا کے غم میں شریک نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں

وہ موضوعات بھی ابھرے ہیں جنہیں ہجرت کے تجربات نے جنم دیا تھا اور ان کی توجہ عالمی موضوعات نے بھی کھینچی ہے۔ دونوں صورتوں میں شاہین کے ہاں المیہ صورت نمایاں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "آئینہ کیھن اور آئتیں" کی یہ سطریں ملاحظہ کیجئے جن میں دیناج پور (مشرقی پاکستان) کی کیھن ندی کے کنارے ہونے والی بربریت کے احساس کو نظم بند کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

ہر طرف بکھری ہوئی ہیں آئینے کی کرچیاں / ایک ریزہ بھی جہاں ہے / آئینہ موجود ہے
گھپ اندھیرا / اور زہریلی ہواؤں کی گھنی آبادیاں.....
سسکیاں کچھ اور بھی ہیں۔ گم ہوتی جا رہی ہیں / آؤ کہ ہم / ان آیتوں کی آج تفسیریں لکھیں
آگ جن کی دفن ہے / دریائے کیھن کے تلے

(آئینہ۔ کیھن اور آئتیں)

سانجھ ڈھلے / مٹیالے میلے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے / یوں دکھتے ہیں
جیسے شفاخانے کے سامنے / ڈھیر عورتیں / اپنی اپنی خالی شیشیاں ہاتھ میں پکڑے
گم سم سی چپ چاپ کھڑی ہوں

(بلاوا)

(اب اس کرب کے کچھ نقوش دیکھئے جو شاہین نے عالمی انسان کی حیثیت میں محسوس کیا ہے۔

دل میں یوں برف جمی ہے اب کے / اک مہاجر کا بوجھ جیسے / اپنی تقدیر سے خوف آتا ہے
ایک بھاگے ہوئے مجرم کی طرح / ہیبت آثار ہو فردا جیسے

(دل میں یوں)

تم ان بستیوں کو / جہاں رات دن تم نے شعلے گرائے
اگر جا کے دیکھو / تو خود رو پڑو گے

(ویت نام)

پھر رہی زخمی ستارے / اور بارودی ستاروں پر جھلستے پھول / آنکھوں کے کٹوروں میں پھٹے کھلیان کا ویران تموج
پھر کوئی ثالث کوئی اعلان / ساری مملکت میں بلدیوں کی چار چھ پیہم نشستیں
اور کچھ سڑکیں شہیدوں کے مقدس نام سے منسوب کرنے کی نئی تجویز / اخبارات کی شہ سُرخیاں

(بے حسی کے کالے حروف)

اپنے وطن کے مقامی انسان اور عالمی انسان کے متذکرہ بالا المیوں میں شاہین نے پوری شرکت کی ہے اور بطور انسان انہوں نے معاشرے کی ہرناہمواری پر گہرے دکھ اور کرب کا اظہار کیا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ غم جس میں شاہین کی اپنی ذات مبتلا ہے اس کا انہوں نے ادراک نہیں کیا۔ شاہین کا ذاتی المیہ تو اس حقیقت سے ہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے روزی رزق کی تلاش میں نکلا ہوا ایک غریب الدیار انسان ہے۔ لیکن ان کا ذاتی غم یہ بھی ہے کہ اس خطۂ غیر میں ان کا مستقبل محفوظ نہیں اور جب وقت

کی دُھوپ ڈھلتی جا رہی ہے تو ایک دائم تنہائی کا خوف ان پر مسلط ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شاہین کی شاعری میں اس خوف نے بڑی کرب ناک صورت اختیار کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں سے باہر / جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے، گماں ہے مشکل
مدد بے خواب سی آنکھوں کا پرانا محرم / یوں ہے درماندہ کہ اب آہ و فغاں تک مشکل
نہر بیڈو کے کنارے میں کھڑا سوچتا ہوں

(قریۂ جاں کی ایک نظم)

جب سے بوڑھے ہوئے شہر ان کا نہ تھا
جاننے والے اپنے پرائے انہیں بھول بیٹھے
کہ اب ان کا دُنیا میں مصرف ہی کیا ہے / وہ جو معذور ہیں ان کی تقدیر میں
گردشِ وقت کا ایک ہچکولا کافی ہوا

(۲۵ دسمبر)

تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ مایوسی اور پژمردگی کے اس قسم کے لمحات میں شاہین نے اپنی رجائیت کو زندہ رکھا ہے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے بدن، کرچی کرچی خواب، اور غیر محفوظ مستقبل کے پیشِ نظر بھی اپنا رشتہ اپنی سرزمین کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔ یہ زمین ان کا عقبی دیار بھی ہے۔ ان کے مستقبل کی محافظ بھی اور ماں کی گود بھی۔ چنانچہ جیسے ہی وطن کی سرزمین انہیں یاد آتی ہے ایک کوندا سا ان کی آنکھوں میں بیدار ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

ہر ایک زلف میں، ہر ایک پیرہن میں گلاب / گلاب آنکھوں میں چہرے پہ اور بدن پہ گلاب
ہزار رنگ کے طوفاں بند کلیوں میں / گلاب تیرے دریچوں میں تیری گلیوں میں
بہت حسیں ہے گلابوں کے شہر تیری شام
جو ریت ریت ہیں ان آنگنوں کا تجھ کو سلام

(اسلام آباد)

سانس لیتی ہوئی کمرے کی فضا میں / کئی صدیاں بیتیں / سات مسجد کو دکھاتی ہوئی / آئینہ یہ بوڑھی گنگا
یہ مغل آرٹ / یہ چغتائی کی تصویر / یہ آرام گہہ شاہ جلالِ یمنی
اور یہ تشنگی روح کا اظہارِ حسیں ـــــ تاج محل
وقت دیوار پہ لٹکے ہوئے خوش رنگ کلنڈر کے ورق سے جھانکے
ہر گھڑی دل کو یہ ارمان / کہ اس آہوئے وحشی کو گرفتار کریں

(گیند)

بار بار اک چڑیا / تیرین کے اڑتی ہے / پیچ کھا کے مڑتی ہے
میگھنا کے پانی میں / ڈبکیاں لگاتی ہے / اور پھر لبِ ساحل / بال و پر سکھاتی ہے
بار بار اک چڑیا / میگھنا کے پانی میں

(رقصِ حیات)

شاہین کی شاعری میں اس قسم کی نظمیں جگنوؤں کی طرح چمکتی ہیں اور تاریک فضا میں ایک روشنی سی بکھیر دیتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شاہین زندگی کے گھمسان میں اور ہجرت در ہجرت کے تجربے میں ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئے بلکہ ان کے ہاں مجتمع ہونے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ ان دونوں زاویوں کو ان کے حقیقی تجربے کی حیثیت حاصل ہے اور وہ مجھے ایسے سچے شاعر نظر آتے ہیں جو دل کی ہر لرزش کو شاعری کا پیکر عطا کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے اس فن کی ایک جہت ان کی غزل بھی ہے لیکن اس جہت پر پوری نظر ڈالنے کے لیے مجھے کچھ عرصہ شاہین کی غزل کے ساتھ مزید رہنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ادبِ اُردو

ابتدائے اُردو سے ۱۹۸۶ء تک کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ۔ جس میں اصنافِ ادب اور اشخاصِ ادب کو اہمیت دی گئی ہے اور ہر صنف کے تدریجی ارتقا کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ یہ ایک غیر جانبدار تجزیہ ـــ ایک مکمل تاریخ ہے۔ (زیرِ طبع)

اُردو ادب میں سفر نامہ

یوسف خان کمبل پوش سے لے کر محمد طفیل (سفرنامہ "مسافرانہ" جولائی ۱۹۸۷ء) تک اُردو سفر نامے کا تحقیقی تنقیدی اور توضیحی جائزہ اردو میں سفر نامے پر پہلی بسوط تصنیف جس میں ہر سفر نامے پر فنی بحث کی گئی ہے۔ (زیرِ طبع)

محترم چہرے

اُردو ادب کی بساط سے جب بھی کوئی محترم شخصیت رخصت ہو جاتی ہے تو انور سدید سوگوار ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نیا ادیب پرانے اور نامور ادیبوں کی جگہ لینے کے تا حال قابل نہیں ہوا۔ اس کتاب میں چند ایسے ہی ادیبوں کا ذکر ہے جن سے اُردو ادب کا جہان روشن ہے (پیش لفظ ڈاکٹر معین الرحمٰن)۔ (زیرِ کتابت)

جاپانی ہائیکو کا ہیئتی مطالعہ

محمد امین

ہائیکو جاپان کی مقبول ترین صنفِ شاعری ہے۔ یہ جاپانی مزاج کے ساتھ مخصوص ہے اور اسے جاپانی فنِ شاعری کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ ماسا اوکرسے جو ایک معروف ناول نگار ہیں ہائیکو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی بطور ہائیکو شاعر کیوں نہیں بسر کی۔ جہاں تک زندگی، فن اور ذہنی رویے میں اتحاد کا تعلق ہے، سب سے زیادہ ہم آہنگی ہائیکو شاعر میں پائی جاتی ہے۔ جاپان جیسے ملک کے لیے ہائیکو پہلا اور آخری درجہ رکھتی ہے۔ ماسا اوکرسے کے اس بیان سے ہائیکو کی اہمیت واضح ہوتی ہے — زین بدھ مت کے پیروکار تو اسے مذہبی درجہ دیتے ہیں، اور اسے مقدس صنفِ شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہائیکو کے مطالعہ کا بھی خاص طریقہ ہے، مثلاً خالی کمرے میں تنہا خالی الذہن ہو کر اکڑوں بیٹھ کر ہائیکو کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اور اس پر غور کرنا چاہیئے۔ اس سے زین صوفی کو گیان حاصل ہوتا ہے۔ اسے روشنی ملتی ہے، جس سے وہ سرور و انبساط حاصل کرتا ہے۔ زین صوفی شعرا نے ہائیکو میں مذہبی اور فلسفیانہ مشاہدے کو شامل کیا ہے۔

جاپان میں ہائیکو کو پہلے ہوکو اور ہائی کائی بھی کہا جاتا تھا۔ بعد میں ہائیکو کا نام اس صنف کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اس صنف کی ابتدا کے بارے میں کئی نظریات ہیں، بعض کے خیال میں یہ کاتا اُوتا سے نکلی ہے، بعض کے خیال میں رینگا اور تانکا سے اس کا آغاز ہوا ہے، شیکی کے مطابق گین روکو عہد سے پہلے ہائیکو موجود تھی، مگر اسے عروج گین روکو عہد میں اور اس کے بعد حاصل ہوا۔ یعنی سترھویں صدی ہائیکو کے عروج کا زمانہ ہے۔

سین ریو مزاحیہ شاعری ہے، یہ بھی تین مصرعوں اور سترہ آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے، مگر اس کا ہائیکو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہائیکو سنجیدہ شاعری ہے، جبکہ سین ریو مزاحیہ اور بے معنی شاعری کو کہتے ہیں، سین ریو میں صرف ہائیکو کی ہیئت کو اختیار کیا گیا ہے، بعض ناقدین کے خیال میں اُردو میں جو ہائیکو لکھی جا رہی ہے، وہ ہائیکو سے زیادہ سین ریو ہے، یہ بات بالکل غلط ہے، اور مجھے اس سے اتفاق

ہائیکو کی ہیئت

جاپانی ہائیکو کی کلاسیکی ہیئت میں تین مصرعے اور پانچ سات پانچ کی ترتیب کے ساتھ سترہ آوازیں شامل ہیں۔ ہیئت کے

عبدالحلیم شرر کا اسلوبِ سخن

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

عبدالحلیم شرر، مروجہ اصنافِ شعر سے دل برداشتہ تھے۔ خصوصاً غزل کو شاعری کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی غزل کے میدان میں طبع آزمائی نہیں کی۔ ان کی خواہش تھی کہ اردو شاعری کو ظاہری اور لفظی پابندیوں سے نجات دلائی جائے اور شعراء حضرات قیود سے آزاد ہو کر اپنے فکر و تخیل کو کھلی پرواز دے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے انگریزی شاعری کی چند اصناف کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ ان اصناف میں نظمِ معریٰ (BLANK VERSE) اور نظمِ آزاد (FREE VERSE) خصوصیت کے ساتھ اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ شرر نے خود بھی ان میں طبع آزمائی کی اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ لیکن یہ طبع آزمائی اردو طبقہ کے لیے بالکل نئی اور غیر معروف تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان پر اعتراضات ہوئے اور ان کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ جس سے بددل ہو کر انہوں نے اس صنف کی طرف بھرپور توجہ نہیں دی۔

غیر مقفیٰ نظم کی تاریخ دو دلچسپ اور متعلقہ باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔ ایک تو روزمرہ کی بات چیت پر اس کا دار و مدار ہوتا ہے اور دوسرے وہ نمایاں فرق ہے جو ڈرامائی نظمِ معریٰ اور اس نظمِ معریٰ میں پایا جاتا ہے جو رزمیہ، فلسفیانہ اور فکری مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ روزمرہ کی بات چیت پر نظمِ معریٰ کا دار و مدار، دوسری شاعری کے مقابلہ میں ڈرامائی شاعری میں زیادہ براہِ راست ہوتا ہے لیکن ڈرامائی شاعری میں شاعر یکے بعد دیگرے مختلف کرداروں کے منہ سے بولتا ہے۔

عبدالحلیم شرر کی نظمیں بہت مرصع اور مخصوص قسم کی ہیں، اس کے باوجود وہ ایک فرد کی نہیں بلکہ سارے معاشرے کی زبان کی حیثیت سے باقی رہتی ہے کیونکہ حالی اور آزاد سے شرر تک کے زمانے میں نظمِ معریٰ بذاتِ خود مُردہ فارم کے خلاف ایک بغاوت تھی یا نئے فارم کی تیاری یا پرانے فارم کی تجدید تھی۔ نظم فارم سے پہلے وجود میں آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فارم کچھ کہنے کی کوشش کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے علمِ عروض کا کوئی قاعدہ، اوزان کی اس مماثلت کے ایک ضابطے کا نام ہے جو یکے بعد دیگرے آنے والے شاعروں کے یہاں ملتا ہے جنہوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے۔

فارم بنتا اور بگڑتا رہتا ہے لیکن ہر زبان، اپنے قوانین اور اپنی پابندیاں بھی نافذ کرتی رہتی ہے۔ اپنے طور پر آزادی کی اجازت بھی دیتی ہے اور بول چال کے اپنے لہجے اور آواز کے سانچے کو پیش کرتی ہے۔ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں ترکیبِ نحوی

وسعت، تلفظ، لہجہ اور لَے ایسی چیزیں ہیں جنہیں شاعر کے لیے قبول کرنا ضروری ہے۔ وہ اس کی ترقی میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی خصوصیات کو برقرار رکھ کر مختلف النوع خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور احساس و جذبات کے ارفع مدارج پیدا کر کے زبان اور ساخت کی خدمت کا شرف حاصل کرتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے تبدیلیوں کو لبیک کہا اور دوسروں کو بھی اس سے باخبر رکھا اور ساتھ ہی گرے ہوئے معیار کے خلاف نبرد آزما بھی رہے :

"اُردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزارہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جاتی ہیں، بخلاف اس کے انگریزی میں بہت کم قیدوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیے کی ضرورت نہیں اور اُردو میں جب تک قافیہ کی پابندی نہ ہو، شعر ہی نہیں ہو سکتا۔"[1]

سب سے پہلے عبدالحلیم شرر نے ہی نظم معریٰ کے تجربے کیے۔ لیکن ان کے تجربے کی مخالفت کی گئی اور اس طرح کی شاعری کو غیر موزوں قرار دیا گیا۔ جس کے جواب میں شرر نے جواز پیش کیا کہ :

بلینک ورس میں جب عروض کی بحروں کی پوری طرح پابندی کی جاتی ہے تو اسے غیر موزوں ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے اسی قدر ہے کہ نظم کی جن اصناف سے ہم آشنا ہیں یا جن کو اگلے دنوں ہم نظم کہا کرتے تھے ان کے حلقے سے یہ انوکھی نظم خارج ہے ورنہ صرف قافیہ کے نہ ہونے سے اس وضع کے اشعار کو غیر موزوں کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"[2]

بعض اعتراضات یہ بھی ہوئے کہ قافیے کی قید سے آزاد ہو کر نظم کہنا زیادہ آسان ہے۔ شرر نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"اگرچہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ قافیوں کی قید سے آزاد ہونے کے باعث ایسی نظمیں لکھنا زیادہ آسان ہوگا مگر دراصل یہ سب قسم کی نظموں سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اور سب نظموں میں الفاظ کا اپنی اصلی اور صحیح ترتیب سے ہٹنا کسی نہ کسی حد تک جائز سمجھا جاتا ہے مگر اس میں چونکہ مکالمہ اور بے تکلف گفتگو سے زیادہ کام پڑتا ہے اور نثر عاری کی حقیقی شان قائم رکھنا پڑتی ہے اس لیے اس میں ترتیبِ الفاظ میں ایک ادنیٰ تغیر بھی معیوب ہے یا یوں کہیے کہ تعقیدِ لفظی سب نظموں میں تھوڑی بہت جائز ہے مگر اس میں مطلقاً جائز نہیں، اور اس وجہ سے یہ تصور کرنا کہ اس قسم کی نظمیں کہنا آسان ہے، بڑی فاش غلطی اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ بلینک ورس (نظم معریٰ) ہر طرح کی نظموں سے زیادہ دشوار ہے۔"[3]

اُردو میں انگریزی کی طرح اس فارم کے لیے ایک خاص بحر اور صنفِ سخن مخصوص نہیں کی گئی ہے بلکہ بحروں میں سالم یا مزاحف کسی بحر میں بھی معریٰ طریقہ کار برتا جا سکتا ہے۔ شرر کے منظوم ڈراما "فلورنڈا" سے یہ مثال دیکھیے۔ ایک منظر میں ہیرو میلی کو اپنی محبوبہ فلورنڈا کا خیال آتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے ؎

---

1. دلگداز — ستمبر ۱۸۸۹ء، ص۵
2. دلگداز — جون ۱۹۱۰ء، ص۱۵
3. ایضاً ۔ جون ۱۹۱۰ء، ص۹

جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ اک مَیں ہوں کہ دل

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

کو قرار آتا نہیں اُلجھن ہے بیتابی ہے اور

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ہر گھڑی اک درد ہے پیاری فلورنڈا تجھے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

اک نظر دیکھوں تو چین آئے کہاں ایسے نصیب

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

مَیں تڑپتا ہوں یہاں تُو اندلس کے باغوں میں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

سیر کرتی ناز سے اٹھلاتی ہنستی بولتی

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

کھلکھلاتی توڑتی پھولوں کو پھر ان کو عجب

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

ناز سے سر پہ لگاتی ہو گی

فاعلاتن فاعلاتن فاع

کیا! یہ کون تھا

لاتن فاعلن

دوسرے سین میں ہیروئن فلورنڈا اور اس کی ماموں زاد بہن مریم، رادرق بادشاہ کی ہوس پرستی سے اپنی عصمت بچا کر بھاگنے کا قصد کرتی ہے۔ اس موقع پر فلورنڈا، مریم اور ایک ساقیہ کے درمیان گفتگو نظم کی گئی ہے۔ اس کی تقطیع دیکھیے ؎

فلورنڈا: (مریم سے) —— کیا کرو گی جاکے اب

فاعلاتن فاعلا

ساقیہ: —— ان کو نہ روکیں

تن فاعلاتن

فلورنڈا: —— کس لیے

فاعلن

ساقیہ: —— بادشاہ کو گر ذرا بھی شک ہوا تو بس مجھے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

اور ان کو قتل کر ڈالیں گے

فاعلاتن فاعلاتن فاع

فلورنڈا : (آنسو بہاتے) تو جاؤ بہن

لاتن فاعلن

اب کہاں جاؤ گی تم ؟

فاعلاتن فاعلا

مریم : — جس جا خدا لے جائے

تن فاعلاتن فاع

فلورنڈا : — تم

لن

کس طرح جاؤ گی یاں سے

فاعلاتن فاعلاتن

مریم : — خاک اڑاتی ٹھوکریں

فاعلاتن فاعلن

کھاتی ننگے پاؤں جاؤں گی بہن اور جس طرح

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

بن پڑے گا آپ کو پہنچاؤں گی ترون میں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

اس منظوم ڈراما میں ایک کردار کے مکالمے کا دوسرا مصرع دوسرے کردار کے جواب کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ لیکن دونوں کی گفتگو کو ملا دینے سے مصرع مکمل ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ؎

فلورنڈا : تو مرا سب حال کہہ دینا

مریم : ضرور

فلورنڈا : اور یہ کہ اب

مجھ کو جلدی واں بلا لیں

مریم : لو خدا حافظ بہن

اب اس مکالمہ کو ملا کر اور تقطیع کر کے دیکھیں ؎

تو مرا سب حال کہہ دینا ضرور اللہ یہ کہ اب
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
مجھ کو جلدی واں بلالیں لو خدا حافظ بہن
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

شرر کی معریٰ اور آزاد نظم نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"شرر نے منظوم ڈرامے میں آزاد نظم کی داغ بیل ڈالی۔ ملاحظہ ہو ؎

چوبدار: ———— اجنبی سیاح اک اترا ہے ساحل پر حضور
آرزو ہے باریابی کی اسے
لاؤ ابھی[1]

گیان چند نے یہ مثال "فلورنڈا" سے ہی دی ہے۔ اسے تقطیع کر کے دیکھیں۔

اجنبی سیاح اک اترا ہے ساحل پر حضور
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان
آرزو ہے باریابی کی اسے
فاعلاتن فاعلاتن فاعلا
لاؤ ابھی
تن فاعلن

اسی نظم سے ایک اور مثال کی تقطیع دیکھیں ؎

ایک درباری: میں تو کہتا ہوں کہ حضرت کوئی عیسائی فقیر
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
مانگنے آیا ہے

جولین: لیکن وضع سائل کی نہیں
(مانگنے آیا ہے، لیکن وضع سائل کی نہیں)
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

اس ڈرامے میں بحر رمل مزاحف مثمن محذوف / مقصور —— فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن فاعلن / فاعلات استعمال کی گئی ہے۔ بقول کنول کرشن بالی:

---

[1] تحریریں۔ گیان چند جین۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۴ء ص۱۳۳

"اس ڈراما میں ہر مصرع کا وزن بحر کے لحاظ سے برابر ہے۔ صرف قافیہ کا روایتی نظام برقرار نہیں رکھا گیا ہے۔ جہاں مکالمہ کی ضرورت کے مدِ نظر بحر کے ارکان توڑ کر مختلف زبانوں پر بکھیر دیا ہے، وہاں بظاہر وزن میں کمی بیشی کا شک گزرتا ہے لیکن ان ٹکڑوں کو ملانے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مصرع کا وزن ایک ہے"[1]

اس نظم سے متعلق عام طور پر بعض غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر حامدی کشمیری اپنی تحقیقی کتاب "جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات" میں شرر کو اُردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم کا موجد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس بحث کے ثبوت میں کہ شرر نے نظم معریٰ کو رواج دینے کی کوشش میں آزاد نظم کی بھی داغ بیل ڈالی تھی، ذیل کا اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک نظم "سمندر" کے عنوان سے لکھی تھی، جو ایک ہی وزن اور بحر میں ہے لیکن جس کے مصرعے خیال کے آہنگ کے مطابق چھوٹے بڑے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نظم "دلگداز" فروری ۱۹۰۱ء میں چھپی[2]

اے سمندر میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش
کس لیے پیدا ہے؟
یہ دیوانگی کیوں؟
منہ میں کف
کیوں بھر آتا ہے ترے
کیا کسی
عارضِ گلگوں کا دیوانہ ہے تو بھی
سچ بتا
ورنہ یوں سر کو پٹکنا اور دے دے مارنا
پتھروں پر
غیر ممکن تھا، مگر
عشق، پُر اندوہ عشق
ظلم سے تیرے بچا ہے، کوئی بھی
کہسار سے۔"[3]

حامدی کشمیری نے نہ تو عبدالحلیم شرر کی نظموں کا مطالعہ کیا تھا اور نہ "دلگداز" کی فائل دیکھی تھی اور نہ ہی نظم "سمندر" ان کی اختراع ہے بلکہ بنگلور سے شائع ہونے والے رسالہ "سوغات" کے "جدید نظم نمبر" میں ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے مضمون "اُردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ

---

[1] آزاد نظم اُردو شاعری میں۔ لکھنؤ۔ صہ ۱۹

[2] جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات۔ دہلی ۱۹۶۸ء صہ ۱۳۲ - ۱۳۳

تشکیلی دور ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۶ء)" کے بعد جو ضمیمہ "تشکیلی دور کی بعض کمیاب نظمیں" شائع ہوا ہے، اس میں عبدالحلیم شرر کے نام سے یہ نظم "سمندر" اس طرح درج ہے:

اے سمندر! میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش
کس لیے پیدا ہوا؟
یہ دیوانگی کیوں؟
منہ میں کف
کیوں بھر آتا ہے ترے
کیا کسی
عارض گلگوں کا دیوانہ ہے تو بھی
سچ بتا
ورنہ یوں سر کو پٹکنا اور دے دے مارنا
پتھروں پہ
غیر ممکن تھا۔ مگر
عشق! پُر اندازہ عشق!
ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی
کہسار سے
بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں
اور آندھیاں
خاک اڑاتی پھرتی ہیں
اور تو اے آسماں!
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں
اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی ہے یہ نظر
میری اُمیدوں کو لے کر
بے قراری اور بے تابی کے ساتھ

اسی نظم "سمندر" کے پیشِ نظر خلیل الرحمٰن اعظمی نے دو ٹوک رائے یوں دی تھی:
"شرر کا یہ ڈراما آج کی اصطلاح میں "آزاد نظم" میں ہے۔"[1]

---

[1] اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ۔ مطبوعہ "سوغات"، بنگلور۔ جدید نظم نمبر ص ۱۹۱۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ غلط روی اور غلط بیانی کی آئینہ داری کی گئی ہے ۔ شرر نے "سمندر" کے عنوان سے کوئی نظم نہیں لکھی مندرجہ اقتباس شرر کے منظوم ڈراما "فلورنڈا" کے پانچویں سین کا ابتدائی حصہ ہے جو میسی کی اس دلی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے جسے وہ فلورنڈا کی جدائی میں آدھی رات کے وقت سمندر سے مخاطب ہو کر بیان کرتا ہے :

"ساحل بحر، طوفاں بپا ہے، موجیں اُٹھ رہی ہیں اور رات کے سناٹے میں ہسپانیہ کی ایک کشتی قلعہ سبطہ کے نیچے کنارے سے بندھی ہوئی ہے ۔ ہسپانیہ کے چند سپاہی اور غلام کچھ کشتی میں اور کچھ کنارے خاموش کھڑے ہیں ۔ سامنے قلعے کا کوٹھا اور برج ہے جس پر یکایک میسی آ کے ٹہلنا شروع کرتا ہے ۔

میسی (خود بخود) : اے سمندر میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش کس لیے پیدا ہے ؟ یہ دیوانگی کیوں ؟ منہ میں کف بھر بھر آتا ہے تیرے ؟ کس پہ یہ غصہ ؟ کیا کسی عارض گلگوں کا دیوانہ ہے تو بھی ؟ سچ بتا ورنہ یوں سر کو پٹکنا اور دے دے مارنا پتھروں پر غیر ممکن تھا ۔ یہی ہے حال سب عاشقوں کا ۔ عشق ! پُر اندوہ و پُر آلام عشق ! ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی ؟ کہسار سے بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں، اور آندھیاں خاک اڑاتی پھرتی ہیں اور آہ تو اے آسمان ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی ہے نظر میری، مری اُمیدوں کو لے کر عجب بے قراری اور بیتابی کے ساتھ ......"[1]

عبدالحلیم شرر نے اُردو شاعری میں "فلورنڈا" کی قسم کا پہلا تجربہ کیا تھا ۔ ایک تو اُردو ڈرامے کی روایت ہی نئی تھی، دوسرے ڈراما ایسی نظم میں ہے جس میں قافیہ نہیں ہے ۔ تیسرے تمام مصرعے برابر نہیں ہیں بلکہ انہیں گفتگو کی ترتیب کے مطابق چھوٹا بڑا کر کے لکھا گیا ہے ۔ اس میں ارکان کی کل تعداد کو نہ صرف یہ کہ دو یا دو سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے بلکہ ایک ہی رکن کو توڑ کر دو جگہ کر دیا گیا ہے ۔ پورے ڈرامے میں شرر نے ڈرامائی انداز یا بول چال کی زبان کی ترتیب کو کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور حسب ضرورت ارکان کو بکھیر کر یا ان کے ٹکڑے کر کے برتا ہے اس تجربہ کے دُور رس نتائج نکلے ۔ مصرع کے تصور میں تبدیلی ہوئی اور اُردو میں ایک نئی ہیئت کا رواج ہوا ۔ یہی نہیں بلکہ اُردو میں ڈرامائی انداز کی طویل نظم نگاری کو فروغ بھی ملا اور اس پر جدت پسند اور قدامت پسند دونوں حلقوں میں ردِّ عمل کا اظہار ہوا ۔

شرر کو اظہارِ خیال پر ملکہ حاصل تھا اور جذبات نگاری میں کمال تک پہنچے ہوئے تھے ۔

ایک سین میں حاکم سبطہ کی بیٹی فلورنڈا جو راڈرک بدکار بادشاہ اسپین کے محل میں ہے اور اس کی بدکاریوں سے ہراساں ہے، اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی کہہ رہی ہے ؎

فلورنڈا : کس غضب میں پڑ گئی ہوں ! آہ کچھ بنتا نہیں ! کیا کروں ؟ کس سے کہوں ؟ کیونکر بچوں ؟ اور کون ہے جس کے آگے سر کو دے ماروں ؟ یہاں کوئی نہیں جو خبر لے اس مصیبت میں مری، افسوس ! میں پھنس گئی کیسی بلا میں ؟ میں تو آتی ہی نہ تھی آہ ! والد نے نہ مانا ! دیکھیے قسمت میں اب کیا لکھا ہے ؟ اور کیسی ذلتیں ہوتی ہیں ؟ اے راڈرک ظالم ! تجھے کچھ شرم بھی آتی نہیں ! مر نہیں جاتا ہے کیوں ؟ جو تیرے ظلموں سے

---

[1] دلگداز ۔ فروری ۱۹۰۱ء ص۱۱

یہیں لڑکیاں شاہی گھرانے اور معزز لوگوں کی

(کچھ آہٹ پاکے) — کون ؟

شرر نے منظر نگاری کی طرف بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ ایک سین سے ہیرو عیسیٰ قلعہ کے اُوپر دریا کے کنارے ٹہل رہا ہے۔ ردبِ آفتاب کا منظر دیکھ کے کہتا ہے —

عیسیٰ : (خود بخود) ۔۔ آہ ! دُنیا تجھ میں کیا کیا لطف ہیں کس شان سے دیکھو سورج ڈوبتا ہے اور کرنیں کس طرح پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں ! ادھر اس کوہسار کو طلائی کپڑے سورج نے پہنائے ہیں جہاں گھاس کی وہ ننھی ننھی پتیاں اس دُھوپ میں جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں ۔ وہاں اس بیل نے کیا طلائی جھالریں منقش کی لٹکائی ہیں ! پھول بھی ہر رنگ کے اس جا کھلے ہیں اور وہ دیکھو کلیاں مسکراتی ہیں عجیب انداز سے ! دیکھ کر یہ لطف چڑیاں کیسی خوش ہیں اور کس جوش سے سب چہچہا اٹھتی ہیں ! کیسی شاد ہیں ۔

ایک اور سین میں منظر نگاری دیکھیے —

مریم : (اُفقِ مشرق کو دیکھ کر) صبح اب ہونے کو ہے

دیکھیے جھونکے نسیمِ صبح کے وہ آپ کی زلف برہم کر رہے ہیں اور تاروں کے چراغ جھلملاتے ہیں فلک پر اور سیہ چادر یہ شب کی مسکتی جاتی ہے ایسا نہ ہو چڑیاں اُٹھیں

"فلورنڈا" میں یوں تو واقعہ ایک ہے لیکن اس میں کہیں اتحاد و اتفاق کا درس ہے، کہیں ظلم و ستم کے خلاف آواز ہے، کہیں عشق و محبت کے الم انگیز جذبے کی دھڑکن ہے، کہیں سیکولرزم کا تصور اور کہیں ایثار و قربانی کی تلقین ہے۔ جہاں تک زبان اور اسلوب کی بات ہے، شرر نے عام فہم زبان استعمال کی ہے اور کہانی کے مطابق الفاظ کو تراشا ہے، وضع ، سائل ، ساحل ، اجنبی سیاح ، باریابی کی آرزو ، مصلوب بیٹا ، بادشاہ بحر و بر ، حامی تثلیث و صلیب ، پریشان و حزیں ، بے شرمی کی نیت ، کمک ، ملعون ، وحشی لیٹیرے ، لاڈلی ، یورش ، بے حمیت ، خاتونِ معظم ، جھونکے نسیمِ صبح کے ، شب کی مسکتی چادر ، برجِ طلسمی ، شفق ، افشاں ، کوہسار ، گھاس ، پستی ، جگنو ، پھول ، کلیاں ، چڑیاں ، قمری ، قوسِ قزح ، سر آنکھوں سے خدمت کرنا ، بلدح افزا بہار ، دلستانی ، جھوٹ موٹ ، مشتاق ، عارضِ گلگوں ، آنسوؤں کی ندیاں ، ماتمی پوشاک ، انگاروں پر لوٹنا ، شمشیرِ دو پیکر ، بہادر نامدار ، بشری ، ماہوش ، ماہ سیما ، رخِ زیبا ، جاسوس ، کالک ، شیریں ادا ، خونِ چکاں ، ناسور ، خرابِ ناز اور اسی طرح بہت سے سخت کھُردرے اور نرم محاورے ، الفاظ اور روزمرہ اس منظوم ڈراما میں اس طرح استعمال کیے گئے ہیں کہ نہ تو خشکی کا احساس ہوتا ہے نہ روانی میں فرق آتا ہے ، نہ وزن پر حرف آتا ہے اور نہ ہی معنوی نزاکت متاثر ہوتی ہے ۔

ویسے اس نظم میں بعض خامیاں بھی راہ پا گئی ہیں ۔ جیسے ؎

اب تو دُشمن عزت و ناموس کا ہے درپے آزار ہے

اس مصرع میں ایک " فاعلاتن " زائد ہے ۔

؎ پڑ گئی کیسی یہ مجھ پر کیا کروں ! یہ بے عزتی

اس مصرع میں "بے عزتی" سے پہلے "یہ" زائد ہے ۔

ــ دین اسی مصلوب بیٹے کا خدا کے جس گھڑی

تک ہے غالب سارے ان دینوں پہ جو

ظلم کی تعلیم دیں اسے بادشاہِ بحر و بر

دوسرے مصرع میں ایک رُکن ہے ۔

اس نظم میں کہیں کہیں آہنگ کے حُسن کی کمی بھی کھٹکتی ہے ــ

پاک خاتونِ معظم تم نے کی آسان ہے

میری مشکل

ع سرزمیں میں اندلس کے خوب زور و شور سے

بعض فنی اسقام کے باوجود " فلورنڈا " بے حد کامیاب اور اچھوتی نظم ہے !

گفتگو کی ضرورت کے مطابق ارکان توڑ کر بکھیرنے کی تکنیک شرر کی نظم "مظلوم ورجینا " میں بھی ہے ۔ یہ منظوم ڈراما رومتہ الکبریٰ کی تاریخ سے ماخوذ ہے ۔ روم میں دو گروہ تھے ۔ایک معززین کا ، دوسرا عوام الناس کا ۔ ان دونوں گروہوں کے جھگڑوں کو فلا دیوس طے کرتا تھا۔فلادیوس بدخصلت تھا۔ اس نے ورجینا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا ۔یہی اس ڈراما کا پلاٹ ہے ۔ کمرۂ عدالت کے سین سے ڈراما شروع ہوتا ہے ــ

آپیوس : (کبر و نخوت سے)

لڑ جھگڑ کر مدتوں کے بعد اب حاصل کیے

ہیں حقوق اپنے کہاں آزادیاں ، یہ پہلے تھیں

پہلے مَیں تھا اک غریب ادنیٰ سپاہی ، آج ہوں

حکمرانِ روم ، اب وہ کون ہے ، جو چار آنکھیں

کر سکے ، میرے مقابل یا کرے انکار میرے حکم سے

یہ منظوم ڈراما فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن / فاعلان کے وزن پر ہے ۔ اس میں شعری تسلسل اور معنوی ربط ہے ۔شرر نے اس میں انسانی کردار کے لیے ذہنی بالیدگی کا سامان فراہم کیا ہے ۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز ، ماحول کی ناسازگاری ، حادثات اور خارجی عوامل کی سختی و درشتی کی تفسیر کے ساتھ ساتھ انصاف کے لیے بغاوت بھری آوازیں اور ان پر عمل بھی اس میں شامل ہے ــ

ایتیلیوس : (جنونانہ طیش سے)

پھونک دو

اس عدالت کو ! جہاں ایسی دغا بازی سے اور

ایسی بے ایمانی سے ہوتی ہو حکومت !

عام لوگ : (جوش و خروش سے)

ہاں ابھی !

پھونک دو اجلاس یہ ! اور کھود ڈالو یہ مکاں !

مار ڈالو سب ڈسمویروں کو ! پائے تاکہ روم

اب نجات ان ظالموں کے ظلم سے اور جور سے

...میں یہ تین مکاتبِ فکر ہیں۔

کلاسیکل مکتبِ فکر

کلاسیکی مکتبِ فکر تین مصرعوں اور پانچ سات پانچ کی ترتیب کے ساتھ سترہ آوازوں پر زور دیتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں بھی آوازوں میں تنوع ملتا ہے، سترہ سے اٹھارہ تک کی آوازیں اکثر شعراء نے استعمال کی ہیں۔ کہیں کہیں آوازوں کی ترتیب میں بھی تبدیلی ملتی ہے۔

ہے کی گودو مکتبِ فکر

ہے کی گودو نے ہائیکو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کی ہیئت میں تبدیلی تجویز کی۔ اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے شعراء نے چار مصرعوں کی ہائیکو لکھی ہیں۔ یہ پانچ پانچ تین پانچ ۵۔۵۔۳۔۵ کی ترتیب کے ساتھ اٹھارہ آوازوں پر مشتمل ہوتی ہیں مثلاً

جس دن ہم نے باز کو دیکھا
مندر کے صحن کے درخت پر
ایک پتنگ بھی
دُور آسماں پر تھی (ہے کی گودو)

آزاد مکتبِ فکر

ہے کی گودو کے رجحان سے ہائیکو میں آزاد مکتبِ فکر نے جنم لیا۔ جس کے بانی سے سین سوئی کہلائے۔ انہوں نے ہائیکو میں زیادہ آزاد روش اختیار کی۔ ان کے یہاں مصرعوں کی تعداد، آوازوں کی تعداد اور ترتیب میں تنوع ملتا ہے۔ ہائیکو کی تاریخ میں اس مکتبِ فکر کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

جاپانی ہائیکو کی تاریخ میں کلاسیکل ہیئت ہی کو مقبولیت حاصل ہے جو تین مصرعوں اور سترہ آوازوں پر مشتمل ہے جن کی ترتیب ہے ۵، ۷، ۵۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں بھی آوازوں کی تعداد اور ان کی ترتیب میں تنوع پایا جاتا ہے۔ درج ذیل میں چند معروف ہائیکو نگاروں کی ہائیکو کی تقطیع ملاحظہ کیجیے:

ایسو یوسے تے	کرسی کھینچ کر
کیکو نو کا اوری نی	گل داؤدی کی خوشبو میں
موتز اوکا کر	[illegible] گھنا

(نو روم میں آگ لگاتے ہیں اور شہر میں بلوہ ہو جاتا ہے)

اپنے حق کے لیے، اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے اور ملک میں امن و سلامتی کے لیے آواز بلند کرنے کی ایک مثال دیکھیے ؎

ورجینیوس: (جان سے ہاتھ دھو کے) —— جس جگہ حاکم ہو ظالم! سنگدل! کم ذات! اور
بدگہر! جس کو شرافت اور نجابت سے نہ ہو
کچھ بھی مس! ایسی جگہ جینے سے بہتر موت ہے

اقیلیوس: (شور سن کر) —— اب نہیں بچنے کی عزت روم میں! ہے خطرے میں
آبرو!

(بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں)

لوگ: (غل مچاتے ہیں) —— مارو! نکالو! ان ڈسمو یروں کو! جو
دشمن عزت ہیں! ساری قوم کے بدخواہ ہیں!

اس منظوم ڈراما کے متعلق ڈاکٹر حامدی کشمیری کی کتاب میں غلط روایت ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۹۰۱ء اگست کی اشاعت میں "مظلوم ورجینیا" کا حصہ بے قافیہ نظم کے روپ میں چھپ گیا۔"[1]

اگست ۱۹۰۱ء کی اشاعت میں "مظلوم ورجینیا" کا حصہ چھپنے کی بات قطعی غلط ہے۔ شرر نے جب نظم معریٰ کی تحریک چلائی اور اس کے واضح مقاصد پیش کیے تو قارئین کا ایک بڑا طبقہ ان کا ہمنوا بن گیا لیکن اسی زمانے میں شرر کی مصروفیت بڑھ گئی اور وہ طویل وقفے کے لیے خاموش ہو گئے۔ تقریباً دس سال کی خاموشی کے بعد جب دوبارہ شرر نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنے پچھلے منظوم ڈرامے کے کچھ حصے بطور نمونہ پیش کیے تو "دلگداز" کے قارئین نے پسند کرنے کے ساتھ ہی نئے منظوم ڈراما کی بھی فرمائش شروع کر دی اور اگست ۱۹۱۰ء کے "دلگداز" میں شرر نے "مظلوم ورجینیا" پیش کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"جون کے دلگداز کو ملاحظہ فرما کر متعدد قدر دانانِ دلگداز نے اس نظم کو بہت پسند فرمایا اور تاکید شروع کی کہ دلگداز میں نظم معریٰ کا سلسلہ برابر جاری رکھا جائے۔ ان کی خواہش کے مطابق ہم .... بر دست ایک نیا مختصر ڈرامہ جو صرف دو سینوں میں ختم ہو گیا ہے، موزوں کر کے نذرِ ناظرین کرتے ہیں۔"[2]

زبان اور اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی یہ منظوم ڈراما قابلِ توجہ ہے۔

بجا ارشاد حضرت کا، ظلم پر ظلم کرنا، مبارک یہ عروج، مہ پارہ، گل اندام، حسین و نازنین، ماہ سیما، مہروش، چابک خرام، گلبدن، لینا دوڑنا روکنا جانے نہ پائے، سرکشی، مملوک، کلیجہ تھام کر رہ جانا، خوش نصیب، اقبال مند، نیک طالع، ذی مراتب، صاحب تر تیر، قدر و منزلت، غلام کا چندہ، مردار، لغو گوئی، دائی، جنایا، فریق، آنکھوں کا نور، جگر کا ٹکڑا، گھر کا اُجالا، بلوہ، جان فدا ہونا، فسادی، غیر منصف، شورش، سر پٹکنا، تنکا چُننا، خاک اڑانا، خون کے آنسو بہانا، در بدر کی ٹھوکریں کھانا، آنسو بہانا، چھاتی سے لگانا، کم ذات، بدگہر، آبرو ریزی، نجابت،

---

[1] جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات۔ دہلی۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۱۳۱۔

[2] دلگداز۔ اگست ۱۹۱۰ء۔ ص ۹

پھونک دینا، کھود ڈالنا جیسے الفاظ سے کہانی کے ماحول کی اجنبیت دُور ہوگئی ہے۔

اس نظم میں کہیں کہیں آہنگ کے حُسن کی کمی ضرور کھٹکتی ہے، مثلاً ؎

وہی نہیں اولاد تھی ان کو خدا نے اور وہ
آرزو اولاد کی رکھتی بہت تھیں الغرض

سب شہادت دینے کو موجود ہیں، شک بھی بھلا
اس میں ہو سکتا کسی کو ہے! ہوتی پیدا یہ جب

ع ہے عدالت کو نہیں ہمدردی ہم سے
ع ہوتی ظاہر اس کی بے ایمانی ہے، اچھا کہاں
ع پھنس گئی ظالم کے پھندے میں ہوں! اور مظلوم ہوں!

جس تاثر کے تحت یہ نظم لکھی گئی ہے اسے قاری تک منتقل کرنے میں شررؔ کامیاب رہے ہیں۔!

نظم "زمانہ اور اسلام" کا اسلوب نہایت سلیس و سادہ ہے جو عام مسلمانوں کے معیارِ فکر کے مطابق اور ان میں ولولہ پیدا کرنے کی قابلِ لحاظ لیاقت کی حامل ہے۔ مثلاً پہلا ہی بند دیکھیے: ؎

فلک کے حسین اور نیچر کے پیارے
چراغِ جہاں اور رہبر ہمارے
انیس ان کے جو ہوئیں آفت کے مارے
گلِ فطرت اور بزمِ انجم کے تارے
نہیں اب جلوہ گر ہیں؟ ہوا کیا؟
کہاں چھپ رہے یک بیک؟ ہو گیا کیا؟

شررؔ اسلام کی شان سے متاثر اور اس کے دلدادہ ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گزرے ہوئے زمانے کو اس کے پورے لوازم اور خصوصیات کے ساتھ واپس لانے کے متمنی ہیں ؎

مسلمانو! افسوس، عبرت کی جا ہے
زمانہ غم قوم میں مبتلا ہے
تمہیں ڈھونڈتا دربدر وہ پھرا ہے
بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے
بہت رو چکے رونے والے اٹھو اب
زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب

"زمانہ اور اسلام" جمہوری اصلاح کے جذبے کے تحت لکھا گیا ہے۔ شررؔ نے طلوعِ اسلام سے اس کا آغاز کیا ہے اور مختلف سماجی اور اخلاقی اچھائیوں اور خرابیوں کا ایک خاص انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ نظم لب و لہجہ، اسلوب، علمی سچائی بلکہ واقعیت پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کے شعور میں انقلاب پیدا کرنے کی شعوری کوشش بھی کہہ سکتے ہیں۔ فعولن فعولن فعولن فعولن کے وزن پر "زمانہ اور اسلام" میں اسلوب اور فن کا معیار ہموار اور یکساں رہتا ہے ؎

کوئی گیارہ سو سال گزرے کہ میرا
گزر ایک جا اتفاقاً ہوا تھا
کہوں کس طرح ہائے عالم وہاں کا
عجب شہر تھا، اور عجب اس کا نقشا
خدائی کا سامان تھے واں فراہم
عجب دھوم دھام اس میں رہتی تھی ہر دم

شررؔ نے جس وقت بزمِ شاعری میں قدم رکھا، اس وقت اس پر ایک خاص قسم کا انحطاط چھایا ہوا تھا اور شعرا تڑپتی مچلتی زندگی سے تو متاثر تھے ہی، مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالت دگرگوں تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ سیاست کی بساط پر مسلمانوں کا حال پٹے ہوئے پیادہ کا سا تھا۔ خودی اور خودداری ان کے دلوں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکی تھی۔ ضمیر کی آواز دل کی گہرائیوں میں محوِ خواب تھی۔ اسلام کا سیدھا راستہ ان سے چھوٹ چکا تھا۔ دنیاداری حد سے بڑھ چکی تھی۔ مروت کا خوف دلوں کو لرزاں کیے ہوئے تھا۔ ایسے حالات میں حالیؔ اور سرسید جیسے مصلح، قوم کی مسیحائی کے لیے آگے آئے۔ ان کا مقصد قوم میں ایک عام بیداری پیدا کرنا تھا تاکہ جمود، افسردگی اور ناامیدی دور ہو جائے اور دوبارہ اجتماعی معاملات میں تخلیقی جدوجہد کر سکے۔ اس تحریک کی زبان حالیؔ تھے جنہوں نے اس کے اثر کو تعلیم یافتہ طبقے کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر ملک اور قوم میں عام کیا اور اس کا ذریعہ ان کی شہرۂ آفاق نظم "مسدس" بنی۔

لیکن حالیؔ کے بعد دردمندی کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کے اُجڑے باغ کا نظارہ شررؔ نے بھی دیکھا کر قوم کی حالت تباہ ہے۔ شرفا خاک میں ملتے جا رہے ہیں، علم کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ دین کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں، امرا جو قوم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے غافل اور بے پروا ہیں، علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔

شررؔ نے ان خوں چکاں حالات کے پیشِ نظر ملّت کے لوگوں کو اسلام کی تعلیم کے روشن پہلو سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیا نے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اب خود ملّتِ اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے ؎

خدا جانے وہ قصر و باغ اب کہاں ہے
وہ صورت کہاں، وہ شکر لب کہاں ہے
وہ عیش اور وہ اقبال کی شب کہاں ہے
جلال، آبرو، دبدبہ سب کہاں ہے

شررؔ کی نظم " زمانہ اور اسلام " فرسودہ نظام معاشرت کی مدلل ہجو ہے ۔ لیکن اس میں قوم کے عروج و زوال کی تصویر اور ایک بشارت ازلی بھی ہے ۔ اقبالؔ نے بھی ملت کو جگانے اور فکر و عمل میں وسعت لانے کی تلقین کی تھی لیکن حالیؔ اور اقبالؔ کی درمیانی کڑی شررؔ کو لوگ بھولے ہوئے ہیں اور اُردو ادب کی تاریخ میں شرر کی نظم " زمانہ اور اسلام " کا ذکر کہیں پر نہیں ہے جبکہ اس وقت کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی پراگندگی اور انتشار کے حل کے لیے یہ نظم بے حد اہمیت رکھتی ہے ۔

اس نظم کا ہر بند سلیس، سہل اور عام فہم اسلوب میں ہے ۔ اس نظم میں نیچر، آفت کا مارا ، قیامت کی تیرگی ، شور و جوش، کانٹوں سے دامن اُلجھنا ۔ دگیر و مضطر، کالا آسمان ، اُب اُب کے سانس لینا ، شورِ اشجار ، پا شکستہ کا جریاں ، داماں کا نچ نچ جانا، تلوا ، خارِ مغیلاں ، مرہم سینہ بریاں ، چٹائی ۔ ہدیہ ، ٹیلہ ، مہندس ، منجم ، بخت برگشتہ ، سیمبرا ، ہرے پودے ، بادِ بہاری ، پھریرا ، اجیپٹ ، یورپ ، اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ شررؔ نے بڑی صناعی سے استعمال کیے ہیں !

نظم " شبِ وصل " فعل فعولن فعل فعولن کے وزن پر ہے ۔ پوری نظم میں ایک والہانہ پن ہے ۔ الفاظ کی نرمی اور جذبے کی تپش کا احساس شدت سے ہوتا ہے ۔

چمڑا ، پانچہ ، زمانہ پھرنا ، قسمت کا ستارہ چکنا ، کترا ، سنکھ ، گھنٹہ ، نیچر ، گلکاری ، پازیب ، شیشہ ، گزک ، پلنگڑی ، جام ، صراحی ، مینا کاری ، عطر آگیں ، مسہری ، صحبت ، سن سن ہوا کا جھونکا ، چلمن ، جوبن ، مکھڑا ، کنگھی چوٹی ، مانگ نکلنا ، مہندی ، مسی ، کاجل ، افشاں ، ماتھا ، آہٹ ، چاپ ، بوسہ ، آنچل ، سر کی قسم ، گھات ، ناک میں دم ہونا ، غم غلط ہونا ، دھانی دوپٹہ ، وصل کا ارمان ، چل ہٹ ، جھونجھ ، تڑپ وغیرہ الفاظ کی تراکیب سے " شبِ وصل " میں خیال کی وضاحت شررؔ نے بڑی عمدگی سے کی ہے !

نظم " شبِ غم " بھی فعل فعولن فعل فعولن کے وزن پر ہے ۔ دل کی سلگتی ہوئی آگ کو شررؔ نے بڑے مؤثر پیرائے میں نمایاں کیا ہے ۔ فراق ، تیاگ اور انتظار کی اس کہانی میں درد و گداز اور تخیل کی کارفرمائی ہے ۔ زبان بھی رواں ، صاف شفاف اور خوبصورت ہے ۔

یہ عام مفروضہ ہے کہ اگر احساسات ، جذبات ، واردات ، تخیلات و افکار کی ہی پیش کش ہوتی رہے تو فن کی دنیا محدود ہو جائے گی اور اُکتاہٹ پیدا ہونے لگے گی ۔ معاملہ بندی ، واقعہ نگاری ، منظر کشی اور پیکر تراشی کی بھی اپنی تاثیرات ہوتی ہیں ۔ شررؔ نے شاعری کے اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دی ہے ۔ ان کی شاعری میں تخیل و معنویت کی جلوہ گری بڑی فنکارانہ سادگی کے ذریعے ہوئی ہے ۔ یہ سادہ ، سہل ، شستہ ، سلیس ، رواں اور نکھری ہوئی ہے ۔ ان کے ہاں نہ تو تعقلات ہے اور نہ سپاٹ سادگی ہی ملتی ہے ۔ بلکہ ان کے اسلوب میں کرشمہ ہوتی ، بیدار و پُر اثر سادگی ، سلیس و نفیس سادگی اور حسین و فصیح سادگی پائی جاتی ہے ۔ ان کا آرٹ نازک ، لطیف ، متین اور سکون بخش ہے مگر اس میں سوز و گداز کی دھیمی آنچ اور میٹھے میٹھے درد کی نرم ٹیس بھی ہے ۔ ان کے اظہار کا لب و لہجہ مخلصانہ ، متوازن ، متعین اور معنویت سے لبریز ہے ۔ وہ سرشار جذبات اور پُر کیف واردات کی ترجمانی کے لیے طرزِ معاملات ، مصوری و بت گری ، نغمگی اور لب و لہجہ کی ایمائیت و اشاریت کو ساحرانہ طور پر بروئے کار لاتے ہیں ۔

شررؔ کی شاعری احساسات کی نزاکت ، جذبات کی لطافت و ندرت ، خیالات کی جدت و نفاست ، تازہ کار و فکر انگیز معنویت ، زبان کی فصاحت ، لب و لہجہ کی نرمی ، پیکر تراشی اور نفیس و نادر تنظیم و تہذیب ، تجربہ کی جہتوں سے نہایت صناعانہ کمال کو پہنچی ہے ۔

انہوں نے احساسات کے نئے پہلو ، مشاہدات کے نئے زاویے ، تخیلات کی نئی اڑان ، تصورات کے جدید صنم کدے ، افکار کی نئی سمتیں

غور کی اُن دیکھی گہرائیاں، نظر کی اچھوتی بلندیاں اور تخلیق کے البیلے امکانات پیش کئے ہیں۔

شررؔ کے یہاں زبان کی سلاست و نفاست، اس کے محاوروں اور کہاوتوں، اسلوب اور رعایتوں کی اہمیت مسلّم ہے۔
شررؔ نے روایتی سلسلوں کو دہرانے سے گریز کیا ہے اور اگر دہرایا بھی ہے تو انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ ان کی نظموں اور منظوم ڈراموں میں ویروز، امروز اور فردا کی دلداریاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں، ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ شررؔ کے زمانے میں شعری زبان کئی مراحل سے گزر کر اپنا ایک خاص مقام بنا چکی تھی۔ یہی زبان لکھنؤ اور دہلی میں مختلف تہذیبی اور لسانی ملحوظات کے ساتھ برتی اور سمجھی جاتی تھی۔

شررؔ کی زبان، فکر اور شخصیت کی تشکیل میں مختلف خارجی اور داخلی عوامل نے حصّہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اظہارِ فن منفرد ہے۔ انہوں نے نظموں میں ڈرامائیت اور مکالمہ کا انداز پیدا کیا ہے۔ یہ انداز جذبات کے اظہار کو اور خیالات کے ربط و تسلسل کو مؤثر اور مترنم بنا دیتا ہے۔ اپنی نظموں میں کہیں کہیں پر شررؔ نے فارسی کے تراکیب استعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آہنگ پر فارسی کے صوتیاتی اور ترکیبی آہنگ کا اثر ہے۔ فری ورس اور بلینک ورس کی زبان کا یہ رنگ دو طرح کے عناصر پر مشتمل ہے۔ ایک روایتی، جس میں غزل کی لفظیات اور تراکیب کی بہتات ہے۔ دوسرے بعض ایسے انفرادی عناصر جو بظاہر فارسی روایت کے زیرِ اثر ہیں مگر بباطن منفرد اور آزاد ہیں۔ بیشتر جگہوں پر شررؔ نے الفاظ صاف، واضح، روشن اور نکھرے ہوئے استعمال کیے ہیں۔ ان میں بول چال کی زبان کے عناصر ہیں اور فارسیت کا گہرا اثر بھی نہیں ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایک ایسا محدب شیشہ ہے جس میں آر پار جھانک کر معانی کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل جن لفظوں میں کسی بات کی ترسیل کی جاتی ہے ان میں الفاظ خود بخود صاف اور روشن ہو جاتے ہیں اور اپنے اندر ترسیلی خصوصیات پیدا کر لیتے ہیں۔ شررؔ کی نظموں میں ہر مصرع اپنی جگہ اتنی ہی بات کی ترسیل کر رہا ہے جو ان سے ظاہر ہے۔
غرض ہم دیکھتے ہیں کہ شررؔ کے فن کی بنیادی خصوصیت میں لکھنؤ اور دہلی دبستانوں کے محاسن نظر آتے ہیں!

محمود ہاشمی کی تنقیدی بصیرت

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

محمود ہاشمی نے گنتی کے چند تنقیدی مضامین لکھے ہیں، لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ ان کے بیشتر معاصرین کی ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں، ان مضامین سے محمود ہاشمی کے تنقیدی ذہن کی جودت، قوت اور انفرادیت کا پتہ چلتا ہے، وہ فکر و خیال کی روندی ہوئی راہوں پر چلنے کے حق میں نہیں وہ منزل رسی کے لیے اپنی راہیں خود تلاش کرتے ہیں اور ہجوم سے الگ پوری تمکنت اور اعتماد سے ان پر گامزن ہوتے ہیں، ان کے غیر معمولی اعتماد کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ راہروِ منزل یا اپنے ذوقِ سفر کے بارے میں کسی اندیشے، تذبذب یا خوف میں مبتلا نہیں، بلکہ ان کے تمام نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہیں، محمود ہاشمی غیر معمولی اعتماد کے ساتھ ساتھ فکر بالیدہ اور ذہن رسا سے بھی تخلیق پر حاوی ہوجاتے ہیں، اور اس کے اشاروں علامتوں اور استعاروں میں نازک اور گریزاں معانی کی دید و دریافت میں منہمک ہو جاتے ہیں، یہ کام وہ دیگر نقادوں کے خلاف بہت مستحکم طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محمود ہاشمی اپنے علم کو خبر نہیں، بلکہ نظر بناتے ہیں، وہ ہمارے عالمانِ تنقید کی طرح صرف اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ ایک اچھے نقاد کی طرح فن کے تجزیہ و تحلیل میں ڈوب جاتے ہیں، اس ضمن میں ان کے مقالے "ماضی کا پورا آدمی نظیر" کی مثال دی جاسکتی ہے، اس میں تنقید کے پامال اور فرسودہ نظریات کی شکست کرکے انفرادی نقطۂ نظر اور ٹھوس نتائجِ فکر کو پیش کیا گیا ہے۔

"میری اس تلاش کا ایک سبب اس تہذیب سے انحراف کی جستجو تھی، جو اردو شاعری کا مخصوص تناظر بنی رہی۔"

"ان کے نزدیک زندگی ایک حیاتیاتی حقیقت ہے، اس حقیقت کے اظہار میں وہ جسم اور روح کی تقسیم کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں"

"لیکن نظیر عوامی شاعر نہیں تھے — یعنی اس معنی میں عوامی شاعر نہیں تھے، جیسا کہ اردو کے ناقدوں، مورخوں اور احتشام حسین نے انہیں عوامی شاعر کہا ہے۔"

محمود ہاشمی جدید شعرا کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے تخلیقی شعور کی روشنی میں ان کی عصری حسیت کی نشاندہی کرتے ہیں، انہوں نے باقی اور محمد علوی کے مطالعات کے ضمن میں لکھا ہے۔

"باقی وہ پہلا مکمل جدید تر غزل گو ہے، جس نے روحِ عصر کو اس عہد کی داخلی اور خارجی کائنات اور فنکار کی ذات کے تصادم کو اپنے فن

کو بنیاد بنایا ہے ۔[1]

" علوی اپنی شاعری میں عصری احساس کا مکمل نمائندہ اور مکمل اظہار ہے ۔"[2]

لیکن وہ ان شعرا کے "عصری احساس" کی شناخت کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس مابعد الطبیعاتی امکان کی تلاش بھی کرتے ہیں، جو عصری احساس کے شخصیت سے متل ارتباط کے نتیجے میں علامتی معنویت پر حاوی ہونے کے میلان کو ظاہر کرتا ہے ۔ یہ جدید تنقیدی رویہ ہے، جس کی وہ بھرپور نمائندگی کرتے ہیں ۔

محمود ہاشمی نے شاعری کے ساتھ ساتھ فنِ افسانہ نیز بعض افسانہ نگاروں کے تنقیدی مطالعے بھی پیش کیے ہیں، ستمبر ۱۹۶۳ء میں ان کا مقالہ "تخلیقی افسانہ کا فن" تلاش میں شائع ہوا اس میں انہوں نے پریم چند سے لے کر لراج مینرا تک اہم افسانہ نگاروں کے فنی اور تخلیقی رویوں کا ایک معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس میں افسانوی ادب کی تخلیقی حیثیت کو پہلی بار متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ محمود ہاشمی ان افسانوں کو جو مقصدیت، خطابیت، حقیقت نگاری اور اکہری معنویت کے حامل ہیں، تخلیقی افسانہ کے دائرے سے خارج کرتے ہیں ۔

محمود ہاشمی بلاشبہ ایک خالص ادبی نقاد کے طور پر اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، وہ فن کے رازِ سربستہ کی نقاب کشائی کے لیے دیگر ضمنی اور اطلاقی وسائل یا شعبہ ہائے فکر یعنی نفسیات یا عمرانیات سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ فنی اصولوں سے لیس ہوکر اپنی غیر معمولی توانائی کا احساس دلاتے ہیں، وہ فنکار کے بجائے فن سے قریبی ذہنی رشتہ قائم کرتے ہیں، اور پھر فنکار کے تخلیقی وجود کی اصلیت، کارکردگی، اس کے رجحانات اور امکانات کی بازیافت کرتے ہیں، محمود ہاشمی شاعری کے مقصود بالذات، حرکی اور کثیر الجہت وجود پر نظر رکھتے ہیں، انہوں نے مارکسی تنقید کے غیر ادبی اور بے نتیجہ طریقۂ کار کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے ۔ وہ تخلیق میں عصری یا تاریخی حالات و واقعات کی عکاسی کو ایک غیر فنی عمل قرار دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک تخلیق کار اجنبی اور حیرت انگیز وقوعات کی تخلیق کرتا ہے، جو زندگی اور کائنات کے ادراک کی سرحدوں کو وسیع تر کرتے ہیں، یہ کام وہ زبان کو لغوی اور روزمرّہ کی سکہ بند اور قطعی معانی کی حد بندیوں سے نجات دلاکر اسے مابعد الطبیعاتی وسعت عطا کر کے انجام دیتے ہیں، شعری زبان کا یہ تصوّر فاروقی کے علاوہ محمود ہاشمی نے دیا ہے ۔ محمود ہاشمی نے اپنے ایک مضمون "جدید شعری تلازمہ اور تنقید" میں گفتگو کے الفاظ اور تخلیق کے الفاظ کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے :

" شاعری بھی ظاہری شکل میں الفاظ کی ترتیب ہے، وہی الفاظ جو ہماری گفتگو کا وسیلہ ہیں، شعری ترتیب یا شعر کے ڈیزائن میں منتقل ہونے کے بعد ایک قسم کا تخلیقی سحر یا واہمہ تعمیر کرتے ہیں، اس سحر یا واہمہ کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں کئی قسم کے فنی عناصر سے مدد لینی پڑتی ہے ۔"[3]

شاعر اپنے عمیق اور پیچیدہ تجربات کے اظہار کے لیے زبان کے علامتی نظام کی تشکیل کرتا ہے، محمود ہاشمی کا مقالہ "غالب کی شاعری کا علامتی پہلو" اس ضمن میں قابلِ مطالعہ ہے، اس میں انہوں نے غالب کے "تخلیقی ذہن اور علامتی طرزِ فکر" کی تفہیم کے لیے تنقید کے مروجہ اسالیب سے صرفِ نظر

۱۔ غبارِ خاطر جلد ص ۱۱۱

۲۔ محمد علوی (ایک مطالعہ) ص ۵۷

۳۔ شب خون ۸۴ ص ۲

کرکے انفرادی انداز میں غالب کے علامتی شعور کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی بنیادی علامتوں میں سے دو علامتوں یعنی سفر اور وحشت کی وساطت سے ان کے ذہنی اور فکری رویّوں کو منوّر کرنے کی سعی کی ہے:

"اس غزل پر پہنچ کر غالب نے وہ علامتیں تخلیق کی ہیں، جن میں تعینات اور آگہی کی منزلوں سے گزر کر خواب کی آخری سرحدوں کو ـــ بصارت اور تارِ نظر کی حدود سے نکل کر لا محدود کی حقیقت کو دریافت کرنے کا مفہوم پوشیدہ ہے"۔[1]

بعض کلیدی علامتوں کے مطالعے کی وساطت سے شاعر کے تخلیقی شعور کی کارکردگی، تفہیم و تحسین کا عمل جو محمود ہاشمی نے "غالب کی شاعری کا علامتی پہلو" میں روا رکھا ہے، غالب شناسی کے ایک نئے باب کو وا کرتا ہے۔ بعینہٖ میر کے کلام کی اسراریت کی دریابی کے لیے گہری بصیرت سے کام لیا گیا ہے۔ میر پر اپنے مقالے میں میر شناسی کے لیے دل کے کلیدی اور مرکزی پیکر کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور دل کو "اسمِ اعظم" کہا گیا ہے:

"میر کی شاعری میں دل کا لفظ ایک لاشعوری علامت کی حیثیت سے موجود ہے"۔[2]

اور اس کی توضیح یوں کرتے ہیں۔

"دل کے لفظ سے میر یقیناً کوئی ایسا مفہوم اخذ کرتے ہیں، جسے ہم ان کی شعوری اور لاشعوری محرکات کی بنیاد کہہ سکتے ہیں ـــ یا دوسرے لفظوں میں میر کے نزدیک دل ایک وجدانی قوت ہے ـــ میر کی جمالیات کا محور و مرکز ہے"۔[3]

محمود ہاشمی دقتِ نظر سے کام لے کر فن کے اندر مضمر رموز تک رسائی حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ تخلیق کے یا تخلیق کار کی اس سحر آلود اور بسیار شیوہ تخلیقی کائنات کو اپنی مکمل گرفت میں نہیں لیتے۔ اس لیے ان کے مطالعے ندرت کے باوجود ایک طرح کی محدودیت کا احساس دلاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی تراشی ہوئی راہوں پر گامزن ہونے کا باوجود منزل رسی کا اہتمام نہیں کرتے، بلکہ منزل کے قرب و جوار میں اپنے سفر کو تمام کرتے ہیں۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بعض دریافت کردہ شعری حقائق کو شاعر کی کلی تخیلی کائنات سے مربوط نہیں کر پاتے۔ میر کی شاعری کی علامتوں کی تہہ دار معنویت کو اجاگر کرنے کا بعد یہ کہنا "میر کی شاعری میں اگرچہ علامت سازی نہیں ہے، استعارے کا عمل بھی کم کم ہے لیکن دل کے لفظ کو اپنی شاعری کا اسمِ اعظم بناتے ہوئے اُنہوں نے علامت کے اوّلیں احضارات کی تخلیق کی ہے"، ایک متناقض صورت حال کو جنم دیتا ہے۔

---

1. شب خون شمارہ ۴۸ ص۲
2. آج کل مارچ ۱۹۸۴ء ص۴۳
3. ایضاً۔ ص۱۷

کاشف الحقائق[1]

ادیب سہیل

سوال یہ ہے کہ اُردو ادب میں کوئی فردوسی، کوئی ہومر، کوئی ویاس، کوئی والمیکی، کوئی کالیداس اور کوئی شیکسپیئر کیوں پیدا نہیں ہو سکا؟ یہ کہنے سے مراد یہ ہے کہ اُردو میں کوئی عظیم ڈرامہ یا کوئی رزمیہ کیوں نہیں لکھا گیا؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بڑے عرصے تک ہم نے ثقافتی طور پر صرف ایرانی ثقافت اور زبان سے (فارسی) خود کو جوڑے رکھا یا جُڑے رہے، فارسی سرکاری یا اشرافیہ کی زبان تھی، مراعات یافتہ طبقے میں شمار کیے جانے اور مقبولِ بارگاہ ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ہم اُس زبان اور کلچر سے قریب تر ہوں جو بادشاہِ وقت کی زبان ہے۔ اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں اور خود کو انہیں کی صف میں شمار کرائیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ میر تقی میر کے دور تک فارسی شعر و شاعری کا پلّہ بھاری تھا۔ فارسی میں شعر کہنا بلکہ فارسی میں سوچنا فخر و مباہات میں شامل ہوتا تھا۔ امیر خسرو سے میر تک جو زبان بازاروں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی جوان ہو گئی تھی، گنوار کی بیٹی سمجھ کر کوئی اُدھر نگاہ تک اُٹھا کے نہیں دیکھتا تھا۔ میر و سودا نے اس کو بازار سے اٹھا کر اپنے گھر کی زینت بنایا پھر دیکھا دیکھی سب اس کا دم بھرنے لگے، اس کی پرستاری اور اس کے گیسوؤں کی آرائش شروع کر دی، اس کے باوجود میر سے غالب تک فارسی کا اقتدار اور چار دَرچھپلا قائم رہا اس کا ثبوت خود غالب ہیں کہ انہوں نے جب اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو فارسی سے کیا اور عمر بھر اُن کے فخر کا سبب فارسی شاعری ہی رہی یہ اور بات ہے کہ اُن کو حقیقی شہرت اُردو شاعری کے وسیلے سے ملی۔

غالب کے بعد کے شعراء کا محبوب بھی اپنے حُلیے بُشرے سے ایرانی لگتا تھا۔ غزل سے لے کر مراثی تک، ہم برِصغیر میں رہتے ہوئے بھی ذہنی اعتبار سے فارسی کلچر میں سانس لیتے تھے۔ جس زمین سے ہمارا ناتا تھا، سالہا سال سے جہاں ہم رہتے بستے آئے تھے، اُس پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اس سرزمین میں جہاں ہم سالہا سال سے رہتے آ رہے ہیں اُس کی بھی اپنی زبانیں ہیں۔ اُس کا بھی ادبی سرمایہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ادبی سطح پر معلّق ہو گئے۔ فارسی میں ہمارا کوئی مقام اس لیے نہیں بن سکا تھا کہ فارسی کا وطن ایران تھا، ایرانی شعرا کی "شیونزم" اتنی قوی تھی، ان کے سُپر کلچر کے احساسات و مباہات اتنے مطلق العنان تھے کہ اپنے مقابلے میں کسی غیر فارسی کی فارسی دانی کو درخورِ اعتنا سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔

برِصغیر کے ہندی نژاد فارسی شعرا اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوصف فردوسی کے رزمیے "شاہنامہ" جیسی کوئی چیز اس لیے تخلیق نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی فارسی بے زمین تھی، اور ایسی بڑی تخلیق کے لیے زمین اور اس کی ثقافت سے دیرینہ رشتہ ازبس ضروری ہے۔

[1] کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن

فارسی اور اردو میں ڈرامے اس لیے نہیں لکھے جا سکتے تھے کہ ڈرامہ عرب اور ایرانی کلچر کا حصّہ نہیں، ان زبانوں میں دُور دُور تک ڈرامے کا سُراغ نہیں ملتا اور اُردو ثقافتی لحاظ سے ایرانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ منسلک تھی۔ اُردو کا چونکہ ایک بڑے عرصے تک براہِ راست مأخذ فارسی رہا لہٰذا ان کی تقلید میں اُنیسویں صدی کے نصف تک اُردو میں ڈرامہ نگاری کا خانہ خالی ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ جب تک انگریز برِصغیر میں آ نہ گئے، اُردو میں ڈرامے کے لکھنے کا آغاز نہ ہوا یعنی ہمارے یہاں اُردو ڈرامہ انگریز اور انگریزی کے اثر سے آیا حالانکہ جس سرزمین پر ہم بود و باش اختیار کر چکے تھے وہاں شکنتلا جیسے ڈرامے صدیوں پہلے لکھے جا چکے تھے، جس کا شمار آج بھی دُنیا کے تین بڑے ڈراموں میں ہوتا ہے، (باقی دو شیکسپیئر کا ہملٹ اور گوئٹے کا فاؤسٹ ہے)۔ اگر آپ سنسکرت و ہندی ادب میں لکھے گئے ڈراموں کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ برِصغیر میں اسٹیج کا رواج بھرت بلکہ اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ البتہ بھرت کے زمانے سے ناٹک کا ذکر ایک تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ مشہور ناٹکوں اور اُن کے مصنفوں کا ایک سلسلہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کالیداس کے شکنتلا کے بعد دن نگا آچاریہ کا ناٹک کُند مالا۔ شودرک کا مرچھ کٹکم، وشاکھ دت کا مدرا راکشش، راجہ ہرش وردھن کے ناٹک پریا درشکا، ناگا نندم، رتناولی۔ بھبھوتی کا مالتی مادھو، مہاویر کا رتا، اتر رام چرتر۔ مراری کا راما انرگھ راگھو، یشو ورمن کا راما بھودے۔ بھٹ نارائن کا وینی سنگھار۔ راج شیکھر کا بال راماین، گرپو منجری، پراکرت وغیرہ ناٹک لکھے گئے۔ یہ تو سنسکرت ناٹک نگار کے چند بڑے نام ہیں۔ سنسکرت کے دستیاب شدہ پُرانے ناٹکوں کی تعداد اس وقت پانچ سو سے زیادہ ہے۔

کاشف الحقائق کے مصنف سید امداد امام اثر نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے، کہ اُردو ادیب و شعراء سنسکرت سے مَس رکھتے اور اسے بھی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے تو اُردو ادب کا دامن ایک اور نئی صنفِ ادب یعنی ناٹک سے مالا مال ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ شروع سے ہمارا میل جول فارسی کی طرح کسی بھی مقامی زبان سے نہ ہو سکا۔ ورنہ اُن زبانوں سے غزل کی طرح دوسری اصنافِ ادب کا تجربہ بھی ہمارے ادب میں عام ہوتا ـــــ سنسکرت سے استفادہ کی انفرادی مثال ضرور ملتی ہے۔

اسی زبان میں راماین اور مہابھارت جیسے رزمیے والمیکی اور ویاس نے لکھے جو اَب بھی رزمیے کے باب میں بے مثل تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر اُردو روزِ اوّل سے اپنا رابطہ سنسکرت اور دوسری ہمسایہ زبانوں سے رکھتی، اور زمین سے رشتے کی اہمیت کو سمجھتی اور یہاں کے بڑے ادب کو بھی ماخذ کے طور پر استعمال کرتی تو عین ممکن کہ اُردو میں بھی ناٹک کا چلن عام ہوتا اور کوئی بڑا ناٹک اور کوئی بڑا رزمیہ اب سے بہت پہلے وجود میں آ چکا ہوتا۔

رزمیہ اور ناٹک تو کُجا ہم نے اُردو ادب کو ہندی گیتوں کے سائے سے بھی دُور رکھا۔ اس کے پیچھے وہی خود عائد کردہ تہذیبی تعصبات اور وہی فارسی (ایرانی) اثرات تھے جنہوں نے ہمیں گھونگھٹ اُٹھا کر اس کامنی، من موہنی چھب کو دیکھنے اور اس کو دل میں اتارنے سے باز رکھا۔ فارسی ثقافت کے حوالے سے ہمارا محبوب تو ایسا مرد تھا جس کے ابھی خط بھی نہیں بھیگے تھے وہ تو اللہ بھلا کرے حسرت موہانی کا کہ بعد کے زمانے میں اُردو والوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کیا کہ غزل کا محبوب خیالی نہیں گوشت پوست بھی رکھتا ہے اور وہ محبوب صنفِ نازک کا نمائندہ ہے۔ دراصل فارسی زبان و ثقافت نے ہماری ساری چالیں اُلٹی کر دی تھیں، گیت میں عورت اپنے مرد یا عاشق کے ہجر و فراق کا دُکھ بیان کرتی تھی بہ الفاظِ دیگر اس کا مخاطب مرد ہوتا تھا اور غزل میں مرد کا مخاطب ایک کم سن مرد ہوتا تھا، غور کیجیے بڑے عرصے تک ہماری غزل کو کتنی غیر فطری صورتِ حال میں اپنا سفر طے کرنا پڑا۔ ہم نے اپنے شعروں میں

ہجر و فراق کے الفاظ تو استعمال کیے لیکن وہ آگ اُس میں نہ بھر سکے جو گیت کے برہ گن کا خاصہ ہے۔ گیت کا مزاج، جذبے، ماحول، مناظر موضوعات سب اس کے اپنے تھے لیکن غزل اپنے ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے ماحول میں نہیں تھی، وہ فضا اور موضوعات کے اعتبار سے شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ایران و توران اور وادیٔ ایمن، عرب و عجم، سرو و سمن، سنبل و ریحان ہی کے آس پاس رہی اور عام شعراء کے خیالات اسی فضا میں پروان چڑھتے رہے۔

ان خامیوں سے قطع نظر یہ درست ہے کہ اُردو میں غزل نے بڑی ترقی کی اور میرؔ و غالبؔ جیسے عظیم شاعر پیدا کیے۔ لیکن چونکہ غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے فرد فرد ہے، اس کا ہر شعر ایک گُنبے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس میں کوئی ایک خیال اور کسی ایک پل کو تو آسانی سے باندھا جا سکتا ہے لیکن ایک یا کئی صدیوں کو بیان نہیں کیا جا سکتا، اُردو میں اگرچہ عشقیہ داستانیں اور قصیدے تحریر کیے گئے لیکن ان کے موضوعات بھی زیادہ تر مستعار رہے۔ لیلیٰ مجنوں یا شیریں فرہاد یا الف لیلیٰ کے قصّے کہانیوں سے ملتے جلتے واقعات کو قلم بند کرنے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہاں بھی فضا اور احوال کے اعتبار سے ان منظوم و منثور تحریروں کا رشتہ فارسی یا الف لیلوی تہذیب سے قائم رہا۔ مختصر یہ کہ اہلِ قلم حضرات لکھتے رہے برِصغیر میں بیٹھ کر اور سوچتے رہے فارسی ذہن سے۔

اس کے برعکس اگر ہم برِصغیر پاک و ہند کی دوسری چھوٹی چھوٹی ہمسایہ زبانوں کا جائزہ لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اپنی پس ماندگی اور کم وسعتی کے باوجود ہیر وارث شاہ جیسی بڑی تصنیف معرضِ وجود میں آگئی۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی دوسری بہت سی زبانوں میں ایسی مثالیں آسانی سے اور بھی ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔

یہاں پھر وہی سوال دہرانا پڑتا ہے کہ آخر اُردو میں ایسی بڑی تخلیقات کیوں معرضِ وجود میں نہیں آئیں؟ تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ اس کے طرف داروں نے ابتدا میں ادب کے سب سے بڑے ماخذ تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہونے دی، درمیان میں لسانی، نظری اور تہذیبی تعصبات کو داخل کر دیا۔ دوسرا جواب میری ناقص رائے میں یہ ہے کہ جس زبان کا اپنی زمین سے رشتہ کمزور اور اوپری ہو اُس میں کوئی بڑی تخلیق نہیں ہو پاتی، بڑی تخلیق کے لیے کسی زبان کی اپنی تہذیب و کلچر سے صرف آگاہی کافی نہیں، اس کا رشتہ بھی ماں بیٹے کے بنیادی احساس و جذبے پر قائم ہونا چاہیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اُردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" کی شکل میں بڑا کام کیا بھی تو اُس کے اظہار کا ذریعہ بجائے اُردو کے فارسی زبان رہی۔ علامہ اقبال نے اُردو کو چھوڑ کر فارسی میں اس کتاب کو لکھنے کا فیصلہ شاید اس لیے کیا ہو کہ ایک تو وہ دونوں زبانوں فارسی اور اُردو پر یکساں دسترس رکھتے تھے، دوم یہ کہ اس بڑے کام کے لیے فارسی اُنہیں آسان اس وجہ سے محسوس ہوئی ہوگی کہ فارسی میں ایسے کاموں کی روایت نہ صرف ایک تسلسل کے ساتھ موجود ہے بلکہ قوی تر ہے۔

فارسی سے رغبت اور اُس کی خوشہ چینی پر تفاخر اور اُردو سے بے رُخی کا رویّہ جس کا ذکر اُوپر کے صفحات میں تفصیل سے کیا گیا ہے اُس کو آج سے ایک صدی پہلے امداد امام اثرؔ نے بھی شدّت سے محسوس کیا۔ شاید اسی وجہ سے امداد امام اثرؔ نے "کاشف الحقائق" (مطبوعہ ۱۸۹۷ء) میں ایک جگہ بڑے دُکھ کے ساتھ یہ تحریر کیا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔ یہ دونوں کتابیں (ایلیڈ اور اوڈیسی) انگریزی میں ترجمہ ہو گئی ہیں اور طرفہ یہ کہ ایلیڈ کو علم پروانِ بنگالہ نے بھی اپنی زبان میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ کہاں ہو اے اُردو کے خیر خواہو، کیا اُردو لٹریچر ایسا ہی تا قیامت رہے گا۔ اپنی جراری قوم

کو دیکھو ستر اسّی برس کے اندر اس نے اپنے لٹریچر کو ایک مختصر حالت سے مؤثر درجے تک پہنچا دیا ہے۔ اس وقت کی کس قسم کی شاعری ہے جو بنگلہ زبان میں نہیں ہے۔ افسوس ہم پر کہ جہاں تھے اب تک وہیں ہیں ——"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اثرؔ اردو والوں کو اُردو کے کم مایہ ہونے کا احساس دلا رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس لب و لہجہ میں (جسے آپ خالص تنقیدی لب و لہجہ بھی کہہ سکتے ہیں) اور اس دردمندی سے، اس سے پہلے کسی نے اُردو ادیبوں کو صدا نہیں دی تھی۔ اُنھوں نے جس ناقدانہ بصیرت کا اظہار اب سے سو سال پہلے کیا ہے، آج بھی اس بصیرت، اس دردمندی اور اس تیور سے کم ہی لوگوں نے ادب کے کسی خاص معاملے، تسامح یا کسی گم شدہ کڑی کی طرف نشاندہی کی ہے۔

"کاشف الحقائق" کے سینکڑوں صفحات پر مختلف النوع موضوعات دُنیا بھر کے مشاہیرِ ادب، اُن کے فن، اور اُن کی فنی خصوصیات کا مکمل سیاق و سباق کے ساتھ مصنف نے احاطہ کیا ہے۔ ایک طرف ہومرؔ، اسکائی لسؔ، سفاکلیزؔ، ارسطوفینزؔ، یوری پائیڈیزؔ، ورجلؔ، کیٹس ؔوغیرہ ہیں تو دوسری طرف، حافظؔ، رومیؔ، جامیؔ، نغانیؔ، صائبؔ، غالبؔ وغیرہ ہیں۔ افراد کے ذکر سے قطعہ نظر اس کتاب میں عربی، یونانی، انگریزی، لاطینی، فارسی اور سنسکرت ادب پر تفصیل سے گفتگو ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ ساری کی ساری "کاشف الحقائق" کارآمد تنقیدی محاکموں، محاسبوں، اور بحثوں سے بھری پڑی ہے۔ مصنف نے موسیقی پر قلم اُٹھایا ہے تو ایک موسیقی دان کی طرح اس کی تفصیل میں گئے ہیں، غنا اور موسیقی کے فرق پر ایسا نازک نکتہ پیش کیا ہے کہ باور کرتے ہی بنتی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ موسیقی اور غنا کے اس فرق کو محسوس کرنا میں نے اسی مضمون سے سیکھا ہے۔ مصوری پر گفتگو کی ہے تو اس اعتماد کے ساتھ کہ جیسے اس فن کا کوئی واقف کار بول رہا ہو، شاعری و ادب تو خیر ان کا اپنا میدان تھا، اس پر بات کرنے پر آئے ہیں تو عالمی شہرت کے دُنیا بھر کے ادب اور ادیب و شاعر اُن کے دائرۂ تنقید میں داخل ہو گئے ہیں۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ امداد امام اثر کی کتاب "کاشف الحقائق" ادبی محاکموں، محاسبوں اور چونکا دینے والے تنقیدی ٹکڑوں سے بھری پڑی ہے۔ آیئے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھتے چلیے۔ لیکن ٹھہریئے اس سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ انہیں بصیرت افروز اور زمانہ شناس ٹکڑوں میں سے اس ایک نے مجھے یہ مضمون لکھنے پر اُکسایا اور نہ صرف اُکسایا بلکہ ذہن میں سوالات کے کتنے روزن کھول دیئے۔ اور میں اِس قابل ہوں کہ کچھ لکھ سکوں۔

"......لاریب اگر اُردو کے شعراء سنسکرت کا تتبّع اختیار کرتے تو اُردو کی شاعری کا دائرہ وسیع ہو جاتا، ایسی حالت میں اُردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی مگر اس عدم تتبّع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُردو کے شعراء زبانِ سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی ہی میں مہارت رکھتے تھے۔ شعرائے فارسی کے سوا انہیں اور کسی دوسری زبان کے شعراء سے تتبّع کا موقع حاصل نہ تھا۔ کاش شعرائے اُردو شعرائے سنسکرت سے مطلع رہ کر ان کے متتبّع ہوتے تو اُردو میں اصنافِ شاعری کا حدود بڑھ جاتا۔ مثلاً ڈرامہ نگاری اُردو میں داخل ہو جاتی اور اس جدّت (سے) اُردو شاعری کا وزن یقینی بڑھ جاتا اور اہلِ یورپ کے نزدیک ترقّی کر جاتا اور اس ترقّی سے زبانِ اُردو کا شمار اعلیٰ درجے کی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا۔ ڈرامہ نگاری کے داخل ہو جانے سے بلاشبہ اُردو شاعری ممتاز تر ہو جاتی، ڈرامہ نگاری کے علاوہ سنسکرت میں ایک بہت اعلیٰ درجے کی رزمی شاعری دیکھی جاتی ....."

(کاشف الحقائق حصہ دوم صفحہ ۱۲، ۱۳)

سید امداد امام اثر کی کتاب "کاشف الحقائق" کی معاصر صرف ایک کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" ہو سکتی ہے۔ کاشف الحقائق ۱۸۹۰ء میں چھپی اور "مقدمہ شعر و شاعری" ۹۳-۱۸۹۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ دونوں کتابوں کی اشاعت کے درمیان تین چار برسوں کی تقدیم و تاخیر بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ طباعت کی جو سہولت دلّی میں میسّر تھی وہ (بنگالہ) میں تقریباً نہیں کے برابر تھی۔ چونکہ کاشف الحقائق دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کا لکھا جانا بہت پہلے شروع ہو چکا ہو اور کچھ حصّے کہیں کہیں شائع بھی ہوئے ہوں۔ اس بات کا ثبوت معروف نقّاد شمس الرحمٰن فاروقی کی اس عبارت سے بھی ملتا ہے۔

"مقدمہ شعر و شاعری" سے دس بارہ سال پہلے امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں لکھا ہے کہ غزل کو استعارے سے کوئی علاقہ نہیں اور غزل میں پیچیدگی نہ ہونی چاہیئے بلکہ بات جتنے سیدھے سادے ڈھنگ سے کہی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

("اردو غزل کی روایت اور فراق" مطبوعہ شب خون شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء)

"کاشف الحقائق" کے زمانی تفوّق کو امداد امام اثر کے اس بیان میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس کتاب کی پہلی جلد میں مصوّری کے باب میں لکھا ہے۔

"بتیس برس کا عرصہ ہوا ہوگا کہ فقیر ہمرکاب صاحب والا ماجد اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کے کلکتہ گیا ہوا تھا۔ اس وقت راقم بھاگلپور کے سرکاری اسکول میں کسی نیچے درجے میں پڑھتا تھا۔ مگر میلانِ طبعی سے کسی قدر تصویر شناسی کی صلاحیت رکھتا تھا......"

(کاشف الحقائق پہلی جلد ص ۶۹۔ (دوبارہ اشاعت) مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی)

اگر امداد امام اثر کے اسکول میں پڑھنے کی عمر آٹھ نو برس مان لی جائے اور ان کی پیدائش کے سنہ ۱۸۴۹ء سے ان برسوں کو ملا دیا جائے تو یہ ۱۸۵۷ء یا ۱۸۵۸ء بنتا ہے، پھر اس میں ۳۲ برس کا مزید اضافہ کر دیا جائے تو ۱۸۸۹ء یا ۱۸۹۰ء قرار پاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ کاشف الحقائق کے مصنف نے ۱۸۸۹ء سے بہت پہلے محولہ باتیں قلم بند کی ہوں گی۔

اختر قادری صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس "آثار اثر" میں (جو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکا ہے) ۱۸۸۱ء کو امداد امام اثر کے شمس العلماء کے خطاب سے نوازے جانے کا سال بتایا ہے۔ "گولڈن بک آف انڈیا" کے مطابق انہیں پہلے پہل ۲۸ برس کی عمر میں شمس العلماء کے خطاب کا سزاوار ٹھہرایا گیا تھا۔ اس وقت اثر صاحب نے بہ وجوہ اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ ۱۸۷۷ء کا ہوگا۔ ظاہر ہے کسی ادیب کو شمس العلماء کا خطاب کسی بڑی اور اہم علمی خدمات اور تصنیف و تالیف کے صلے ہی میں تفویض ہوتا تھا۔

بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس پر تفصیل سے بات کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس موضوع کو نئے ذہن کے لیے چھوڑتا ہوں کہ اس پر فکر کریں اور اس بات کا سراغ لگائیں کہ اہل الرائے اور محققین میں وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ہمیں ایک عرصے تک کاشف الحقائق کی ہوا تک نہ لگنے دی، اس تازہ ہوا کو ہم تک پہنچنے سے روک رکھا اور اتنی اہم کتاب کو مورد تحقیق و تنقید نہیں گردانا جسے آپ عملی تنقید کی اساس کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے برعکس اس سے کمتر تصانیف کے سلسلے میں ڈھول پیٹے جاتے رہے۔ ادبی سطح پر اس کا محاسبہ ہونا چاہیئے بے محاسبے کا معاشرہ اور بے محاسبے کا ادب مستقبل کے لیے سود مند ہونے کے بجائے گمراہی پھیلانے کا موجب ہوتا ہے اور آنے والی

نسل کو اندھیرے میں رکھنے کا جرم کرتا ہے۔ اس موقع پر غلام سرور صاحب کی یہ باتیں یاد آرہی ہیں جو انہوں نے کاشف الحقائق کے سلسلے میں اپنی کتاب "پرکھ" میں تحریر کی ہیں۔ اس وقت من وعن تو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے لیکن وہ باتیں کچھ اس طرح ہیں۔

"تعجب ہے گیا میں بیٹھے بیٹھے شمس العلماء امداد امام اثر نے ساری دُنیا کی زبانوں کے ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، اسکالر اور دیگر مشاہیر کو نظر میں رکھا اور اپنی کتاب "کاشف الحقائق" میں ان پر بحث کی اور ایک رام بابو سکسینہ ہیں کہ اُن کو اپنے ہی ملک کے ایک شہر میں بیٹھے امداد امام اثر نظر نہ آسکے"

یہ ایک رام بابو سکسینہ کا رویّہ نہیں، اُن سے پہلے اور بعد کے بہت سے سکسینہ حضرات نے اسی رویّے کو اپنایا۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر امداد امام اثر گمنام ہوتے تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ ایک تذکرہ نگار کے لیے غیر معروف گوشے یا فرد تک پہنچنا مشکل ہے بلکہ بعض صورتِ حال میں ضروری بھی نہیں، لیکن اثر صاحب کے سلسلے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ تصنیفی، تالیفی اور تخلیقی کاموں کے صلے میں انہیں اعتراف کے طور پر شمس العلماء کے خطاب سے نوازا جا چکا تھا۔ ان کی تصنیفات کی شہرت برِصغیر سے نکل کر یورپ اور دیگر ممالک تک جا چکی تھی۔ اُن کی تصنیف "مراۃ الحکما" سوئیڈش زبان میں ترجمہ ہو کر وہاں کے نصاب میں داخل ہو چکی تھی۔ اس بارے میں ہمیں کھلے دل سے تسلیم کرلینا چاہیئے کہ اس رویّے (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کے پیچھے بالقصد چشم پوشی، سرد مہری اور نظر انداز کر دینے کا شاخسانہ کارفرما تھا۔
شمس العلماء امداد امام اثر طبعاً بہت سیدھے سادے آدمی تھے، ایک حد تک گوشہ نشین بھی تھے۔ اس بارے میں صحیح اندازہ وہ لگا سکیں گے جنہوں نے نقوش کے شخصیات نمبر میں جناب حسن امام وارثی کا مضمون موصوف کی شخصیت پر پڑھا ہے۔

وہ مولانا حالی کی دلّی جسے برِصغیر میں سیاسی مرکزیت حاصل تھی اس سے دُور، بہت دُور گیا کے مضافاتی بستی آبگلہ میں باغبانی کے رمز سے علمی اور عملی طور پر آشنا ہوتے تھے، اس پر کتابیں لکھتے تھے یا دُنیا بھر کے ادب کے مطالعہ میں معروف رہتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے کام میں شب و روز لگے رہنا اُن کا شوقِ بے پناہ تھا ورنہ وہ دلّی کے سیاسی ماحول میں بود و باش کرتے تو سنسکرت سے اُردو کا خلا ملا نہ ہونے پر صرف یہ کہہ کر نہ رہ جاتے — "لاریب اگر اُردو کے شعراء، شعرائے سنسکرت کا تتبّع اختیار کرتے تو اُردو کا دائرہ وسیع ہوجاتا ایسی حالت میں اُردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی، مگر اس عدم تتبّع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُردو شعراء زبانِ سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ ...." بلکہ وہ سیاسی سطح پر اُردو کے دوسری مقامی زبانوں کے ساتھ خلا ملا نہ ہونے کے اسباب تلاش کرتے، اس وقت کے معاشرے اور معاشرتی صورتِ حال کا ماضی میں دُور تک جائزہ لیتے، پھر یقینی کچھ بہت قیمتی باتیں سامنے آجاتیں، لیکن آج سے سو سال پہلے اُردو کے فروغ کے سلسلے میں اس طرح کا احساس رکھنا اور احساس دلانا بھی کم غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بلاشبہ اُردو ادب میں اس نہج سے اتنا وافر تنقیدی مواد کسی اور ہم عصر کتاب میں نہیں ملتا ہے۔ شمس العلماء امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" کا اُس کے مقابلے میں کروہ کا منظر پیش کرتی ہے۔ اثر صاحب کے یہاں عالمی ادب پر بحث کا یہ انداز اور یہ تنقیدی رویّہ اُن کی انگریزی دانی، انگریزی ادب کے گہرے مطالعے، اور اس کے توسط سے دیگر یورپی ادب تک رسائی کی دین ہے۔

اس سارے مباحث سے جو چند نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مُغل دور سے پہلے اور تمام تر مُغل دور میں (فرخ سیر ۱۷۲۴ء کے زمانے تک شدّ و مدّ کے ساتھ اور اس کے بعد کے ادوار میں کم تر) جس طرح ہماری وجہ سے اُردو مُعلّق اور مغائرت کی فضا میں رہی اور ہم اپنی گوناگوں مصالح کی بنا پر صاحبِ اقتدار زبان (فارسی) پر جانیں چھڑکتے رہے۔ ہمارے اس رویّے کے نتیجے میں اُردو کی

مظلومیت اور محرومیت میں اضافہ ہی ہو سکتا تھا ۔
اس اندازِ نظر نے پوری دلّی کو قلعہ معلّیٰ جانا اور قلعہ معلّیٰ کی برسرِ اقتدار زبان کو پورے ہندوستان کی زبان باور کرانے کے درپے رہے ۔ اب یہ کہانی دُہرانے کی ضرورت نہیں ۔ اگر اُردو کا اگلا سفر ایک عالمی زبان اور سب کی زبان بننے کی طرف ہے تو اسے چاہیئے کہ ہمسایہ زبانوں سے شیر و شکر کی طرح کا رابطہ استوار کرنے کی سعی کرتی رہے ۔ اپنے اندر کے قلعہ معلّیٰ کا دیس نکالا کر دے ۔ اس کی جگہ زمینی رشتے کی اہمیت کو اس طرح بسائے کہ خود بھی پھیلے اور ہمسایہ زبانوں کے دامن کو بھی وسیع کرے ۔ زمین کی خوشبو اُس کے اپنے بدن سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو کہ اس کے بغیر کسی بڑی تخلیق کا معرضِ وجود میں آنا ممکن نہیں ۔

مَیں — معترفِ میر

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

مَیں میر تقی میر کی عظمت اور اُستادی کا معترف و معتقد اس وقت سے ہوں جب ایم اے اُردو کی تعلیم کے دوران کلامِ میر کے عظیم شارح اور مداح استادِ گرامی ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے وہ لکچر سُنتا تھا جو میر کے منفرد رنگِ تغزّل کا نقش دل پر بٹھا دیتے تھے اور استادِ محترم کی طرح طلبہ و طالبات بھی "سودائی" نہیں "میری" بننا پسند کرنے لگتے تھے۔ لیکچر کے دوران یوں محسوس ہوتا تھا کہ میر سید صاحب پر وارد ہو رہے ہیں اور اُن کی ڈوبی ہوئی گفتگو کے حوالے سے خود ہم سب کو اپنی گرفت میں لے رہے ہیں۔ رنگِ میر کی سحر انگیزی اور اُس کے سامنے اپنی مغلوبیت کو پہلے تو مَیں نے اپنے بے مثل استاد کی سحر گفتاری اور میر پسندی کا اعجاز سمجھا لیکن جب خود کلامِ میر کا مطالعہ کیا تو میر کا سحر دو چند ہو گیا اور اب مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں کہ میر اپنے رنگ کے یکتا اور بے مثل شاعر ہیں۔ اس لیے نہیں کہ قائم نے انہیں "شمعِ انجمنِ عشق بازاں" اور "فروغِ محفلِ سخن پردازاں" کہا یا لچھمی نرائن شفق نے انہیں "میرِ میدانِ سخنوری" تسلیم کیا یا میر حسن نے "شاعرِ دلپذیر" اور شیفتہ نے "اشعر شعرا" قرار دیا، یا مجنوں گورکھپوری نے "خدائے سخن" اور مولوی عبدالحق نے "سرتاجِ شعرائے اُردو" کہہ کر پکارا بلکہ اس لیے کہ انسانی جذبات و محسوسات کا جتنا تنوع میر کے کلام میں دکھائی دیتا ہے اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں ملتا ہو۔ پھر میر نے ان محسوسات کو جس دھیمے، پُرتاثیر اور نرم لہجے میں ڈھالا ہے وہ بے مثال ہے۔ میر ایک دروں بین (INTRO VERT) شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سوز و گداز اور جذبہ و احساس کی گرمی اور شدت ملتی ہے۔ اُن کی شاعری اُن کے خلوص کی پیداوار ہے۔ یہ اس درد و غم سے عبارت ہے جو میر کی زندگی کی سب سے بڑی نعمت تھا۔ اس لیے کہ اس درد و غم نے اُن کے کلام میں وہ تاثیر بھر دی جس نے ہر زخمی دل کو مرہم فراہم کیا۔ اس شاعری کو پڑھ کر طبیعت سکون کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جذبوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ نغمگی سے بھری لَے اور نرماہٹ، مزاج کو صوفیانہ رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ بلاشبہ میر کا مزاج صوفیانہ تھا۔ اس میں بچپن کی تربیت کا اثر بھی تھا اور زمانے کے دکھ درد کا اثر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے لیے شاعری ذہنی ورزش کا ذریعہ نہ تھی بلکہ انہوں نے دل اور جگر کا خون کیا اور اسی کی نمود نے ان کی شاعری میں بے پناہ تاثیر بھر دی۔ کلامِ میر سوز و گداز، درد و غم اور نشتریت سے بھرپور ہے۔ اداس ضرور کرتا ہے لیکن اس میں مریضانہ گھٹن کا احساس نہیں ہوتا اس لیے ہر پڑھنے والا اس میں دلچسپی لیتا اور اپنے دل کی آواز پہچانتا ہے۔ یہ غم انگیز شاعری ہمارے زخموں پر پھاہے رکھتی ہے اور ہمیں سکون پہنچاتی ہے۔ یہ ہمارے دُکھ درد، خوف اور ترحم کے جذبوں کا کتھارسس کرتی ہے۔ سبب ظاہر ہے کہ آج کے انسان کو فنا کا شدید احساس لاحق ہے۔ آج تشخص اور پہچان ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ دُکھ درد کے کتنے حوالے ہماری

زیست کے درپے ہوگئے ہیں۔ ہلاکت اور تباہی کے دہانے پر کھڑی ہوئی دنیا میں آج کا انسان جس طرح موت اور بربادی کے احساس میں شدت
سے مبتلا ہے تنہائی اور لایعنیت کا کرب جس طرح ہم سب کی زندگیوں میں نقب زنی کر رہا ہے اس سے کون واقف نہیں ایسے وقت میں
میر کے شعر جذبوں میں پھیلتے اور وجود میں سرایت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ علاج بالمثل کی طرح ہمارے جذبوں کو شدید تر (INTENSIFY)
کر کے ان کی تطہیر کرتے اور سکون پہنچاتے ہیں۔ دراصل میر کو بھی ایسا ہی زمانہ نصیب ہوا تھا جب ہر طرف انتشار، بے سکونی، خوف
قتل و غارت، لوٹ مار اور خود غرضی کا دور دورہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر نے دل کی دنیا میں پناہ لی جس طرح آج ہمارا خارجی حوالہ کرب ناک اور
دہشت انگیز ہے ـــــ میر کے دور کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی اور اس لیے میر نے دل کو وسیع صحرا تصور کر کے اس میں تحفظ ڈھونڈا۔
باہر کی دنیا کی حالت تو یہ تھی کہ۔

جز کشمکش ہووے تو کیا عالم سے ہم کو فائدہ
یہ ہے فضا ہے اک قفس ہم ہیں گرفتا اس قدر
رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
سب فکر خانہ سازی میں منعم ہلاک ہے
بنیاد زندگانی کی ناپائیدار ہے
ہے زیست کوئی یہ بھی جو میر کرے ہے تو
ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجئے
زنہار نہ جا پرورش دور زماں پر
مرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرے ہے

کیا یہ سب اشعار ہماری زیست کی بے ثباتی کا حوالہ نہیں بن جاتے ؟
ظاہر ہے ہلاکت ہتھیاروں کی دوڑ، سپر پاورز کے استحصالی ہتھکنڈوں اور آشوب دوراں نے انسانی زندگی کی بے ثباتی کا احساس اس قدر
نمایاں کر دیا ہے کہ ہم بھی میر کی طرح دل کی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہمیں میر کی آواز اپنے ہی دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ میر جب سر کو
گریبان میں ڈالنے کی تلقین کرتے ہیں تو اس لیے کہ دل ایک دامن وسیع صحرا ہے جہاں سکون میسر آ سکتا ہے۔

ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

میر کے نزدیک دل محض وسعت پذیر ہی نہیں بلا خیز بھی ہے، طوفاں بردوش بھی ہے، نسخۂ تصوف بھی ہے، متاع بے بہا بھی
ہے، طریق عشق میں رہنما بھی ہے ـــــ لیکن اس دل کی پہچان کے لیے چشم بصیرت کا وا ہونا ضروری ہے۔ میر کے خیال میں فن عشق کے مشکل

حقائق کی آگاہی کے لیے دل کا مطالعہ لازمی ہے۔ دل آئینۂ عالم ہے جو ہر شے کو چشمِ معرفت پر منعکس کر دیتا ہے۔ دل اک قطرہ خون ہے جو ایک عالم کے سر بلا لاتا ہے۔ یہ نہ صرف منزلِ عشق کا رہبر ہے بلکہ خود پیمبر، خود قبلہ اور خود خدا ہے۔ میر کے اشعار میں دل کی کیفیتیں ملاحظہ فرمائیے۔

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
ایک قطرۂ خون یہ دل طوفاں ہے ہمارا

دل نے تم کو مثالِ آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

گر دل کا بہت چھوٹا پر جائے تعجب ہے
عالم کو تمام اس میں کس طرح ہے گنجائی

دل عجب نسخۂ تصوف ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں میں دکھا لایا

دل کہ اک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا !!

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

جی چاہے مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
پر ہو سکے تو پیارے ٹک دل کا آشنا رہ

عمرِ انساں راہ تو ہے تشویش سے طے ہوتی ہے دلے
دل کے تئیں پہنچے جو کوئی چین کی پھر منزل ہے دل

قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے
اس کے نقادی کو نظر ہے شرط

دل کے ساتھ یہ انجمن آرائی میر کی تنہائی، اداسی اور اجنبیت و مغائرت کے احساس کی بدولت ہے۔ جب مکالمہ کرنے کو کوئی محرم

میسر نہ آسکے۔ جب ماحول سنسان اور گلیاں سونی ہوں۔ جب بند کمرے کی سی کیفیت طاری ہو۔ جب پورا عہد محبت اور مروّت کے جذبوں سے خالی دکھائی دیتا ہو۔ تو پھر خود کلامی کو جی چاہتا ہے۔ دل کے ساتھ مکالمہ غنیمت نظر آنے لگتا ہے۔ پھر اپنی گمشدگی کا احساس ابھرتا ہے اور اپنی تلاش کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

گیا تھا اس کی گلی میں سو پھر نہ پلٹا میرؔ
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار آیا

اپنے ساتھ مکالمے کا یہ تصور اس وقت ابھرتا ہے جب سناٹے کو توڑ دینے کی خواہش ابھرتی ہے۔ احساسِ تنہائی کو مارنے اور اجنبیت و مغائرت کے اثرات زائل کرنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ میرؔ کو اپنے ساتھ مکالمہ کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس لیے کہ اپنی ذات کچھ کم اہم نہیں ہے اور میرؔ کے یہاں تو ذات کا حوالہ پھیل کر خدا کا حوالہ بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اپنے تئیں پہنچنا خدا تک پہنچنا ہے۔ اور جب تک خود کو نہیں پہنچتے تھے تو محبت سے دوری قائم تھی۔

پہنچا میں آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

میرؔ تو اپنے سوا کسی کو موجود نہیں جانتے تھے۔ بلکہ خود کو اپنا مقصود جانتے تھے۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں
اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

ان کا سارا عجز و نیاز خود اپنی ہی طرف تھا اس لیے کہ مشتِ خاک ہوتے ہوتے بھی اپنے آپ کو مسجود سمجھتے تھے یہی نہیں اہلِ نظر کے نزدیک بھی خود معبود تھے۔

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں!!

گویا میرؔ اس مقامِ اتصال تک پہنچ چکے تھے جہاں عبد اور معبود ایک ہو جاتے ہیں تاکہ دوئی کا تصور مٹ جائے۔ "تو من شُدم من تو شُدی" والا معاملہ درپیش ہوتا ہے دراصل آدم کی نمود یا جلوہ گری کا مقصد اپنی ہی سیر تھا لیکن اس رمز کو میرؔ نکتہ داں جیسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

اپنی ہی سیر کرنے کو ہم جلوہ گر ہوئے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

[illegible]س لیے جلوہ گری کے بعد اپنے آپ سے غافل نہیں رہا جا سکتا اور جو خود سے غافل گزر گئے وہ گویا یہ نہ سمجھ سکے کہ اُن کے قالب [illegible] [illegible] موجود تھا۔

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تُو تھا

چنانچہ میرؔ کے نزدیک اگر بظاہر بے نشان ذات کا سُراغ پانا ہے تو اُس کے لیے اپنا سُراغ لگانا بہت ضروری ہے۔

میرؔ اس بے نشاں کو پایا جان
کچھ ہمارا اگر سُراغ لگا

دراصل یہ جذبۂ آرزو ہے جو انسان کو خدا سے بندہ کر دیتا ہے ورنہ اگر انسان کا دل بے مُدعا ہوتا تو شاید وہ بھی خدا ہوتا اور یہ آرزو بھی تو اُسی ذاتِ بے ہمتا کی ہے۔ یہی خواہش کاہش کا موجب بنتی ہے۔ اور شاید یہیں سے طالب اور مطلوب میں دُوری کا احساس اُبھرتا ہے اور مطلوب بیگانگی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے تاکہ خواہش اور آرزو کو بڑھا سکے ورنہ دونوں ایک ہی جہاں کے ہیں۔

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خُدا تھے گر دلِ بے مُدعا ہوتا

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

مَیں میرؔ کا اس لیے بھی معترف ہوں کہ میرؔ کی گفتگو ہمیشہ عوام سے رہی، اُنہوں نے عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گذاری، نہ کسی سے وظیفہ قبول کیا نہ کسی دولت مند کے آگے دستِ طمع دراز کیا نہ کسی کی خوشامد سے اپنی زبان اور قلم کو آلودہ کیا۔ نہ تو نوابوں اور امیروں کی چوکھٹ پر اپنا سر جُھکایا نہ اپنے کلام کو داد و دہش کے آگے نادم ہونے دیا۔ نہ کبھی بندگی کی خواہش کی اور نہ کبھی خدا بننا گوارا کیا۔ میرؔ خستہ و خراب رہے۔ تمام عمر ناکامیوں سے کام لیتے اور "نامرادانہ زیست" کرتے عمر بیتی لیکن محبت میں نبھانے کا سلیقہ اور وضع داری کا طریقہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

مَیں جب شکستوں سے چُور اور شمعِ اُمید کی کرنوں سے دُور ہونے لگتا ہوں تو میرؔ مجھ پر حوصلہ مندی سے زندگی گزارنے کا چلن بتا کر مجھ پر زندگی کے امکانات منکشف کر دیتے ہیں اور یہی کشف اور عرفان مجھے اپنے مرحوم اُستاد ڈاکٹر سید عبداللہ کی طرح میرؔ کا معترف بنا دیتا ہے۔

تقطیع :

سانپ بھاگ گیا
مجھے گھورنے والی آنکھیں
گھاس میں باقی ہیں

... بی ئی گے تے ۵
... ادمی شی سے تو ۷ کل آوازیں : ۱۸
... ساتی تو کو رو ۶

ان کے علاوہ سترہ سے کم آوازوں کی ہائیکو بھی ملتی ہیں۔ چودہ، پندرہ اور سولہ آوازوں کی ہائیکو بھی دستیاب ہیں۔ سولہ آوازوں کی ایک ہائیکو کی تقطیع دیکھیے :

... کہ گی ۴
... میتے نو فوا تو ۷ کل آوازیں : ۱۶
۵

ان سطور سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہائیکو کی کلاسیکی حیثیت میں بھی آوازوں میں تنوع ملتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہائیکو کا اختتام اسم پر ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں۔ مذکورہ بالا ہائیکو میں چند ہائیکو کا اختتام فعل پر ہوا ہے۔ کاکو، اوکو، توکورو افعال ہیں۔ اور ان پر ہائیکو ختم ہو رہی ہے۔ ہائیکو فعل، اسم اور حرف پر ختم ہو سکتی ہے۔ ایسی کوئی پابندی نہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں ہائیکو صرف اسماء پر مشتمل ہوتی ہے، یہ تاثر بھی غلط ہے۔ ہائیکو میں اسم، فعل، حرف سب استعمال ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وزن کی خاطر محذوف ہو جاتے ہیں۔ جس طرح اردو میں بھی ہوتا ہے۔ ہائیکو میں قافیہ نہیں ہوتا۔

موضوعات

جاپانی ہائیکو کے موضوعات متنوع ہیں مگر فطرت کا حوالہ مستحکم روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید ہائیکو نگاروں نے بھی کسی نہ کسی طرح فطرت کے حوالے کو قائم رکھا ہے۔ فطرت کا موضوع اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ اس لیے راقم کے خیال میں اردو ہائیکو نگاری کو موضوعات کی پابندی کرنی چاہیئے۔ یہ پابندی ممکن ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ حسن

اقبال کا فکری ارتقا

اوراق میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا مقالہ "اقبال کا فکری ارتقا" مَیں نے بغور پڑھا ہے۔ میرے خیال میں موصوف اقبال کے فکر کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے ایک دلچسپ موضوع کا دَر تو ضرور وا کیا ہے لیکن جس قدر عرق ریزی اور دقّتِ نظر مطلوب تھی، وہ اس سے پہلوتہی کر گئے۔ نظموں سے چند اشعار کے نامکمل حوالے اپنے سیاق و سباق کے بغیر، تفہیم کی راہ میں مشکل پیدا کرتے ہیں کیونکہ نظم تو ایک اکائی ہوتی ہے جہاں تمام اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک معنیاتی مرقّع پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ نظموں کے اشعار کی ترتیب میں ردّ و بدل کر کے اُن کے حوالے پیش کرنے میں بالکل حق بجانب نہیں ہیں۔

ان کا پہلا اعتراض تقلید کے متعلق ہے۔ اقبال کے نظریۂ تقلید میں ذرا بھی اشکال نہیں ہے۔ اس مغالطہ کی وجہ یہی ہے کہ علامہ نے لفظ تقلید کو مختلف علامتوں کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ اُنہوں نے تقلید کی موافقت میں علامہ کے جتنے اشعار پیش کیے ہیں اُن کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ علامہ نے خود اس سلسلہ میں واضح کر دیا ہے۔

...تقلید ضبطِ ملت است

اب دیکھئے تقلید کی مخالفت میں اُن کے اعتراضات۔ وہ فرماتے ہیں

مصطفٰی کو از تجدّد می سرود ‏ ‏ ‏ گفت نقشِ کہنہ را باید زدود

اور اس کا ترجمہ فرماتے ہیں "نعوذ باللہ کہ حضرت رسالت مآب نیاپن پسند فرماتے تھے۔ آپؐ نے کہا کہ پرانا نقش مٹا دینا چاہیئے۔"

نو نگردد کعبہ را رختِ حیات ‏ ‏ ‏ گر ز افرنگ آیدش لات و منات

اور اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "کعبہ کا غلاف کبھی نیا نہ ہو اگر افرنگ سے اس کے لیے بُت آتے رہیں یعنی اگر کعبہ میں بُت آ آ کر جمع ہوتے رہتے وہ کبھی کعبہ نہ بن پاتا۔"

سعید حلیم پاشا کی زبان سے فرمودہ یہ اشعار جاوید نامہ (کلیاتِ فارسی صد ۶۵۲) میں جہاں پر مرقوم ہیں وہاں مصطفٰی کا لفظ خط کشیدہ ہے اور حاشیہ میں لکھا گیا ہے "مصطفٰی مراد از مصطفٰی کمال" صاحبِ مضمون نے اسے حضرت رسالت مآبؐ کیسے سمجھ لیا یہ تو وہی جانتے ہیں لیکن اگر وہ ذرا سی توجہ فرماتے تو اُن پر یہ آشکارا ہو جاتا کہ جہاں کہیں مصطفٰی کا لفظ حضرت رسالت مآبؐ کے لیے آیا ہے (یا آتا ہے) وہ مصطفٰیؐ لکھا گیا ہے (یا لکھا جاتا ہے)

مصطفی ۴+ = مصطفیٰ۔ مثال کے طور پر اسی کلیاتِ اقبال میں جاوید نامہ صفحہ ..... پر مرقوم آخری شعر کا پہلا مصرعہ

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید

اسی طرح دوسرے شعر کی تشریح میں بھی انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہاں کعبہ اور لات و منات کا استعمال استعاراتی طور پر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانا چاہتے ہیں تو افرنگیوں کی اندھی تقلید سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اب ان اشعار کی معنویت کے متعلق اپنی رائے پیش کرنی چاہتا ہوں۔ "زیارتِ ارواح جمال الدین افغانی و سعید حلیم پاشا" کی سُرخی کے تحت جہاں یہ اشعار مرقوم ہیں وہاں ان کے لیے شرق و غرب کا عنوان دیا گیا ہے، جس سے اس پوری نظم کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مصطفیٰ کمال کا تجدد غلط ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال اتا ترک نے ترقی اور تمدنی برتری کی دھن میں ایسے اصولوں اور نظاموں کو اپنایا جو مغربی سوسائٹی میں عرصہ ہوا اپنی وقعت کھو چکے تھے۔ اور وہ اُن کو بہت پہلے ہی خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس کی سب سے اچھی مثال قومیت یعنی NATIONALISM ہے جس کو یورپ اب ترک کر چکا ہے۔ ان اشعار کے پس آمدہ اشعار سے میرے خیالات کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست ..... تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست

سینۂ او را دمِ دیگر نبود ..... در ضمیرش عالمے دیگر نبود

لاجرم با عالمِ موجود ساخت ..... مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

طرفگیہا در نہادِ کائنات ..... نیست از تقلید تقویمِ حیات

مؤخرالذکر شعر کا جو مطلب انہوں نے لکھا ہے وہ بھی شعر کے حقیقی مفہوم سے دُور ہو جاتا ہے۔ شعر کا نثری متن کچھ یوں ہوتا ہے۔ طرفگیہا در نہادِ کائنات از تقلید تقویمِ حیات نیست۔ یعنی دُنیا کی فطرت میں نیا پن حیات کی تقویم کی تقلید سے نہیں ہے۔ اُنہوں نے تقویم معنیٰ مزاج سمجھ لیا ہے جس سے ان کو مغالطہ ہوا ہے ورنہ نظم کے آخری اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ وہ تُرکوں کی تقلید یورپ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر رہے ہیں کیونکہ اُن کی آرزو تو یہی ہے کہ ترک اُن کے خوابوں کے مردِ مومن کی سچی تعبیر بن جائیں اور قرآن کی روشنی میں جہان کی تلاش کریں۔ ملاحظہ ہو۔

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ..... ہر جہان اندر بر او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش ..... می دہد قرآں جہانے دیگرش

اسی طرح

زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور ..... جانش از تقلید گردد بے حضور

میں "زندہ دل" کا ترجمہ انہوں نے خوش باش کیا ہے جو شعر کی حقیقت کو مجروح کرتا ہے۔ زندہ دل کا مطلب یہاں یہ ہے کہ ایسا دل جس میں سوز ہو اور عشق بھی کس کا، اُس یارؐ کا جس کی تقلید میں حضرت بایزید بسطامی نے خربوزہ کھانے سے اجتناب کیا تھا۔ پھر اس شعر کے معنی ایک رسا محروم ہونے کے باوجود وہ اسے وہ معنویت عطا کر رہے ہیں جو شاعر کے مافی الضمیر سے مختلف ہے۔

چاک کُن پیراہنِ تقلید را ..... تا بیا موزی از و توحید را

یہاں علامہ، حلاج کی زبان سے بھی یہی بات کہلوا رہے ہیں کہ

(غیروں کی) تقلید کا لباس چاک کر تاکہ حضرت رسالت مآب (از دو = از + او) سے تو توحید کا علم حاصل کرسکے۔ جس کی تقلید کرنا ہر مسلمان کے لیے باعثِ عزّ و افتخار ہے۔ جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے علامہ نے مسلمانوں کو مختلف پیرایوں میں، فرنگیوں اور یوروپ والوں کی تقلید سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی حضرت رسالت مآب کی تقلید کا پیغام بھی دیا ہے۔

صاحبِ مضمون نے اُردو کا جو شعر 'خضر کا سودا بھی چھوڑ دے'، اور فارسی کا جو قطعہ تقلید کے مخالف رویّہ کی نشاندہی کے لیے تحریر فرمایا ہے وہ علامہ کے لفظ تقلید کی تیسری معنیاتی جہت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں علامہ جستجو اور تلاش کی — دعوت دیتے ہیں اور تقلید کی روش کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے خضر کی رہنمائی تک سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بھی تقلید سے مراد غیروں کی تقلید ہے۔ ایک فارسی قطعہ میں بھی یہ خیال اس طرح ادا ہوا ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — به راهِ دیگراں رفتن عذاب است

پدید آید گر از تو کارِ نادر — گناهے هم اگر باشد ثواب است

میرے خیال میں تقلید کے متعلق صاحبِ مضمون کے بے بنیاد اعتراض کے خلاف قارئین بھی میری ہم نوائی کریں گے۔

دوسرا مفروضہ تضادِ جدائی کے متعلق ہے۔ علامہ نے اپنے اشعار میں تو جدائی کی تعریف ہی کی ہے جیسا کہ صاحبِ مضمون کے تمام حوالوں سے منکشف ہوتا ہے۔

خوش گفت ولے حرام کردند — در مذہبِ عاشقاں جُدائی

'اس نے درست کہا لیکن عاشقوں کے مذہب میں جدائی کو حرام کر دیا گیا ہے' سے یہ تو ظاہر نہیں ہوتا کہ علامہؒ رومی کے خیال سے اتفاق فرماتے ہیں دونوں کے اندر اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ اس لیے صاحبِ مضمون کا یہ کہنا کہ کبھی وہ اسے اچھا اور سازگار بتاتے ہیں اور کبھی بُرا کہتے ہیں، میرے خیال میں علامہ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

اسی طرح شاہی کے متعلق اُن کا مبیّنہ تضاد بھی علامہ کے کلام سے ثابت نہیں ہوتا ہے 'گورستانِ شاہی' عالمگیر کے مزار کے پس منظر میں کہی گئی نظم ہے۔ اور عالمگیر بادشاہ ہو کر بھی فقیری میں مست رہتا تھا۔ اسی لیے اس خاک کو گردوں پایہ کہا ہے۔ لیکن وہ ہر حال میں سلاطین کی پرستش کے مخالف تھے۔ بادشاہوں سے عقیدت اور چیز ہے اور ان کا پرستار ہونا چیزے دیگر ہے۔ پھر اس شعر کا پس منظر بھی مختلف ہے۔ اسی لیے ملوکیت کا مخالف ہونے کے باوجود کسی بادشاہ سے عقیدت رکھنا فکری تضاد پر تو محمول نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ صاحبِ مضمون، شاعر کے نظریات کے عقب میں چھپے ہوئے شعری باطن کو گرفت میں نہ لے سکے۔

اُن کا دوسرا اعتراض خودی اور تسلیم و رضا' کے تضاد سے تعلق رکھتا ہے۔ رضائے حق میں فنا ہو جانے کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوتا ہے کہ انسان دل کو آرزو سے خالی کرے۔ تسلیم و رضا کو رہبانیت کے مترادف سمجھ لینا غلط فہمی نہیں تو اور کیا ہے۔ نہ ہی تسلیم و رضا، ترکِ دُنیا کے معنی میں استعمال ہوا ہے — اسرارِ خودی (فارسی کلیات ص۱۶ و ص۱۷) کے حوالے، دعوتِ عمل اور دعوتِ جستجو کے جذبات سے مملو ہیں۔ کیا رضائے حق میں فنا ہو جانے کا مطلب عقل کوش و گردوں تاز، کے اعجاز کی تلاش سے بیگانگی اختیار کر لینا ہے۔ اسی طرح ...... بتا تیری رضا کیا ہے، کے متعلق اُن کا یہ فرمانا کہ "یہاں اہمیت رضائے الٰہی کی نہیں رضائے بندہ کی ہو جاتی ہے، اور یہ بڑی اُلجھن کا مقام ہے۔" یہ اُلجھن صرف اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ خودی اور بے خودی کو بالکل الگ الگ WATERTIGHT COMPARTMENTS سمجھتے ہیں۔ علامہ کے یہاں 'خودی' کا محرک اور اُس کی 'قوت' بے خودی' ہے۔ میرے خیال کی

وضاحت وزیر آغا کے ان الفاظ سے ہوگی " اقبال جب بے خودی کو مس کرتے ہیں تو اس سے قوت حاصل کر کے خودی کو نکھارتے اور سنوارتے ہیں۔ گویا خودی، بے خودی کی انتہائی کیفیت سے ہی وجود پذیر ہوتی ہے اور اس حالت میں بندہ خود سے نجات پا کر ذاتِ لازوال میں گم ہو جاتا ہے اور اُس کی رضا، رضائے الٰہی سے مختلف نہیں رہتی ۔

عقل و دل (عشق یا جذبہ) کے تضاد کے متعلق صاحبِ مضمون کے اعتراض کا جواب دینے سے پہلے، میں جگن ناتھ آزاد کے مضمون " اقبال کی معنویت " سے یہ اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

" اگر ہم اس وہم میں گرفتار ہیں کہ اقبال نے عقل پر عشق کی برتری تسلیم کی ہے یا اقبال عشق کو عقل کا تضاد سمجھتے ہیں تو یہ کلامِ اقبال کے ہمارے بے احتیاط مطالعہ کا نتیجہ ہے ۔ اوّل تو اقبال نے عشق اور عقل یعنی دانشِ نورانی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی اور اس موضوع پر اس قسم کے مصرعے اُنہوں نے ہمیں دیے ہیں۔

عشق صیقل می دہد فرہنگ را
عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست

دوسرا عقل کی برتری اور فضیلت کی اہمیت اقبال کی نظر میں کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ اُن کا عشق دراصل دانشِ نورانی ہی کا ایک پہلو ہے ۔ "

جاوید نامہ میں اقبال نے سعید حلیم پاشا کی زبان سے شرق و غرب کی ترجمانی کے تحت یہ اشعار کہلوائے ہیں ۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ‏ ‏ ‏ ‏ شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ‏ ‏ ‏ ‏ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم سفر شود ‏ ‏ ‏ ‏ نقش بندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ‏ ‏ ‏ ‏ عشق را با زیرکی آمیزہ دہ

جن سے عقل و دل کے متعلق اُن کے افکار کی وضاحت ہوتی ہے ۔ اسی خیال کو اُردو میں یوں ادا کیا ہے

مُردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق ‏ ‏ ‏ ‏ عقل ہے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اُنہیں شدت سے اس کا احساس تھا کہ مشرق میں عقل بے ربطیٔ افکار کی وجہ سے غلام ہے جبکہ مغرب میں لادینیت کی وجہ سے عشق مُردہ ہو چکا ہے۔ اسی لیے وہ عقل اور عشق کے آمیزہ سے عالمِ دیگر کی بنیاد رکھنے کی دعوت دیتے ہیں ۔

صفحہ ۲۲۸ پر جو شعر اُنہوں نے حوالہ میں پیش کیا ہے اُس کا مطلب کچھ اور اخذ کر لیا ہے ۔

خرد را با دل خود ہم سفر کُن ‏ ‏ ‏ ‏ یکے با ملتِ ترکاں نظر کُن ‏ ‏ ‏ ‏ (کلیاتِ فارسی صفحہ ۵۴۴)

کہ فوراً بعد کا شعر اُنہوں نے دیکھنے کی زحمت گوارا ہی نہ کی ۔ ملاحظہ ہو ۔

بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدے ‏ ‏ ‏ ‏ میانِ ملک و دیں ربطے ندیدے
بدن را با فرنگ از جاں جدا دید ‏ ‏ ‏ ‏ نگاہش ملک و ملت را دوتا دید

ان اشعار میں بھی وہی پیغام ہے کہ عقل کو زندگی کے سفر میں دل کا ساتھی بنا ۔ اور ترکوں کی قوم کی طرح فرنگیوں کی تقلید میں ' ملک و دیں ' کو بے ربط نہ

کہ اُن کے مابین تو بدن اور روح کا تعلق ہے۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون نظم سے کسی ایک شعر کو نکال کر اُس کا حوالہ بنا لیتے ہیں، اور اُس سے مربوط دوسرے اشعار کو عمداً یا سہواً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' کے جس شعر کا حوالہ اس سلسلے کے آخر میں دیا گیا ہے۔

عقل اندر حکمِ دل یزدانی است　　چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

یہ عقل کو نیک و بد کی دو قسموں میں نہیں بانٹتا ہے بلکہ اسی پیغام سے ہم رشتہ ہے جس کے تحت وہ کہتے ہیں کہ عقل و دل یا عقل و عشق کے آمیزہ سے عالمِ دیگر کی بنیاد رکھو۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش　　در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

اے کہ جاں را بازمی دانی ز تن　　سحرِ ایں تہذیبِ لادینے شکن

جس کے بعد یہ شعر آتا ہے　　عقل اندر حکمِ دل یزدانی است　　چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

اب شعر کی معنیاتی سطح روشن ہو جاتی ہے اور عقل و دل کا تنافر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

صاحبِ مضمون کا آخری اعتراض جبر و قدر کا مسئلہ ہے۔

اس حصّہ میں جاوید نامہ کے ذکر سے پہلے جتنے اشعار کے حوالے دیئے گئے ہیں وہ انسان کو مجبور تو ظاہر کرتے ہیں لیکن کس کے سامنے، اللہ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے جہاں کسی کی ایک نہیں چل سکتی ہے۔ جاوید نامہ میں حلّاج کی زبان سے جبر کی تعریف میں جو کچھ بھی کہلوایا گیا ہے وہ کس سلسلے میں ہے؟ کیا یہ اللہ کی قدرت کے بارے میں نہیں ہے۔ آخری شعر کے مطابق تسلیم و رضا ہی مردوں کا کام ہے۔ پھر یہاں تضاد بیانی کا سوال کہاں؟ علامہ نے صرف اسی بات کے دوسرے رُخ کو پیش کیا ہے۔ تربیتِ خودی کے تین مرحلوں میں سے پہلا مرحلہ اطاعت ہے اور علامہ یہ کہتے ہیں کہ اطاعت یعنی فرائض کی پابندی سے ہی سچی حُرّیت نصیب ہوتی ہے اور چاند اور پروین کو مسخر کرنا قانون کی پابندی سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ حصّہ اس مصرعہ پر ختم ہوتا ہے۔

از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

دوسرے حصّہ میں وہ رموزِ بیخودی کے حوالے پیش کرتے ہیں لیکن اشعار کی ترتیب میں تبدیلی کر کے اس حصّہ کی ابتدا میں اقبال کہتے ہیں

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ　　ہست شیطاں از جماعت دُور تر

اور فرد اور قوم کے رشتہ کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ

قوم فرد کو شمشاد کی طرح زمین میں گاڑ دیتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد بھی اس کو آزاد کر دیتی ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان بے خودی کے عالم سے آشنا ہو کر اجتماعی قوت اور فعالیت حاصل کریں اور آگے اسی بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ خودی (انفرادیت) جُزو ہو کر بھی کُل پر قابو پا لیتی ہے یعنی اس کی فطرت (جماعت) کی پابند ہو کر بھی آزاد ہے۔ یہاں میں وزیر آغا کے مضمون اقبال کے تصوراتِ عشق و خرد کا یہ اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

اب صورت یوں اُبھرتی ہے کہ اقبال کے ہاں بے خودی وہ زمین ہے جس میں سے خودی کا تخم پودے کی صورت میں برآمد ہو کر برگ و بار لاتا ہے۔ اس کے برعکس صوفیہ کے ہاں بے خودی وہ سمندر ہے جس میں قطرہ جذب ہو کر خود سمندر بن جاتا ہے۔ فرق بہت واضح ہے۔ تصوّف میں بے خودی منزل ہے جبکہ اقبال کے ہاں خودی کی یافت اور تکمیل ہی اصل شے ہے۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ تصوّف ایک ایسا سکہ ہے

جس کے دونوں اطراف پر لفظ 'بے خودی' کھدا ہے جب کہ اقبال کے ہاں اس سکّے پر ایک طرف 'بے خودی' اور دوسری طرف 'خودی' کے الفاظ کندہ ہیں۔ بے خودی وہ قعرِ عمیق یا وسعتِ بے کنار یا ژونگ کے الفاظ میں وہ اجتماعی لاشعور ہے جس میں امکانات ہی امکانات موجود ہیں۔ جب کہ خودی ایک بہاریں لمحہ ہے جو بے خودی سے قوت حاصل کرتا ہے۔ بے خودی اجتماعیت کا علامیہ ہے خودی انفرادیت کا چہرہ ہے۔"

یہ تو ہوئیں اُن کے مفروضہ تضادات کی باتیں، مضمون کے آخری سطور بھی محلِ نظر ہیں یعنی اگر وقت وقت کی باتیں اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات (صاحبِ مضمون کی نظر میں) نہ ہوتے تو اقبال حقیقی معنوں میں عظیم شاعر نہ ہوتے۔ بہ الفاظِ دیگر اقبال کی عظمت کو مثبت قدروں کی بنا پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

اسی طرح مضمون کے ابتدائی حصّہ میں 'من موجی' کا لفظ سطحیت کا حامل ہے اور کسی گہرے فکری شعور اور ادراک کی نفی کرتا ہے۔

آخر میں اُن کا یہ دعویٰ کہ "مختلف اوقات میں ظاہر ہونے والے مختلف بلکہ متضاد خیالات کو اس فکری نشو و نما کی منزلیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن انہیں اس کے کسی مربوط فکری نظام کے نشانات قرار نہیں دے سکتے۔" میرے خیال میں بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے۔ کاش صاحبِ مضمون اقبال کے فکری ارتقا سے متعلق بھی کچھ باتیں کر سکتے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال اور غزل

تاج پیامی

ساحل احمد کی تصنیف اقبال اور غزل زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ تصنیف دوسری تصنیفات کے مقابلہ میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ اقبال اور غزل میں غزل کی تمام خصوصیات اور اس کے ارتقائی منازل کی نشاندہی عالمانہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال کے کلام کا اقبال کے پُرشکوہ مقام سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال پر ہر سال بے شمار کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن اس کتاب کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی، زیادہ تر کتابیں اقبال کی فکر اور ان کے پیام سے متعلق ہیں۔ ان کے فن سے متعلق بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اقبال اور غزل اقبال کے کلام کی ہیئت یعنی ان کے فن پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں اقبال کی چند نظموں یا غزلوں کو پیشِ نظر رکھ کر عملی تنقید کے سہارے ان کے کلام کی فنی خوبیوں ہی کو پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں ان کے ہمہ گیر پہلو کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے اور یہ کام سخت محنت اور دیدہ سوزی کا متقاضی ہے، اس کام کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع اور تنقیدی شعور نہایت بالیدہ ہو۔ وہ شعر فہم، ماہرِ لسانیات، شاعری کے تمام فنی نکات سے واقف اور ساتھ ہی تاریخی حس (HISTORICAL SENSE) کا حامل بھی ہو۔ ساحل احمد کی یہ ساری خوبیاں اقبال اور غزل میں نمایاں ہیں۔

اقبال اور غزل کی ترتیب کی ندرت بھی ملاحظہ ہو۔

مقطع : عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

گویا اقبال اور غزل کی ترتیب غزل کی ترتیب ہے۔ اس کتاب کے ہر باب کا عنوان، اقبال کی مختلف غزلوں کے ایک ایک مصرع سے بنایا گیا ہے جو عنوان کے لحاظ سے بے حد موزوں اور بامعنی ہے۔ مطلع کا مصرع ہے:

"پردہ چہرے سے اُٹھا انجمن آرائی کر"

واقعی جب پردہ اُٹھتا ہے تو فنی خوبیوں کی ایک انجمن نظر آتی ہے۔ اس کتاب کے ہر باب میں مصنف کے "مطالعۂ عشق اور جذبہ کی تپش کارفرما" دکھائی دیتی ہے۔

باب ۱ ۔ نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات

اس مصرع کا نفسِ مضمون، ہر ترکیب اور ہر لحاظ اس باب کا ترجمان ہے۔ اس باب میں مصنف نے اقبال کی سوانحِ حیات، ان کے زمانے کے حالات اور تاریخی واقعات کو نہایت کاوش اور محنت سے یکجا کیا ہے اور ان کے پس منظر سے اُبھرنے والی اقبال کی شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کی نفسِ گرم، اس کی تاثیر اور زندگی کی کرشمہ سازیوں سے وجود میں آنے والی شاعری کو اس کے صحیح تناظر میں جاننے کے لیے اس باب کا مطالعہ ضروری ہے۔

باب ۲ : میخانۂ حافظ ہو کہ بُت خانۂ بہزاد

حافظ شیرازی کو فارسی غزل گوئی میں اہم مقام حاصل ہے۔ میخانۂ حافظ کی وضاحت کے لیے اس باب میں اردو غزل کی روایت اس کے لسانی پس منظر میں پیش کی گئی ہے۔ قدیم اردو شعراء معظم، وجہی اور ولی سے موجودہ دور کے شعراء تک کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اردو غزل کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے بُت خانۂ بہزاد کی معنویت اُجاگر ہوتی ہے۔

باب ۳ : شعر گویا روحِ موسیقی ہے رقص اس کا بدن۔

اس باب میں شعر کیا ہے؟ شعر کے لیے بحر اور وزن کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ساتھ ہی مختلف بحروں سے پیدا ہونے والی موسیقی اور ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اقبال نے کن کن بحروں میں غزلیں کہی ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ساحل احمد نے ردیف و قافیہ کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کہتے ہیں: "اقبال نے طویل ردیف کے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں ۳۰ فیصد سے زیادہ ردیفیں استعمال نہیں کی ہیں۔" اس قسم کا تحقیقی کام بغیر عرق ریزی کے انجام نہیں دیا جا سکتا۔

باب ۴ : معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔

اقبال کا یہ مصرع منہ بولتا ہوا ہے کہ فن کا اعجاز اسی وقت نمودار ہوتا ہے جب اس میں خونِ جگر شامل ہو۔ اس باب میں اقبال کے فنِ شاعری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس میں صرف "موزوں لفظ موزوں جگہ پر" کے مقولہ ہی کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اقبال کی غزلوں میں لفظوں کے زیر و بم سے پیدا ہونے والے آہنگ کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس پیچیدہ بحث میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "زبان کے مختلف اجزاء {صوتیات (PHONETICS)، تصوتیات (PHONEMICS) صرف (ETYMOLOGY) نحو (SYNTAX) اور معنیات (SEMANTICS)} کے تجربے سے اسلوبِ بیان، فکر و احساس اور جمالیات کی مجتمع قوت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔" چنانچہ حروفِ علت بھی مصوتے (VOWELS) اور مصمتے (CONSONANTS) کے زیر و بم سے پیدا شدہ

آہنگ کو نقشوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ ساحل احمد لکھتے ہیں: "اقبال کے انتخابی اوزان اور ان اوزانوں کی مناسبت سے لفظوں کا استعمال صوتی آہنگ کو چمکا دیتا ہے اور یہ چمک چمکانے والی کیفیت طویل اور خفیف مصوتوں کی فراوانی اور تناسب سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

اS S ،SIS ااا SISا SS اS اا = ۸ طویل + ۱۲ خفیف

آگے لکھتے ہیں: "انہوں نے (اقبال نے) لفظی خواص و افعال سے قطع نظر، دری (ASPIRATED) معکوسی RE-BOFLEX آوازوں کے مقابلہ میں ہم صفیری (FRIATIVE) آوازوں کے ارتباط کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ ذیلی غزل مذکورہ بیان کی نہ صرف تصدیق کرتی ہے بلکہ خیال کے مصورانہ کیفیا نہ اور صوتیا نہ بصیرت کو صیقل بھی کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے کلام کا آہنگ بلند بانگ اور پرشکوہ ہوتے ہوئے بھی حسنِ سماعت پر گراں نہیں گزرتا بلکہ دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

اس باب میں لسانیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس میں اردو زبان کی پیدائش، اس کے ارتقاء، لفظوں کی ساخت، اس کے استعمالی متروکات، اضافی ترکیبوں، روز مرّہ اور محاوروں پر اردو شعراء کے کلام سے روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں اقبال بھی شامل ہیں۔ ساحل احمد لکھتے ہیں: "مختصر یہ کہ اقبال نے تراکیب و بندش کی اختراع میں اپنی جودتِ طبع کی بھی نمائش کی ہے اور نامقبول لفظوں یا ترکیبوں کو چمکانے کی عمدہ کوشش   کلام میں صرف فارسی کی ڈھلی ڈھلائی ترکیبیں یا جملے ہی نہیں نئی روز مرّہ ترکیبیں بھی موجود ہیں۔

باب ۵ : بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق۔

یہ باب بھی بڑی محنت اور کاوش سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ اردو شاعری میں جتنی صنعتیں استعمال ہوتی ہیں مصنف نے ان کا شمار کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "عروضیوں نے لگ بھگ ساٹھ ستّر صنعتوں کا تعین کیا ہے۔ اقبال کے کلام میں صنعتوں کا وہ استعمال نہیں ملتا جو ان کے پیش روؤں یا بعض ہم عصروں کے یہاں موجود ہے البتہ انہوں نے صنعتِ تلمیح سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔" ساحل احمد نے اس باب میں واضح کیا ہے کہ اقبال نے مخصوص تلمیح کیوں استعمال کی ہے۔ اقبال کے نزدیک تلمیح کا استعمال برائے صنعت نہیں بلکہ برائے مقصد ہے۔ مثلاً ساحل احمد لکھتے ہیں۔ "اقبال کی غزلوں میں موسیٰ سے متعلق تلمیحات کا استعمال فوقیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ۸ بار بانگِ درا، ۱۱ بار بالِ جبریل اور ایک بار ضربِ کلیم میں یہ تلمیح استعمال کی ہے..... حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور ان کا دائرۂ عمل بے پناہ وسعت کا حامل ہے۔ ان کی پیغمبرانہ خودی ان کی شخصیت کا وہ جزوِ عظیم ہے جس نے فرعونی غرور و نخوت کو شکست دی۔ اقبال نے یدِ بیضا، عصائے موسیٰ اور ضربِ کلیم جیسی تلمیحات کے توسط سے انسانی زندگی کو مغز و موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ضربِ کلیم کا یہ شعر دوہری تاثیر کا حامل ہے۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے   خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے   کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال نے پیغمبرانِ دین، بزرگانِ دین اور مشہور شخصیتوں کے علاوہ اسماء و صفات کو بھی اپنی غزلوں میں بطور تلمیح استعمال کیا ہے تاکہ تاریخی و سیاسی، سماجی و معاشی، ادبی و تہذیبی اور دُنیوی سیاق و سباق سے تعلق واضح کیا جا سکے۔ مثلاً یہ شعر

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے قدسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

الغرض یہ باب بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

باب ۶ : معجزۂ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ ۔

اس باب میں مصنف نے تشبیہہ و استعارہ کے مطالب، ان کے اقسام اور استعمال کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ہی یہ واضح بھی کیا ہے کہ " اقبال کے کلام میں استعاروں اور تشبیہوں کا جو فکری نظام ملتا ہے وہ ان کے مخصوص مزاج و ماحول کا اظہار ہے"۔ اس کے علاوہ اقبال نے جن الفاظ کو بطور علامت استعمال کیا ہے، اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان میں شاہین، کوہ و دریا، لالۂ خودرُو، دشت و صحرا، فرہاد و پرویز، آشیانہ، باغ، موج و ساحل، چاند، عصا وغیرہ بار بار اشعار کی زینت بنے ہیں۔ اقبال نے ان الفاظ کے در و بست میں جو ریزہ کاری کا طلسم جگایا ہے وہ تاریخ و حقائق کے پردہ کشا رنگ کا حامل ہے۔ مثلاً ان کا شاہین بلند خیال، غیرت مند، خود پسند اور گوشہ نشینی کا سمبل ہے۔ اس میں مثبت اقدار کی روشنی ہے، تلاش و جستجو کی ہمک ہے اور بے قرار جذبہ کی تڑپ ہے۔ اسی طرح اقبال کے یہاں ہر علامت نئے مفہوم کی حامل ہے۔

باب ۷ : سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خود رَو

اس باب میں ساحل احمد نے ادب و شاعری کے حقیقی مفہوم کو مختلف شعراء و ادباء اور ناقدین کے آراء سے واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور پھر اقبال کے شعری محاسن پر اپنی گرانقدر رائے پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: " فن اور آرٹ سے متعلق اقبال نے جس طرزِ فکر کی جودت پیدا کی ہے اس میں ایٹس کی پُر اسراریت، ویلاس ہٹوئز کی نوری مشابہت، آڈن کے تخیلی اشعاب اور ہربرٹ ریڈ کے کشف و الہام کی ملی جُلی ہیئت وجود میں آتی ہے جس کے پسِ پشت سائنسی رویّہ کی جھلکی شباہت بھی موجود ہے .... اقبال نے لفظ و معانی کے اٹوٹ رشتہ پر زور دیا ہے۔ انہوں نے لفظ کے مخصوص معنی کو موضوع کی مطابقت سے ہم آہنگ کیا ہے اور صرف ایک معنی میں کئی معنوی دُنیائیں یک جا کر دی ہیں۔" اس کے بعد وہ اقبال کے کلام میں پائی جانے والی ڈرامائیت اور خود کلامی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: " اقبال کی انفرادیت کا جواز یہ نہیں کہ ان کا کلام تخیلی وحدت یا غنائی تہذیب کا عمدہ نمونہ ہے بلکہ ان کی انفرادیت کا راز اس مجموعی تاثیر میں ہے جو اسلوب کی فکری، جذباتی، جمالیاتی اور تخیلی اوصاف سے ممزوج و ہم رشتہ ہے .... اقبال کے اس معنی خیز اسلوب میں ڈرامائیت کی وہ فضا تخلیق ہوتی ہے جس میں نظم و ضبط، خود کلامی، عمل اور ردِّ عمل کے وہ تمام عناصر ملتے ہیں جو لفظ کو بولنا اور چلنا سکھاتے ہیں اور ان کی جادوئی کیفیت کو جگائے رکھتا ہے۔"

یہ باب بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مقطع : عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے ـــــــ اس میں کوئی شک نہیں ساحل احمد کے آئینۂ ادراک میں اقبال کی غزل کا عکس بحسن و خوبی جلوہ گر ہوا ہے۔ اقبال اور غزل ایک گرانقدر کتاب ہے اس کے لیے ساحل احمد نے گرانقدر اسلوب (GRAND STYLE) اختیار کیا ہے۔ اس کتاب سے بیک وقت اساتذہ اور طلباء دونوں استفادہ کرسکتے ہیں اس لیے ہر یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہونا چاہیئے۔

اُردو میں ہائیکو کی ہیئت

اُردو میں ہائیکو کی ہیئت میں بغیر قوافی تین مصرعوں پر اتفاق ہے۔ مگر بحر کے معاملے میں اختلاف ہے اور یہ اختلاف فطری ہے۔ جاپانی ارکان کو اُردو میں اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو اسے مستقل طور پر اختیار کرنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ ایسا کرنے سے شاعری پیچھے رہ جائے گی اور صرف ارکان ہی ارکان رہ جائیں گے۔ اُردو ہائیکو نگاروں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر شعراء نے بحر خفیف مسدس کو استعمال کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے اسی بحر کو کیوں اختیار کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ بحر جاپانی ارکان کے قریب ترین ہے۔ اس بحر کے ارکان ہیں، فاعلاتن مفاعلن۔ فعلن جن کی جاپانی آوازیں سات بنتی ہیں۔ یوں تین مصرعوں میں اکیس جاپانی ارکان یا آوازیں بنتی ہیں۔ اگر فعلن کی جگہ فعِلن بہ حرکتِ عین استعمال ہو۔ تو پھر ارکان کی تعداد چھ رہ جاتی ہے۔ یوں اس بحر کے استعمال سے اٹھارہ سے اکیس ارکان تک کی گنجائش ہے جو ہائیکو کے ارکان کے قریب ترین ہے۔ جاپانی ہائیکو میں پہلے اور تیسرے مصرعے کا ہم وزن ہونا اور ہر حالت میں دوسرے مصرعے سے چھوٹا ہونا لازمی شرط نہیں ہے جیسا کہ محولہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہائیکو کے لیے یہ بحر کافی موزوں ہے جو اُردو کی باقاعدہ عروضی بحر ہے۔

غالب اور فیض!

وزیر آغا

بظاہر غالبؔ اور فیضؔ میں بُعدالقطبین ہے۔ اس بات کا اوّلین احساس دونوں کے تخلص کے فرق سے ہوتا ہے۔ شعروں کا انتخاب اگر شخصیت کی رسوائی کا موجب ہے تو تخلص کا چناؤ بھی شخصیت کی تشہیر ہی کا باعث ہے مثلاً "غالب" واقعتاً غالبؔ کی انا یا کم سے کم شخصیت کے اثبات کی کوشش پر دال ہے۔ چنانچہ غالبؔ کی زندگی کے متعدد واقعات (خصوصاً ملازمت کے سلسلے میں واپس چلے جانے کا واقعہ) اس کی انا پسندی ہی کو سامنے لاتے ہیں۔ دوسری طرف فیضؔ کی زندگی ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو دوسروں سے متصادم ہونے یا مجہول انانیت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ہمیشہ محبت اور خیر سگالی کے مسلک پر کاربند رہا۔ یوں لگتا ہے جیسے فیض پہنچانا فیضؔ کی شخصیت کا ایک مستقل رویہ تھا۔ مادی معاملات میں تو یہ رویہ بوجوہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا مگر شاعری کے میدان میں اس نے عوام کو استحصال اور ظلم کے پنجوں سے نجات پانے کی جو راہ سجھائی میں اُسے فیض کے اسباب ہی میں شمار کرتا ہوں۔ اس نکتے کے ساتھ اگر یہ نکتہ بھی منسلک کر دیا جائے کہ غالب جاگیرداری نظام سے ہم آہنگ اور تصوف کی روایت کے تابع تھا جب کہ فیضؔ اشتراکی نظام کے ہم نوا اور سماجی ہمہ اوست کے قائل تھے تو دونوں کا فرق نظروں کے سامنے مزید ابھر آتا ہے۔ مگر غالبؔ اور فیضؔ میں "فراق" کا معاملہ بس یہیں تک ہے۔ اس سے آگے دونوں کی مشترک صفات دریا کے دونوں کناروں کی طرح بہت دُور تک ہم سفر دکھائی دیتی ہیں۔

مثلاً غالبؔ کی زندگی میں نقلِ مکانی اور شاعری میں آوارہ خرامی کا فی الفور احساس ہوتا ہے اور یہی احساس فیضؔ کی حیات اور کلام کے مطالعے سے بھی ہوتا ہے۔ غالبؔ کا قصہ یہ ہے کہ اُس کی آوارہ خرامی خود اُس کی طبیعت کی بے قراری کا شاخسانہ تھی اور طبیعت کی اس بے قراری میں اس کے آبائی خون کی گرمی اور اُبال کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل غالبؔ کی طبیعت کسی ایک پیمانے میں سما نہیں سکتی تھی اور چھلک چھلک جاتی تھی۔ چھلک جانے کی یہ صورت اُن کردہ گناہوں (یعنی سفروں) سے بھی ظاہر ہے جو غالبؔ نے کلکتہ، رام پور اور میرٹھ کے سلسلے میں کیے اور ان ناکردہ گناہوں سے بھی جن کی حسرت اُس کے دل میں دمِ آخر تک رہی۔ حج کے سلسلے میں بھی وہ ثواب کے حصول سے زیادہ سفر سے لطف کشید کرنے کی طرف مائل تھا ؎

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

حقیقت یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر ایک سیاح تھا اور ہمہ وقت حالتِ سفر میں رہنا اُسے مرغوب تھا۔ مگر اُن دنوں نہ تو سفر کی وہ سہولتیں میسر تھیں جو آج کل حاصل ہیں اور نہ غالبؔ مالی اعتبار سے اس قابل تھا کہ اپنے ذوقِ تماشا اور حسرتِ آوارگی کی تسکین کا اہتمام کر سکتا۔ لہٰذا اُس نے ایک تو آوارہ خرامی سے محروم ہونے کی تلافی نقلِ مکانی سے کی، دوسرے اپنی شاعری میں تخیل آفرینی کی مدد سے سفر کیا۔ نقلِ مکانی کی صورت یہ تھی کہ غالب

کسی ایک جگہ ٹک کر نہ رہا۔ شعبان بیگ کی حویلی، کالے میاں کی حویلی، حکیم محمد حسن خان کی حویلی — غالب ایک خانہ بدوش کی طرح عمر بھر اپنا بوریا بستر اٹھائے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا رہا۔ محض اس لیے کہ بقول حالی وہ ایک جگہ رہتے ہوئے اس سے اکتا جاتا تھا۔ آخری مکان — گلی قاسم جان کے دانے پر تھا۔ غالب وہاں بھی نہ رہا۔ موت کی پالکی میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔"

غالب مکان ہی نہیں گھر کی تنگ دامانی سے بھی نالاں تھا۔ اس کے لیے گھر ایک بندی خانے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ ذرا ملائم الفاظ میں سرسیئے کا کمرہ کہہ لیجئے۔ بیوی کو بیڑی اور عارف کے بچوں کو ہتھکڑیاں کہہ کر پکارنا غالب کی اس خاص روش ہی کا غماز ہے۔ سفر کرنے والا چاہے وہ جسمانی طور پر حالت سفر میں ہو یا تخیلی طور پر، تنہائی کو ہمیشہ عزیز جانتا ہے کیونکہ اسی عالم میں وہ پوری طرح متحرک ہو سکتا ہے۔ غالب فطری طور پر متحرک تھا۔ اس لیے شور و شغب سے اپنے ذہن کی رفتار کو مدھم پڑتے دیکھتا تو احتجاج کرتا۔ گھر بنیادی طور پر ایک آشیانے کی طرح ہے اور آشیانے میں چہکار نہ ہو تو وہ آباد نہیں کہلائے گا! مگر غالب گھر کی چہکار کو اپنے اعصاب پر ایک بوجھ گردانتا تھا۔ قدرت نے اس سے طبیعت کے اس میلان کا انتقام یوں لیا کہ وہ بے اولاد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہی آوارہ خرامی، آزادہ روی کے ایک مسلک کی صورت اُس کے کلام سے بھی مترشح ہے۔ غالب کے کلام کا مطالعہ کریں تو ایک بے قرار روح اپنے زندان کی سلاخوں سے سر پھوڑتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے تاکہ آزاد ہو سکے۔ چنانچہ غالب کے کلام میں تشبیہوں اور استعاروں یا تخیل کے لطیف ہیولوں کی موجودگی اس کی آوارہ خرامی ہی کی توسیع ہے۔ تشبیہہ کسی شے یا کیفیت کو بعینہٖ پیش کرنے کے بجائے ہمیشہ اسے تقابل سے پیش کرتی اور یوں گویا ایک شے سے پھدک کر کسی دوسری شے پر بسیرا کرنے کے بعد واپس اپنی اصل جگہ پر آ جاتی ہے۔ اس میں دو کناروں یعنی مشبّہ اور مشبہ بہ (جنہیں جولین جینز نے METAPHIER اور METAPHIED کہا ہے) کے ملاپ کا منظر ابھرتا ہے جو اس بات پر دال ہے کہ قاری یا فنکار کسی ایک کنارے سے بندھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کناروں کی درمیانی خلیج کو پھلانگ گیا ہے۔ مراد یہ کہ تشبیہہ میں مشبّہ ایک ایسی کھڑکی بن جاتا ہے جس میں باہر کی اشیا منعکس ہونے لگتی ہیں اور مشبّہ بہ، مشبّہ کا جزو بدن بن کر لفظ کے بندی خانے سے نجات پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ غالب کے ہاں تشبیہہ اور استعارہ — دونوں کی فراوانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غالب لفظ کے بندی خانے سے آزاد ہونے پر قادر ہے، ویسے بھی شاعری میں تشبیہہ اور استعارے کا استعمال ایک متحرک اندازِ بیان کا غماز ہے جسے وہ طبائع زیادہ عزیز جانتی ہیں جو آزادہ روی کو پسند کرتی ہیں۔ غالب کے اپنے زمانے میں ذوق، ظفر اور دوسرے بلند پایہ شعرا بھی شعر کہہ رہے تھے۔ ان کے کلام کی سادگی، صفائی اور سامنے کی بات کو سامنے کی زبان میں بیان کرنے کی روش اردو زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت کی غماز تو ہے لیکن اس میں تشبیہہ اور استعارے کی وہ فراوانی نہیں جو غالب کے ہاں موجود ہے وجہ یہ کہ بنیادی طور پر ان سب شعرا کے مقابلے میں غالب کہیں زیادہ متحرک اور بے قرار شخصیت کا مالک تھا۔

غالب کے اشعار کی بُنت میں تشبیہہ اور استعارے کے علاوہ تخیلی ہیولوں نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض اوقات تو غالب آب و گل کی دنیا سے اوپر اٹھ کر ایک ایسا خیالی جہان تعمیر کر لیتا ہے جو شاید قدموں کی ہلکی سے ہلکی چاپ کا بھی متحمل نہ ہو سکے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں SIGNIFIER اپنا رشتہ SIGNIFIED سے توڑ لیتا ہے یعنی لفظ اپنے کویے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور ریشم کے کیڑے کی طرح رینگنے کے عمل کو تج کر اڑنے کا ڈھب سیکھ لیتا ہے اور پھر پوری کائنات سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔

بہرکیف یہ وہ متبرک اور مقدس مقام ہے جہاں شاعر ارتکاز کی اُس فضا میں سانس لے رہا ہوتا ہے جو معمولی سے شور کو بھی برداشت نہیں کرتی۔ اس سے یہ بات بھی کھُلی کہ غالب، عارف کے بیٹوں کے پھیلائے ہوئے شور و شغب سے کیوں نالاں تھا کیونکہ ہر بار جب کوئی ننھا مُنا ہاتھ اُسے چھوتا تھا تو اس کے خوابوں کے آبگینے چُور چُور ہو جاتے تھے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ غالب کی آوارہ خرامی یا آزادہ روی باہر کی کسی منزل کے لیے نہیں تھی۔ منزل تو اُس کے اعماق میں پوشیدہ تھی۔ اسے ایک یوٹوپیا یا عظیم تجرید کا عالم کہہ لیجئے جس کا حصول اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اس تک رسائی پانے کی وہ کوشش جسے سلسلۂ شوق کا نام دینا چاہیے۔

آوارہ خرامی کا جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے راستے میں کوئی بند نہ باندھا جائے کیونکہ بقول غالب جب طبع رُکتی ہے تو ابلنے لگتی ہے۔ روانی سے تو انکار نہیں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ غالب رکاوٹ کے عمل کا شکوہ سنج ہمیشہ رہا اور اُسے ہر وہ شے یا عمل ناگوار محسوس ہوا جس نے اُس پر کسی قسم کی بندش عائد کی یا کم سے کم جس پر اُسے بندش یا بھیڑ چال کا گمان ہوا۔ غالب کے نزدیک روانی، روانیٔ طبع یا آوارہ خرامی کناروں میں بند ہو کر بہنے کا نام نہیں تھا بلکہ کناروں سے چھلک جانے کا عمل تھا۔ چنانچہ وہ سماجی کھائیوں یعنی GROOVES سے ہمیشہ متنفر اور لفظی کھائیوں یعنی CLICHES سے ہمیشہ نالاں رہا۔ یہ بات اُس کے اشعار کے مخصوص مزاج سے لے کر اُس کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک پھیلی ہوئی ہے۔ مثلاً اُس نے پیروی کو چاہے وہ خضر کی پیروی کیوں نہ ہو، لازمی قرار نہیں دیا ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

دنیا میں عام لوگوں کے ساتھ مرنا بھی اُسے پسند نہیں تھا جب دہلی میں مارشل لا لگا تو غالب کو دوسروں کے مقابلے میں گھٹن کا کہیں زیادہ احساس ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیاوی معاملات کے علاوہ اُس نے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں بھی آزادہ روی کا مسلک اختیار کیے رکھا مثلاً یہ شعر ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

علاوہ ازیں ؎

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ان اشعار سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب کے ہاں آزادی کا تصور کس قدر کشادہ تھا۔ اتنا کشادہ کہ بڑی سے بڑی آزادی بھی اُسے قید و بند کے تدریجی احساس سے رہائی دلا نہیں سکتی تھی۔ آسمان کو "بیضۂ مور" صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ایک مقام بلند سے وجود اور موجود کی تشکیل کو دیکھ رہا ہو۔ دوسرا شعر غالب کے ہاں کائناتی شعور کا بھی غماز ہے۔ بنیادی طور پر کائناتی شعور بیسویں صدی میں ابھرنے والے ذہن کا دوسرا نام ہے۔ حیرت ہے کہ انیسویں صدی کا باسی ہونے کے باوجود غالب کے ہاں ایک ایسا زاویۂ نگاہ ابھر آیا جسے اس ذہن کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب غالب تمنا کے دوسرے قدم کا ذکر کرتا ہے تو قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دیوتا نے تو خلائی قدموں میں پوری کائنات کا

کے جبر و استبداد، نیز وباؤں اور خشک سالیوں کے لیے ایک علامت کی صورت اختیار کر گئی تھی اور غالب کی حیثیت اُس کھلی آنکھ کی سی تھی جو دہلی کے لمحہ بہ لمحہ اُجڑنے اور متغیر ہونے کے مناظر کو ایک تار دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ دہلی میں لگائے گئے مارشل لا کے دوران جو پابندیاں عائد ہوئیں (بالخصوص دہلی کے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا) زبان بندی ہوئی بلکہ ٹکٹ کے بغیر شہر سے نکلنا یا شہر میں داخل ہونا ناممکن ہوا اور پھر بے گناہ افراد کو جس بے دردی سے گوروں اور کالوں نے قتل کیا اور بالآخر جس طرح پرانی حویلیاں اور مدرسے اور مکان ٹوٹے تاکہ نئی اور شادہ سڑکیں بن سکیں ـــــ یہ سب کچھ غالب کے لیے موہانِ روح سے کم نہ تھا۔ غالب اس سب کا ایک بے بس ناظر تھا۔ اس کے دل میں اس سب کے خلاف ایک طوفان برپا تھا مگر وہ ایک حرف بھی زبان پر نہ لا سکتا تھا پھر بھی اپنے خطوط میں اور اپنے کلام کے ذریعے اس نے اشاروں کنایوں میں اس ساری صورتِ حال کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ آج کے سیاسی شعور کے حوالے سے تو ہم اس ردِ عمل کو سیاسی ہرگز نہیں کہہ سکتے مگر اس طور پر سیاسی ضرور ہے جیسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ جو شکست و ریخت کی اُس فضا کی عکاس ہے جس کے محرکات میں سیاسی مد و جزر نے بھی ایک اہم حصّہ لیا تھا۔ بہر طور غالب کا ردِ عمل اُس کے کلام میں اُبھرنے والے اُن الفاظ اور تراکیب سے بطورِ خاص مترشح ہے جو بعد ازاں ہر قسم کے سیاسی جزر و مد کو گرفت میں لینے کے لیے بروئے کار لائی گئیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے ساری جدید غزل غالب کے لہجے، جہت اور مزاج سے متاثر ہے اور اس میں رہبر، رہزن، سایا، جنوں، قلم، خنجر اور خون وغیرہ الفاظ کے نئے علامتی مفاہیم براہِ راست غالب سے آئے ہیں۔ مثلاً فیض کے کلام کو لیجئے جو گہرے سیاسی شعور کے لیے بہت مشہور ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فیض کس قدر غالب سے متاثر تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے دو مجموعوں یعنی "نقشِ فریادی" اور "دستِ تہہ سنگ" کے نام تک غالب سے مستعار ہیں، اپنے متعدد اشعار میں بھی فیض نے غالب سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فیض صاحب کا ایک مصرعہ ہے سے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور غالب کا مصرعہ ہے ع

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اسی طرح فیض کہتے ہیں ع

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اور غالب کا شعر ہے سے

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اس کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے کلام میں ایک ایسا ذہن کار فرما نظر آتا ہے جو بیسویں صدی کے متحرک ذہن کا پیش رَو ہے۔ غالب سیاسی مد و جزر ہی کے ناظر نہیں تھے بلکہ سماجی معاملات کے سلسلے میں بھی خاصے باشعور تھے اور فکری اعتبار سے تو وہ بیسویں صدی سے ایک بڑی حد تک ہم آہنگ بھی تھے۔ گویا جس فکری اور سیاسی موسم میں فیض نے ساری عمر بسر کی، اسی سے ملتے جُلتے فکری اور سیاسی موسم سے غالب بھی اپنے زمانے میں متعارف ہوئے تھے۔

کچھ یہی صورتِ حال ان دونوں کے شعری اسلوب کے سلسلے میں بھی نظر آتی ہے۔ دونوں کے ابتدائی کلام میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی فراوانی ہے — اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ کے ہاں فارسی پیرایۂ اظہار نے پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا جس سے بعض اوقات شعری لطافت گنجلک اسلوب کے بارِ گراں تلے دب گئی جب کہ فیضؔ نے فارسی الفاظ کو بالعموم بڑی نفاست سے اس طور استعمال کیا کہ وہ دل کی آواز بن گئے۔ بعد کے کلام میں دونوں نے فارسی آمیز پیرایۂ اظہار کو ایک بڑی حد تک ترک کر کے سہلِ ممتنع کو اپنایا — اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ کے ہاں سادہ گوئی میں معانی کے نئے نئے ابعاد اُبھرتے چلے آئے اور ان کا کلام شعریت اور لطافت کی آخری حدوں کو چھونے میں کامیاب ہوا جب کہ فیضؔ کے ہاں تخلیقی کرب کے منہا ہو جانے کے باعث سادہ گوئی کے عمل نے شعر کو نثر کی سطح تفویض کر دی اور فیضؔ صاحب شعری اخفا سے محروم ہو کر نعرہ بازی کی سطح پر اُترنے چلے آئے۔ تاہم دونوں کے ہاں اسلوبِ شعر کے سلسلے میں جس طرح کی تبدیلی آئی وہ ان کے شعری مزاج کی مماثلت ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں میرؔ کی سادہ گوئی شروع سے آخر تک قائم رہی اور راشدؔ کے ہاں فارسی سے شغف کا جو انداز ابتدا میں اُبھرا تھا وہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دمِ آخر تک موجود رہا۔

خاتمۂ کلام سے پہلے میں ایک اور دلچسپ مماثلت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ غالبؔ اور فیضؔ دونوں قید و بند کے تجربے سے گزرے اور دونوں کو قمار بازی کے الزام میں سزا ملی — اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ پر تو عام سی جُوا بازی کا الزام تھا جب کہ فیضؔ سیاسی نوعیت کی قمار بازی کے مرتکب ہوئے۔ جُوا بازی کی نوعیت کے فرق کے باعث ان دونوں کے ہاں نتائج کا فرق بھی مرتب ہوا، وہ یوں کہ غالبؔ کو تو بدنامی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور اُس کے لیے زمانے کا سامنا کرنے کی سکت نہ رہی مگر فیضؔ کو قید و بند کے واقعے نے پر پرواز عطا کر دیئے اور وہ ہر دلعزیزی کی ایک گرم و گداز فضا میں شہرت کے ساتوں افلاک کو پار کر گئے۔ مگر پھر اس کے کچھ دیگر اثرات بھی مرتب ہوئے بالخصوص تخلیق کاری کے سلسلے میں! غالبؔ جس کے دل میں پہلے ہی خراشیں اور دراڑیں پڑ چکی تھیں، اس حادثے کی تاب نہ لا کر ایک تمثال دار آئینے کی طرح کرچ کرچ ہُوا مگر پھر شکستہ ہو کر نگاہِ آئینہ ساز میں عزیز تر ہو گیا اور یوں تخلیقی اعتبار سے آخری دم تک فعّال رہا جب کہ فیضؔ کا آئینۂ دل جو ذاتی سطح کے واقعات اور حادثات سے متاثر ہو چکا تھا، قید و بند کے واقعے سے مزید کچھ متاثر تو ہوا مگر پھر اس کے بعد زمانے کی طرف سے ملنے والی محبت اور عقیدت نے ان کے آئینۂ دل کی کرچیوں کو اس خوبصورتی سے جوڑ دیا کہ فیضؔ اُس داخلی شکست و ریخت ہی سے محروم ہو گئے جو تخلیقِ فن کے لیے بہت ضروری ہے۔ قید و بند کے واقعے کے بعد غالبؔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور اُس کی رُوح کا زخم ناسور بن گیا تھا مگر فیضؔ قید و بند کے واقعے کے بعد اندر سے جُڑ گئے اور ان کا زخم مندمل ہو گیا۔ لہٰذا زندگی کے آخری بیس سالوں میں ان کے ہاں تخلیق کاری کا گراف بتدریج زمیں بوس ہوتا چلا گیا جب کہ غالبؔ تخلیقی اعتبار سے دمِ واپسیں تک پوری طرح "زندہ" رہا۔

پچھلے موسموں کا پھول

آلِ احمد سرور

مظہر امام اس دور کے ایک ممتاز اور صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ یوں تو انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان نظموں کو اربابِ نظر نے سراہا بھی ہے۔ مگر دراصل ان کے دل و دماغ اور سوز و ساز کا زیادہ بھرپور اظہار ان کی غزلوں میں ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں ان کی تحریریں بھی ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں اور "آتی جاتی لہریں" کے نام سے شائع شدہ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے میں ایک رچا ہوا ذوق اور ایک شگفتہ اسلوب ملتا ہے۔ ہماری کلاسیکی سرمائے پر ان کی نظر گہری ہے، اور فکر و فن کے نئے میلانات سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ شائستگی، ذوقِ سلیم اور دردمندی ان کی شخصیت ہی نہیں، ان کی شاعری کی بھی خصوصیات ہیں۔ اس سے پہلے ان کے کلام کے دو مجموعے "زخمِ تمنا" اور "رشتہ گونگے سفر کا" شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا مجموعہ "پچھلے موسموں کا پھول" ان غزلوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنے کشمیر کے قیام کے زمانے میں کہی ہیں۔ بیشتر غزلیں رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، لیکن اس مجموعے کی اشاعت سے ان کی خصوصیات کو سمجھنے اور آج کی غزل میں ان غزلوں کا مقام متعین کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے۔ یہ اشارے، کنائے، رمز و ایما، کم سے کم الفاظ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ کام لینے، معنی کی کئی پرتوں کو برتنے، مدھم چراغوں کی لَو سے ذہن میں چراغاں کرنے کا فن ہے۔ یہاں سورج کی تیز روشنی کا گزر نہیں، چاندنی کا جادو جگایا جاتا ہے۔ غزل قدما سے لے کر اب تک بہت سے رنگوں، سمتوں، تجربوں، وارداتوں، کیفیتوں اور جلووں کو جذب کر چکی ہے تجربے کے شوق میں یہ غزل بعض آداب سے بغاوت پر بھی آمادہ رہی ہے، مگر مجموعی طور پر یہ زندگی کی ہر منزل، ذہن کی ہر کروٹ اور مزاج کے ہر موڑ کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ یہ سادہ سی شاعری نہیں ہے لیکن شاعری کی ایک اہم، قابلِ قدر اور جاندار صنف ہے۔ یہ نہ "نیم وحشیانہ" ہے، نہ "گردن زدنی"۔ اس کا فن ہمارے صدیوں کے ریاض کا ثمرہ ہے، اور اس میں ہماری زندگی، تہذیب، ماحول، روایت، مزاج اور مخصوص ذہن کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے۔ یہ دو اور دو چار کا فن نہیں ہے۔ یہاں بیان کی نہیں، حسنِ بیان کی کارفرمائی ہے۔ یہ تنظیم، تفصیل، تسلسل اور تعمیر سے بے نیاز، اپنے اشاروں، اپنے نشتروں اور اپنی فضا آفرینی کے ذریعے سے اپنی طاقت کا لوہا منواتی ہے۔ یہ ذاتی تجربات کو آفاقی جہت دیتی ہے۔ یہ کاروبارِ شوق کو زندگی کے ہر رنگ میں دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ یہ حدیثِ دلبری بھی ہے اور صحیفۂ کائنات بھی۔ مگر صحیفۂ کائنات کو بھی یہاں حدیثِ دلبری کا رنگ و آہنگ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

جدید غزل میں تغزل کا وہ جلوہ ہے، جس کے پیچھے اس دور کے کرب، آگہی، نشے، زہر، احساس اور عرفان کی کئی جہتیں ملتی ہیں۔ کچھ غزل گو فن کے کلاسیکی دروبست کا لحاظ رکھتے ہیں، مگر ان کے احساس کا ذائقہ چونکہ نیا ہے، اس لیے ان کی غزل کا مزاج بھی روایت کی توسیع کی نمائندگی کرتا ہے۔ یکسر انحراف کی نہیں۔ ہاں، جن لوگوں کے یہاں نئے احساس نے کلاسیکی فن کے آداب کا سایہ قبول نہیں کیا اور شاہراہ پر چلنے کے بجائے پگڈنڈی پر چلے ان کے یہاں نیا اظہار بے راہ روی یا گمراہی کا مترادف بن جاتا ہے۔ میں تجربات سے ہمدردی رکھتا ہوں، مگر روایت کو یکسر فراموش کر دینے کو ذہنی کج روی اور گمراہی سمجھتا ہوں۔ ساری روایت کو کھنگالنے، کسی معمولی بسری روایت کو زندہ کرنے، کسی پرانی رو کو نئی آب و تاب دینے سے ہی معنی خیز تجربہ وجود میں آتا ہے۔ ان پٹری پر چلنے کا نام نہیں، مگر سفر میں سمت کا احساس تو ضروری ہے۔

مظہر امام کی غزلوں میں مجھے روایت کی پاسداری کے ساتھ نئے احساس اور عرفان کی جلوہ گری ملتی ہے۔ یہ نیا احساس، حسن کے نت نئے کرشموں اور عشق کے نت نئے آداب کی عکاسی میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور زندگی اور اس کی فتح و شکست، امید و بیم، حوصلوں اور حسرتوں، زخموں اور الجھنوں کی آئینہ بندی میں بھی۔ بظاہر یہاں جسم کی پکار ملے گی، مگر یہ جسم کی پکار روح کی فریاد کے ساتھ ہے، اس لیے گہرائی اور معنویت رکھتی ہے۔

مظہر امام کے تجربے کے مخصوص محور کیا ہیں؟ ان کی شاعری میں کن موضوعات اور ان کے متعلقات کا ذکر بار بار آتا ہے؟ کیا ذات اُن کے لیے سب کچھ ہے یا کائنات بھی؟ وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ وہ رومانی مزاج رکھتے ہیں یا حقیقت پسند ہیں؟ وہ کیا صرف سماجی انسان ہیں یا اپنی خوشیوں اور غموں، اپنی محرومیوں اور مسرتوں میں گرفتار ہیں؟ — ان سوالات کا جواب پانے کے لیے ہمیں اُن کے ان اشعار پر نظر رکھنی ہوگی:

جانے کس سمت چلوں، کون سے رُخ مُڑ جاؤں
مجھ سے مت مل کر زمانے کی ہواؤں میں بھی

بلائے شام کے سائے تھے اور وادیٔ دل
اگرچہ صبح کا چہرہ دُھلا دُھلا سا تھا

ہم کو ملا تو سایۂ ابرِ سیہ ملا
ورنہ اس آسمان پہ شمس و قمر بھی تھے

دھوپ میں پہلے پگھل جاتے تھے لوگ
اب کے کیا گزری کہ پتھر ہو گئے!

اب دیکھیے کہ فصل ہو کس کے نصیب میں
میں تخمِ خواب رات کی کھیتی میں بو گیا!

مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا
زمانہ سرپھرا ہے، اور میں ہوں

کس سلیقے سے مُہریں لگائی گئیں
لب جو کھولے کسی نے، اچنبھا ہوا

کب دھنک سو گئی، کب ستارے بجھے
کوئی کب سوچتا ہے ترے شہر میں!

کوئی خوشبو کی جھنکار سنتا نہیں
کون سا گُل کھلا ہے ترے شہر میں؟

اب کیا یہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے
وہ شہر تو کب کا جل چکا ہے

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

ہر ایک شخص کا چہرہ اُداس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے

وہ بے جہت کا سفر تھا، سوادِ شام نہ صبح
کہاں پہ رُکتے، کہاں یادِ رفتگاں کرتے!

مظہر امام ترقی پسندی سے چلے تھے، وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے، مگر اُن کا شمار جدیدیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ان دونوں

میلانات سے انہوں نے اپنے ذہنی سفر میں اثر قبول کیا ہے۔ اُن کے پاس حساس ذہن ہے اور وہ زندگی کے اس آشوب سے، جو آج کے دور سے
عبارت ہے، آشنا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ خواب کے ساتھ شکستِ خواب، شہر کے ساتھ اُس کا دھواں، دھوپ کے ساتھ پتھر لگ، صبح کا دُھلا دُھلا
چہرہ اور جلانے شام کے سائے، زمانے کی ہَوا اور اُس کی من کی موج۔ سلیقے سے ٹھہریں لگانا، اُداس چہرے —— مظہر امام کے یہاں ایک داستان
سکتے ہیں۔ یہ عصری حسیت کی داستان ہے۔ اس میں وہ چیختا ہوا سماجی شعور نہیں ہے، جو ہمارے ایک دَور کی خصوصیت تھا۔ اس میں اپنے زخموں
کو کھجانے اور ان سے لذت حاصل کرنے والا مریض ذہن بھی نہیں ہے۔ جو کبھی کبھی آج کی غزل میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اس میں ایک زخمی
رُوح کی فریاد ہے۔ مگر فریاد کی لے فن کے آداب کے مطابق مدھم، اس لیے زیادہ اثر انگیز ہے۔ غزل کا فن ایک طور پر UNDERSTATEMENT
کا فن ہے۔ میرؔ کے حسبِ ذیل اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ — کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا مُنہ

کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوانہ تھا

یہاں الفاظ شور نہیں مچاتے، سینہ کوبی نہیں کرتے۔ چیخوں سے آسمان سر پہ نہیں اٹھاتے۔ لیکن ان کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ ہمارے
دور میں ایک طرف تو سماج کی تنظیم ہمارے خوابوں اور منصوبوں کے مطابق نہیں ہے۔ دوسری طرف جبر بھیس بدل بدل کر سامنے آتا رہتا ہے۔ تیسرے
ہر طرح کے ہنگامے اور فسادات نے زندگی کو ایک بھیانک خواب (NIGHT MARE) بنا دیا ہے۔ مظہر امام کے شعری تجربے بھی دراصل
اپنے کم کہنے میں اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ ہم زندگی کے ان المیوں کو گویا اپنے احساس کی انگلیوں سے چھو لیتے ہیں۔

جدید دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اب معاشرہ فکر کا محور نہیں ہے، بلکہ وہ فرد ہے جو اس معاشرے میں سانس لے رہا ہے۔ کچھ لوگ
اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ادیب اپنے معاشرے سے کٹ کر رہ گیا ہے اور صرف غمِ ذات میں گرفتار ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور ہو بھی
نہیں سکتا۔ ادب، فرد تخلیق کرتا ہے اور افراد کے تجربات ہی سے وہ فن کا رنگ محل بناتا ہے۔ اس لیے اگر سماج کے سمندر میں فرد کی ایک موج پر نظر
مرکوز ہوتی ہے۔ تو وہ بالآخر موجوں کے ذریعے سے سمندر ہی کی داستان ہوتی ہے۔ اور چونکہ براہِ راست اظہار سے بالواسطہ اظہار زیادہ اثر انگیز
ہوتا ہے، اس لیے رمز و ایما، تمثیل اور علامت کے ذریعے سے جو بات کہی جاتی ہے، وہ لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیتی ہے اور ہر لفظ اپنے
انسلاکات کے ذریعے سے ہیرے کی طرح ہر پہلو سے شعاعیں دینے لگتا ہے۔ غزل میں یہ گنجینۂ معنی کا طلسم، یہ پہلو داری، یہ سامنے کی بات کے
بجائے تہہ داری، دوسری اصناف سے زیادہ ہوتی ہے اور یہی اس کا جواز ہے۔ پھر اگرچہ غزل کاروبارِ شوق ہے، مگر یہ کاروبارِ شوق پوری زندگی
تک پھیلا ہوا ہے۔ یعنی حُسن اور عشق صرف حُسن اور عشق نہیں ہیں۔ زندگی کے دو زاویے، دو رنگ، دو جلوے ہیں۔ کسی نے کہا بھی ہے کہ عشقیہ شاعری
کو صرف معاملات تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے (گو معاملات کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے)۔ بلکہ اس میں جو جذبے کی گہرائی، لگن اور سپردگی ملتی ہے اور
اس طرح اس جذبے کے ذریعے سے زندگی کے سمندر میں تازہ غسل کرنے اور اس طرح زندگی کے متعلق ایک نئی بصیرت، ایک نیا عرفان حاصل کرنے کا موقع ملتا
ہے، اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ ذرا مظہر امام کے ان اشعار پر غور کیجئے:

کہا یہ سب نے کہ جو وار تھے، اُسی پہ تھے — مگر یہ کیا کہ بدن چور چور میرا تھا

نہ جانے موسمِ تلوار کس طرح گزرا
مرے لہو کا شجر تو جھکا جھکا سا تھا

وہ نام، جس کے لیے زندگی گنوائی گئی
نہ جانے کیا تھا، مگر کچھ بھلا بھلا سا تھا

اصرار تھا کہ ذکر ہماری طرف سے ہو
ورنہ ہمارے حال سے وہ باخبر بھی تھے

حنا اب درختوں پہ اگتی نہیں
مرے خون میں ہاتھ تر کیجئے

بیچ میں کچھ تو رہ و رسمِ تکلف رکھو
اجنبی یوں نہیں ملتے ہیں شناسا کی طرح

کشتیوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں
جتنے صحرا تھے، سمندر ہو گئے

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آنکھ، جو شیطاں بھی ہے، فرشتہ بھی!

آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

وہ پل کہاں ہے، جو دنیا سے جوڑتا تھا مجھے
جو پاؤں تجھ کو، تو سب سے قریب آؤں میں

جو تو ملا بھی تو وہ پل کا ساتھ تھا تیرا
مری جبیں پہ مگر کب سے خاکِ دنیا تھی!

جاگتی آنکھیں لٹاتی ہیں زر و گوہر ابھی
شہر سے لوٹے نہیں خوابوں کے سوداگر ابھی

بس میں، شکست و فتح مرا مسئلہ نہ تھا
یوں تو اسی محاذ پہ جتنے تھے، سب ملے

نہ مجھ میں ہی شعلۂ طلب تھا، نہ تم میں جوشِ سپردگی تھا
مجھے بھی احساسِ کمتری تھا، تمہیں بھی احساسِ کمتری تھا

اس سے پہلے سی عنایت کی توقع نہ رکھوں
اپنے صحراؤں پہ خود برسوں، گھٹا ہو جاؤں!

اس نے کس ناز سے بخشی ہے مجھے جائے پناہ
یوں، کہ دیوار سلامت ہو، مگر گھر نہ رہے

بظاہر یہ اشعار ایک ذاتی واردات کی نشاندہی کرتے ہیں، مگر معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ان اشعار میں وہ نظر ہے، جو عشق کی زبان میں زندگی کی داستان کہتی ہے۔ غمِ جاناں، غمِ دوراں ہو گیا ہے۔ جو تجربہ ہے وہ پہلو دار ہے۔ اور اب یہ صرف ایک عشق کا تجربہ نہیں رہا، زندگی کی پیچیدگی، اسرار، تضادات، تباہ کاری اور تازہ کاری، سب کا تجربہ بن گیا ہے۔ اردو غزل میں یہ بات شروع سے ہے، مگر اس دور میں اور نمایاں ہو گئی ہے اور مظہر امام کے یہاں تو خصوصیت سے آج کی زندگی کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک اور بات جو مظہر امام کی غزلوں میں مجھے قابلِ توجہ معلوم ہوئی، وہ اُن کی فضا آفرینی ہے۔ فضا آفرینی سے میری مراد یہ ہے کہ شعر میں تجربے کا ایک نقش ہی نہیں اُبھرتا، بلکہ کئی ہلکے اور گہرے رنگوں سے ذہن میں ایک منظر نامہ مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

رنگ در رنگ دھنک تھی کہ چھلک آئی تھی
یاد کا شہر، کہ آئینہ در آئینہ تھا

کیا پتہ تھا ایک دن تصویر بن جائیں گے ہم
خامشی چپکے سے آئے گی، صدا لے جائے گی

رُتوں کے ساتھ دلداری کی رنگت بھی بدلتی ہے
وہ ہر موسم سے گزرا ہے، مگر اکثر نہیں بدلا

مظہر امام لفظ کے رمز شناس ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ فن کے آداب جانتے ہیں۔ لفظ ان کے یہاں پھاوڑا یا تلوار

کاگا

سید احسن شیرازی

اگر "پالتو" پرندے کی تعریف میں مارے باندھے پنجرے میں قید کر کے "پالنے" کی شرط کم کر دی جائے تو یہ پرندہ صد فیصد "پالتو" ہے، کہ یہ پلتا ہے آپ کے گھر میں، آپ کی فصلوں پر، اور آپ کے باغات میں، غرض جہاں اور جیسے آپ "پلتے" ہیں وہیں اور ویسے یہ پلتا ہے۔ اور بزور بازو، اگر آپ کسی طوطا مینا کی قبیل کا کہ ئی پرندہ جائز ناجائز حربے سے زیرِ دام لا کر، قفس میں رکھ کر اُس پہ پالتو کی تعریف لاگو کرنا چاہیں تو اُس کا آب و دانہ محدود ہو گا، اُسے آپ اپنی مرضی یا حسبِ استطاعت خوراک دینا پسند کریں گے۔ لیکن اس کے بعد "ایک قیدی پرندے کی فریاد" یہ قسم کی نظموں کی تخلیق کا احتمال موجود ہے، اور یوں آپ کی نجابت پر بھی حرف آئے گا، ادھر این جناب کہ ہمہ وقت جو ملے قبول، آپ کی خورد و نوش کی ہر چیز میں اس کا "اشتراکِ مسلّم" اس حق سے آپ محروم کر سکتے ہیں اسے، نہ کوئی قانون یا تعزیر قادر ہے اسے باز رکھنے پر۔

آپ کی بیگم دودھ، مکھن، پنیر یا گوشت وغیرہ رکھ کر اندر کسی کام سے گئی ہیں، یہ اپنا حصّہ بقدرِ جُثّہ بانٹ کر چلتا بنے گا، آپ ماحضر تناول فرما رہے ہیں، اور اسے مدعو کرنے سے اغماض برت رہے ہیں۔ یہ ناخواندہ مہمان اس میں سے آپ کی آنکھ بچا کر یا آنکھ میں آنکھ ڈال کر صرف بوٹیاں وغیرہ اٹھا لینے پر اکتفا کرے گا۔

دیہاتی بچے خصوصاً اسے "پالنے" میں خاص کردار ادا کرتے ہیں، روٹی کے ٹکڑے ہاتھ میں لیے صحن میں یا گلی میں ہو نفے اڑاتے آئیں گے اور اپنے دوست کو کھلا کر تالیاں بجاتے (خالی ہاتھ) منہ بسورتے گھر لوٹیں گے، اگر اپنا حصّہ وصول کرتے اُس سے کچھ دراز دستی یا دست درازی کا مظاہرہ ہو جائے تو آپ کی وسیع القلبی سے ناک بھوں چڑھانے کا خدشہ نہیں، اس کے خوش خوراک ہونے کے قصّے عام ہیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ یہ جینے کے لیے ہی نہیں کھاتا، بلکہ کھانے کے لیے جینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ درسی کتب میں اکثر اسے اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا جاتا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسے قدرت نے خصوصی طور پر کسان دوستی کے لیے پیدا کیا ہے، آپ فصل بو کر گھر لوٹتے ہیں، آپ کا کام ختم ہو، اس کا دردِ سر شروع، یہ غلّہ کی ورائٹی، ہیئتِ ترکیبی، مضمرات اور اثرات سے متعلق ریسرچ پر کمر بستہ ہو جائے گا۔ ظاہر دانے کو اُٹھا کر چکھے گا، پوشیدہ دانے کو کھود کر نکالے گا اور اُس کا انیلسز کرنے کے لیے معدہ میں داخل کر دے گا، اور پھر دانہ تو مٹی میں مل کر گل و گلزار بننے کے شوق میں اپنی ہستی مٹانے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ اگر وہ ایک مفید جانور کی قوتِ لا یموت بن سکے

نہیں۔ نشتر ہے۔ اُن کی لے دھیمی مگر پُر سوز ہے۔ اس میں جا بجا موسمِ تلوار، وجود کی رِم جھم، پھول ٹانکنا، دلداری کی رنگت، خوشبو کی جھنکار، آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب۔ بھیگے ہوئے ورق، احساسِ کمتری، بے جہت کا سفر، شہر کا منظر جیسے الفاظ اس حیثیت کی ترجمانی کرتے ہیں جو اس دور کا خاصہ ہے۔ نشاط کے احساس کے ساتھ اور اس کے باوجود بھی حُزن کی فضا، اُن کے مزاج کا ہی نہیں، اس دور کے تجربے کا سچ بھی ہے مظہر امام کے تجربہ کا سچ، ہمیں جو بصیرت عطا کرتا ہے، اس کی قدر و قیمت مسلّم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی کہانی بقولِ سیماب بہت سوں کو "رودادِ جہاں" معلوم ہوگی۔ اچھی شاعری یہی تو ہوتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

معنیٰ کی دھنک بن کر الفاظ میں ڈھل جاؤ
تم موم ہو یا شعلہ، جو کچھ ہو، پگھل جاؤ

مظہر امام نے جن بحروں کا انتخاب کیا ہے، وہ بڑی مترنم اور شگفتہ ہیں۔ وہ قادر الکلامی ظاہر کرنے کے لیے بعض لوگوں کی طرح نامانوس بحروں میں شعر نہیں کہتے۔ اُن کی ردیفیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مصرع طرح پر نہیں کہی گئیں، بلکہ ان کے جذبات کے موڑ اور تجربات کے بہاؤ کی امین ہیں۔ اُن میں کشمیر کے حُسن اور دلنواز موسم کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ مگر مظہر امام کو فطرت سے زیادہ انسان سے دلچسپی ہے۔ وہ خاص طور سے یہ دیکھتے ہیں کہ "باہر" کچھ نہ بدلنے کے باوجود "اندر" کیا کچھ بدل گیا ہے!! ۔

پہلی بُوند سمندر

محمود ہاشمی

"پہلی بُوند سمندر" کے نام سے شائع ہونے والا فیروزہ جعفر کا یہ مجموعہ جو سترہ افسانوں پر مشتمل ہے، فنی تہذیب اور تخلیقی احساس کا ایسا آئینہ خانہ ہے، جس سے جدید اُردو ادب کے نئے بین الاقوامی منظر نامے کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

گزشتہ کچھ عرصہ سے ادبی رسائل میں جدید افسانے کے نام پر ایسی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں، جن میں فنی اقدار کی بجائے جبلّت، قانون کی جگہ مزاج، معاشرے کی بجائے نیچر، اخلاقی و فنی انضباط کی جگہ انفرادیت، جذباتی ہیجان اور تخیّل کی بے راہ روی کو اہمیت دی گئی۔ ان تحریروں کی وجہ سے جدید افسانے کی اُس تحریک کو نقصان پہنچا، جو اس صدی کی چھٹی دہائی سے شروع ہوئی تھی، اور جس کے ذریعہ نثر نگاروں نے اپنے افسانے کو شعر کی تخلیقی منطق سے وابستہ کرتے ہوئے یہ جواز پیش کیا تھا کہ اب افسانہ شاعری کی نسبت دوئم درجے کی تخلیق نہیں، بلکہ شاعری کا ہم نوا بھی ہے، اور اس کے ساتھ ہی اپنے عہد کی ایسی ذمہ دار تخلیق بھی، جو موجودہ صدی کو نثر کا عہد تصور کرتے ہوئے اُس کے مطالبات پورے کرنا چاہتی ہے۔

فیروزہ جعفر کے افسانوں سے جدید اُردو افسانے کو ایک بار پھر اپنا منصب، اپنا وقار اور اپنا اسلوب میسّر آیا ہے۔

ان افسانوں میں انسانی معاشرت کا وہ نیا محور ہے، جس میں مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ یورپ کے معاشرتی ماحول کا منظر نامہ پیش کرنے والے ان افسانوں میں ایک باطنی پس منظر بھی ہے، جسے فیروزہ جعفر نے اس طرح تخلیق کیا ہے کہ ہر افسانہ اپنے کردار کی داخلی اور نفسیاتی حقیقتوں کا آئینہ خانہ بن کر نمایاں ہوتا ہے۔

فیروزہ جعفر نے اپنے افسانوں میں چونکا دینے والے یا اہم اور غیر معمولی واقعات کی جگہ روزمرّہ زندگی کے خاکوں کو اہمیت دی ہے، اور ان خاکوں میں نفسیات اور معاشرتی کیفیات کے رنگوں سے انسانی رویّوں کو تلاش کیا ہے۔ عام جدید افسانوں کی طرح، معروض سے بے تعلق ہو کر تخلیق نہیں کیا، بلکہ اپنے افسانے کو ایک مکمل نظم کی طرح معروضی اور نامیاتی کُل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہ افسانے جدید عہد کے انسان کی روح کا سفینہ ہیں۔ فیروزہ جعفر نے جدید عہد کی زندگی کو، بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں اور منہدم ہوتے ہوئے عقائد کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اُن کے کردار اپنے سماجی اور نفسیاتی محاکمہ کی شدید اذیّت ناک منزلوں سے گزرتے ہیں، اور اس طرح اپنے عہد اور اپنے ضمیر کی بھٹی میں سُلگتے ہوئے، زندگی کی ناگفتہ حقیقتوں کے ترجمان بن جاتے ہیں —— مثلاً "اُس نے کہا" کا بے نام کردار، جو افسانے

یا خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے :

" گزشتے سال کا آخری حصّہ ہے ، نومبر کے مہینے نے ہر طرف خزاں کا ڈیرہ ڈال رکھا ہے ۔ درختوں کے پتّے ایک ایک کر کے جھڑتے جا رہے ہیں ۔ اب اگر کوئی زرد رنگ کا خشک پتّہ شاخوں پر لٹکا بھی رہ گیا تو کیا ـــ ؟ سبز رنگ کی شادابی تو رخصت ہو چکی ۔

آنے والی بہار میں اس سُوکھے ، بے رنگ پتّے کی طرف کون دیکھے گا ! اپنے باغ کے اس سب سے اُونچے درخت کو جب تکتا ہوں تو یہ پتّہ مجھ سے میری پوری توجہ مانگتا ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ سرسراتی ہوا کے ساتھ وہ میری زندگی کی ہر ساعت پر دستک دیتا ہو ، اور کہتا ہو ' تم بھی اب میرے ہی جیسے ہو ، خشک ، بے رنگ اور زندگی بھری سری ہری رگوں سے محروم ۔ ـــ میں اس اونچے سے درخت کی شاخ پر بس لٹکا ہوا ہوں ، اور تم بھی ' اس مصروف شور مچاتی دُنیا میں تنہا خشک پتّے کی مانند کھڑکھڑا رہے ہو ۔ اس کھڑکھڑاہٹ کے لیے تم پوری توانائی استعمال کرتے ہو تاکہ تم اپنے وجود کا یقین دلا سکو ۔ کب تک یہ کوشش کرو گے ـــ سُوکھے پتّے کی زندگی کتنے دن کی ہے ۔ "

(اس نے کہا)

یہ ایک ایسے بے نام کردار کا احساس ہے ، جو زندگی بھر مذہبی خطابت کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں کو درس دیتا رہا ، اور خود مختلف راہوں سے زندگی کی نعمتوں سے سرشار ہوتا رہا ۔ پھر جب خود ذہنی طور پر اُسے اپنے لفظوں کی ، اپنی خطابت کی بے معنویت اور کھوکھلے پن کا اندازہ ہوا تو اُس کا وجود اپنے ضمیر کی بھٹّی میں جُھلس کر تمام توانائی سے محروم ہو گیا ۔

اس افسانے میں ایک علامتی پہلو تو وہ ہے جو " سبز رنگ کی شادابی " سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اگر اس علامتی مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ مخصوص معاشرے کی سیاسی ابتری کا احوال نمایاں ہوتا ہے ۔ دوسرا علامتی مفہوم خطابت سے متعلق ہے ۔ یعنی وہ لفظ ، جس کا عملی زندگی میں مفہوم سے حقیقی رشتہ نہ ہو ، وہ یکسر واہمہ اور سراب بن کر رہ جاتا ہے ۔

مفاہیم کی اس تہہ دار کائنات کے علاوہ فیروزہ جعفر کے افسانے ایک طرز کے تہذیبی محاکمہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے کرداروں کے سماجی اور نفسیاتی اضطراب کو اپنے فن کی فراست اور اثر پذیری سے اس طرح وابستہ کیا ہے کہ اُن کے بیشتر افسانے عصر حاضر کے انسان کا اعتراف بن جاتے ہیں ۔ مثلاً اُن کا افسانہ " سائے کا بوجھ " جس کا ایک کردار عذرا ہے ۔ عذرا بظاہر بے حد ثابت و سالم ہے ۔ لیکن اُس کے باطن میں ایک احساس کچھ اس طرح برقرار رہتا ہے کہ وہ اندر سے بالکل منہدم ہو جاتی ہے ۔ افسانے کے اختتام پر اصل حقیقت قلب ماہیت بن کر نمایاں ہوتی ہے ، اور عذرا ان الفاظ میں اپنے اعتراف کو منکشف کرتی ہے ۔۔

" تم مجھے جتنی گالیاں دینا چاہو ، دے ڈالو ـــ مگر آج میں اس وقت تم سے ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں ۔ مجھے اُس شخص سے نفرت تھی ، سخت نفرت ـــ میں نے اُس کے لیے کتنی بار ایسا ہی انجام سوچا تھا کہ وقت اُسے اپنی خطائیں معاف کرانے کی مہلت بھی نہ دے ۔

اُس نے میری زندگی میں زہر گھول کر رکھ دیا تھا ۔ میرے خواب آرزوئیں ، سب ہی کُچل دیے تھے ۔

سُنتی جاؤ ـــ بولو مت ـــ شادی کے پہلے دن سے خالد نے مجھ سے دیوانہ وار محبت کی ہے ۔ میں نے اس کی چاہت کا جب بھی جواب دینا چاہا ، ایک سایہ درمیان میں حائل رہا ۔ گہرے جذباتی لمحوں میں جب اُنہیں مضبوطی سے تھامنا

چاہا — سائے کے شکنجے نے مجھے جکڑ لیا۔ اُس نے مجھے جسمانی اور روحانی حبس دیا ہے — یہ کہاں کہاں مجھ پر حملہ کرتا رہا۔ مَیں خیانت نہ کرتے ہوئے بھی مجرم رہی۔ رنگ، خوشبو، چاہت، سب دُھندلکے میں گم ہو جاتے تھے۔ یہ سایہ بھوت پریت بن کر میرے وجود سے لپٹا رہا ہے — آج مَیں آزاد ہوں — "

(سائے کا بوجھ)

داخلی حقائق کے انکشاف کی ایسی ہی کیفیت، ایک دوسرے افسانے "بلاوا" میں بھی موجود ہے۔ لیکن "بلاوا" کی رومانہ، اعتراف کے باغیانہ اور انقلابی مرحلے تک پہنچنے سے پہلے خود کو حالات کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ دو افسانے عورت کے اعتراف و انقلاب اور سپردگی و بے چارگی کا بڑا خوبصورت مرقع بن کر سامنے آتے ہیں۔

فیروزہ جعفر کے افسانوں کا ایک اہم پہلو، اُن کا وہ نیا خارجی منظر نامہ ہے۔ جو برطانوی معاشرے میں آباد بیرونی اقوام کی کیفیات، اُن کے دُکھ درد، اُن میں موجود انسانی اقدار کا یکساں احساس اور ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی انسانی رشتوں کا احساس دلاتا ہے۔ آج کے یورپ میں بڑھتی ہوئی بے حسی، اقدار کا زوال، نوجوانوں میں باغیانہ اور سرکشانہ جذبہ — یہ کیفیات جن افسانوں میں تمام تر فنکارانہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوئی ہیں، اُن میں "ونڈر لینڈ کی ایلس"، "درد کے رشتے" اور "گیتوں کے دُکھ" جیسے افسانے شامل ہیں۔ عصرِ حاضر کے یورپی معاشرے پر لکھی ہوئی بعض وضاحتی کتابوں سے زیادہ آگاہی اور آگہی ان افسانوں سے حاصل ہوتی ہے۔

فیروزہ جعفر اپنے خارجی ماحول اور عمرانی گرد و پیش سے وابستہ ہو کر اپنے داخلی تخلیقی احساس سے اس کا رشتہ استوار کرتی ہیں۔ اس طرح اُن کے کردار اور کرداروں کا ماحول، اس عہد کی دستاویزی داستان بن جاتا ہے۔ یہ افسانے زندگی سے گریز کے نہیں، بلکہ زندگی کے تعارف و تجزیہ کی مثال ہیں اور اُردو افسانے کی نئی جہت سے ان کا مستحکم رشتہ ہے۔

ارضِ تمنّا

رحمان مذنب

جذبہ بیدار ہونا ہو، نصیبا بیدار ہو جائے تو ارضِ تمنا کے سفر کی صورت نکل آتی ہے۔ پھر قلب و نظر سے اپنے آپ راہ ہموار ہو جاتی اور اک نسیل بہہ نکلتا ہے۔ اوپر سے حکم ہوتا ہے، جوں جوں قدم اٹھتے ہیں، سیل بڑھتا پھیلتا اور ایک مقام پر جا کر بے پایاں ہو جاتا ہے۔ یہ مقام حیرت ہے۔ اللہ کے گھر اور نبیؐ کے شہر کی یہ بے بہا دین ہے۔ غلام الثقلین نقوی اس سے مالا مال ہو چکے اور ارضِ تمنا ہو آئے ہیں۔ ان کی تازہ تالیف 'ارضِ تمنا' اسی مقدس سفر کی روداد ہے۔

نقوی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ارضِ تمنا ان کی اچھی، بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ ظاہری اور باطنی حسن سے آراستہ ہے۔ یہ سفر ان کی کسی دیرینہ خواہش کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی تخلیقی کارگزاری کا صلہ ہے جو انہیں اب ملا ہے ورنہ وہ تو کسی اور ہی سوچ میں تھے۔ جسم و جاں کی توانائی انہیں کچھ نہ کرنے دیتی۔ پختہ قلم ادیب ہیں۔ قلم گھستے گھستے منجھ گئے ہیں۔ ارضِ تمنا کا حال قلم بند کرنے کے لیے اتنی ہی ریاضت کی ضرورت تھی۔ کتاب کا ہر لفظ بول رہا اور اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ اعلیٰ درجے کی تخلیقی کارگاہ کا مال ہے۔ ایسا کارنامہ صرف صاحبِ طرز ادیب ہی سرانجام دیتا ہے۔ یہ ان کی برسوں کی خون پسینے کی کمائی ہے اسی لیے اس میں زیبائی اور دلربائی ہے۔

جس طرح جنونِ عشق میں کوئے یار کی سمت بے ساختہ قدم اٹھتے ہیں اسی طرح 'ارضِ تمنا' کے لفظ بے ساختہ ٹپکتے ہیں جس سے ایک دل پذیر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قاری بے تکان ایک لازوال اور لافانی حیرت کدے کا حال پڑھتا اور سرشار ہوتا ہے۔ اندازِ بیان ایسا ہے کہ قاری کی ساری توجہ جذب کر لیتا ہے۔ اس میں تازگی اور شگفتگی ہے۔ قلم کی سُبک رفتاری ہے۔

مجھے غلام الثقلین نقوی کے بیشتر افسانے پڑھنے اور ادبی انجمنوں میں سننے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ دھیمے مزاج کے بندے ہیں۔ دھیمی چال چلتے ہیں لیکن ارضِ تمنا میں وہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تنفس کے مریض ہیں۔ صحت میری ہی طرح ناقابلِ رشک ہے لیکن اس پاک شہر نے ان کی مریضانہ کلفتیں دور کر دیں۔ وہ کہیں رکتے تھمتے ہی نہیں۔ ان کا قلم بھی ان کے قدموں کی طرح رواں دواں ہے۔ ان کے تمام افسانے ایک طرف اور یہ گراں قدر سفرنامہ ایک طرف۔ اس میں تیزی، تندی اور توانائی ہے۔ مجھے اس سفر کی ابھی توفیق ارزاں نہیں ہوئی لیکن 'ارضِ تمنا' سے اتنا تو ظاہر ہوا کہ یہ تجربہ ہر سفر کے تجربے سے کہیں زیادہ وقیع، انوکھا اور جاندار ہوتا ہے۔ وہ تجلیاں جو اللہ کے گھر اور نبیؐ کے شہر میں شب و روز نازل ہوتی ہیں، قلمکار کو غسلِ صحت دیتی ہیں، جسمانی طور پر بھی، جذبے کی سطح پر بھی اور فکری انداز سے بھی۔ قلمکار پرانی کینچلی اتار پھینکتا اور نئی اوڑھنی اوڑھ لیتا ہے۔ وہ نیا ہو جاتا ہے۔ جسم و جاں

اندازِ فکر و فن کا اعادہ کشیاب ہوتا ہے۔

نقوی اب تک شعری سطح پر زندگی گزار رہے تھے۔ ارضِ تمنا کے سفر سے کنویں کی تہہ میں روشنی پھیل گئی ہے۔ دل کے وہ گھرے گوشے منور ہوئے میں جو اب تک اندھیرے میں تھے۔ اس ایک سفر نے ان کی کایا پلٹ دی ہے۔

اُنہوں نے زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا لیکن ارضِ تمنا میں نیا پن تھا۔ نیا حُسن تھا ــــ پاکیزگی کی ایک عجیب کیفیت تھی۔ ان کے مشاہدے اور تجربے کا ارتقائی سلسلہ کچھ یوں مرتب ہوا۔

"شاہی مسجد کے مینار مجھ پر ہیبت طاری کر دیتے ہیں ..... اس مسجد کے معمار اور مہندس نے ان میناروں کو خدائے جبر و قہر کی علامت بنا کر کھڑا کیا۔ نہ جانے کیوں ؟ شاید اس لیے کہ انہیں ڈیزائن کرتے وقت اس نے نادر و متقی اورنگ زیب عالمگیر کے مزاج کو پیشِ نظر رکھا۔ مقبرۂ جہانگیر کے مینار مجھے ہمیشہ ان سرو قامت چھریرے ترک شہزادوں کی مثال نظر آئے جو انار کلیوں کے ساتھ بے وفائی کے مرتکب ہو کر نادم و شرمسار کھڑے ہوں۔ بلاشبہ حرم کعبہ کے مینار اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا مظہر ہیں لیکن جب ان پر میری پہلی نظر پڑی تو مجھے اپنے دل میں حیرت و انبساط اور سکون و قرار کی لوندیں ٹپکتی سنائی دیں۔"

یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو PERSONAL INVOLVEMENT کی انتہا کو پہنچا ہے۔ ارضِ تمنا میں یہی پرسنل انوولمنٹ کارفرما ہے۔ ذاتی تجربہ کی شمولیت ہی سے میسر آتا ہے۔ نقوی میں ایک اچھے افسانہ نگار کی خوبیاں موجود ہیں۔ اس سفر کے تجربہ نے ان کا تخلیقی درجہ بلند کر دیا ہے۔ کتاب اعلیٰ و ارفع ہے تو اس لیے کہ وہ نظارے میں پوری طرح جذب ہو گئے ہیں۔ لفظ نگینہ بنے تو اسی جذبے اور سرشاری کی بدولت ان کے رگ و پے میں سما گیا۔ اسی سے تجربہ میں چمک آئی ہے۔

ان میں تھوڑی سی رندی ہے لیکن ارضِ تمنا میں ان پر بادہ پیمائی اور سرمستی کی جو کیفیت طاری ہوئی اس نے ان کے فکر و اظہار بیاں کو جولانی بخشی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے تخلیقی پر پُرزے پوری طرح کھولے۔ ارضِ تمنا انہیں کہیں سے کہیں لے گئی ہے۔ ان کے سن و سال اور تجربے کی یہ بلوغت ہے۔ ارضِ تمنا نے انہیں نئی جوانی دے دی ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے تخلیق کا جو نادر و نایاب اور گراں قدر خام مال سمیٹا اسے سمیٹتے ہوئے دل جس طور دھڑکا اور آنکھیں بھیگیں، وہ کہاں تک، کس رنگ میں ان کے قلم کو سجائے رہے گا۔

بہر حال "ارضِ تمنا" ایک تجربے کی حکایتِ شیریں، ادب کا حسین سرمایہ اور حقیقت بیانی کا ایک قیمتی نمونہ ہے۔

ماجرا

منظر علی خاں

شریکِ سفر کا تصور ذہن میں آتے ہی انسانی طبیعت بے اختیار اپنے پہلو کا جائزہ لینے لگتی ہے شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ شریکِ سفر ٹھیک ٹھاک تو چل رہا ہے! کچھ لوگوں کے خیال میں یہ جائزہ اس بات کے لیے بھی لیا جاتا ہے کہ اس کا تعین کیا جا سکے کہ شریکِ سفر کہیں بہت آگے آگے تو نہیں جانے لگا ہے۔ ویسے شریکِ سفر کو آگے بھیجنے میں جہاں متعدد فوائد ہیں وہاں کئی نقصانات بھی ہیں۔ فائدے پر روشنی ڈالنا بہرحال میرے اختیار میں نہیں کہ سُنی سنائی باتوں پر عموماً نہ میں یقین رکھتا ہوں اور نہ انہیں آگے بڑھاتا ہوں، ہاں از خود وہ آگے بڑھ جائیں تو اور بات ہے۔ اب رہی بات نقصانات کی تو ان کی کھوج لگانے کے لیے برادرِ عزیز جناب محسن بھوپالی سے رجوع کرنا پڑا، جن کی شناخت عام طور پر لوگ "شریکِ سفر" کے حوالے سے کرتے ہیں۔ میرا اشارہ ان "غیر شریکِ سفر" کی طرف ہے جو بقول محسن بھائی خوبیٔ تقدیر سے آسودۂ منزل ہو گئے اور ادھر بھائی محسن بھوپالی لوگوں کو ایک عرصے سے سیاستِ دوراں کی نیرنگی دکھانے میں مشغول و مصروف ہیں اور پاکستان کے ہر شہری کو اپنا یہ شعر ؎

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اب تک یاد کرا چکے ہیں۔ بات شریکِ سفر سے غیر شریکِ سفر کی طرف جا پڑی ہے لہٰذا اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر عرض کرنا چاہوں گا کہ اس مضمون کا عنوان "شامِ شریکِ سفر" طے کرتے وقت ایک ذرا اُلجھن سی محسوس ہوئی، یعنی چھوٹی سین کے پہلو میں دو بڑی شینوں کا ٹکراؤ مجھے کئی واقعات یاد دلا گیا۔

یہ ایک عرصہ قبل کا ذکر ہے جب ہم اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے، رہتے تو خیر اب بھی بڑے بھائی کے ساتھ ہی ہیں لیکن اب بڑے بھائی کا "محلِ وقوع" تبدیل ہو چکا ہے۔ سامعینِ کرام میں ذکر اُن دنوں کا کر رہا ہوں جب ہمارے بنگالی بھائی ہمارے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ مہینہ یہی تھا یعنی جنوری کا، اور تاریخ تھی یکم — میں نے صبح ہی صبح اپنے ایک دوست جناب جلیل کو فون پر نئے سال کی مُبارکباد روایتی انداز میں دی یعنی HAPPY NEW YEAR TO YOU تو فوراً ان کا جواب آیا: شیم ٹو یُو (SHAME TO YOU) مجھے شرم بہرصورت نہیں آئی، شاید اس لیے کہ میں نے جلیل صاحب کو اپنا تعارف "ذلیل" کہہ کر خود کراتے بارہا سُنا ہے یعنی "آمی ذلیل آشی"۔

سامعینِ کرام: جناب محسن بھوپالی کو شاعرِ شریکِ سفر کہہ کر میں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے یا شریکِ سفر کے ساتھ یہ بات ابھی تصفیہ طلب ہے، رہی بات "غیر شریکِ سفر" کی تو جیسا کہ مشہور ہے اُس نے تو منزل کو پہلے ہی جا لیا ہے اب اس کے ساتھ کوئی کیا زیادتی کرے گا۔ ہاں وہ خود اس طرف مائل ہو تو اور بات ہے۔ بہرحال میں یہاں جناب محسن کی شناخت کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میرے سامنے کا یہ شعر ہے ـ

میری شناخت مجھ سے طلب کر نہ اے زمیں
پھر زیرِ بحث آئے گا تیسرا جواز بھی

میرا تعلق زمین سے تو بہرحال ہے کہ خلاء میں معلق ہونے کا رواج ابھی پاکستان میں عام نہیں ہوا لہٰذا اس شعر کی زد مجھ پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور پڑتی ہے بشرطیکہ یہ فیصلہ ہو جائے کہ کون سی زمین پر میں کھڑا، بیٹھا یا لیٹا ہوں یا لیٹنے والا ہوں ویسے لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا لیٹنا مشکوک ہے کہ سامنے بحرِ عرب ہے جہاں اور دوسری سہولتوں کے علاوہ بآسانی غرقابی کی سہولت موجود ہے جس کی دعا حضرت غالب مانگتے رہے کہ -

ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا

آخر کو ہم بھی غالب کے قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں -

صاحبو — بات ہو رہی ہے جناب محسن بھوپالی کی، جن کے مجموعۂ کلام "ماجرا" کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے کتاب کی پشت پر جناب محسن کی تصویر ہے جسے دیکھ کر بآسانی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مشاعرے میں یہ اُس وقت اُتاری گئی جب محسن بھائی ہُوٹ کرنے والوں کا سراغ لگا رہے تھے - تصویر کے ساتھ ساتھ کچھ اعداد و شمار اور تاریخیں بھی لکھی ہیں یعنی سب سے اوپر ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء لکھا ہے اور اس کے نیچے ایم اے اُردو (کراچی) اور سہ سالہ ڈپلوما (این ای ڈی) - ہمیں ان تاریخوں سے یہ پتہ چلا کہ جامعہ کراچی اور این ای ڈی دونوں سے لوگوں میں بالترتیب تقسیم ڈگری و ڈپلومہ شروع کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ۲۹ ستمبر ۳۲ء کو جناب محسن کا یومِ پیدائش بھی بتاتے ہیں اور اس کے ڈانڈے برِصغیر میں ان کی ولادت کے فوراً بعد پے در پے رونما ہونے والے سن ۳۴ اور ۳۵ کے عظیم زلزلوں سے ملاتے ہیں — چونکہ کتاب میں اس ضمن میں کوئی اشارہ موجود نہیں لہٰذا ہم نے اسے برائے تحقیق اسی طرح گرہ میں باندھ رکھا ہے جس طرح محسن بھوپالی کے بیشتر اشعار لوگوں نے جمع کر رکھے ہیں کہ ان پر تفتیش و تحقیق کی جائے کہ یہ کیوں کہے گئے، کب کہے گئے، کس حال میں کہے گئے اور سب سے سوا یہ کہ انہیں سننے کے بعد سامعین کا کیا حال ہوا، مثلاً -

ہماری جان پہ دُہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اپنا یہ حسبِ حال شعر کسی مشاعرے میں کسی معاملہ فہم سامع نے بطورِ خاص جنابِ محسن کو سُنایا تھا - جسے اکثر یہ دونوں عذاب بھگتنے پڑے تھے -

خواتین و حضرات!

آپ نے دیکھا ہوگا اکثر کتابوں میں بہت سی باتیں عرض کرنے کے بعد مصنف علیحدہ سے بھی کچھ عرض کرتا ہے یا یہ فریضہ ناشر سرانجام دیتا ہے - ان عرض داشتوں میں کیا کچھ ہوتا ہے اس سے آپ سب آگاہ ہیں جنابِ محسن کے "ماجرا" میں بھی "عرضِ مصنف" کا شعبہ موجود ہے جس میں مصنف نے پہلے ایڈیشن میں پیش لفظ شامل نہ کرنے کا ذکر کیا ہے اور اہلِ نقد و نظر کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے پیش لفظ اور فلیپ شامل نہ کرنے کے باوجود ان کے ... کو تقویت پہنچائی - اس "تقویت" کے حصول کے بعد مصنف نے یہ کیا کہ دوسرے ایڈیشن میں پیش لفظ شامل کر دیا - اب اہلِ نقد و نظر کے اعتماد کے ضعف کا کیا ہوگا، اس کے کھوج لگانا میرے لیے آسان نہیں -

سامعین کرام!

بات آگے بڑھانے سے قبل جنابِ محسن کا ایک شعر پیش کرنا چاہوں گا ۔

بات کہنے کی ہمیشہ بھولے   لاکھ انگشت پہ دھاگہ باندھا

حالانکہ ایک محتاط اندازے کے مطابق جنابِ محسن کہنے کی باتوں کے علاوہ پچاس فیصد وہ باتیں بھی کہہ گئے ہیں جو کہنے کی نہ تھیں۔ کسی کو اگر اس حقیقت سے انکار ہو تو وہ ان کے "نظمانے" کا مطالعہ کرلے جس کے حسنیت کے متعلق ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ جنابِ محسن کا ایک "نظمانہ" ہے خفظِ ماتقدم ؎

چونکہ تھا اُس کے دل میں

بھی تو

نقلی بھائی کہہ کر بہت مطمئن ہے

اُسے کیا خبر !

میری بیوی بھی ——— میری

چچیری بہن ہے۔

اسے بھائی شرف اس نظمانے کو سُن کر بولے "اگر شعر و سخن میں چچیری، خلیری و پھوپھیری بہنوں کا رواج عام ہوگیا تو شعر سُننے سے پہلے شاعر کے پورے شجرۂ نسب کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔" ——— بات نظمانے کی چلی ہے تو ایک اور نظمانہ ملاحظہ کیجئے، عنوان ہے "وجۂ بیگانگی" ؎

ایک افسر سے جب میں نے پوچھا

کہ بھوپال سے ——— آپ کا بھی تعلق رہا ہے؟

تو بولے

رہا ہے ——— مگر

میں تو بچپن میں ہی

خیرپور آگیا تھا

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کے لیے جنابِ محسن نے لکھنؤ کی جگہ خیرپور لکھا ہے اور ایڈیٹر کی جگہ افسر لکھا ہے ورنہ یہ نظم صریحاً جناب صہبا لکھنوی کے لیے کہی گئی ہے جنہوں نے افکار میں نظمانہ شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ —— بہر حال یا تو صہبا صاحب بچپن میں بھوپال سے لکھنؤ آئے تھے یا لکھنؤ سے بھوپال گئے تھے مگر خیرپور یا خیرنگر کسی طور نہیں گئے تھے جس کے متعلق جناب عالیتاب تشنہ کے شعر میں کچھ ذکر موجود ہے۔

بچپن کا وہ شہزادہ کیا یاد نہیں تشنہ

ملنے اُسی بالک سے ہم خیرنگر جائیں

جنابِ محسن کے نظمانے کے ساتھ جناب تشنہ کا شعر میں نے صرف اس لیے پڑھا کہ اس سرد موسم میں کچھ تو گرمیٔ محفل کا سامان ہو۔ آخر یونہی تو جنابِ تشنہ خیرنگر نہیں جاتے تھے، سُنا ہے اُن کے ہاتھ میں میرؔ کا دیوان بھی ہوتا تھا۔ یہاں یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ دونوں شعراء نے خیرپور و خیرنگر کا ذکر کیا ہے جبکہ شاعری کا زیادہ تر واسطہ بجائے خیر کے شر سے رہا ہے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اب اس مختصر سے مضمون کے آخر میں جناب محسن بھوپالی کا ایک نظمانہ بطورِ خاص پیش کرنا چاہوں گا تاکہ حقیقتِ حال کا کچھ پتہ چل سکے اور دوسرے لوگ بھی اگر چاہیں تو فائدہ اُٹھا سکیں یوں بھی اس نظمانے میں جس کا عنوان "کمرشیل بیوی" ہے، جیمخانے کا ذکر بھی موجود ہے، جہاں آج یہ خوشگوار تقریب برپا ہے ؎

"بڑے ساب" سے

ساری باتیں طے کر لی ہیں

آج رات تم جیمخانے میں

خود بھی ان سے مل لینا

اور ہاں

رخصت ہوتے وقت یہ کہنا

ٹھیکہ "بلیک اسٹار" کو دیں!

سامعینِ کرام! جب تک ٹھیکے کا فیصلہ ہو، جنابِ محسن کے بے شمار اچھے اشعار میں سے ایک بہت اچھا شعر سُن لیجیے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اچھے اشعار اب شعرائے کرام بیرونِ ملک ہی جاکر پڑھتے ہیں۔ درونِ ملک وہی پینتیس غزلیں ہیں جنھیں گزشتہ سال سے سُنایا جا رہا ہے۔ اِس صورتِ حال پر اگر اعتراض کیجیے تو تو جواب ملے گا کہ صنعت کاروں سے کوئی نہیں پوچھتا جو (EXPORTABLE ITEMS) ہمیشہ ہی اعلیٰ بناتے ہیں اور گھر کی مُرغی کے لیے دال کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔ ہمیں شعرائے کرام کے اس رویّے پر اعتراض نہیں کہ وہ باہر جاکر ہمیں دینار و درہم لاکر دیتے ہیں، تشویش کی بات صرف یہ ہے کہ خود بھی دینار کے ساتھ واپس چلے آتے ہیں۔ بہر حال فی الوقت تو آپ جنابِ محسن بھوپالی کا شعر سُنیے:

شاید اگلی فصل میں مہکیں محبت کے گلاب

اس کے پودوں کو محسنؔ خوں دیے جاتا ہوں میں

خواتین و حضرات ــــ اس ناچیز کو اب اگلی فصل تک کے لیے اجازت دیجیے ــــ شکریہ!

تو کیا بُرا، جب دانہ اُگنے کا عمل شروع کرتا ہے تو اُسے اُکھاڑ کر دیکھتا ہے کہ یہ فی الحال روئیدگی کے کن مراحل سے گزر رہا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ اس دانۂ گندم کی کونسی پشت سے ناطہ ہے اُس دانے کا جس نے حضرت آدمؑ کو بیٹھے بٹھائے جنّت سے کھینچ نکالا۔ کچھ اس لیے بھی کہ دانہ واقعی گل وگلزار بن بھی پا رہا ہے کہ بس دعوی ہی ہے خالی خولی جو دانے بچ رہیں اور اُگنے پر بضد ہوں، اُن کی تلاشی کرتا ہے فصل پک کر تیار بھی نہ ہو پائے گی ابھی کہ یہ خدائی فوجدار موجود، ہر سٹے، ہر بالی کی رکھوالی کرے گا۔ دانہ دانہ چکھ کر دیکھے گا کہ کوئی ایسا دانہ معرضِ وجود میں تو نہیں آ رہا جس سے نقصان کا احتمال ہو اُس کے دوست کسان کو۔

اگر آپ خوش بختی یا بدقسمتی سے کسی باغ واغ کے بھی مالک ہیں یا چلو ٹھیکیدار ہیں تو اس سلسلہ میں بھی دستگیری کرے گا آپ کی، ہر اوّل نمبر دانہ پر اپنے نام کی مُہر دیکھ کر نوش فرمائے گا اور پس خوردہ چھوڑ دے گا غریب غربا کے لیے،
یہ پرندہ کسان کی ہر حال اور ہر موقعہ پر استمداد کرنا فرض جانتا ہے اپنا، اُس کے ڈھور ڈنگروں کی خبر گیری اور رکھوالی اس کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے، اگر آپ کی گائے بھینس یا بیل کے جسم پر جوئیں وغیرہ سے زخم آگیا ہے تو یہ ابتدائی طبی امداد کے لیے حاضر، زخم کو ہر وقت ہرا بھرا رکھے گا۔

اس کے تعلقات حضرت عزرائیلؑ سے ہمیشہ قابلِ تعریف حد تک خوشگوار رہے ہیں۔ کوئی جانور مرنے کے قریب ہو تو اسے بذریعۂ خاص میسجز اطلاع ملتی ہے، اور یہ اپنی مسلّمہ رقیق القلبی کے باعث قلیل عرصہ کے نوٹس پر، معہ اپنے عملہ فعلہ کے میل، فی میل نرسز، لیبارٹری اٹنڈنٹ سامانِ جراحت وغیرہ کے آموجود ہوگا۔ ساتھ ہی خیمہ وخرگاہ، نہ جانے کب تک چلے یہ سلسلۂ دراز خودی بارگاہِ ساخت پر عمل کرتے ہوئے امدادی کیمپ برپا ہو جائے گا۔ پہلے پہل نرسز کو پیشنٹ پر اپنے نازو انداز آزمانے کا حکم ہوگا۔ گدگدانے کا اشارہ ملے گا، اگر مریض ہنسنے بولنے کی سٹیج سے گزر چکا ہے تو نبضیں ٹٹولنے کو کہا جائے گا۔ نبضیں بھی ڈوب رہی ہوں تو اُن سے ممکنہ حد تک بلڈ سیمپل لے کر لیبارٹریز میں بھجوانے کا اہتمام ہوگا۔ رزلٹ حوصلہ فرسا ملنے پر جسم کے ہر حصّہ پر جراحت کا انتظام ہوگا۔ آخری ہیلتھ بلیٹن سے معذوری کا اظہار ہو تو آنکھوں کو آئی بنک (معدہ) میں محفوظ کرنے کے (جبراً وقہراً) انتظامات ہونے لگیں گے۔ اس ضمن میں کاگا سب تن کھائیو اور نیناں مت کھائیو، جیسے فرسودہ اور ازکار رفتہ اشعار کا خیال، وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔
اس سارے تحقیقِ جدید پر مبنی معالجہ کے باوجود اگر کوئی جانور خُلد آباد بسانے پر بضد ہو تو "صلائے عام" کا اِذن ہوتا ہے اور اِس دعوتِ طعام وقیام میں محمود وایاز سب ایک صف میں نظر آئیں گے آپ کو۔

اِس مفیدِ خلائق پرندے کی شاہی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اس سلسلہ میں عقاب (یا شاہین سہی)، کو جب آئیڈیل کے طور پر پیش کیا گیا تو اس جانور کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا، حالانکہ عقاب کی ذات اس پرندے کے مقابل اتنی بھی ستودہ صفات نہیں، وہ ہمیشہ خود سے کمزور پہ ہاتھ ڈالے گا، اور چڑیوں سے کبوتر تک ہی اُس کی شاہی کا حدود اربعہ ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ کبھی دیکھا آپ نے عقاب کو جھپٹتے ہوئے اِس جناب پر؟ حالانکہ اِسے، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دیکھا ہم نے دو ایک بار گوشت کھاتے عقاب کا، (طبعی موت مرے ہی سہی) پھر اسے تو مرے ہوئے کم ہی دیکھا ہوگا کسی نے، شاید حضرت خضرؑ نے جب سکندر کو آبِ حیات سے باز رکھا تو یہ غچّہ دے گیا اُنہیں بھی۔
دریا ہو یا جنگل، آبادی ہو کہ ویرانہ یہ پرندہ موجود ملتا ہے ہر جگہ، سُنا ہے کہ ہر ذی روح سے زیادہ ہے اس کی آبادی، واللہُ اعلم، پھر یہ انٹرنیشنل شہری نہ ویزے کا چکر نہ پاسپورٹ کا ٹنٹا۔ اِدھر سے کھاپی، کسی ہمسایہ ملک میں جا کائیں کائیں کرے گا۔

خیمۂ خواب

ڈاکٹر معین تابش

ہر عہد میں شاعری کی تفہیم کے لیے مختلف النوع نظریات و محرکات کارفرما رہے ہیں اور الگ الگ مکاتبِ خیال کے ماننے والوں نے اس کے لیے الگ الگ حوالے اور ضابطے مرتب و متعین کیے ہیں۔ بعض نے شاعری اور پیغمبری کے منصب کے اتحاد کی تبلیغ و ترویج کی تو بعض نے اپنے معاملاتِ قلب کی ترجمانی کا وسیلہ قرار دیا اور بعض نے اس کی روح میں ایسی انقلاب آفرینی بھر دینے کی تمنا کی اور اس کے لیے اس عصری آئینہ داری اور عکاسی کو جزوِ لازم قرار دیا جو شعری لطافت کو سماجی مسائل کی صد رنگ کیفیت سے ہم آہنگ کرنے کی سبیل نکال سکے۔ یہ تمام باتیں عمومی طور پر تمام فنونِ لطیفہ اور خصوصی طور پر شاعری کو احاطہ کرتی ہیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈس نے چند مختلف فیہ خیالات کے باوصف شاعری یا شعر کے ذریعہ انسانی شخصیت و وجود اور اس کے شعور کی جس نفسیاتی تشریح و تعبیر کی بات کی ہے مذکورہ بالا نکات اس کا خلاصہ ہیں۔ پھر آگے چل کر وہ مابعدالطبیعاتی تناظر سے سائنسی اور عقلی تناظر کی طرف پیش قدمی کی بات کرتا ہے اور وہاں بھی شعر یا شاعری کا داخلیت (شعریت) سے خارجی عوامل (نظریات) تک کے ایک وسیع سفر کا اشارہ ملتا ہے۔ غزل کا مطالعہ بھی ان دائمی شعری اقدار کے پیشِ نظر بے حد دلچسپ اور بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔

میں نے جب اسعدؔ کو 'خیمۂ خواب' کے حوالے سے کھوجنا شروع کیا تو غزل کے ان تمام اوصاف کی پرتیں ایک نئے انداز سے کھلنے لگیں اور محسوس ہوا کہ اس ایک کتاب کا مطالعہ دراصل غزل کی اس خوبصورت روایت کا مطالعہ ہے کہ شعریت اور قلبی اضطرار کی تازگی جس کا بابِ اوّل ہے اور انسانی مسائل و معاملات کی وسعت جس کی انتہا۔ درونِ ذات سے کائنات تک کا یہ اشتغال ہر اچھی اور بڑی شاعری کا منبع و مخزن ہے۔ اسعد بدایونی کو میں نے 'خیمۂ خواب' سے پہلے بھی جانا اور پہچانا اور اس کے بعد بھی ان کی شعری افتاد کا میرا مطالعہ جاری و ساری ہے لیکن فی الحال میں صرف اور صرف اسی کتاب کے حوالے سے گفتگو کروں گا۔

ہمعصر غزل گو شعرا نے تازہ ترین شعری رجحانات سے غزل کے نئے مزاج کی تنظیم کی ہے ایسا میرا یقین ہے لیکن انہیں محدودے چند نے ہی نئے رجحانات کو غزل کی مہتم بالشان روایت سے جوڑے رکھنے کی کوشش روا رکھی ہے ایسا میرا خیال ہے۔ ۶۰ء کے بعد یقیناً غزل کے تازہ امکانات نمودار ہوئے ہیں لیکن بلا مبالغہ وہی شعرا نئی غزل کے دوام کی ضمانت ہیں جنہوں نے روایت اور جدت کے متوازن انضمام کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان دانائے راز شعرا میں اسعدؔ کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے قابلِ قدر شعری روایات سے اکتسابِ حُسن کرتے ہوئے اس تازہ کار شعری نظام کی دیانت میں اپنے ان دوسرے اہم ہمعصروں کا ساتھ دیا ہے جو ماضی اور حال کے انسلاک کے حُسنِ عمل میں مصروفِ کار ہیں اور جن کا یہ

عمل بذاتِ خود ایک اعلیٰ ترین فنی اور شعری تحریک ہے۔

یہ دیکھنا ہے کرن کس طرف سے گذرے گی
کھُلے ہوئے ہیں دریچے بھی میری آنکھیں بھی

شاعرانہ اسلوب کی تازہ کاری میں ایمائیت اور رمزیت کو اہم خصائص میں شمار کیا گیا ہے۔ اسعدؔ کے یہاں یہ عنصر ایک انوکھے انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے اور بڑے گہرے اشارے نہایت سادہ اور سہل باتوں میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ درد ان اشعار کی کیفیات کا محور ہے لیکن عام شعرا کی طرح اس کا راستہ یاسیت اور قنوطیت کی طرف نہیں جاتا۔ محبت اس شاعری کا فنی ایمان ہے لیکن وہ عام شعرا کی طرح محبت کو طلسمات کا اسیر نہیں کرتا۔ اس محبت میں آفاقیت سے زیادہ ارضیت ہے جسے ہم عصری تقاضوں کی نکتہ شناسی کا نام دے سکتے ہیں یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا شاعر محبت اور محبوب کو کوئی مابعد الطبیعاتی علیحدگی عطا کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ بلا تکلف دوسرے استعاروں کی طرح اس کی شناخت کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ محبت کے تجربے شاعر کو یعنی آج کے سچے شاعر کو ایسے بیش قیمت تجربے سے آشنا کرتے ہیں جو اس کے جہان کو متنوع کیفیات کی آگاہی سے سیراب کرتا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں اب کے بڑا کمال ہوا
مجھے اس بچھڑتے وقت سے ذرا نہ ملال ہوا
اب یادِ سفر کا قصہ ہے بس اتنا سا
مجھے پیاس لگی، مرے ہونٹ جلے میں نڈھال ہوا
زیاں رسیدہ جزیرے بھی میری آنکھیں بھی
بکھر رہے ہیں کنارے بھی میری آنکھیں بھی
گداز برف جو خورشید لمس سے پگھلی
تو رو اُٹھے کئی چشمے بھی میری آنکھیں بھی

مندرجہ بالا اشعار مضمون میں بے ساختگی، اظہار میں ندرت، زبان میں چاشنی اور احساس میں شدت کے لحاظ سے بے نظیر ہیں اور دل و دماغ تک رسائی کے لحاظ سے بے مثال۔ ان میں ہر شعر بڑی سرعت کے ساتھ محسوسات کو متاثر کرتا ہے اور فکر و آگہی کی مدد میں دور تک اپنے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ پہلے شعر میں ایک انوکھا خیال، دوسرے شعر میں ایک خوبصورت تجربے کا تحیر خیز ارتقا، تیسرے شعر میں ایک منفرد شعری لہجہ اور چوتھے شعر میں وصال کا ایک نادر نفسیاتی تجزیہ۔ یہ سب ان اشعار کی وہ جہات ہیں جو ان کے مطالعے میں مزید تلاش و جستجو کا رنگ و روغن بھرتی ہیں۔ اس قبیل کے چند اور حسین اور تہہ دار نمونے دیکھیں۔

مَیں اپنی رات کو تاریک تر بناتا ہوں
پھر اسے چراغ تجھے معتبر بناتا ہوں
مَیں ایک شاخ کو تلوار کر کے لڑتا ہوں
مَیں اک گلاب کو اپنی سپر بناتا ہوں

چشمۂ وصل اور کتنی دُور ہے
اب تو لگتا ہے قیامت ڈھونڈنا

بس اک چراغ ہے اپنی متاعِ بیش بہا
سو شام آتی ہے ہم اسے جلاتے رہیں

ان اشعار میں ایک بھی شعر ایسا نہیں جس میں کوئی بات کہے گئے انداز میں کہی گئی ہو یا کوئی خیال براہِ راست خود کو دہرا رہا ہو۔ یہ اسعد کا شعری کمال ہے کہ وہ اپنے شعروں میں ہر خیال کو تازگی اور ہر طرز کو ندرت تفویض کر دیتے ہیں۔ ایک طرف یہ اشعار تھے جن میں اکثر قلبی واردات نئے رنگ و آہنگ میں پیش کی گئیں، محبت اور ہجر و وصال کے تجربے بڑے ہی تیز اثر احساس کے ساتھ رقم کیے گئے اور اب چند ایسے اشعار بھی شعریاتِ اسعد کے مطالعے کے نئے ابواب کھول سکتے ہیں جن میں عصری مسائل کی پیشکش ہے۔ عصری مسائل سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ قتل و غارت گری، تخریب و تباہی اور افراط و تفریط کی منظر کشی کی گئی ہے بلکہ یہ کہ خالص احساساتی کیفیت سے الگ ہو کر کچھ ایسی باتیں جو لوحِ نگاہی پر اپنے نقوش مرتسم کر سکیں اور شدّتِ احساس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک قسم کا فکری آہنگ بھی موجود ہو۔

تھی چہروں کی پہچان مجھے اس جُرم پہ ظالم لوگوں نے
مرے سر کو نیزے پر رکھا مرے دل میں ترازو تیر کیا

پھر بستی پر کیا قہر اُترنے والا ہے
کیوں لوگوں میں رونے کی عادت عام ہوئی

مجھے بھول کے نادم مت ہونا اے اگلی نسلوں کے بچّو!
ہاں اپنے بزرگوں کا ماتم کبھی تازہ پھول نہیں کرتے

ابھی ان نیزوں کی تشکیل میں ہے کتنی دیر
جن پر اک روز یقیناً مرا سر ہونا ہے

اپنے بازو ہی علم کرنا ہیں ہر مقتل میں
اپنا سینہ ہی بہر حال سپر ہونا ہے

ہم تو اس ساعتِ سفاک کو روتے ہیں میاں
جب اُفق پار نہ رنگوں کی سواری نکلے

کہا جا سکتا ہے کہ اسعد کے یہاں "گہے ایزد و گہے اہرمن" کی کیفیت پوری طرح موجود ہے۔ ایک طرف وہ قلب کے اسرار سربستہ کے امین ہیں تو دوسری طرف فکر و معنویت کے جگنو ان کے اشعار کے جنگل میں جھلملاتے ہیں۔ عشق کی آشفتگی تسلیم کہ اس نے اسعد کو شعریت اور رومانویت سے ہی مالا مال نہیں کیا بلکہ ان کی شخصیت کو بھی سحر انگیز بنا دیا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ علی گڑھ اور بدلیوں کی نرم سبز فضاؤں میں جینے والا یہ عشق کا بندہ اپنے اشعار اور اپنی فکر میں حیرت انگیز عصریت رکھتا ہے۔ گمشدگی اور عصریت کے امتزاج نے اس کے اشعار کو دو آتشہ کر دیا ہے: اس کا سفر ہجر کی رات سے شروع ہوتا ہے اور کسی صبحِ آئندہ کی تلاش کا استعارہ بنتا ہے۔

دل سرائے میں بہت سے رنگ شرماتے ہوئے
آسمانوں پر ہویدا اک کرن ہوتی ہوئی
ایک منظر خیمۂ مژگاں سے کب ہوگا طلوع
ایک ساعت سارے لمحوں سے جدا کب آئے گی
سات رنگوں کی کماں ہوگی اُفق پر کب نمود
مژدۂ خوش منظری لے کر ہوا کب آئے گی
بارشِ گریہ رکی ، بادل پھٹے ، سورج ہنسا
دھوپ اُتری زینہ زینہ آسمان روشن ہوا

آخری بات جو اس کھوج کے بعد میرے سامنے آئی وہ اسعد بدایونی کی شخصیت اور خیمۂ خواب کی شاعری کے درمیان کا دلچسپ تضاد ہے ۔ اسعد کی شخصیت میں بلا کا انتشار اور بے یقینی کی کیفیت ہے جب کہ یہ غزلیں نظم و ضبط اور ترتیب و تنظیم کی بہترین مثال ہیں۔ شاعر سے مل کر تھوڑی دیر کے لیے اس کے بکھراؤ سے بوریت کی کیفیت پیدا ہونے کا خدشہ بنا رہ سکتا ہے جب کہ اس کی ان غزلوں کے مطالعے کے بعد ایک خاص مسرت انگیز تاثر رگ و پے میں اُتر جاتا ہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان ایسا تعجب خیز تضاد کیوں ہے۔ بقول سعد یہ بہار ...... کا ہی عطیہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کتاب کا انتساب بھی بہار کی اس بہار کے نام ہی ہے ۔

پتھریلے چہرے

اختر امام رضوی

کتاب پتھریلے چہرے میں فی الواقع پتھر کے بہت سے چہرے ہیں لیکن ان کا ادراک کرنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ چہرے دیکھنے والے کا اپنا پتھر چہرہ جس میں صرف آنکھیں متحرک ہوں۔ حقائق کے لاتعداد سوچوں کے درمیان یک بیک گھل گیا ہے اور متحرک آنکھیں پتھر ہو گئی ہیں۔ اور پتھریلے چہرے کے مطالعے کا تجربہ، میرے لیے اس اعتبار سے بالکل نیا تھا۔

میں نے کتاب کے آغاز میں معروف اہلِ قلم اور ماہرینِ انتقاد کی آرا پڑھ کر اندازہ لگایا تھا کہ شمع خالد نے اکثر خاتون ادیبوں کی طرح فہمیدہ ریاض کو کہانیوں میں دہرایا ہوگا۔ صرف معروف افسانہ نگار جناب رشید امجد کے اس خوبصورت جملے نے کہ "شمع خالد کی کہانیاں اپنے عہد کے وہ منظر نامے ہیں، جن کے دریچوں سے اُن کا عصر جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔" مجھے چونکایا — اور میں شمع خالد کے اپنے پیش لفظ کو پڑھے بغیر پتھر چہروں کے گنجان شہر میں اُتر گیا۔

جوں جوں میرے گرد پتھریلے چہروں کا ہجوم بڑھتا گیا میرا پہلا تاثر اور اس کے ساتھ ساتھ میری کیفیات بھی بدلتی رہیں۔ ایک دو سلگتے ہوئے جملوں کو چھوڑ کر میں نے پہلا افسانہ "ہونی" گویا ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالا اور سوچا قریب المرگ بیوی سے بے وفائی کرنے والے آصف کے دماغ کی رگ پھٹنی ہی چاہیئے تھی۔ دوسرے افسانے مونٹ ایورسٹ میں مجھے رس ملائی ایسے ہونٹوں والے ڈبل روٹی نما جسم پر مکھن لگا ہوا دیکھ کر کراہت سی پیدا ہوئی۔ اسی طرح تیسرے افسانے میں مجھے اپنے چھوٹ موٹ کے پریشان بیٹے کے لیے اپنا سارا اثاثہ قربان کر دینے والی دادی اماں کے موت کے کرب سے لتھڑے ہوئے چہرے اور اکڑی ہوئی لاش سے کچھ ہمدردی پیدا ہوئی — چوتھے افسانے بے لذت گناہ میں میں نے پھر بہت سی رس ملائیوں اور ڈبل روٹیوں کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن اگلی کہانی پتھریلے چہرے نے جیسے میرے قلب و وجدان کو اپنے حصار میں لے لیا۔

اپنی طرز کے اس جدید افسانے کے مرکزی کردار نوشی کو کئی ایک پتھریلے چہروں نے گھیر رکھا ہے، اس کا دکھ یہ ہے کہ اسے بستی کے ہر شخص کا چہرہ پتھر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے — اور جب معاشرے کے دکھوں کا علاج کرنے والوں کے چہرے بھی پتھر ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو پتھر کے ریزوں میں بکھرتا ہوا محسوس کرتی ہے۔ یہ تاثراتی کہانی اپنی اثر آفرینی میں اس قدر شدید ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد میں نے بھی اپنے چہرے کو ٹٹول کر دیکھا —

اس کے بعد کی کہانیاں آدھا مرد، اَنا کا سفر اور پچھتاوے، شمع خالد کی کامیاب کہانی کاری کی دلیل ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں،

"کسی معمولی واقعے کے غیر معمولی پن کو دیکھنے اور دکھانے کی صلاحیت کوئی معمولی بات نہیں ہے"

ان کہانیوں کے بعد ایک افسانہ واچ ڈاگ ہے —— موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ، ذات کے بے ساختہ اظہار پر اُن معاشرتی پابندیوں اور عصری خوف و ہراس کا ایک مربوط تذکرہ ہے جن کے باعث ہم میں سے اکثر اپنی ذات کے لیے ایک لمحہ جئے بغیر چپکے چپکے مرتے رہتے ہیں اور ایک دن جب ہم پورے مر جاتے ہیں تو زمانہ ہمیں بھول کر کسی اور کو ایثار، مفاہمت یا مصلحت کی سولی پر لٹکا دیتا ہے، یہ افسانہ اس معاشرتی المیے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور ہاں یاد آیا اس سے پہلے کی کہانی —— میرے بچپن کے جگنو —— بظاہر جنریشن گیپ کے موضوع پر ایک اچھوتی کہانی ہے لیکن اس سے جو تاثر قائم ہوتا ہے اس کے ڈانڈے بھی واچ ڈاگ ہی سے جا ملتے ہیں، اس کہانی میں بھی معصوم یادوں کے ننھے جگنو جب روح کا تعاقب کرتے ہیں تو مجھے واچ ڈاگ کی آنکھوں کی طرح لگتے ہیں۔

یہ آنکھیں ان سے اگلی کہانیوں 'اپنا جہنم'، پہچان اور بانجھ لفافے سے کر خانوں میں بٹی ہوئی عورت تک میرا تعاقب کر رہی ہیں، میرے موم چہرے میں اٹکی ہوئی دو پتھر آنکھیں فرار کا راستہ تلاش کرنا چاہتی ہیں، لیکن بے سود ——

کتاب کے آخری صفحے تک پہنچتے پہنچتے / میرا موم چہرہ پھر پتھر ہو چلا ہے / لیکن اس کا مجھے کوئی دکھ نہیں / یہ نہ بھی ہوتا تو میں اپنے بانجھ لفظوں سے / —— اپنے ماضی کی ایک ننھی سی گڑیا شمع خالد کے جذبوں کے اس اظہار کے بارے میں اور کہہ بھی کیا سکتا تھا —— ؟

وزیر آغا | انتظار حسین کا "تذکرہ"

انتظار حسین کا "تذکرہ" بیک وقت ناول بھی ہے اور ایک خاندان کی خود نوشت سوانحعمری بھی! — سوانحعمری یوں کہ ہر زمانے میں اس خاندان کے کسی نہ کسی رکن نے اپنی ساری نسلی داستان کو قلمبند کیا ہے۔ بقول مصنف "اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر پہنچ کر تذکرہ لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔" — ناول یوں کہ اس میں انتظار حسین نے اخلاق کو مرکزی نقطہ مان کر اس کے گرد فاصلے فاصلے سے کئی دائرے اور قوسیں بنائی ہیں جو ایک ہی کہانی کے مختلف ابعاد کو سامنے لے آئی ہیں۔ دیکھنے کو تو اس کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے، وہی ہجرت کی سالخوردہ کہانی جو آدمؑ کی نقلِ مکانی سے شروع ہو کر اخلاق کی خستہ سامانی تک بار بار دہرائی گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کون سی بات اس دنیا میں دہرائی نہیں گئی ہے۔ اس کے باوجود ہر بات نئی بھی ہے۔ ہر صبح سورج نکلتا ہے اور ہر شام غروب ہو جاتا ہے مگر ہر دن دوسرے تمام دنوں سے مختلف اور منفرد ہے اس کا ایک اپنا مزاج، ایک اپنی خوشبو ہے۔ یہی حال انتظار حسین کے "تذکرہ" کا ہے جس میں پرانی داستان کو اس طور بیان کیا گیا ہے کہ اس کا لفظ لفظ اپنی انفرادیت کی دہائی دے رہا ہے۔

ہرمن ہیسے کے ناول JOURNEY TO THE EAST کا واحد متکلم اپنے سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ہمہ وقت حالتِ سفر میں ہے۔ اس کے باوجود اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بھی کھڑا ہے۔ صبح کے وقت وہ چین میں ہوتا ہے، شام کو مشرقِ وسطیٰ میں، جبکہ رات وہ یورپ میں گزارتا ہے۔ مگر یہ سفر محض افقی سطح تک محدود نہیں ہے کیونکہ وہ ہمہ وقت عمودی سطح پر سفر کرنے میں بھی منہمک ہے کبھی وہ پندرھویں صدی میں ہوتا ہے کبھی آٹھویں صدی میں اور کبھی بیسویں صدی میں۔ گویا جس SPACE-TIME CONTINUUM میں وہ سفر کر رہا ہے وہ مکانی اور زمانی، دونوں اعتبار سے ایک نقطہ پر موجود ہے۔ وہ بیک وقت ٹھہرا بھی ہوا ہے اور متحرک بھی! کم و بیش یہی صورتِ حال انتظار حسین کے ناول میں بھی ابھری ہے۔ بو جان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"وہ تو اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں کہ کتنے زمانے کہاں کہاں سے آ کر یہاں ملتے تھے اور خوش اسلوبی سے جدا ہو جاتے تھے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"عجب ہوا کہ بو جان کے چپ ہونے کے ساتھ ہمارے گھر میں بھی خاموشی نے ڈیرہ کر لیا۔ اس گھر میں بولنے، باتیں کرنے

کا سلسلہ تو بوجان ہی کی کسی بات سے شروع ہوتا تھا۔ اے دُلہن! اے بیٹے! اے لال! کبھی زبیدہ سے خطاب، کبھی مجھ سے خطاب! بس پھر شروع ہو جاتی تھیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ اگلے پچھلے قصے، کب کب کی کہانیاں۔ ایک ان کے دم سے کتنے زمانے، کتنے جُگ اس گھر میں دم لے رہے تھے۔ وہ چُپ ہوئیں تو جیسے اس گھر میں کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہی۔ سب زمانے رُوپوش ہو گئے!"

بُوجان ہی نہیں اس "تذکرے" کے دوسرے کرداروں کے ہاں بھی کتنے جُگ اور کتنے زمانے یکجا نظر آتے ہیں۔ مشتاق علی، پنڈت گنگادت بھیر، حتیٰ کہ خود اخلاق اور شیریں بھی دراصل کئی زمانوں کے سنگم ہیں۔ وہ بیک وقت دو دیسوں کے باسی ہیں۔ انتظار حسین پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ نوسٹلجیا میں مبتلا ہیں اور ہجرت کے تجربے سے وابستہ "افسوس" کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ بے شک "تذکرہ" میں بھی یہ نوسٹلجیا جابجا اپنی جھلک دکھاتا ہے اور احساسِ زیاں پڑھنے والے پر چھا بھی جاتا ہے مگر اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فقط ماضی نہیں اُبھرا، ماضی، حال اور مستقبل مل کر ایک ایسا سنگم بھی بن گئے ہیں جو زمانوں اور رنگوں کی کروٹوں اور خوشبوؤں کا گہوارہ ہے۔ بالخصوص اخلاق کے کردار میں ان تینوں زمانوں کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ وہ ماضی کی حسین یادوں میں بھی گرفتار ہے اور شیریں کے ساتھ مل کر ان کی بازآفرینی کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ چراغ حویلی اور اس کی بنیادوں میں دفن دیگر حویلیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک آنکھ میچ بھی لیتا ہے یوں لگتا ہے جیسے وہ ان تمام حویلیوں سے منسلک توہمات کو خندۂ استہزا میں اڑا رہا ہے۔ ساتھ ہی حال کے مسائل اور برق رفتاری سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا بھی اُسے گہرا احساس ہے، چنانچہ وہ اُن تبدیلیوں کے بہاؤ سے خود کو بچانے کے لیے ایک طرف تو چراغ حویلی کو اور دوسری طرف فطرت اور اُس کے مظاہر — ہارسنگھار کا پودہ اور اس پودے کے نیچے یا اس کی شاخوں پر کودتی ہوئی چڑیوں، بگلیوں اور گلہریوں کی دُنیا — کو بطور ایک لنگر استعمال کرتا ہے۔ ان نادر و نایاب لمحات میں جب وہ پرندوں کے ساتھ مل کر خود بھی ایک پرندہ بن جاتا ہے تو اس کے چاروں طرف کی اُتھل پتھل، اور افراتفری گویا رُک سی جاتی ہے۔ یہ لمحہ جسے ISNESS کے حوالے سے آج کے بہت سے مفکرین نے اپنا موضوع بنایا ہے اور جسے بعض نے کشف و عرفان کے حصول کا ایک ذریعہ بھی جانا ہے انتظار حسین نے اس ناول میں بطور ایک "لنگر" استعمال ہوا ہے جس نے ناول کے اخلاق کو ایک سنگم کی حیثیت دے دی ہے۔ مگر اس سنگم کا ایک جزو مستقبل بھی ہے۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی نظر آتی ہے کیونکہ اس ناول میں یا تو ماضی کا تذکرہ ہے یا پھر حال کا مگر مستقبل کہیں نظر نہیں آتا بجز کامریڈ کے شیخ چلی ایسے خوابوں میں جن کا مذاق مصنف نے قدم قدم پر اُڑایا ہے۔ لیکن اگر یوں دیکھیں کہ اخلاق کی زندگی میں تین چھلاوے ظاہر ہوتے ہیں اور تینوں کا تعلق مستقبل سے ہے تو بات آئینہ ہو سکتی ہے۔ ان میں سے ایک چھلاوہ تو وہ بے چہرہ ہیولیٰ ہے جو ابھی تھا اور اب نہیں ہے۔

"تو وہ کون تھا جو میرے پاس سے تیزی سے گزر گیا تھا۔ کون تھا وہ جو میرے برابر سے شام کے جھٹپٹے میں اس تیزی سے گزرا کہ میں اُس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا"

"مگر وہ کہاں گیا تھا۔ دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ وہ تو کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا وہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا"

"کتنی مرتبہ اپنے ہی قدموں کی چاپ پر چونکا۔ کتنی مرتبہ شک ہوا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے آرہا ہے۔ وہ میرا پیچھا کیوں کرے گا۔ مگر کیا خبر ہے۔"

اخلاق اس چھلاوے کے لمس سے تو آشنا ہوتا ہے مگر اس کے چہرے کے خدوخال دیکھ نہیں پاتا (مستقبل کے خدوخال کب کسی نے دیکھے ہیں!) وہ بار بار اس کا راستہ کاٹ جاتا ہے (بد رنگ بلی کی طرح) مگر اخلاق تعاقب کرنے کے باوجود اس تک پہنچ نہیں پاتا —— دوسرا چھلاوہ "گھنٹی کی آواز" ہے۔ یہ آواز بھی مستقبل کی جانب ہی سے آتی ہے۔ اخلاق اس پر اسرار آواز کو سنتا ہے مگر آواز کے پیچھے کا ہاتھ اُسے نظر نہیں آتا:

"پھر یہی گمان کہ جیسے دروازے پر کوئی ہے۔ جیسے کسی نے گھنٹی بجائی ہے...... کس تیزی سے میں دروازے پر آیا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

تیسرا چھلاوہ زکیہ احمد ہے جو بیک وقت ایک ہیولیٰ بھی ہے اور ایک دستک بھی، دراصل زکیہ احمد اخلاق کا ایک خواب ہے جس کی تعبیر کا کوئی امکان نہیں اور خواب ہونے کے ناتے وہ مستقبل ہی کی مخلوق ہے۔ ناول کے آخر تک وہ زکیہ احمد سے صحیح طور پر ملاقات نہیں کر پاتا۔ وجہ یہ کہ وہ تو ساری کی ساری فقط ایک "آواز" میں ہے۔ اگر ملاقات کر سکتا تو آواز فی الفور گوشت پوست کا ایک جسم اوڑھ لیتی اور مستقبل کا ہیولیٰ حال کی سوئی کی نوک سے گزر کر ماضی میں تبدیل ہو جاتا اور پھر زکیہ احمد اور شیریں میں کوئی فرق باقی نہ رہ جاتا۔

میں نے ابھی ابھی کہا کہ تذکرہ میں انتظار حسین نے SPACE-TIME CONTINUUM کا منظر دکھایا ہے جس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ زندگی اور کائنات زمانوں، لمحوں اور ہیولوں میں منقسم نہیں ہے۔ یہاں ہر کردار بیک وقت تینوں زمانوں کا باسی ہے اور اُفقی اور عمودی دونوں سطحوں پر ہمہ وقت موجود ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے کسی ایک سطح پر ٹھہر جائے یا کسی کا رن محض ایک زمانے سے جڑ جائے تو گویا رُک کر پتھر کا بت بن جائے۔ اس ناول میں "رُکنے" کا یہ عمل بعض کرداروں کے ضمن میں دکھائی بھی دیا ہے۔ مثلاً بوجان ہجرت کرتی ہیں اور نئے دیس اور نئے زمانے سے کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ کر لیتی ہیں مگر جب انہیں ایک اپنا گھر میسر آتا ہے تو وہ فی الفور اسے چراغ حویلی کا منصب عطا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ذات میں از سرِ نو کئی زمانے کروٹیں لینے لگتے ہیں اور وہ خود کئی زمانوں میں سانس لینے لگتی ہیں۔ ایسے میں جب پراپرٹی ڈیلر ایک خریدار کو ساتھ لیے ان کے گھر میں گھستا ہے تو بوجان کو ایک نئی ہجرت، ماضی سے انقطاع کا ایک نیا منظر دکھائی دینے لگتا ہے چنانچہ اس خدشے کے تحت کہ کہیں ان سے آشیانہ چھن نہ جائے وہ ساری کی ساری آشیانہ پر مرتکز ہو جاتی ہیں اور چونکہ آشیانہ دراصل چراغ حویلی کا نیا روپ ہے لہٰذا یہ ارتکاز اصلاً چراغ حویلی اور اس کے حوالے سے "ماضی" پر ہوتا ہے:

"وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگیں —— آج کل چراغ حویلی خواب میں بہت آ رہی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ رات کیا دیکھا کہ جیسے حویلی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ راج مزدور لگے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے صفائی ستھرائی ہو گئی ہے۔ کیسی چمک رہی تھی ماشاءاللہ! مردانے کے صحن میں چھڑکاؤ پر چھڑکاؤ....... پھر جیسے میاں جان ہیں۔ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے۔ چہرے پر ایسی رونق کہ کیا بتاؤں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ کتنی شفقت سے کہا کہ بہو تم آ گئیں۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔"

بوجان صرف خواب ہی میں چراغ حویلی میں داخل نہیں ہوتیں اپنی عام زندگی میں بھی وہ چراغ حویلی کے نام پر آشیانے کو اس طور گلے لگا لیتی ہیں کہ پھر کوئی انہیں اس سے جدا نہیں کر پاتا۔

یہی حال کا مرید کا بھی ہے۔ بوجان اگر ماضی کے ایک لمحے سے چمٹ کر رک گئیں تو کامرید مستقبل کے کسی لمحے سے اس بری طرح منسلک ہوا کہ

پھر واپس زمانۂ حال میں نہ آسکا۔ دراصل مستقبل اُس کے لیے سانپ کی آنکھ بن گیا تھا جس کے سحر میں پرندہ بے بس ہو جاتا ہے۔ ایک انجانا خوف اُس پر مسلط ہو گیا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے:

"ستار تم نے تو آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ مَیں تو دیکھ رہا ہوں کہ کیا ہونے والا ہے۔"

مصنف نے کامریڈ کے "مستقل طور پر" رُکنے کا منظر تو نہیں دکھایا لیکن بدرنگ بلی کے راستہ کاٹنے کا ذکر کر کے کامریڈ کی موت کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔

نوجوان ماضی سے چمٹ کر رکیں اور کامریڈ مستقبل سے۔ البتہ انتظار حسین نے حال کے لمحے پر رُکے ہوئے کسی کردار کے درشن نہیں کرائے تاہم اس کی جگہ دو علامتوں سے کام لیا ــــ ایک بم، دوسری پھانسی! پھانسی کا واقعہ اُس کے گھر آشیانہ کے عقب میں اور بم کا دھماکہ بھرے بازار میں ہُوا اور دونوں موقعوں پر لوگوں کا ہجوم "حال" کے منجمد لمحے کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا۔ حال کو جو لمحے کی نوک پر ٹھہرتے ہی گزر جاتا ہے، الگ کر کے دکھانا بہت مشکل تھا۔ انتظار حسین نے اس کے لیے پھانسی اور بم کے واقعات سے کام لیا اور اس میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے۔ کیوں کہ جب پھانسی ملتی ہے تو ماضی اور مستقبل، دونوں غائب ہو جاتے ہیں اور حال کا لمحہ دار پر لٹکا ہوا صاف دکھائی دے جاتا ہے۔ اسی طرح بم کے دھماکے میں خلقِ خدا کا سارا ارتکاز اُس نقطے پر ہوتا ہے جو مجسم تکست و ریخت ہے اور جس کے دائیں بائیں کچھ نہیں ہوتا۔ یوں بھی آج کے زمانے کو ان دو علامتوں سے بیان کرنا ہی مستحسن ہے۔ دونوں موت پر منتج ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک خاموشی میں اور دوسری بے پناہ شور میں خود کو منکشف کرتی ہے۔ علاوہ ازیں پھانسی سیاسی عمل کے ٹوٹنے کا اور بم سماجی نظم و ضبط کے پُرزہ پُرزہ ہونے کا ایک بلیغ اشارہ بھی ہے۔ دونوں "حال" کو اس کی تمام تر بہیمیت، بربریت اور عفونت کے ساتھ مادر زاد برہنہ کر دیتے ہیں۔ یوں کہ حال کی داغدار پیشانی سب کو دکھائی دے جاتی ہے۔ پھر حال کی پیشانی کا داغ تمام پیشانیوں پر اُبھر آتا ہے۔

"تذکرہ" سیدھی لکیر پر نہیں چلتا۔ اس میں جا بجا موڑ اور غلام گردشیں ہیں۔ اس کے کردار لمحہ بھر کے لیے ایک ملک میں نظر آتے ہیں، پھر دوسرے ملک میں۔ پھر تیسرے ملک میں۔ اسی طرح وہ صدیوں کو یوں پھلانگتے پھرتے ہیں جیسے ہرڈل ریس دوڑ رہے ہوں۔ بہت کم ناولوں میں ایسی شعبدہ گری دیکھنے کو ملتی ہے جیسی "تذکرہ" میں کہ مصنف جب چاہتا ہے اپنے قاری کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں پہنچا دیتا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس عمل میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ اس ناول کے کردار آسیب کی طرح دیواروں اور زمانوں میں سے گزر جاتے ہیں اور کسی بھی وقت کسی بھی جگہ نظر آ سکتے ہیں۔ مشہور کہانی THREE FACES OF EVE میں جب کردار کی ایک شبیہہ برآمد ہوتی تھی تو باقی دونوں صورتیں غائب ہو جاتی تھیں۔ "تذکرہ" میں سب شبیہیں اور ساری صورتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس کے باوجود کہیں کوئی گھپلا نہیں ہوتا اور قاری لحظہ بھر کے لیے بھی کسی بھول بھلیّاں میں پھنس کر اپنا راستہ نہیں بھولتا گو اسے بھول بھلیّاں کی موجودگی کا احساس ہمہ وقت کچوکے لگاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ انتظار حسین جب ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں جاتے ہیں تو ان کی گفتگو کا انداز اور لہجہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے بالکل جیسے EXORCIST میں لڑکی بات کرتے کرتے یکلخت بھاری بھرکم مردانہ آواز میں بولنے لگتی تھی۔ پُرانے زمانے کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے انتظار حسین کے اس ناول کے کردار داستانی پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہیں جبکہ حال یا مستقبل سے منسلک کردار آج کے دور کی زبان میں اپنی کہانی سُناتے ہیں۔ داستان کی زبان میں دائرے کا سا انداز ہے۔ ہر بات تشبیہہ استعارے سے مزیّن، چھم چھم کرتی اور ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ میں باندھتی سامنے آ جاتی ہے۔ زمانۂ حال کی زبان لوڈشیڈنگ

یہ جنم جنم کا آزادی پسند پرندہ ہے، آپ نے چوہے، بلی سے شیر تک اور طوطے، چڑیا سے "شاہین" تک سب کو باضابطہ زیرِ دام آتے اور خصائل خدمات بجا لاتے دیکھا ہوگا، لیکن شاباش ہو اس ذاتِ شریف کے لئے کہ نہ آیا تو یہ زیرِ دام، اور نہ قبولی تو اس نے غلامی، اگر کہیں دھوکے دھڑی سے پکڑ بھی لیں آپ اسے، تو راضی نہ ہوگا کبھی، کاٹ کھانے کو دوڑے گا، کھائے گا نہ پیئے گا، اور یوں بکا "مرن برت"۔ رکھے گا کہ دو ایک دن میں راہیٔ ملکِ بقا ہوگا۔ جب یہ باقاعدہ رحلت فرما جائے گا تو آپ اسے پھینک دیں گے بیچ چوراہے۔ پر اس کا خونِ ناحق چھپے گا نہیں، اور آپ کی آستین کا لہو پکارے گا پورے کرۂ ارض کے اس کے ہوتوں سوتوں کو، اس کے بہن بھائی، ماسیاں، پھپھیاں سروں پر دو ہتڑ مارتی آن موجود ہوں گی، اور "انتقام انتقام" کی "غیر مانوس" آوازوں سے حشر برپا کر دیں گی، ان کا ہراول دستہ آپ اور آپ کے خاندان پر حملہ آور ہوگا۔ چند ابتدائی جھڑپوں کے بعد باقاعدہ میمنہ، میسرہ، قلب و جناح ترتیب پائیں گے، رجز خوانی کے بعد مبارز طلبی ہوگی، اگر آپ چیلنج قبول کرنے سے گریزاں ہیں، تو عام حملہ کا حکم ہوگا، صفیں الٹ جائیں گی آپ کی، اگر سرینڈر پر فی الحال تیار نہیں آپ، اور قلعہ بندی میں عافیت سمجھتے ہیں تو پھر یہ جمِ غفیر اپنے مقتول کی میت پر وہ وہ نوحہ خوانی کرے گا کہ کلیجہ منہ کو آئے گا۔

روایت ہے کہ ہنسوں نے اپنا ایک سکالر اس پرندے کی متوازن اور صحت بخش خوراک اور "چال" وغیرہ پر ریسرچ کے لیے بھیجا، کہ اگر یہ سب کچھ مفید مطلب ہو تو اُسے اپنا لیا جائے، ان کے ایک مہمان پُرشی نے دریافتِ احوال کی۔ ادھر سے اپنی قوت بخش اور فرحت افزا خوراک پیش کی گئی، اور مستانہ چال چل کر دکھائی، اور ہنس اپنا سا منہ لے کر چل دیا کہ اسے اپنانا اُن کے بس کا روگ تھا نہ ممکن، پھر حق بحق دار رسید۔ کاگا ہی دیوان بنا ہمیشہ کے لیے۔

یہ بڑا باذوق پرندہ واقع ہوا ہے۔ دوسرے چوتھے ادبی میٹنگز برپا ہوتی ہیں ان کے ہاں۔ اس کے خاندان کا ہر فرد اس تنظیم کا کمپلسری ممبر ہے۔ یہ مجالس بیک وقت مشاعرہ، مناظرہ، مجادلہ، مقاتلہ اور "کوالی" پر مشتمل ہوتی ہیں، حاضری صد فیصد (کورم پورا ہونے کی شکایت نہیں ہوتی کبھی) ایک بڑے سر اور چھوٹے بھیجے والے مہاں کوتی یا (مہاں کوے) نے صدارت سنبھالی، طرح مصرع عرض ہوا، شعرا نے غزلیں "فی البدیہہ" سنانا (کہنا) شروع کیں، نظمیں ہوئیں، بچے بالے نثری نظمیں منمنانے لگے کہ وہ وزن، زمین قافیہ، ردیف کا جھنجٹ پالنا نہیں سیکھے۔ پھر کہانیاں، طویل، مختصر، علامتی، غیر علامتی، بعد ازیں طرزِ خاص پر غزل کی کوالی، جس میں ہاہا کا استعمال زیادہ اور الفاظ کا کم رہا۔ پھر شروع ہوا مجادلہ مقاتلہ، آخر میں لطائف پھر مصافحہ معانقہ اور کارروائی ختم سب چلے گھر کو۔

جہاں تک اسی کی گلوکاری کی صلاحیتوں کا تعلق ہے تو اس میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں، قدیم تجزیہ نگاروں اور تبصرہ نویسوں نے بلا جواز چند پرندوں مثلاً کوئل، مینا وغیرہ کو بانس پر چڑھا رکھا ہے۔ تاحال کوئی ایسا جدید ذہن اجتہادی نقطۂ نگاہ کا حامل تنقید نگار نہیں اُٹھا، جو دیومالائی زبان میں لکھی روایاتِ فرسودہ سے انحراف کر کے اس پرندے کی پوشیدہ خوبیاں وقیع طریق پر اُجاگر کر کے۔ اسی میدان میں اس عظیم موسیقار پرندے کی سب خدمات فراموش کر دی گئیں، دراصل یہ فوک گلوکار ڈسمو ڈھر گھرانے کی گائیکی کا نمائندہ ہے۔ پپیہا، طوطی اور مینا کی گلوکاری تو اس قابل نہیں کہ اسے زیرِ بحث لایا جائے البتہ کوئل کو کتب سیر میں اس قدر اُچھالا گیا کہ اس سے متعلق چند حقائق سامنے لانا ازبس ضروری ٹھہرا۔

کوئل بجائے خود ہمارے ممدوح کی خانہ زاد ہے۔ بے جھٹلانا ممکن نہیں۔ اس پر جس قدر احسان کوّے کے ہیں کسی کے کیا ہوں گے۔ سب کے انڈوں سے لذتِ کام و دہن اُٹھانے والا یہ پرندہ اسے کتمِ عدم سے معرضِ وجود میں لایا۔ (انڈے سیہ کر) دانتوں کاٹی روٹی

کا منظر دکھاتی ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور لفظیات کے بوجھ کو تج کر کفایتِ لفظی کو حرزِ جان بناتی ہے۔ قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر اور پھر ان پیرایوں کو یکے بعد دیگرے برت کر انتظار حسین نے ناول کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہے جس میں "قابلِ مطالعہ" ہونے کا وصف نمایاں ہے۔

"تذکرہ" اس اعتبار سے "بستی" کی توسیع ہے کہ اس میں ماضی اور حال کو نسبتاً کشادہ کینوس پر ایک دوسرے کے رُو برو لا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ "بستی" کی نسبت اس میں ابعاد زیادہ ہیں، فنی انضباط بہتر ہے اور زمانوں اور انسانوں کو ایک نسبتاً زیادہ وسیع تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ انتظار حسین کا یہ ناول یقیناً اس قابل ہے کہ اسے اُردو کے چند چوٹی کے ناولوں میں شمار کیا جائے۔

آپس کی باتیں

فضلُ مِّنَ اللہ

سالنامہ ۱۹۸۷ء اوراق ملا۔ بہت بہت شکریہ، جی خوش ہو گیا۔ اقبال پر چاروں مقالے خاصے کے ہیں بالخصوص این میری شمل کے مقالہ کا ترجمہ، تھامس ہارڈی اور ہومر پر مضامین متوجہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے سوال اُٹھایا ہے کیا لاہور دبستانِ ادب ہے؟ یا اللہ! ہم اب اوراق تک بھی پہنچ گئے ——— گوشۂ مجید امجد خوب ہے۔ مجید امجد اور بہت سارے دیگر شعرا کے ساتھ ستم یہ ہوا کہ جب انہوں نے شعر شعار کیا تو حفیظ، فیض، فراق، جوش، ن۔م۔ راشد زندہ تھے اور "پائندہ" تھے۔ سید حامد سروش کے بقول ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی شاعری بے جواز تھی۔ لہٰذا ان برگدوں کے ہوتے ہوئے دیگر سرو و سمن بچے نہیں۔ اب مجید امجد فہمی کے دروا ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی خواجہ محمد زکریا اس سلسلہ میں کاوش کرتے رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اوراق سالنامہ کا گوشہ مجید امجد فہمی میں مفید و ممد ہو گا ——— مشفق خواجہ پر "گوشہ" کا لفظ دیکھ کر ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ عنوان رفتگاں کے لیے ہے، زندوں کے لیے نہیں۔ بہر حال ایک کمی اور نظر آئی کہ خواجہ صاحب کی زندگی (بشمول ادبی زندگی) پر اگر ایک صفحہ بھی موجود ہوتا تو ان کی تحقیقی، شعری اور ادبی مجلّاتی زندگی پر روشنی پڑ جاتی دیگر یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد مرحوم کے پاس حضرت علامہ کی ختم نبوت والی تقریر (یا بیان) کا مسودہ موجود تھا۔ ایک پادری نے ایک لاکھ کی پیشکش کی جسے خواجہ صاحب نے ٹھکرا دیا۔ مشفق خواجہ صاحب کا ایک مجموعۂ کلام ابیات ہے، اور وہ تخلیقی ادب جیسے لازوال اور لاثانی ادبی پرچہ کے مدیر و مالک تھے۔ تخلیقی ادب ایک ایسا مجلّہ تھا جس کا تتبع ہر ادیب کی خواہش ہوتی ہے۔ اور اکثر حسرت میں بدل جاتی ہے ——— سید غلام الثقلین نقوی کا مضمون میں نے اس مغالطے کے تحت پڑھا کہ شاید سید عبداللہ مرحوم کے بارے میں ہے، بہر حال شاہ جی نے مایوس نہیں کیا، بڑے مزے کی تحریر ہے ——— خطوط (آپس کی باتیں) میں جناب عبدالعزیز خالد کا مکتوبِ گرامی توجہ سے پڑھا، اس طرح جاپانی شاعری کے دو مترجموں سے شناسائی ہو گئی۔ میرؔ اور سوداؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک کا کلام واہ ہے اور دوسرے کا آہ۔ بلراج کومل کے ہاں سلاست و سادگی جب کہ خالدؔ کے ہاں شکوہ و شوکت۔ اس طرح ہائیکوز کے مطالعہ کا لطف دونا ہو گیا۔ پہلا ورق کا میں ہمیشہ سے قتیل ہوں بین الاقوامی ادب کے تناظر میں جس اعتماد سے آپ بات کرتے ہیں پوری اردو دنیا میں شاید ہی کوئی آپ کا حریف ہو۔ موجدکا سرورق بھی لائقِ تحسین پہلی مرتبہ اس نے متاثر کیا۔

اکبر حمیدی

اس بار کا اداریہ بہت علمی ہے جس میں شعری زبان کے حوالے سے "کلیشے" اور "کلید" کی توضیح کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کلید شاعری کا لازمہ اور زیور ہے جبکہ کلیشے کلام کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دینے والی دیمک۔ یہ ایک بہت اہم بات ہے جسے شاعروں کے لیے خطرے کا سُرخ نشان بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقبول شاعری کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ وہ فوری داد تو سمیٹ لیتی ہے مگر وقت کے ساتھ دو قدم بھی لگے نہیں چلتی۔ "اوراق" کے اداریے ہمیشہ سے ایسی ہی علمی جہتوں تک راہنمائی کرتے آئے ہیں۔

—— مشفق خواجہ صاحب کا گوشہ پڑھا۔ میں انہیں شاعر کے طور پر جانتا ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے اُردو کے بہترین اشعار جمع کرنے شروع کیے، ان میں مشفق خواجہ کا یہ شعر میں نے درج کیا تھا:

بوا لہو سانِ شہر کو مژدہ کہ یہ ہجوم رنگ

میرے لیے ہی تھا مگر راس نہ آسکا مجھے

اسلام آباد میں میرے دوست مہتاب ظفر صاحب بھی اکثر خواجہ صاحب کا ذکر کرتے تھے۔ اپنی تحقیق اور کالموں کے ذریعے خواجہ صاحب نے ادبی دنیا میں ایک وقیع حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان پر میرزا ادیب، ڈاکٹر انور سدید اور منظر علی خاں کے مضامین بھرپور ہیں، اور اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ میرزا ادیب نے مخفی رنگ میں خواجہ صاحب کی شخصیت کے دوسرے پہلو بھی اُجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون خواجہ صاحب کو ایک مزاح نگار کی حیثیت میں پوری طرح سامنے لاتا ہے۔ یہ محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ منظر علی خاں کا مضمون اپنے شگفتہ اسلوب کے باعث بہت دلچسپ ہے۔ —— اس گوشے کے مقابلے میں مجید امجد کا گوشہ زیادہ سنجیدگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ تاہم شجر کے استعارے کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون مجید امجد کی شاعری کے نئے گوشے سامنے لاتا ہے —— "اوراق" کی غزلیں اس مرتبہ بھی دلکش ہیں اور ان میں بکثرت ایسے شعر ہیں جنہیں ہم غزل کے شعری سرمائے میں اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ اختر ہوشیارپوری کی ساری غزل زور دار ہے مگر کوئی ایک شعر نمایاں نہیں ہوتا اس لیے وہ نظم سی ہو کر رہ گئی ہے۔ عرش صدیقی کی غزل کے شعر تیز ہیں۔ خاص طور پر یہ شعر پڑھنے والے کو پکڑ لیتا ہے:

ہوس کا کوئی نہیں فاصلہ دفا سے مگر   فصیل بیچ میں اک حرمتِ نظر کی ہے

جمیل ملک کی غزل پہ دوہے کا رنگ غالب ہے۔ اصغر سودائی، فضا ابنِ فیضی اور سید احسن شیرازی کی غزلوں پر گہرے بادل چھائے ہیں مگر بجلی کی چمک نہیں۔ اظہر جاوید کو حیدر قریشی نے مشورہ دیا تھا کہ وہ بیوی بچوں کے لیے غزلیں کہیں بے وفا محبوب کو بھول جائیں کہ اس پر اظہر جاوید کی آہ و فریاد کا اثر نہیں ہو رہا۔ ان کی موجودہ غزل بھی بے وفا محبوب ہی کے لیے ہے۔ مظفر حنفی کی غزل معنویت سے گراں بار ہے، فرداً فرداً لکھنے کی شاید "اوراق" میں گنجائش نہ ہو۔ چند بہت اچھے اشعار قندِ مکرر کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ "اوراق" کی غزلیں بھی پوری طرح نمایاں ہوں۔ منتخب اشعار کی ہر مرتبہ کمی محسوس ہوتی ہے۔

کسی بیدار خوشبو نے گلے مجھ کو لگایا ہے   ہواؤ آج میرے خواب کا بستر بدل دینا

(ذکاء الدین شایاں)

بدن کی قید سے خود کو رہا تو کرنا ہے — ہوا کو خاک سے آخر جدا تو کرنا ہے

(آزاد گلاٹی)

اُسے تو خلعتِ شاہی نے ڈھک لیا ورنہ — امیرِ شہر کے تن پر لباس کتنا تھا

(ہیرانند سوز)

ہم سے بھی راہ و رسم بڑھانے میں سوچنا — ہم سے بھی احتیاط کی صورت ہے بس یہی

(شوکت مہدی)

یہ اور بات کہ پہلے بھی کم ہی اڑتا تھا — پرندہ قید میں آیا تو کتنا رویا تھا

(محمد فیروز شاہ)

ویسے تو لوگ سب کے سب مانتے ہیں اس کو رت — ان کی گواہی اور ہے میری گواہی اور ہے

(شہزاد احمد)

جہاں بھر میں ہمارے عشق کی تشہیر ہو جائے — اسے کس نے کہا تھا دل پہ یوں تحریر ہو جائے

(حیدر قریشی)

لوگوں ہی پہ الزام نہیں سنگ زنی کا — مجھ تک میرے پھینکے ہوئے پتھر بھی تو آئے

(اطہر ادیب)

مجھ سے چل کے سب رستے مجھی پہ ختم ہوتے ہیں — مسلسل ایک ہی جانب سفر کیسے کیا جائے

(امداد آکاش)

دار پر ٹکی ہوئی ہے جانے کب سے یہ زمیں — اور سر پر آسماں اک سر پھرا جلاد ہے

(وزیر آغا)

دبستانِ لاہور کی بحث میں بعض حضرات نے لاہور کو دبستان تو قرار دیا ہے مگر اس کی وہ معنوی اور صوری خصوصیات بیان نہیں کیں جن کی بنا پر ہم لاہوری ادب کو کراچی، پشاور یا کوئٹہ کے ادب سے الگ کر سکیں اس طرح دبستانِ لاہور کا کوئی بھی تشخص ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر لاہور دبستان ہے تو اس کا تشخص کیا ہے؟ جس طرح ہم لکھنؤ، دلّی اور رام پور دبستاں کے نمائندہ شعرا کو پہچان سکتے ہیں کیا لاہور دبستان کے شعرا کو ہم کسی بنیاد یا تشخص کی بنا پر دوسرے شعرا سے الگ کر سکتے ہیں؟ دبستان سے مراد اگر پورا پنجاب بھی ہو تو بھی میرے خیال میں اس کی کوئی الگ شکل و صورت نہیں بنتی۔ زبان، اسلوب اور مضامین مختلف شعرا کے مختلف ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ ایک شہر یا ایک صوبے میں رہنے والے شعرا کے ہاں بھی زبان اسلوب اور مضامین مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً شیر افضل جعفری، عبدالعزیز خالد اور وزیر آغا کی زبان، اسلوب اور مضامین مختلف ہیں حالانکہ وہ ان معنوں میں دبستانِ لاہور ہی سے متعلق ہیں۔ مگر ایسا بھی ہے کہ کراچی، لاہور اور پشاور یا کوئٹہ کے شعرا کی زبان، اسلوب اور مضامین ایک جیسے ہوں۔ ترقی پسند شعرا کو یہاں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں کسی شہر یا علاقے کا دبستان قرار پانا آج سے سو دو سو سال پہلے کی باتیں ہیں۔ جب رسل و رسائل اور پریس کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ میل جول کے مواقع بہت کم تھے، بڑے

بڑے شہر دوسرے شہروں کی ثقافت سے الگ تھلگ ایک جزیرے کی طرح زندگی کرتے تھے۔ کوئی بھی دوسرے پر اثر انداز ہونے کے ذرائع نہیں رکھتا تھا چنانچہ ہر ادبی مرکز اپنے آپ میں سمٹ کر اپنے تشخص کو بحال رکھے ہوئے ایک مخصوص مقامی رنگ میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہی حال اُس کے ادب کا تھا جو نہ تو کسی سے متاثر ہو رہا تھا اور نہ ہی کسی کو متاثر کر رہا تھا۔ اس طرح اس کی کچھ اپنی خصوصیت اور پہچان بن گئی تھی آج تو ذرائع ابلاغ اور رسل و رسائل کے وسائل کی کثرت نے سارے پاکستان کے ادب کو یک جان کر دیا ہے۔ اب کسی بھی شہر یا علاقے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اپنے تشخص کو دوسروں کے اثرات سے بچا سکے۔ ادبی رسائل، اخبارات، ریڈیو، ٹی وی نے سارے پاکستان کو ادبی سطح پر ایک شہر بنا دیا ہے۔ اس لیے موجودہ صورت حال میں کسی دبستان کا تصور قائم کرنا بہت محال ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ پاک بھارت کے ادب کو بھی ایک دوسرے سے الگ تھلگ کرنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ اور شاید ہی دونوں کو الگ دبستان قرار دیا جا سکے۔ آج کی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے۔ ہر آدمی کہیں بھی ہے اس کا طرزِ زندگی ایک ہے کیونکہ اسے سارے ذرائع حاصل ہیں اس طرح کراچی اور چیچو کی ملیاں کے ہم طبقہ لوگ ایک ہی ثقافت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح یونڈہ اور پشاور کا غریب آدمی ایک جیسی روٹی مفلوک الحالی کی کھا رہا ہے۔ میرے خیال میں دبستان کی بنیاد ہمارے زمانے میں نظریاتی سطح پر رکھی جا سکتی ہے۔ مگر کسی جغرافیائی دبستان کا تصور قائم کرنا شاید اب ممکن نہیں!! ——— نظموں میں مظفر حنفی کی نظم "مجھے ن رکھا" مجھے بہت منفرد لگی زندہ رہنے والی ——— نظموں میں اعجاز فاروقی، تخت سنگھ، تبسم کاشمیری، وزیر آغا، فرحت نواز، نصیر احمد ناصر اور ممتاز اطہر نے اچھی نظمیں کہی ہیں ——— آخر میں انشائیوں کے بارے میں بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں، چند باتیں ہی کہوں گا۔ اس حصے میں جمیل آذر کا انشائیہ "شمولیت"، سلیم آغا کا انشائیہ "پسینہ"، بشیر سیفی کا "روشنی"، انجم نیازی کا "چار آنکھیں"، رعنا تقی کا "آتش فشاں" مجھے زیادہ اچھے لگے۔ جمیل آذر کا انشائیہ "شمولیت" پڑھ کر زندگی اور زندگی کی مسرتوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ آدمی زندگی کرنا سیکھتا ہے۔ فنی طور پر جمیل آذر نے اپنے آپ کو آگے بڑھایا ہے گویا خوب سے خوب تر کا سفر جاری ہے۔ کسی بھی لکھنے والے کی زندگی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ سلیم آغا نے انشائیہ "پسینہ" کے ذریعے ایک عالم کی سیر کروائی ہے۔ انشائیہ پڑھ کر یوں لگا جیسے لفظ پسینہ اپنے لغوی معنوں کے اعتبار سے کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ سلیم آغا نے اس لفظ میں معنی کی ایک نئی دُنیا سمیٹ لی ہے۔ بشیر سیفی "روشنی" میں کہتے ہیں کہ روشنی مادی ہی نہیں روحانی ضرورت بھی ہے اور اس میں کسی کو کلام نہیں۔ انجم نیازی نے انشائیہ "چار آنکھیں" میں اندر کی آنکھوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شاید بصیرت کی یا حواس کی آنکھوں کی طرف۔ رعنا تقی نے اپنے انشائیے کے ذریعے انسان اور آتش فشاں میں فرق واضح کیا ہے۔ انسان اپنی قوت کے اظہار کے لیے رُخ کا تعین کرتا ہے جبکہ آتش فشاں محض قوت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک اچھا موضوع ہے اور رعنا تقی نے اسے مہارت سے لکھا ہے۔

رشید نثار

اس بار آپ نے اپنے اداریے میں زبان کے نشانات، کلیشے اور تخلیقی تازگی کی بڑی دلچسپ بحث چھیڑی ہے۔ مجھے آپ سے اس حد تک اتفاق ہے کہ ہمارے شعرا بلکہ نثر نگار بھی پُرانے شعرا اور ادیبوں کی پیروی میں "کلیشے سازی" کرتے رہتے ہیں کہ ان کے نزدیک "کلیشے" سند کا درجہ رکھتا ہے۔ تاہم ایک بہت اہم بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج "خیال" کی اکائی کسی کلیشے کی محتاج نہیں۔ اس ضمن میں مومن کا یہ شعر ہی مثال کے لیے کافی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چنانچہ خیال کی نثر اور شاعری دونوں کیلئے سے آزاد ہوتی ہے اور اسی سے بہتر ادب پیدا ہوتا ہے ——— اس مرتبہ سجاد نقوی صاحب نے پت جھڑ کے ضمن میں جن مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے ان میں عنایت کبریا کا نام شامل نہیں۔ عنایت کبریا نہ صرف ادیب، شاعر اور تاجر تھے بلکہ معاشرتی سطح پر ادیب اور ادب کو بہت اونچا دیکھنے کے متمنی تھے۔ میرا خیال ہے پت جھڑ کے سماں میں عنایت کبریا کا تذکرہ بھی ہونا چاہیئے تھا ——— کیا لاہور ایک دبستانِ ادب ہے؟ ایک اہم سوال ہے۔ میرے نزدیک لاہور عہدِ موجود میں ایک دبستانِ ادب ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن یہ دبستان صحافت کے آغوش میں پل کر جوان ہوا ہے۔ اگر ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو دبستانِ لاہور صحافت کی سیڑھیاں طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر لاہور صرف ادب کا دبستان ہی نہیں، سیاست، مذہب، روحانیت، نفسیات اور فلسفے کا بھی دبستان ہے ——— لاہور کی مرکزی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہے اور یہاں جس ادب نے جنم لیا ہے وہ ایک دبستان ہی کی نشاندہی کرتا ہے ——— اب یہ سوال کہ دبستان کیسے بنتا ہے (ایک الگ بحث ہے) اور اس کی نشاندہی بھی کی جانی چاہیئے۔ میں یہاں صرف اتنی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور ایک زمانے میں مہذب انسانوں کی اجتماعی بستی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کے نقش و نگار، نئی تشکیلات، تنقید و تبصرہ، تاریخ و سیاست، اس کے تصورات اور رجحانات سب مل کر اسے ایک دبستان بناتے ہیں ——— لاہور دلّی کے قریب ہے۔ لہٰذا اس کا محاورہ اور روزمرّہ بھی دلّی سے مستعار ہے، لیکن لاہور نے عوامی مذاق کی جس طرح تربیت کی ہے اس طرح دہلی اور لکھنؤ بھی نہیں کر سکے۔ لاہور میں کوئی بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا قوال مرثیہ خواں نہیں تھا ——— لاہور نے سیاسی بے چینی، ذہنی انتشار اور ادبی مایوسی کے عہد میں اپنے استعارے خود تخلیق کیے اور کنایوں میں ایک ایسی دنیا تشکیل کی ہے کہ جس میں محبت، خیر اور حق ایک جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ لاہور نے داخلیت کی تحریک بھی پیدا کی ہے اور جدید نظم کو رواج دے کر خارج پر طلوع ہو کر اس کا نظارہ بھی کیا ہے۔ لاہور نے اپنے عہد کی تاریخ، زندگی کا روزنامچہ اور اہم واقعات کی یادداشتیں ہی تخلیق نہیں کیں بلکہ تنقید، اصناف، ذہنیت میں بھی انقلاب برپا کیا ہے۔ لہٰذا لاہور آریائی ثقافت، ایرانی تمدن اور روحانی ارتفاع کے باعث پوری دنیا میں ایک الگ مقام رکھتا ہے اور یہ الگ مقام ہی اسے مکمل دبستان بناتا ہے ——— اس مرتبہ اوراق میں گیت مالا کا سماں ہے اور ہائیکو کا خوبصورت نظارہ بھی موجود ہے۔ مقالات میں "اقبال کی شاعری میں لالہ" کی علامت بڑی افادیت کی حامل ہے۔ مگر "لالہ" کی علامت فارسی سے آئی ہے اور علامہ اقبال نے اسے اپنے مزاج کے مطابق برتا ہے، بلکہ مولانا ظفر علی خان اور شورش کاشمیری تو "لالہ" کی قید سے نکلے ہی نہیں، چنانچہ لالہ کی "علامت" جس انداز سے علامہ اقبال کے ہاں آئی تھی وہی انداز ان کے بعد کے عہد میں بھی برقرار رہا ہے ——— غالب، اقبال اور بیدل بنیادی طور پر ایک ہی دبستانِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان میں آسانی سے مماثلتیں تلاش کی جا سکتی ہیں اور ان پر مضمون بھی باندھا جا سکتا ہے، تاہم جب بھی کسی لمحے انکشاف کا در کھلتا ہے تو بازگشتِ زمانہ میں ملفوف لمحۂ انکشاف برآمد ہوتا ہے۔ ادیب سہیل نے تین مشاہیر کو ایک سطح پر اکٹھا کیا ہے۔ اور علامہ شبلی نعمانی کے ایک تاثر کو انہوں نے روا روی میں ٹال دیا ہے۔ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ بیدل کی فارسی کو جدید یا قدیم، صحت مند یا غیر صحت مند ثابت کرتے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کی فارسی کو برِصغیر میں مناسب ماحول نہیں ملا ——— مقالات میں "بارے ہو جانے امالے کا بیان" میرے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ امالے کی بحث میں نے کوئٹہ میں ۱۹۵۶ء میں چھیڑی تھی۔ کوئٹہ میں یہ ایک نئی بحث تھی جس نے مجھے ایک سرخوشی بخشی تھی اور اس بحث نے مجھے تین قدر دان عطا کیے تھے ان میں پروفیسر آغا صادق، اثر جلیلی اور اقبال سلمان۔ ان تینوں شخصیتوں نے مجھے محبتیں پیش کی تھیں اور اس کی وجہ امالے کے ساتھ میری وابستگی تھی۔ اس بحث کے بعد ماہنامہ فیض الاسلام میں مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی نے اس کی گرامر متعین کی اور ایک بھرپور

مقالہ لکھا۔ اس مقالے کا تعاقب ماجد الباقری نے کیا اور میں نے ان حضرات کے نکات پر گوشۂ میں دوبارہ گفتگو کی۔ جو اب تاریخ کے صفحات میں گم ہے مگر طویل عرصے بعد عبدالعزیز خالد نے اماں کی بحث چھیڑ کر میری پرانی یادیں تازہ کر دی ہیں۔ انہوں نے ذاتی تاثر اور لیکچر کے انداز میں تفہیم پیدا کی ہے، جبکہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی کا مضمون گرامر کا پورا احاطہ کرتا تھا ——— فیاض تحسین کی شاعری، تھامس ہارڈی، ہومر کے لاثانی مذہبیے، لارنس کے خطوط، شخصیات اور ان کے فن پر مباحث معلومات افزا ہیں اور علمی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، جبکہ لسانی فلسفے کی سرگذشت افسانے میں کہانی کا عنصر، جدید اردو افسانے میں تخلیقیت، دوہا تجزیہ اور چند سوال فنی اور تکنیکی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اس طرح اوراق کا سالنامہ فن اور شخصیت کا مکمل احاطہ کرتا ہے ——— نظموں میں احمد ظفر کی تخلیق طویل نظموں میں ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ مگر انہوں نے جہاں اپنے ہونے کی تشبیہہ شجر کی علامت سے پیش کی ہے وہاں ذہن ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے ور بہت سے دوہے، بہت سے افکار ذہن میں مماثلت بن کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جس فلسفیانہ اور خیال پرور انداز سے انہوں نے نظم کا آغاز کیا اس کا اختتام بھی مثالی ہونا چاہیئے تھا، غیر انفرادی نہیں۔ پھر بھی ان کی نظم کا بقیہ حصہ بڑا جاندار، ہمہ جہت اور فکر انگیز ہے ——— انشائیے تازہ اور جواں لہو کی گردشیں لے کر طلوع ہوئے ہیں اور اسی طرح افسانے بھی خوشنما اور نئے ہیں۔ ——— میں اب ایک ایسی شخصیت کی طرف آنا چاہتا ہوں جس نے خواجگی میں، فقیری کی ہے اور وہ ہے مشفق خواجہ! آپ نے ان کے نام کا گوشہ قائم کر کے ہم سب سے (ان کی) خوبصورت انداز میں ملاقات کرائی ہے ——— مشفق خواجہ، نثر اور نظم کا جداگانہ وصف رکھتا ہے۔ عہدِ موجود میں اپنے وصف کو سنبھالنا، برقرار رکھنا اور دنیا سے چھپا کر، نظروں سے اوجھل رکھنا کسی کسی کا کام ہے اور مشفق خواجہ نے توڑے اعتماد کے ساتھ فن اور زندگی کا سفر طے کیا ہے۔

غیاث اقبال

سالنامے کے پہلے ورق میں ادبی کلیشوں کی عالمانہ تشریح نیر تودو رود اور جیکب سن کی چونکا دینے والی باتوں کے حوالے پیش فرما کر ڈاکٹر وزیر آغا نے ہماری ادبی بصیرتوں کو مزید روشنی عطا فرمائی ہے، جزاکم اللہ! ——— سوال یہ ہے کہ بحث میں، ڈاکٹر حسن اختر نے دبستان کے عمومی قاموسی مفہوم کی جانب اشارہ فرمایا ہے اس کی رو سے فیض اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے شغف رکھنے والے دیگر ادیب و شاعر لاہور دبستانِ ادب میں کن بنیادوں پر شامل کیے جائیں گے؟ حل طلب ہے! محترم نے پطرس کے حوالے سے بھی دبستانِ لاہور کے وجود کو منوایا ہے۔ مگر پطرس کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دلیل جذبات کی فوق دستی سے ماند پڑ گئی ہے اور علم و ادب کے معاملات میں جذبات سے زیادہ سنجیدگی کو مشعلِ راہ بنانا خود علم و ادب کے لیے نیک فال ہے۔ چنانچہ محترم حسن اختر کے پیش کردہ دلائل سے اتفاق کی سبیلیں تلاشنا مجھ جیسے کم فہم کے لیے دشوار ضرور ہے۔ سید عابد علی عابد کے طویل مضامین آج سے بہت پہلے زیرِ بحث آ چکے ہیں اور یہ مسئلہ SINE DIE ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اچانک اس کے دوبارہ زیرِ بحث آنے کی ادبی، علمی اور ثقافتی وجوہات کیا رہی ہیں، اس تفصیل سے قطع نظر، ڈاکٹر وزیر آغا کے عطا کردہ زیرِ نظر نکات سے، ڈاکٹر صاحب کے ایک سابقہ مضمون کی یاد آتی ہے۔ جس میں مولانا آزاد کو ان کے دو ادبی اوصاف یعنی خیال کی بالادستی، اور تمثیل نگاری، کو بنیاد بنا کر دبستانِ لاہور کا "بانی" قرار دیا گیا تھا (ملاحظہ فرمائیں۔ دبستانِ لاہور کا بانی — آزاد: تنقید اور مجلسی تنقید)۔ 'اوراق' کی بحث میں شرکت فرماتے ہوئے، ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے دلی کے دبستان کا تذکرہ کیے بغیر لکھنؤ اور لاہور کے ادبی و لسانی مزاج کے فرق کی وضاحت فرمائی ہے۔ تو کیا لاہور کے دبستان کو KIRILIAN PROCESS کے تقاضوں میں شامل کریں؟ ——

بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ لاہور ایک دبستانِ ادب ہے تو ہمارے لیے لاہور ایک شہر کا نام نہیں بلکہ ایک 'استعارہ' ہوگا جس کی رُو سے ہم علاقۂ پنجاب مراد لیں گے۔ جو کہ خیال آفرینی، تمثال نگاری اور اپنے منفرد آہنگ کے لیے مشہور ہے ——— مگر WRITINGS ON THE WALL سے جو توانا خیال مجھ جیسے کمزور ذہنوں میں جنم لیتا ہے وہ یہ کہ اب تو دبستانِ سرگودھا بھی روشن ترین امکانات سے وابستہ ہو چلا ہے۔ اس کا کیا کیا جائے (میرے اس خیال کو خام اور ناپختہ گردانیں تو صرفِ نظر فرماویں۔ محض اس لیے کہ میں لاہور سے سرگودھا تک کی TOPO GRAPHY سے ناواقف ہوں۔ شیلی کے اس بیان سے میں خود کو دلاسہ دوں تو کیا برائی ہے؟ (WHEN WINTER COMES CAN SPRING BE FAR BEHIND)

——— گوشۂ اقبال میں شامل سب مضامین بے حد پسند آئے۔ اسلوب احمد صاحب کے تقابلی مطالعے سے ہمارے لیے مفاہیم کے نئے باب وا ہوتے ہیں۔ بیدل والے مضمون کے سلسلے میں عرض ہے کہ غالب کی بیدل سے عقیدت اور شیفتگی کی نفسیاتی وجہ یہ بھی تھی کہ غالب کی نظر میں معیاری انسان اور شاعر وہ تھا جو مدح سلاطین و وزراء سے بے نیاز ہو۔ بیدل میں غالب کو معیاری فن کار، شاعر، اور مفکر نظر آیا جو اس کے وجودِ معنوی میں مثالی تصویر کی طرح زندہ تھا۔ اس لیے دراصل جب غالب، بیدل کی مدح کرتا ہے تو وہ اس غالب کی مدح کرتا ہے جو وہ بن نہ سکا۔ یہ بھی خود بینی، بے نیازی اور عزتِ نفس کے قیام کی اُلجھی ہوئی صورت ہے۔ بہرحال یہاں خود بینی کا جذبہ اتنا مہذب ضرور ہو گیا ہے کہ اس نے مدحِ غالب کی بجائے مدحِ بیدل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (سید عابد علی عابد کے مضمون سے اقتباس ص۱۵۳ مضامین عابد)۔ مشفق خواجہ کی غزل گوئی کے مختلف ابعاد پر ڈاکٹر انور سدید کے معنی خیز تجزیاتی مقالے کا جواب نہیں۔ اور 'ابیات' سے منتخب اشعار موصوف کے حسنِ انتخاب پر دلالت کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم شکر گزار ہیں کہ موصوف نے CREATIVE MYTHOLOGY کی عطا کردہ روایت کے حوالے سے مجید امجد کے 'شجر' میں پنہاں مفاہیم کی مختلف سطحوں کو طشت از بام فرمایا ہے اور 'شجر' کی صرف ایک شاخ کے ڈھول بننے پھر اس کے آواز میں منقلب ہونے اور اس کے طفیل پرندے کی اڑان پر منتج ہونے کی داستان نہ صرف بصیرت افروز ہے بلکہ اس میں علم و ادب کی ساری چاشنیاں ضم کر دی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہم اس کے سرور سے تادیر چمٹے رہیں۔ اساطیری جہت سے مملو تنقید کا یہ خوبصورت نمونہ اپنی مثال آپ ہے۔ ——— افسانوں میں 'دودھ ماں' (یوسف چوہدری) پنج کلیان (منشا یاد) آخری موڑ (سلیم آغا) بے نام رشتے (جتندر بلو) سفر (طارق محمود) اور بے چہرہ (نکہت سیما) بے حد عمدہ ہیں۔ بالخصوص دودھ ماں اور آخری موڑ میں بیانیہ کے روایتی عنصر کی شمولیت سے تاثر دو چند ہو گیا ہے۔ یوسف چوہدری کے 'دودھ ماں' سے تائی ایسری (کرشن چندر) اور ہزار بچوں والی ماں (رام لعل) جیسے مثالی افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کا موضوع بھی REMINISENCE کے ذیل میں آتا ہے ——— انشائیہ نگاروں نے خون کو پسینہ بنانے میں بقول غالب 'پانی کے ہوا' ہو جانے سے زیادہ علامہ اقبال کی طرح اپنے نقوش کو خونِ جگر سے تمام کیا ہے۔ "انسان کی پوری المناک سرگزشت پسینہ بہانے اور خون بہانے کے سوا اور ہے بھی کیا" کہہ کر انشائیہ 'پسینہ' کے اس جملے میں سلیم آغا نے زیرِ لب ایک ایسے دُکھ کی کیفیت ابھاری ہے جو ہر لحاظ سے معنی خیز بھی ہے اور زندگی کو معنویت سے ہمکنار کرنے کا ذائقہ بھی ——— "ڈوبتا تو ہر کوئی ہے لیکن ابھرتا کوئی کوئی ہے اور جو اُبھرتے ہیں وہ کندن بن کر اُبھرتے ہیں" کہہ کر قمر اقبال نے اپنے انشائیہ میں فکر و فن کے عظیم تقاضوں کی بنیاد پیش فرمائی ہے اور کندن بننے کے لیے ہر فن کار کو ایک حقیقت افروز پیغام دیا ہے۔ جزاکم اللہ! ان کے علاوہ تجزیاتی مطالعے، تبصرے، شعری و نثری حصے کافی وقعت کے حامل ہیں جن کو بار بار پڑھنے اور انہیں اپنے فکر و احساس میں بسا لینے کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔ دوہے پر شین کاف نظام نے محنت سے مقالہ تحریر فرمایا ہے جس موضوع پر آج تک بہت کم لکھا گیا ہے، تاہم اُردو میں لکھے جانے والے دوہوں کا مزاج ضروری نہیں کہ ہندی دوہوں کی PHOTO COPY ہو۔ جس طرح ترائیلے، ہائیکو، ترسیلے ہمارے ہاں اپنا ایک خاص انداز رکھتے ہیں اسی طرح دوہے بھی اپنا مزاج منفرد خود وضع کر لیں تو کیا برائی ہے؟ اوزان کے بارے میں یہ مقولہ ہے جو اس کے حدود مقرر کرتا ہے۔ "تیرہ و شم (۱۳/۱۱) نہ جادی

میں سمو گیا ہے کل دنتھ" (یعنی ۱۳ ماترائیں + ۱۱ = ۲۴) نیز دوہا "جگن" یعنی لگو گرو لگو سے شروع نہ ہو (کبیر کے دوہے اس سے مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں) بلکہ گرو، گرو لگو سے شروع ہو، اور چرن کی انت میں لگو آنا چاہیئے - ۱۳ دو گیارہ کا جوڑ ہی مستند کہا جاتا ہے۔ اورگیان چند صاحب کی تحقیق اس ضمن میں قابلِ تعریف ہے! ________ سالنامہ کے خطوط میں سب سے زیادہ ڈاکٹر نارنگ کا مقالہ "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" زیرِ بحث آیا ہے۔ اکثر احباب نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ ایک بحث خیز مقالہ ہے اور ایسی تحریریں روز روز نہیں لکھی جاتیں۔ شاہین بدر کی اس رائے سے اتفاق ممکن مشکل ہے کہ اس مقالے کی پہلی حیثیت "تحقیقی مقالے" کی ہے۔ میرے خیال میں یہ "تنقیدی مقالہ" ہے جس سے تنقید کی تاریخ میں نئی جہتوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ ہر زمانے کے ساتھ کچھ رجحانات پیدا ہوتے ہیں اور کچھ معدوم ہو جاتے ہیں۔ نارنگ نے جدید شاعری کے ایک نئے تخلیقی رجحان کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُردو کے ہم عصر مزاحمتی ادب میں کربلا کا استعارہ کتنے معنوی ابعاد کے ساتھ اُبھر رہا ہے، اس سب کا احاطہ نہ تو نارنگ نے کیا ہے اور نہ یہ شاید اُن کا مقصد رہا ہوگا۔ انہوں نے ایک بنیادی تھیسس پیش کیا ہے کہ جدید اُردو شاعری میں کربلا کی مذہبی اہمیت و معنویت کے علاوہ اس کو وسیع پیمانے پر نئے انسانی، سماجی اور سیاسی مفاہیم میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس بات کو خاص خاص شاعروں کے حوالے سے ثابت کیا ہے۔ ________ استعارہ کی بحث میں ہر بات منطقی طور پر بیان نہیں کی جا سکتی نہ ہی ہمیں نارنگ سے اس کی توقع کرنا چاہیئے ---- حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مقالہ کئی اعتبار سے SEMINAL رہا، اور ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ نارنگ نے ایک اچھوتے موضوع پر بحث کی ہے اور ان کے اس بنیادی CONTRIBUTION سے انکار ممکن نہیں۔ ضروری نہیں کہ ہم مقالہ نگار کے ہر نتیجے سے اتفاق کریں۔ ______ شاہین بدر کا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ جن بیسیوں نوکلاسیکی مرثیہ گو شعراء کا ذکر نارنگ نے کیا ہے، ان میں کئی ایک نے مرثیہ نہ لکھا ہو، لیکن یہ بات تو مقالے کے مرکزی خیال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ نارنگ نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ "نوکلاسیکل مرثیہ بھی رثائی ادب ہے۔ اور اس کے مقالے کو رثائی ادب سے کوئی سروکار نہیں" یعنی انہوں نے کربلا کے مذہبی پہلو نہیں بلکہ اس کے انسانی آفاقی پہلو کی بحث اٹھائی ہے جو سب فرقوں، مذہبوں اور طبقوں کے لیے تخلیقی کشش رکھتا ہے۔ اوراق کے بعض مکتوب نگاروں نے باوجود نارنگ کی اس تنبیہہ کے کربلا کو رثائی ادب ہی کی روایت کے پس منظر میں دیکھا ہے اور غلط توقعات کا شکار ہوئے ہیں۔

عباس رضوی نے مقالے کی جی بھر کر داد تو دی ہے مگر افتخار عارف اور پروین شاکر کو جو اہمیت مقالے میں نارنگ نے دی ہے اس سے وہ خوش نظر نہیں آتے۔ عباس رضوی اگر پروین شاکر کو خوش اظہار شاعر نہیں مانتے تو انہیں حق ہے کہ وہ ان کو بدسلیقہ شاعر ثابت کریں۔ نارنگ نے پیش گفتہ میں اشارتاً لکھا ہے کہ وہ ہر جگہ تجزیے سے کام نہیں لیں گے، کیونکہ اس سے تکرار کا خطرہ ہے یا پھر ادبی مباحث کے مذہبی بحث میں بدل جانے سے غلط مبحث پیدا ہو سکتا ہے۔ نارنگ کا یہ مسلک سب کو معلوم ہے کہ اسلوبیات و ساختیاتی نقاد ہونے کے باوجود وہ کسی جگہ عام اقداری تنقید سے مدد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عباس رضوی صاحب کو (۱) ع کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا۔ نیز (۲) ع بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے (۳) ع ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم۔ جیسے مصرعوں اور اشعار میں موضوع کربلا سے پیوستہ معنیاتی ابعاد نظر نہیں آئے! تعجب ہے کہ "خیمۂ عافیت کی طنابوں سے بکھڑی ہوتی خلقتِ شہر، رزق کی محتاجی، جاہ پرستی، رزق کی مصلحت اور انسان کی بے ضمیری پر طنز و تعریض میں ان کو کوفہ و دمشق کے معاشروں کی منافقت اور ریاکاری کا اشارہ نظر نہیں آیا۔ نارنگ نے ایسی باتوں کو غالباً OBVIOUS سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عباس رضوی اگر ذرا غور سے ان اشعار کو پڑھیں اور کربلا کی مختلف معنیاتی جہات پر توجہ فرمائیں تو باور ہوگا کہ کربلا صرف شہادت نہیں ہے ایک نصب العین، حق کوشی اور حق طلبی کی تڑپ، نیز ایثار، قربانی، وفاداری اور اُصول پرستی کا نشان بھی ہے۔ کوفہ و دمشق کے واقعات کو نظر میں رکھیئے تو اس بے ضمیری کا نوحہ بھی ہے جس سے آج کا بدکردار اور منافق معاشرہ دوچار ہے۔ غرض مباحث کو تو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے جس نقطۂ نظر سے وہ لکھے گئے ہیں ——

—— ادبی روایت کے تناظر میں ہم جانتے ہیں کہ بعض تحریریں تمام تر کمال فوراً سمجھ نہیں آتیں۔ خیالات کو جذب ہونے میں وقت لگتا ہے۔ یہ اوراق کا کمال ہے کہ اس کی وساطت سے ایسا جاندار اور بحث انگیز مقالہ پڑھنے کو ملا۔ آخر میں یہ بھی عرض ہے کہ جہاں تک پاکستانی شعراء کی نمائندگی کا سوال ہے تو غالباً نارنگ نے بھارتی شعراء کے مقابلے میں پاکستانی شعراء کو زیادہ جگہ دی ہے۔ بلاشبہ پاکستانی شعراء کے شعری مجموعے بھارت میں زیادہ آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ بایں ہمہ نارنگ نے فیض، مصطفیٰ زیدی، جعفر طاہر، مجید امجد، وزیر آغا، شہرت بخاری، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، کشور ناہید، افتخار عارف، پروین شاکر، عبیداللہ علیم، صابر ظفر، سلیم کوثر وغیرہ کی شاعری سے جو حوالے دیے ہیں تو کیا یہ سب پاکستان کے شعراء نہیں ہیں؟!

خاور اعجاز

اوراق میں چھپنے والے خطوط میں مجموعی طور پر گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والے مندرجات کا بہت اچھا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کلیدی مقالات، خصوصی گوشوں اور اہم مباحث سے لے کر افسانوں، غزلوں، نظموں اور انشائیوں سمیت تقریباً سبھی اصناف پر مختلف خطوط میں ناقدانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔ علمی اور استادانہ آہنگ میں بھی اور ہلکے پھلکے دوستانہ انداز میں بھی لیکن ایک بات جو میں نے اکثر محسوس کی ہے وہ نثری تحریروں کے مقابلے میں منظومات پر سرسری رائے کا اظہار ہے جو کہیں کہیں محض پسندیدہ نام گنوا دینے کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثال کے طور پر گزشتہ اوراق کے بیس خطوط میں سے گیارہ (یعنی ۵۵٪) صرف نثری تحریروں کے بارے میں ہیں (ان میں ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن میں منظومات کے متعلق صرف پسندیدگی کا اظہار ہے) سات خطوط میں (یعنی ۳۵٪) نظم و نثر دونوں پر بحث ہے اگرچہ اس میں بھی نثر کا پلہ بھاری ہے اور صرف دو خطوط (یعنی ۱۰٪) میں منظومات پر بات کی گئی ہے۔ یہ تناسب کچھ اتنا اچھا نہیں۔ غزل ہو یا نظم، گیت ہو یا ہائیکو اپنے اندر اتنی ہی توانائی اور اثر رکھتے ہیں جتنا کہ کوئی بھی نثر پارہ بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی۔ سو حقیقتاً نظم اپنی طرف ایک اُچٹتی سی نظر نہیں بلکہ گہری توجہ کا طالب ہے۔ میرے خیال میں قصہ یہ ہے کہ خطوط نگار نثری تحریروں سے تو فوراً انہی کی زبان سے کچھ نہ کچھ اخذ کر لیتے ہیں لیکن نظم یا غزل کے بارے میں قلم اُٹھاتے ہوئے ذرا سوچنا پڑتا ہے اور ان کے ضمن میں لکھتے ہوئے زیادہ تر اپنے ذاتی الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کے لیے خطوط نگار غالباً اتنا وقت نہیں نکال پاتے لہٰذا کچھ توجہ دلانے کی خاطر میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ اس بار اوراق کی غزلوں پر مختصراً کچھ عرض کروں۔ اپنی سہولت کے پیشِ نظر میں نے اوراق کی تمام غزلوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اجمالی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلا حصہ: اختر ہوشیار پوری، عرش صدیقی، وزیر آغا، شہزاد احمد، فضا ابن فیضی، احمد ظفر، جمیل ملک، اصغر سودائی، راسخ عرفانی، مظفر حنفی، سید احسن شیرازی، ضمیر اظہر، رفعت سلطان، کرشن ادیب، رشید قیصرانی، خورشید رضوی، ذوالفقار احمد تابش، پرتو روہیلہ، بیدل حیدری، انور سدید، اظہر جاوید، جعفر شیرازی، انوار فیروز، افتخار نسیم، آزاد گلاٹی، صبا اکرام، اکبر حمیدی، پریم کمار نظر، ذکاءالدین شایاں، طالب قریشی —— دوسرا حصہ: سلیم کوثر، افتخار عارف، غلام حسین ساجد، اسعد بدایونی، بشیر آذر، شاہین بدر، ہیرا نند سوز، اسلم کولسری، پنہاں، شہپر رسول، حیدر قریشی، جان کاشمیری، زاہد نوید، انجم یوسف زئی، نصیر احمد ناصر، شہباز نقوی، محمد فیروز شاہ، بیدار بخت، اظہر ادیب، فرحت نواز، شہناز نبی، سیما شکیب، امداد آکاش، جاوید منظر، شاعر صدیقی، تسلیم الٰہی زلفی، شاہد ماہلی، شوکت مہدی، محمود اسیر، گفتار خیالی، رضی الدین رضی، ارمان نجمی، زاہد سعید زاہد، ممتاز اطہر، شوکت راز، انور سعید انور، عباس رضوی، ساجد مرزا، عزالہ خاکوانی، سجاد مرزا، قمر رضا شہزاد، محمود قریشی، محمد اصغر سلیم، فرحت زاہد، امروز قمر۔ اس ترتیب سے میرا مقصد ہمعصر شعراء کو زیادہ سے زیادہ قریب رکھنا اور نسبتاً نوجوان شعراء کے کلام کو ذرا الگ کر کے دیکھنا ہے۔ اس نشست کے لیے میں نے مذکورہ شمارے کی غزلوں کی لفظیات کو چُنا ہے۔ نقد الشعراء کے مصنف قدامہ بن جعفر کہتے ہیں

کھلاکر پالا پوسا) سردی گرمی میں حفاظت کی، پاؤں پاؤں چلنا سکھایا، چُٹپٹے ہی سے اپنی گلوکاری کے اوصاف اس میں منتقل کرنا شروع کیے، اور یوں اپنی تلمیذ (جو رشید کہلانے کی ہرگز سزاوار نہیں) کو چند ابتدائی اسباق عطا کیے۔ ابھی سرگم سے بھی واقف نہ ہو پائی تھی کہ والدین سے ورثہ میں ملی، باغیانہ روش نے ترکِ تعلق پر مجبور کیا اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سجا گلوکاری کا دعویٰ داغ دیا، اب یہ زیادہ سے زیادہ رمبا سمبا اور چاچا چا کی دھنوں پر چند سُر لگا لیتی ہے اور بس لیکن جائے استاد خالی است جب یہ پرندہ اپنی گھر جدار آواز میں اُڑتے اُڑتے مڑ کر یا مُڑتے مُڑتے اُڑ کر اپنے رس بھرے سُر بکھیرتا ہے تو فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے اور ثقلِ سماعت کے مریض بھی کان کھڑے کر لیتے ہیں۔

پھر جب کسی بیر کے بنیرے پر بیٹھ کر "بلن" کے گیت گاتا ہے تو اُسے کسی رانجھے کی آمد کی نوید ملتی ہے گویا، اور کبھی دیر ہو جاتے تو بے ساختہ "آہ۔ بنیرے کانواں بول" کی التجا ہوتی ہے۔

اس کے گوشت میں بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو نوجوان بنانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود بتائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک شکاری ایک افسر کو مطلب براری کے لیے کبوتر بنا کر کھلاتے رہے۔ اور پھر سُنا کہ اُنھوں نے جلد دوسری شادی کر لی، (پہلی نے طلاق لے لی تھی. ایک بار ہم ایک دوست کے ساتھ شکارپور کے اسٹیشن سے گزرے۔ ہمارے دوست نے حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے گاڑی سے چھلانگ لگائی کہ میرو تہیں تلیئر کھلاتے ہیں!! ایک دو لقمے کھانے پر ایک دوسرے پر جھپٹنے کو جی چاہنے لگا۔ جوابی کارروائی کے خوف سے خیریت گزری، بعد میں ڈکار کی بجائے کائیں کائیں کی آواز نکلتی محسوس ہوئی منہ سے جانے کیوں؟۔

یہ پرندہ اجارہ داری نظام سے متنفر رہا ہے ہمیشہ، اور اجتماعی نظامِ زندگی کا داعی، بلکہ عامل و موجد۔ جو ملے سب کو کھلائے گا۔ نہ جھگڑا نہ تکرار۔ منہ اندھیرے تلاشِ رزق میں نکل کھڑا ہوگا۔ کچھ پائے گا تو سب کو بلا کر کھلائے گا۔ اُمید ہے کہ اس ہمہ صفت موصوف پرندے کی نسل کشی کے مزید منصوبے اربابِ حل و عقد کے زیرِ غور آئیں گے تاکہ اس کی صلاحیتوں اور افادیتوں سے بطورِ خاص استفادہ کیا جا سکے۔

کہ شعر کی اصل روح معانی نہیں بلکہ الفاظ ہیں۔ کتاب العمدہ کے مصنف ابن رشیق کے نزدیک اگر شعر میں معنی بلند ہوں لیکن الفاظ پست ہوں تو شعر ناقص ہوگا۔
حالی کی رائے یہ ہے کہ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے تو ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے۔ ان چند آرا کی روشنی میں
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کی تاثیر کا انحصار الفاظ کی موزونیت، تر و تازگی اور اثر پر ہے۔ آیئے اب ذرا غزلوں میں برتے گئے الفاظ کو ایک نظر دیکھیں۔
پہلے حصے کے شعراء کے ہاں ایسے الفاظ جو اپنے اندر مابعد الطبیعاتی زاویہ رکھتے ہیں یا ان میں اُوپر کی فضا سے متعلق حوالے، بلندی یا ماورائی کیفیات مضمر
ہیں ان میں علی الترتیب خدا / رب، آسمان / فلک، وقت / زمانہ، روشنی، سحر، ستارہ، سورج، اجالا، تقدیر، تعبیر، دعا، ابد، ابتدا، ارتقاء، ازل، تجلی
فراز، لوح اور عرش کا استعمال زیادہ ہے جبکہ دوسرے حصے کے شعراء میں یہ ترتیب روشنی، وقت / زمانہ، آسمان / فلک، سورج، ستارہ، دعا، تقدیر
تعبیر اور ازل جیسے مشترک الفاظ کے علاوہ بادل، انتہا، بیکراں، بشارت، توفیق، خیر، فضیلت، فرشتہ، مہتاب اور نور جیسے الفاظ کے اضافہ پر منتج ہوتی
ہے۔ غزلوں میں عمومی طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کا مجموعہ جسے غزلوں کا NET WORK بھی کہا جا سکتا ہے پہلے حصے کے شعراء کے ہاں کچھ اس
طرح کا ہے: دل، ہوا، شہر، خواب، شجر / پیڑ، آنکھ، گھر، چہرہ، سایہ، دریا، زمین، صحرا، منظر، ہاتھ، پرندہ / پنچھی، خوشبو، رُت، سمت، سمندر، صدا
قدم، لوگ، لہو / خون، منزل، مکان، موسم، نظر، نگر، نقش، یاد، آئینہ، اثر، جاں، حرف، دھوپ، ردا، زخم، شاخ، صورت، صبا، عالم، فاصلہ، فضا
فن، قریہ، نفس، وفا، ہنر، آواز، احساس، انا، بازار، بستی، بارش، پتھر، پل، پیاس، تلاش، جستجو، چادر، خیمہ، خیال، خواہش، دیوار، در،
دھرتی، دن، دھیان، ذات، راہ / راستہ، رابطہ، زبان، ساحل، سکون، شعلہ، صدی، عمر، فکر، قرض، قرب، قدوکرہ، کوزہ، گمان اور نگاہ وغیرہ جبکہ
دوسرے حصے کے شعراء کے عمومی الفاظ میں بھی دل، خواب، ہوا، گھر، آنکھ، جان، لہو / خون، شجر، راہ / راستہ، پرندہ / پنچھی، منظر اور موسم وغیرہ کا
استعمال زیادہ ہے تاہم چند الفاظ ایسے بھی ہیں جو پہلے حصے کے شعراء نے استعمال ہی نہیں کیے یا بہت کم کیے ہیں مثلاً لفظ، جہاں، سوال، انسان
تنہائی، تحریر، دھنک، امتحان، حادثہ، رشتہ، لباس، مٹی، رنگ، سوچ، چاند، لمحہ، دائرہ، دریچہ، ذہن، سماعت، قربت، کرن، کتاب، کشش، گنبد
مسافت، منصب، مہک، ہونٹ، ہمسایہ، آہٹ، تمثیل، تالاب، جھیل، زاویہ، ساعت، صحن، لہجہ، معیار، محیط اور وطن وغیرہ۔ لفظوں کا پُرانا یا
نیا ہونا جہاں زبان کے ترقیاتی مدارج پر منحصر ہے وہاں اُن سے معانی کا منسوب کرنا بھی بڑا دخل رکھتا ہے لیکن کچھ الفاظ ایسے ہیں جن سے خواہ مخواہ فرسودگی
کا احساس ہونے لگتا ہے شاید اس لیے بھی کہ انہیں باربار اُن کے پُرانے اور بوسیدہ لباس ہی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نسبتاً سینئر شعراء کے ہاں دشت
بزم، ہجر، آبلہ، دستار، دار، قضا، وصال، بام، بلا، پیام، تلوار، جلاد، خنجر، راہزن، ستمگر، شمشیر، صیاد، طبیب، فتنہ، فراق، قفس، کوچہ، گل
مسیحا، نازنیں، وحشت، ورنئے لکھنے والوں کے ہاں ان الفاظ سے ہٹ کر اسیر، آشیاں، شمع، فغاں اور مقتل کے الفاظ ملتے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں میں
DEPRESSION، ناپائیداری، پستی اور منفی رجحانات کے حامل الفاظ میں رات / شب، غم، شام، موت / مرگ، اندھیرا، غبار، آنسو، بکھراؤ، تنہائی، جبر
خاک، شکست اور قید نمایاں ہیں جبکہ نئی نسل کے ہاں ان کے علاوہ دُکھ / خوف، دُھواں، اشک، ویران، چُپ، حجاب، خالی، بوجھ، حسرت اور عذاب
پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مثبت، حوصلہ بخش، متحرک، روشن اور پُریقین الفاظ میں پہلے طبقہ کے شعراء نے صبح، دعا، چشمہ، سحر، جذبہ، چراغ، حُسن
زندگی، اڑان، رفتار، شاداب، طلوع، مینار، منور اور وسعت جیسے الفاظ کو ترجیح دی ہے جبکہ دوسرے طبقہ نے چراغ اور جذبہ کے علاوہ سند،
یقین، اُمید، چمک، دوست، رفاقت، اخوت، امن، تابندہ، جیت، جگنو، ستون، شگون، عظمت، مہربان اور نمو جیسے الفاظ کو پسند کیا ہے۔ مختصراً
حصہ اوّل کے شعراء کے مقبول الفاظ کی ترتیب یوں بنتی ہے: ـــــــ دل، ہوا، رات / شب، غم، شہر، خواب، شجر / پیڑ، آنکھ، گھر، چہرہ، سایہ جبکہ
حصہ دوم کے شعراء کے مقبول الفاظ اس ترتیب سے ہیں: ـــ دل، خواب، ہوا، گھر، رات / شب، آنکھ، جاں، لہو / خون، روشنی، شہر، راہ / راستہ، پرندہ

پنچھی، رنگ، موسم، شام، وقت / زمانہ، منظر اس کے علاوہ حصّہ دوم کے شعراء کے ہاں دو سو کے قریب الفاظ ایسے ہیں جو پہلی نسل کے شعراء کے ہاں استعمال نہیں ہوئے جب کہ اس سے نصف تعداد میں پہلی نسل کے استعمال شدہ الفاظ نئے لوگوں نے نہیں برتے ۔ نئی نسل نے بلندی کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ کو پہلی نسل سے زیادہ استعمال کیا ہے اور پُرانے الفاظ کی تعداد بھی نئی نسل کے اشعار میں نسبتاً کم ہے ۔ مثبت الفاظ کا ذخیرہ نئی نسل کے ہاں بے حد توانا ہے ۔ بھرپُور قوّت کا اظہار کرنے والے الفاظ بھی نئے شعراء کے پاس موجود ہیں جن سے پُرانے لکھنے والوں کی غزل بہت کم آشنا ہے جیسے آندھی، چیخ، زور، زلزلہ، طوفان اور گونج وغیرہ ۔ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو بیس تیس برس پہلے کی غزل میں تقریباً ناپید ہیں جیسے استعارہ، تجسّس، تتلی جزیرہ، چائے، چابی، سگریٹ، قوس، کنکری، کھڑکی، گملہ، لڑکی، مستقر اور ہوٹل وغیرہ ۔ ان تمام مثالوں سے نئی نسل کے شعراء میں الفاظ کی وراثت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ لفظیات کا ذکر یہیں ختم کر کے اب ایک نظر فنّی محاسن پر بھی ڈال لی جائے ۔

گوشن ادیب : مطلعوں کے علاوہ باقی سب اشعار کے پہلے مصرعے بے بحرے ہوگئے ہیں یعنی باقی تمام مصرعِ اولیٰ ایک بحر میں اور مصرعِ ثانی دوسری بحر میں ہیں ۔

شہناز نبی : "ذہن و بدن" والے مصرع کا آخری لفظ "میں" اور "فلیٹ کی چابی" والے مصرع میں آخری لفظ "میری" کی "ری" بحر سے خارج ہے ۔ لفظ "فلیٹ" کی "ف" بھی قابلِ غور ہے ۔

اظہر جاوید : "اپنے گھر کو آگ لگا کر" والے مصرع کا آخری لفظ "ہوں" غزل کی بحر سے متجاوز کر گیا ہے ۔

سیداحسن شیرازی: مطلع میں جو قافیہ "اپنے" اور "بیٹھے" میں "نے" کی مشترکہ آواز سے قائم ہوا ہے وہ باقی غزل میں موجود نہیں ۔

پرتو روہیلہ : معلوم نہیں اس شعر میں کیا کہنا چاہتے ہیں ؎

یہ اس سے کہنا کہ تُو نے معنی کی وہ انوکھی لغت لکھی ہے
کہ اب تو آئینِ آسمانی کی کوئی شق معتبر نہیں ہے

اختر ہوشیارپوری : مطلع کا دوسرا مصرع پہلے سے پوری طرح مربوط نہیں ہو پایا ۔ دونوں مصرعوں میں الگ الگ خیال محسوس ہوتا ہے ۔

عرش صدیقی : مطلع کا دوسرا مصرع ساخت کے لحاظ سے قدرے کمزور رہ گیا ہے ۔

فضا ابنِ فیضی: ایک مصرع میں "ناز بین" کی جگہ "ناز نہیں" چھپ گیا ہے ۔

عباس رضوی : ایک مصرع میں "چاہا" کی جگہ "چاہتا" چھپ گیا ہے ۔

بیدار بخت : دوسرے شعر میں لفظ "سمٹنا" کی جگہ "سمٹتا" ہوگا ۔

مظفر حنفی : ان کی غزل روایت کو قابو میں رکھنے کی اچھی مثال ہے ۔

جعفر شیرازی : ایک مشکل زمین کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے ۔

آزاد گلاٹی / غلام حسین ساجد: ان کی غزلیں اچھی شاعری کا نمونہ ہیں ۔

تبسم کاشمیری

اس بار سالنامہ کا اداریہ توجہ طلب ہے۔ اُن سب شاعروں کے لیے جو سمجھتے ہیں کہ ہم شاعری کر رہے ہیں اور ہر مہینے اُن کا کلام رسائل میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اداریہ ان تمام شاعروں کو ٹھنڈے دل سے پڑھنا چاہیئے۔ ان شاعروں کو بھی جن کے بڑے بڑے نام ہیں اور اُونچے مقام ہیں اور ایسے شاعروں کو بھی جو ابھی نئی منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج کی اُردو شاعری کا مجموعی اثاثہ کلیشے (CLI-HE) سے بھرا پڑا ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی المناک ہے۔ اس کے باعث شاعری غیر تخلیقی ہوتی جا رہی ہے، رسائل کے صفحات کو پڑھتے جایئے کہیں مشکل ہی سے تازگی کا جھونکا آئے گا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ہمارے شاعر لفظ کے اندر چھپے ہوئے معنوی منطقوں کو دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ پہلے سے دریافت شدہ مفاہیم کو تن آسانی کی وجہ سے استعمال کرتے جا رہے ہیں، ان کے ہاں لفظ کا اُفق بہت محدود ہو گیا ہے، وہ اس قرینے سے واقف نہیں کہ نیا شعری تجربہ لفظ کے اندر کتنا زرخیز معنوی عمل ٹھہرا سکتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے شعرا کو اپنے کنوئیں سے نکل کر جنوبی ایشیا سے آگے مشرقِ وسطیٰ، افریقا اور لاطینی امریکہ کے ادب کو پڑھنا چاہیئے تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ لفظ سے کیسے کھیل سکتے ہیں۔ ایک بات میں اور کہوں گا اور آپ شاید مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے کہ اب نئی شاعری پیدا کرنے کے لیے صرف ایک صنف میں وسیع تر امکانات ہیں اور وہ ہے "نثری نظم" مگر نثری نظم کہنا خود پُل صراط پر چلنا ہے۔ اس کے لیے خونِ جگر چاہیئے ورنہ اس کی نمود ناممکن ہے۔ کلامِ منظوم، نظم کہلا سکتا ہے، مگر نثری نظم کے لیے جس فن کی ضرورت ہے اُس سے بھی ہم لوگ بہت کم آشنا ہیں۔ اب اگر کوئی بڑا تجربہ ہوا تو اسی صنف میں ہو گا اور اسی صنف کی وسعتوں سے نظمِ آزاد کو توانائی ملنے کا امکان ہے ———— "دبستانِ لاہور" کی بحث دلچسپ ہے۔ میں لاہور کو شعری دبستان تسلیم کرتا ہوں۔ اس لیے کہ دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں دبستانِ لاہور کی بنیاد "جدیدیت" پر ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نئی سرزمین پر اُردو شاعری نے ہمیشہ کلاسیکی رویئے کے خلاف جدیدیت پر زور دیا ہے۔ میرا جی، راشد، مجید امجد اور ان کے بعد نئے شاعروں کی جدیدیت کی تحریک نے اس دبستان کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔ مجھے مرزا ادیب صاحب کے اس بیان پر خوشگوار حیرت ہوئی ——— "پنجاب میں اگر کوئی خطہ دبستانِ ادب بالخصوص دبستانِ شاعری کہلانے کا مستحق تھا تو وہ لاریب امرتسر تھا۔" ———— اگر مرزا صاحب اس منفرد خطے پر کبھی کچھ لکھ سکیں تو بہت بہتر ہو گا، اور مجھ جیسے قارئین ان کے افکار سے مستفیض ہو سکیں گے۔ ڈاکٹر حسن اختر اور رشید امجد کے دلائل قابلِ توجہ ہیں۔ رشید امجد کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ———— "موضوعاتی تنوع، عصری تقاضوں کا احساس، نئی جہت کی قبولیت اور زبان کے سلسلے میں بندھے ٹکے رویوں کی بجائے اس کے فطری ارتقا پر یقین، دبستانِ لاہور کی منفرد خصوصیات ہیں" ———— ڈاکٹر وزیر آغا دبستانِ لاہور کے وجود کو تاریخی، تہذیبی، جغرافیائی، ثقافتی، فکری اور لسانی بنیادوں پر ایک الگ دبستان تسلیم کرتے ہیں۔ میری رائے میں اُنہوں نے صرف ایک جملے میں اس دبستان کی جو تعریف کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے ——— "لاہور کا دبستانِ ادب بحیثیت مجموعی خیال اور وژن کا اعلامیہ ہے نہ کہ لفظی آرائش و زیبائش کا!" ———— بلراج کومل نے گزشتہ دو شماروں میں جاپانی شاعری کے خوبصورت ترجمے پیش کیے ہیں۔ سالنامہ میں اُنہوں نے جاپانی شاعری کی ایک پرانی صنف "تانکا" (TANKA) کے ترجمے شائع کروائے ہیں۔ یہ خوبصورت انتخاب ہے اور ان کے اعلیٰ ذوقِ نظر کی دلیل ہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بلراج کومل نے انگریزی سے ترجمہ کرتے ہوئے اس صنف TANKA کو "ٹینکا" لکھ دیا ہے، جب کہ صحیح جاپانی تلفظ "تانکا" ہے۔ جاپانی زبان میں "ٹ" کی آواز نہیں ہے۔ مگر یہ انگریزی کا کرشمہ ہے کہ ساری دنیا میں جاپان کے دو شہروں "توکیو" اور "کیوتو" کو "ٹوکیو" اور "کیوٹو" کہا جاتا ہے۔

انور سدید

"اوراق" کا سالنامہ ۱۹۸۹ء منظرِ عام پر آیا تو مَیں نے چند روز اس پرچے کے مضامینِ نظم و نثر کے ساتھ گزارے اور یہ ایسی محفل تھی جس میں بظاہر "اوراق" اور یہ ناچیز انور سدید ہی شامل تھے لیکن درحقیقت میرے کمرے میں علامہ اقبال، مجید امجد اور مشفق خواجہ بھی موجود تھے جن پر آپ نے خصوصی گوشے شائع کیے ہیں، میری ملاقات عبدالعزیز خالد، شہزاد منظر، عرش صدیقی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ریاض صدیقی اور ناصر بغدادی صاحب سے بھی ہوئی جنہوں نے اس پرچے کے مقالات لکھے ہیں، سرحد کی اس طرف سے ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں، مناظر عاشق ہرگانوی، ش۔ک۔ نظام، مظفر حنفی، اسلوب احمد انصاری شرون کمار ورما، ہیرانند سوز، شہپر رسول بھی اس محفل میں موجود تھے اور میرے ساتھ ہم کلام تھے۔ یہ سب اپنی تخلیقات کے وسیلے سے باتیں کر رہے تھے۔ مَیں ان سے اپنے تاثرات بیان کر رہا تھا۔ اب "اوراق" کے مندرجات کی طرف آیئے ــــــــــ کچھ عرصہ قبل گھر آب کے لیے جعفر شیرازی اور گلِ رعنا قزلباش نے مجھے غزل کی نسوانی آوازوں پر مضمون لکھنے کی دعوت دی تھی، اس دفعہ "اوراق" میں شامل خواتین کی غزلوں کو مَیں نے اسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دلچسپ کیفیت سامنے آئی کہ پنہاں کی غزل میں اندر کے رونے کی آواز نمایاں ہے۔ ان کی نا آسودگی نے ان کے داخلی المیے کو جنم دیا ہے اور بعض استعارے، تراکیب اور تلازمے مثلاً "بجھتے چراغ کا رشتہ"، "حاصلِ سفر کی ماندگی"، "بجھی ہوئی شام" اور "روشنی نہ ملنے کا دُکھ" وغیرہ پس پردہ معنویت کو آشکار کرتے ہیں۔ ــــ سیما شکیب کی غزل میں ایک ایسی بیاہتا عورت کی آواز سنائی دی جو خاوند کو حصارِ جاں میں لینے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن باہر کی دنیا اُنہیں حسد کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے۔ ان کی غزل میں سپردگی اتنی نمایاں ہے کہ دل کے دھڑکنے کی آواز بھی محبوب کی سماعت میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس شہناز نبی کی غزل سے جو کردار اُبھرا ہے یہ ہرجائی محبوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ سیما شکیب کے ہاں طمانیت ہے لیکن شہناز نبی نے سُکھ کو قطرہ قطرہ کرب سے کشید کیا ہے اور وہ خود اذیتی کے آلام سے گزرتی محسوس ہوتی ہے۔ فرحت نواز کی آزاد غزل میں زندگی کو حجابات کی اوٹ سے دیکھنے کا رویّہ نمایاں ہے لیکن "کچے گھڑے" کو تحفظ فراہم کر کے دوام جذبوں کی تلاش کی آرزو بھی کی گئی ہے، اس غزل میں ایک خاص نوع کا داخلی کیف نظر آیا ہے۔ غزالہ خاکوانی نے غزل کی روایت کی پابندی کی ہے، ان کی غزل کا رُخ معاشرے کی طرف ہے، اور لہجہ دعائیہ ہے! ان کی غزل امکانات میں محصور ہے ــــــــــ "پہلا ورق" میں کلیشے کی وضاحت بڑی خوبی اور خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ٹی وی کے ادبی پروگرام "ماہنامہ" میں اس موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا اور حیرت ہوئی کہ کلیشے کی پیش پا افتادگی مذاکرے کے شرکاء پر پوری طرح آشکار نہیں ہوئی تھی، چنانچہ بعض مفرد الفاظ کو بھی کلیشے کی گرد میں لپیٹ دیا گیا۔ اوراق کے اداریے تشنہ نے میں اشارہ، اور علامت کے امتیاز اور پھر ایک اچھی اور معنی خیز علامت کے کلیشے بن جانے کے نکات کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے، لیکن تردد رد دو کی یہ بات کہ "ادب ایک ایسا مہلک ہتھیار ہے جس کے ذریعے زبان خودکشی کرتی ہے اور جیکب سن کا یہ تصوّر کہ شاعری عام زبان پر منظم تشدد کرتی ہے" بے حد حیران کُن ہے۔ مدیر اوراق نے ان ہنگامی بیانات سے نئے معنی نکال کر انہیں مثبت بنا دیا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ادب جس طرح فرد کی تہذیب کرتا ہے اسی طرح شاعری اور زبان کو بھی رفعت توانائی اور فضیلت عطا کرتا ہے۔ یہ تشدد یا خودکشی کا عمل نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس میں تخلیقِ نو اور ارتقا کا زاویہ ہمیشہ موجود رہتا ہے، اور کرب بھی تخلیقی نوعیت کا ہے جو راحتِ گمنام یا بے عنوان کا پیش خیمہ ہوتا ہے، سجاد نقوی صاحب نے لکھا ہے کہ حال ہی میں ابوالفضل صدیقی کی دو کتابیں شائع ہوئیں، حقیقت میں ان کی تین کتابیں "جوالا مکھ"، "انصاف" اور "آئینہ" چھپی ہیں ــــــــــ "آپس کی باتیں" میں کرشن کمار طور صاحب نے تخلیق کار کی واضح طور پر طرفداری کی ہے اور نقاد کے اس عمل پر اعتراض کیا ہے کہ وہ ادب پارے کو خود سمجھنے سے پہلے دوسروں کو سمجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقاد کو آخر میں بُرائی ہی ملتی ہے۔ اُنہوں نے بیکن اور والٹر ریلے کے حوالے سے تخلیقی فوقیت ہی واضح کرنے کی کاوش کی ہے تاہم میرا

خیال ہے کہ تنقید کا یہ رویّہ تبدیل ہو چکا ہے ۔ نقاد اب ادب پارے کی تشریح نہیں کرتا بلکہ ادب پارے کے باطن کو دریافت کرتا اور خود بھی ایک نوع کے تخلیقی عمل سے گزرتا ہے ۔ تارتھ رُوپ فرائی نے تو نقاد کو اپنی اقلیم میں خود مختار قرار دیا ہے ، اس کے نزدیک تنقید کا عمل استقرائی ہے ۔ طوُر صاحب نے استخراجی عمل کی حمایت کی ہے جو اب پیش پا اُفتادہ ہو چکا ہے ، اب تو فن پارے کو گونگا یا خاموش بھی کہا جاتا ہے اور تنقید اس فن پارے کی زبان ہے ۔ قاری جب فن پارے سے مفہوم اخذ کرتا ہے تو وہ بھی درحقیقت نقاد کا ہی فریضہ ادا کرتا ہے ، اور فن پارے کو گویائی عطا کرتا ہے ——— ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے " جدید اُردو غزل " (مؤلفہ ڈاکٹر معین الرحمٰن) میں افتخار عارف کو کربلائی شاعر قرار دیا ہے ۔ اوراق کے اس شمارے میں ان کا سلام عزائیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور اس کا کیف اس بات میں ہے کہ افتخار عارف نے سوچی ہوئی بات کہنے کے بجائے ہر شعر حل کی نہر سے نکالا ہے ، کرامت بخاری اور شہباز نقوی کے عزائیوں میں عقیدت اور جذبے کی روانی متاثر کرتی ہے ——— انشائیہ کی محفل میں اس دفعہ محمد ہمایوں ، رشید احمد گریجہ اور علی اختر جیسے ناموں کا اضافہ ہوا ۔ ہمایوں صاحب کا انشائیہ ٹیلی وژن سے بھی نشر ہوا ۔ اور نسبتاً وسیع حلقے تک پہنچا ۔ اس پہ تبصرہ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے کیا جو بظاہر انشائیہ کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں لیکن ٹی وی پہ اس کی موافقت کرتے ہیں ۔ مجھے کسی صنفِ ادب کی مخالفت عجیب سی بات نظر آتی ہے ۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ فلاں انشائیہ اچھا نہیں لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ پوری صنفِ اظہار مردود ہے ، دوسری طرف جب کسی سرکاری ادارے سے اظہارِ خیال کا موقعہ پیدا ہو تو یہ مردود صنفِ ادب ہی محبوب اور مرغوب قرار پا جاتی ہے ——— " رائے فروختند وچہ ارزاں فروختند " والی بات پیدا ہو جاتی ہے ، افسانوں میں طارق محمود ، ہیرا نند سوز ، شرون کمار ورما ، سلیم آغا قزلباش ، محسنہ جیلانی ، محمد سعید شیخ نے متنوع افسانے لکھے ہیں ۔ " پنج کلیان " میں منشا یاد نے اور " بندر " میں علی تنہا نے جانوروں کی نفسیات اور انسانی نفسیات کے عمدہ زاویے تراشے ہیں ۔ گزشتہ شمارے میں آصف فرخی کے افسانے " کاگ داس " نے جو کیفیت پیدا کی تھی منشا یاد اور علی تنہا نے اس کی توسیع کی ہے ، ادیب سہیل کا مقالہ " غالب ، بیدل ، اور اقبال ، اس موضوع کے چند نئے گوشے آشکار کرتا ہے ——— مجید امجد پر ڈاکٹر سہیل احمد خان کا مقالہ اور آپ کا مقالہ " مجید امجد کی شاعری میں شجر " اس دلآویز شاعر کے فن کے داخلی گوشے عمدگی سے سامنے لاتے ہیں ، ان کے عہد کے متعدد شاعروں کے چراغ گل ہو رہے ہیں لیکن مجید امجد روز بروز نمایاں ہو رہا ہے ، غزلوں کے حصے میں احمد ظفر ، انوار فیروز ، شاہد علی محمود امیر ، رضی الدین رضی ، حیدر قریشی ، جاوید منظر ، کرشن ادیب ، ممتاز اطہر ، اظہر ادیب ، امداد آکاش ، رشید قیصرانی ، فیروز شاہ ، جعفر شیرازی ، صبا اکرام نے نئے مضامین نکالے ہیں ۔

خیر الدّین انصاری

اوراق کا سالنامہ باصرہ نواز ہوا جسے دیکھ کر جہاں نظروں میں پھول کھلنے لگے وہاں دل میں مسرتوں کی بہت سی مشعلیں بھی روشن ہو گئیں ——— میرا معمول ہے کہ میں کوئی کتاب یا رسالہ حرفِ اوّل سے شروع کرتا ہوں اور تمت بالخیر تک پہنچ کر دم لیتا ہوں ۔ لیکن اس بار میں نے سب سے پہلے مجید امجد کے گوشہ پہ نظر ڈالی ۔ ممکن ہے اس فعل کی تہہ میں کسی قسم کا علاقائی تعصب بھی کار فرما ہو لیکن مجید امجد کی شہرت تو زمان و مکان کی حدود کو کبھی کی پھلانگ چکی ہوئی ہے ۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مقالہ " مجید امجد ——— ایک الگ دُنیا کا باسی " میں کچھ فیصلے سنائے ہیں لیکن GROUNDS کو گول کر گئے ہیں ۔ ڈاکٹر سہیل احمد نے اس ماحول کو ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا دینے کی سعی کی ہے جس کا قاری کو مجید امجد کے الفاظ سے رشتہ قائم کرتے وقت احساس تو ہو جاتا ہے لیکن اس کا بخوبی مشاہدہ نہیں کر پاتا ۔ مقالہ کے بعض حصّوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے ۔ مثلاً وہ مجید امجد کی ایک نظم " ہڑپے کا ایک کتبہ " کا تجزیہ کرتے وقت اسے ایک طرف تو مجموعی ماحول کا نوحہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس ماحول میں جبریت ہی کا نہیں فطرت کا حُسن بھی دیکھتے ہیں اور یوں زندگی کے دھیمے دھیمے

واگ میں طمانیت ڈھونڈ نکالنے کی سعی بھی کرتے ہوتے نظر آئے ہیں۔ حالانکہ اس نظم کی آخری لائن سراپا احتجاج ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ "مجید امجد کی شاعری میں شجر" پڑھا۔ اس زور دار مقالہ کی مدد سے درخت کا وہ رُوپ نکھر کر سامنے آتا ہے جو انکشاف و عرفان کی لطیف ترین تہوں سے مرتب ہوتا ہے ـــــــ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مقالہ میں مشفق خواجہ کی مزاح نگاری کے جو نمونے درج کیے ہیں ان کا مطالعہ ایک طرف تو دل و دماغ کو سکون و عافیت کی نعمت سے نوازتا ہے اور دوسرے یہ بھی خیال آتا ہے کہ انور سدید نے اپنے مقالے کی سُرخی ٹھیک ہی جمائی ہے۔ اب دیکھیے ڈاکٹر انور سدید مشفق خواجہ کی غزل کی مدح سرائی میں لگے ہوئے ہیں اور قاری کو اپنے خیال کی موجوں کے ساتھ ساتھ بہائے لیے جا رہے ہیں۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید کسی انسان کا نام ہے یا کمپیوٹر قسم کی کوئی شے ہے۔ ایک ہی ماہنامے کے ایک ہی شمارے میں تین مقالے، ایک نعت، لاہور کے ادبی دبستان ہونے کے سلسلہ میں بحث میں حصہ اور چھتیس کتابوں پر تبصرے۔ کیا یہ کسی ایک انسان کا کام ہو سکتا ہے۔ میں اس انسان کی محنت اور صلاحیتوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔ ـــــــ پہلا ورق کئی بار پڑھا۔ تو دو تو رود اور جیکب تسن کی باتیں میری سمجھ تو نہ آتیں اگر آپ تفصیل سے ان چھلکوں کی تہوں کو نہ کھولتے۔ آپ کی باتیں پڑھ کر بڑا مزہ آیا اور ذہن میں کشادگی بھی آئی ـــــــ افسانوں میں شرون کمار ورما نے "پیاؤ" میں بڑے ہی دلچسپ کردار کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ عوض سعید کا "پنجرہ" گو مختصر سا تھا لیکن تاثر اور لذت سے بھرپور تھا۔ منشا یاد نے بہت مختصر سے عرصے میں اُردو زبان کے افسانہ نگاروں میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ ان کا کوئی بھی افسانہ بھرتی کا نہیں ہوتا "پنج کلیان" ایسا ہی ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ اس کا سارا حُسن پنج کلیانی بھینس کے کردار اور بیگی کی فطرت کے درمیان قائم کردہ مماثلت میں مضمر ہے۔ نیز اس افسانے میں ایک بہت ہی گہرے نفسیاتی مسئلہ کو بنیاد بنا کر افسانے کی خوبصورت اور رفیع الشان عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اے خیام کا "گوتم مشکل" بھی اس شمارے کا ناقابلِ فراموش افسانہ ہے افسانہ نگار نے جس سادگی اور آہستہ روی سے افسانے کے واقعات کو فطری عروج عطا کیا ہے وہ اس کی فنی پختہ کاری کی غمازی کرتا ہے۔ طارق محمود کا "سفر" معاشرے پر گہری طنز ہے۔ افسانے میں شروع سے لے کر آخری لفظ تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ چونکہ یہ افسانہ روایتی انداز کا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہ آئے جو ادب میں آسان فہمی کو ناقابلِ معافی جرم قرار دیتے ہیں لیکن عام قاری اسے قدر کی نگاہوں سے ہی دیکھے گا۔ جتندر بلّو کا "بے نام رشتے" نہایت اہم موضوع کو لے کر سامنے آیا ہے۔ کہنے کو تو ایک میاں اور بیوی کی کہانی ہے لیکن حقیقت میں یہ عصرِ حاضر کے انسان کا المیہ ہے کہ اب نظروں میں سارے جانے پہچانے رشتے رفتہ رفتہ بے نام ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان اس پر پشیمان ہونے کی بجائے پھُولے نہیں سماتا اور جہانِ نو کو تشکیل دینے کی بشارتیں سنانے میں لگا رہتا ہے۔ نگہت سیما کا "بے چہرہ" روایتی انداز کا افسانہ ہے لیکن اسے جس فنی چابکدستی سے انجام کو پہنچایا گیا ہے اسے پڑھ کر اس کی فکر انگیزی اور معنی آفرینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ محمد سعید شیخ کے "تسخیر" میں افسانویت کم اور فکری مواد زیادہ ہے۔ "کھنکتی ہوئی ہنسی" کا عنوان ہی دل پذیر ہے۔ محسنہ جیلانی نے پلاٹ کی تعمیر میں فنی شعور کا خوب مظاہرہ کیا ہے اور کہانی کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیا ہے۔ ہم عملی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ پڑھے لکھے اور صاحبِ علم تو جوتیاں چٹخاتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جاہل لوگ پیسوں میں کھیلتے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ان جہلا کو معاشرے میں بلند مقام بھی مل جاتا ہے جس کے یہ اہل نہیں ہوتے۔ بعض اوقات اہلِ علم لوگ ان کے سماجی مرتبے کو دیکھ کر ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے بھی لگتے ہیں۔ قدسیہ انصاری کا افسانہ "چھتری" ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو ہزار آندھیوں کے باوجود اپنے اعتماد کو ڈگمگانے نہیں دیا۔ یہ رجائیت پسندی قابلِ داد ہے۔ کلیم احمد کے افسانے "روشنی" میں تحیّر زا کیفیت بڑا مزہ دیتی ہے۔ "سہمے ہوئے" ایک ایسے موضوع کی کہانی ہے جس کی طرف کسی دوسرے افسانہ نگار نے توجہ نہ دی۔ ایسے واقعات آئے دن ہماری آنکھوں کے سامنے نمو پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن انہیں ایک انمول افسانہ بنانے کا شرف صرف خورشید عالم ہی کو حاصل ہو سکا ہے۔ یوسف چوہدری

کا "دودھ بان" بھی اچھا افسانہ ہے اور "اوراق" کے دوسرے افسانوں کا ہم نشیں بن کر شرماتا نہیں ہے۔ ——— جہاں تک انشائیوں کا تعلق ہے، اس بارے میں میں عموماً یہ بات کیا کرتا ہوں کہ کسی انشائیہ کے لیے یہ اعزاز ہی بہت ہے کہ اسے "اوراق" کے صفحات پر جلوہ فگن ہونے کا شرف حاصل ہو جائے۔ جمیل آذر نے اپنی جولانیٔ طبع کا جوہر دکھانے کے لیے ایک ایسے موضوع کو چنا جسے انشائیے کا روپ دینا تقریباً ناممکن تھا لیکن وہ اپنی مشاقی کے بل بوتے پر اس منزل سے سلامت گزر گئے ہیں۔ "مماثلت" میں فکر و خیال کے کتنے ہی حسین گوشے مستور ہوئے ہیں۔ ارشد میر "دوپٹہ" تحریر کرتے وقت مضمون نگاری کی تہمت سے بال بال بچ گئے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش "پسینہ" میں کتنی ہی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ اس میں تقدیرِ امم کے بننے اور بگڑنے کا سوال بھی اٹھایا ہے لیکن قاری کی طبع نازک پر گراں نہ گزرا اور قاری نے اس میں کہی گئی عمیق اور فلسفیانہ باتوں کو بھی اس طرح وصول کیا جس طرح بچے نیلی جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے کنول کے پھولوں کو دیکھ کر پُر اشتیاق ہو جایا کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی نے تاریخ کے ایک کردار "نظام سقہ" کو انشائیے کا موضوع بنا کر انشائیہ نگاروں کی طبع آزمائی کے ایک نیا جہان آباد کیا ہے۔ کل کوئی "محمد بن قاسم" پر انشائیہ لکھ کر جی۔ ایم۔ سید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ بشیر سیفی کا "روشنی" ایک مکمل انشائیہ ہے۔ اس میں اختصار ہے، جملے خوبصورت اور جامع ہیں۔ اس کے علاوہ موضوع ہے کہ جس میں انسان کے ظاہر اور باطن کے درمیان موانست کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ انسان کی دو آنکھیں تو سبھی نے دیکھ رکھی ہیں لیکن انجم نیازی نے ہمارا تعارف انسان کی ان دو آنکھوں سے کرایا ہے جسے صرف وہی دیکھ سکتے ہیں۔ جان کاشمیری بھی انجم نیازی کی طرح اُردو ادب کی دلنواز صنفِ سخن یعنی غزل گوئی کے راستے سے انشائیہ نگاری کی طرف آئے ہیں اور اس میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ "رات کی رانی" ایک خوبصورت انشائیہ ہے ——— اپنے کندھوں پر اپنے گھروں کو اُٹھائے پھرتے رہنے والے لوگوں کو ہم سب نے دیکھ رکھا ہے اور ان کی زندگیوں کے بارے میں بھی ہم نے اکثر غور کیا ہوگا لیکن اقبال انجم نے اس سوچ میں اپنے وجود کو داخل کر کے "خانہ بدوش" لکھا ہے۔ رضا نقوی "آتش فشاں" کی صورت میں ایک نئی دُنیا تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو سراسر ان کی اپنی ہے تاہم ایک باشعور قاری کو اس کے اندر جھانک لینے کی اجازت ہے ———

راجہ ریاض الرحمان کا "پانچواں موسم" شاید بھارت کے ایک مشہور فلمی گیت سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ قمر اقبال غالباً پہلی بار بزمِ انشائیہ میں شامل ہوئے ہیں تاہم ڈوب کر اُبھرنے کا فن جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "ڈوبنا" میں ڈوبنے کی رٹ لگانے کے باوجود ڈوبے نہیں ہیں۔ علی اختر کا "فاؤل" پوری توجہ سے پڑھا۔ شروع شروع میں جی کو نہ بھایا لیکن پھر جوں جوں آگے چلتا گیا تو ایک حیرت زا کیفیت سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ ایک غیر شاعرانہ نام ہے لیکن خود نگشائی کے جذبے نے انہیں انشائیہ نگار بنا دیا ہے، محمد ہمایوں کا "نہ جنید گل محمد" پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مصنف میں انشائیہ نگاری کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ——— حصۂ نظم میں بلدیو مرزا کی نظم اور آپ کے ترجمہ کا بطورِ خاص ذکر کروں گا کہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ لذتیں رکھتی ہیں۔ نظم کا اختتامیہ قاری پر ایک بھرپور تاثر چھوڑتا ہے، اور اس کی سوچ کے لیے بہت سا سامان فراہم کرتا ہے۔

کرشن ادیب

انور سدید نے سوال کیا ہے کہ کیا لاہور ایک دبستانِ ادب ہے؟ اس میں شرکت کرنے والے بڑے بڑے جغادری ادیب ہیں۔ سوال بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ جہاں تک میری ذاتی رائے رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ لاہور شروع سے ہی ایک دبستانِ ادب رہا ہے۔ بلکہ دلّی، لکھنؤ والوں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔ اسی لاہور سے اقبالؔ جیسے شاعر پیدا ہوئے، فیضؔ، ساحرؔ اور اور بھی بہت اہم شعرا کا مرکزی ادبی مقام لاہور رہا ہے۔ اور اسی طرح افسانے اور ناول میں کرشن چندر، منٹو، بیدیؔ وغیرہ کی سرگرمیوں کا بھی مرکز رہا اور مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا بھی تعلق لاہور سے ہی رہا ہے۔ بہرحال لاہور یقیناً

دبستانِ ادب ہے اور رہے گا ـــــــــ انور سدید کا دوسرا مضمون "ایک انوکھا مزاح نگار" پڑھ کر لطف آگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے خود بھی مشفق خواجہ کا بحیثیت شاعر نام ہی سن رکھا تھا۔ پڑھا بالکل نہیں تھا۔ تاہم آپ نے اوراق میں اُن کے لیے "گوشۂ مشفق خواجہ" مخصوص کر کے بہت گرانقدر کام کیا۔ مَیں نے انور سدید کے دونوں مضامین پڑھے، مزاح نگار کے طور پر بھی خواجہ صاحب اہم ہیں اور بحیثیت شاعر تو یقیناً بہت اچھے لگے۔ جانے کیوں اُن کے اشعار پڑھتے ہوئے غیر شعوری طور پر باقی کی یاد آگئی۔ ان دونوں شعرا کا ملتا جلتا اسلوبِ بیاں محسوس ہوتا ہے لیکن سب سے منفرد و الگ تھلگ، ـــــــــ اب کے انور سدید اوراق پر چھائے ہوئے ہیں۔ "مجید امجد ـــــ ایک الگ دُنیا کا باسی" بہت پسند آیا لیکن مَیں ایک بات سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا ہوں کہ انور سدید ایک نہایت محترم ملازمت پر فائز ہیں۔ دفتری ذمے داریاں بھی یقیناً بہت ہوں گی۔ جنہیں بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تخلیقی کام، نظم، غزل، مضامین، تبصرے، دیباچے اور اکثر "جواب آں غزل" (میری مراد لاہور کے حملہ آوروں سے ہے) بھی خوب دیتے ہیں۔ وہ محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ آخر سوتے، جاگتے کس وقت ہوں گے۔ میرے لیے یہ واقعی ایک معمّہ ہے جو مَیں حل نہیں کر پاتا ـــــــ انشائیے زیرِ مطالعہ ہیں۔ اس وقت تک جو انشائیے پسند آئے وہ یہ ہیں۔ دوپٹہ (ارشد میر) نظام سقہ (اکبر حمیدی) پسینہ (سلیم آغا قزلباش) البتہ نظمیں ساری پڑھ لی ہیں، ان میں سے ٹیبلنگ (کومل) ہاؤس پلانٹ (بیدار بخت) دروازے کھُلے (کمار پاشی) ہَوا (اقتدار جاوید) نظم (بسمل شکیب) بہت دُور (نصیر احمد ناصر) ابھی کچھ دن لگیں گے (ممتاز اطہر) اس شمارے کی بہترین نظم لگی (کیونکہ زندگی کے تلخ اور سپاٹ حقائق کو نہایت خوبصورت مصرعوں میں پیش کیا ہے) ان کے علاوہ بلراج کومل کی نظم (گولڈ رش) بہت اچھی لگی، پچھلے دنوں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ مبہم اور تجریدی نظمیں کہنے لگے تھے، جو میرے لیے ناقابلِ فہم ہوتی تھیں! انگیٹھی (وزیر آغا) اور بُدھو میرا محبوب (ترجمہ آغا صاحب)۔ بہت ہی پسند آئی ہیں، ــــــــ بُدھو میرا محبوب پڑھتے وقت ترجمے کا احساس تک نہیں ہوتا اور یہی مترجم کی خوبی ہے۔ آپ نے نظم کے مزاج کے مطابق زبان کا استعمال اور الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ جو کہ ترجمے کا احساس نہیں دلاتی بلکہ نظم اوریجنل محسوس ہوتی ہے۔ محترمی بلدیو مرزا کی نظم انگریزی میں تھی، اُسے بھی پڑھا تو شدید احساس ہوا کہ آپ نے ترجمہ کرنے سے قبل اس نظم کی خوبصورت شعری فضا میں خود کو سمویا اور پھر آورد نہیں بلکہ آمد کے تحت خود بخود ترجمہ ہو کر آپ کے سامنے آگئی ہوگی۔ بلدیو مرزا اور آپ کو بھرپور داد دینے کو جی چاہتا ہے!

رضی الدّین رضی

ادبی جرائد ہمیشہ سے ہی ادب کی ترویج و ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے قارئین کو ایک طرف تو ادب کی رفتار اور معیار کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن ادبی تحریکوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی حلقوں میں پروان چڑھتی رہتی ہیں۔ آج کے اس تیز رفتار سائنسی دور میں جہاں اور بہت سے فنونِ لطیفہ ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر اور اخبارات کے سہارے فروغ پا رہے ہیں وہیں ادب بھی انہی ذرائع ابلاغ کا محتاج ہو گیا ہے۔ ادبی جرائد کی تعداد کم ہو گئی ہے اور ان کا معیار بھی اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس کے باوجود اب بھی چند ایسے ادبی جرائد باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں جو اپنے منفرد معیار اور مزاج کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ "اوراق" کا شمار ایسے ہی ادبی جریدوں میں ہوتا ہے ـــــــــ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والا "اوراق" کا سالنامہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ادب کے قارئین کے لیے مختلف دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں غزلوں، نظموں، گیتوں، افسانوں، انشائیوں اور مضامین سمیت ادب کی تمام اصناف کو نمائندگی دی گئی ہے۔ سالنامے کی ابتدا میں انور سدید اور اطہر ... کی نعتیں اور افتخار عارف، شہباز نقوی اور کرامت بخاری کے سلام شائع کیے گئے ہیں۔ "کیا لاہور ایک دبستانِ ادب ہے؟" اس موضوع پر ایک دلچسپ ادبی بحث شائع کی گئی ہے۔ بحث میں ڈاکٹر سہیل بخاری، میرزا ادیب، غلام جیلانی اصغر، شہزاد احمد، رشید امجد، ملک حسن اختر اور ڈاکٹر وزیر آغا نے

حصّہ لیا ہے جبکہ بحث کے محرک ڈاکٹر انور سدید ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا موازنہ کرنے کے بعد لاہور کے دبستان کو مذکورہ دبستانوں کی توسیع تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے ان کی رائے میں لاہور ایک الگ دبستانِ ادب ہے جس کی خصوصیات اور حدود ادب نہ صرف دوسرے دبستانوں سے الگ ہیں بلکہ ان کی نوعیت بھی جدا گانہ ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی رائے یہ ہے کہ لاہور دبستانِ ادب تو نہیں البتہ ایک مخصوص و منفرد لسانی مرکز ضرور ہے۔ مرزا ادیب نے بھی لاہور کو دبستانِ ادب قرار دینے کی بجائے گہوارۂ ادب قرار دیا۔ شہزاد احمد نے دبستان کی بحث کو سرے سے بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے لیے دبستان کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ وہاں کے دربار تھے اس وقت بادشاہوں کے حضور ایک ہی وقت میں یکجا ہونے کا رواج تھا۔ مشاعروں میں بھی اسی روایت کے تحت لوگ جمع ہوتے تھے۔ لہٰذا اس اجتماع کو "دبستان" کہنے کا رواج پڑ گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے یہ ہے کہ لاہور کے دبستانِ ادب سے مراد پورے پنجاب کا دبستانِ ادب ہے اور اس کی انفرادیت میں پنجابی ادب کی زیرِ سطح کارکردگی کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ـــــــ اس بحث کے علاوہ اس سالنامے کی دوسری خصوصیت وہ گوشے ہیں جو اقبال، مجید امجد اور مشفق خواجہ کے بارے میں شائع کیے گئے ہیں گوشۂ اقبال میں اسلوب احمد انصاری ڈاکٹر این میری شمل، ادیب سہیل اور حسن رضا جعفری کے مضامین شامل ہیں۔ ادیب سہیل کے مضمون میں غالب، اقبال اور بیدل کی شاعری کا موازنہ کیا گیا ہے۔ گوشۂ مجید امجد میں شائع ہونے والے تینوں مضامین کے مطالعے سے مجید امجد کی شاعری کے مختلف زاویے ابھر کر سامنے آتے ہیں ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں مجید امجد نے اپنی شاعری میں خارج سے خول کو توڑ ڈالنے کی ضرورت محسوس کیے بغیر داخل کی طرف مراجعت کی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد نے مجید امجد کی نظم نگاری کی محسوساتی اور فکری جہتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جبکہ وزیر آغا کے مضمون کا عنوان " مجید امجد کی شاعری میں شجر " ہے اسی طرح گوشۂ مشفق خواجہ میں شامل مرزا ادیب، انور سدید اور منظر علی خان کے مضامین کے مطالعے سے مشفق خواجہ کے فن اور شخصیت کے کئی رُخ قاری کے سامنے آتے ہیں ـــــــ نظموں کے حصّے میں بلراج کومل کی نظم "ایک نظم"، سحر صدیقی کی "سمندر سے ناراض جزیرہ"، نصیر احمد ناصر کی "بہت دُور ایک گاؤں" اور ممتاز اطہر کی "ابھی کچھ دن لگیں گے" قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ افسانوں پر ایک نظر ڈالیں تو منشا یاد، علی تنہا، سے خیام سعید شیخ، نگہت سیما اور محسنہ جیلانی سمیت بہت سے افسانہ نگاروں کی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن افسانوں کی نسبت انشائیوں کا حصّہ زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ یہاں ہمیں جمیل آذر کا انشائیہ "شمولیت"، ارشد میر کا "دوپٹہ"، سلیم آغا قزلباش کا "پسینہ"، بشیر سیفی کا "روشنی"، رعنا تقی کا "آتش فشاں" اور علی اختر کا "فاؤل" پڑھنے کو ملتا ہے۔ ان تمام انشائیہ نگاروں نے بظاہر چھوٹے چھوٹے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے داخلی تجربات اور مشاہدات کو اس خوبصورتی کے ساتھ انشائیے کا رُوپ دیا ہے کہ پڑھنے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ـــــــ غزلوں میں شہزاد احمد، وزیر آغا افتخار عارف، رشید قیصرانی، عرش صدیقی، جعفر شیرازی، بیدل حیدری، اظہر جاوید، قمر رضا شہزاد، اسلم کولسری اور حیدر قریشی کا کلام پڑھ کر تازگی فکر کا احساس ہوتا ہے۔ ان شعراء نے عہدِ حاضر کے معاشرتی مسائل اور ذاتی کیفیات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔ چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

ٹوٹتا پھر کیوں نہیں یہ دشمنی کا سلسلہ
تم اگر کہتے ہو ہر رشتے کی اک میعاد ہے

(وزیر آغا)

مَیں نے چھُو کر پڑھ لیا چہرہ تیرا
اب مری آنکھوں سے پٹّی کھول دے (بیدل حیدری)

وہ اپنے گھر میں یوں برپا شبِ تمثیل کرتا ہے
چراغوں کے دھوئیں میں خود کو بھی تحلیل کرتا ہے

(بشیر آذر)

طلسمِ عشق سے تسخیر ہونے والا ہے
وہ شخص اب مری جاگیر ہونے والا ہے

(قمر رضا شہزاد)

مقالات کے حصے میں عبدالعزیز خالد، عرش صدیقی، ذکاء الدین شایاں، مرزا حامد بیگ، مناظر عاشق ہرگانوی، شہزاد منظر، ریاض صدیقی، شین کاف نظام اور ناصر بغدادی کے مقالے شامل ہیں۔ عرش صدیقی نے نیاز فتح پوری کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ شہزاد منظر نے "افسانے میں کہانی کے عنصر کا مسئلہ" کے زیرِ عنوان اپنے معاشرے میں لکھا ہے کہ آپ افسانے میں خواہ کتنا ہی تجربہ کریں اس میں کہانی کے صنفی جوہر کو برقرار رکھنا بےحد ضروری ہے۔ اس کے بغیر افسانہ "افسانہ" نہیں رہے گا۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جسے جدید علامتی افسانہ نگاروں کو حل کرنا چاہیئے۔ شین۔ کاف نظام کا مضمون "دوہا، تجزیہ اور چند سوال" دوہے کے حوالے سے ایک سیر حاصل تنقیدی اور تحقیقی مضمون ہے۔ "اوراق" کے سالنامہ کے آخری حصہ میں کتابوں کے بارے میں مضامین اور کتابوں پر تبصرے شامل ہیں ـــــ بحیثیت مجموعی "اوراق" کا یہ سالنامہ معیاری ادبی تخلیقات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے ایک اہم ادبی دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے۔

مشتاق احمد

اوراق (سالنامہ) آج میں نے ختم کرلیا ہے۔ میری عادت ہے کہ میں ہر کتاب اور رسالے کو صفحۂ اوّل سے لے کر صفحۂ آخر تک مسلسل پڑھا کرتا ہوں۔ اوراق کو میں نے ہمیشہ اسی طرح پڑھا ہے۔ موضوعات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی غزلیں کبھی نظمیں کبھی افسانے اور کبھی مقالے جس ترتیب کے ساتھ اوراق میں شامل ہوتے ہیں، اسی ترتیب سے میں انہیں پڑھتا جاتا ہوں۔ اوراق کا مطالعہ گویا ایک ایسا سفر ہوتا ہے جس کے دوران میں اصنافِ ادب کی مختلف وادیوں سے گزرتا ہوں۔ یہ سفر جو ایک سیاحت بھی ہوتا ہے میرے لیے سُود مند بھی ہوتا ہے اور مسرّت بخش بھی۔ اوراق کا ہر شمارہ مجھے علمی آگہی اور ادبی شعور کی سطح پر ایک زینہ اور بلند ہوجانے کا باعث بنتا ہے ـــــ موجودہ شمارے میں آپ نے کلیشوں کی وضاحت بڑے اچھے انداز سے کی ہے۔ اس سے پہلے میں خود اس اصطلاح کو اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ "سوال یہ ہے کہ اس عنوان سے لاہور کے ایک دبستانِ ادب ہونے یا نہ ہونے کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ بحث میں حصہ لینے والوں نے اپنی قوتِ استدلال کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے جس سے یہ بحث خاصی دلچسپ ہوگئی ہے۔ تاہم مجھے ان لوگوں سے اختلاف ہے جو ادبی دبستانوں کے قائل نہیں، یا جو لاہور کو ایک دبستانِ ادب نہیں مانتے ـــــ ہائیکو اور گیت سبھی اچھے ہیں۔ ہائیکو نے تھوڑے سے عرصے میں ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے اپنے آپ کو تسلیم کروا لیا ہے۔ اس معرکے کو سر کرنے میں اوراق نے اس۔۔ت مدد کی ہے ـــــ حضرت علامہ اقبال کے بارے میں جتنے مضامین ہیں سبھی اچھے ہیں البتہ ادیب سہیل صاحب کا مضمون غالب، اقبال اور بیدل پڑھنے کے بعد بےحد تشنگی محسوس ہوئی۔ نظمیں فکری اور فنی اعتبار سے سبھی اچھی ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بلراج کومل، تبسم کاشمیری، سحر صدیقی، حیدر قریشی، سیما شکیب اور نصیر احمد ناصر کی نظمیں بہت اچھی لگیں۔ بُدھ میرا محبوب کے عنوان سے وزیر آغا کا ترجمہ اور ان کی دوسری نظمیں تو مجھے بےحد پسند آئیں۔ افسانے بھی بہت اچھے ہیں۔ منشا یاد، طارق محمود، سلیم آغا قزلباش، انور خان، یوسف چوہدری کے افسانے تو بہت خوبصورت ہیں ـــــ جناب مشفق خواجہ

نیکی، دریا اور سمندر

جمیل آذر

میری شریکِ حیات میرے سامنے بیٹھی اُن حضرات کے خلاف لگاتار شکایات کا دفتر کھولے جا رہی ہیں جنھوں نے اُس کے احسانات کا بدلہ دشمنی کی صورت میں دیا۔ میں فرانس کے مشہورِ زمانہ ادیب کامیو کا ایک ناول پڑھنے میں محو ہوں۔ وہ مسلسل میرے انہماک کو اپنی شکایات کی تکلیف دہ ضربوں سے توڑ رہی ہے۔ اچانک میری نظر اُن سطور پر مرکوز ہو جاتی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار کہتا ہے "جس کسی پر میں نے احسان کیا وہ میرا دشمن ہو گیا۔" میں خوشی سے اُچھل پڑتا ہوں اور اپنی "نصف بہتر" کو جو میرے سامنے جناب یونگ (JUNG) کے فلسفۂ نفسیات کے مطابق عینیما (ANIMA) کی مکمل تجسیم بنی بیٹھی ہے یہ سطور پڑھ کر سناتا ہوں اور اُسے باور کراتا ہوں کہ وہ ہی اس دُنیا میں اکیلی نہیں جو اس قسم کے ناخوشگوار تجربات سے دوچار ہے۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ جاتی ہے۔ مگر میں مسلسل خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

فیض احمد فیضؔ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص تمہارے خلاف بہت بکواس کر رہا ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے بولے "بھئی! ہم نے تو اُس پر کوئی احسان نہیں کیا وہ پھر ہمارے خلاف کیوں ہے؟" دراصل جب آپ کسی شخص پر احسان کرتے ہیں تو اس سے اس کی خود پسندی اور نخوت کو صدمہ پہنچتا ہے جسے برداشت کرنے کا وہ ہرگز متحمل نہیں ہوتا لہٰذا اس کا آپ سے عداوت رکھنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ آپ کا وجود ہر لمحہ اُسے آپ کے سامنے چھوٹا کر دیتا ہے جسے برداشت کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ تو کیا پھر احسان کے بدلے میں محبت کے پھولوں کی بجائے ہمارے دامن میں نفرت کے، دشمنی کے کانٹے گرتے ہیں؟ تو کیا پھر ہم صلۂ رحمی، نیکی اور احسان جیسی لازوال انسانی اقدار سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اور خود غرضی، بے فیضی، لاتعلقی اور سرد مہری جیسے رویّوں کو اپنا لیں؟ نہیں ہرگز نہیں، جس روز ہم نے احسان و عنایت سے منہ موڑ کر خود غرضی اور بے مہری کا مکروہ راستہ اختیار کیا اُس روز ہم تاریک جنگل کے وحشی درندوں میں بدل جائیں گے جو صرف اور صرف اپنی بقا کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ بزرگوں نے سچ ہی تو کہا ہے کہ "نیکی کر دریا میں ڈال"۔ بظاہر تو اس مقولہ کے یہ معنی ہیں کہ آپ نیکی کر کے بھول جائیں۔ لیکن اس حکیمانہ قول پر آپ جتنا غور کریں اس کے اندر چھپے ہوئے معانی کے لامحدود امکانات آپ پر روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ اگرچہ میکیاولی کا فلسفۂ حیات تو یہی ہے کہ جب کوئی شخص آپ پر احسان کرے تو سب سے پہلے آپ اسی کا گلا گھونٹ دیں ورنہ وہ شخص ہمیشہ آپ کو اپنے احسان تلے دباتا چلا جائے گا اور آپ کی شخصیت کو مجروح کرتا رہے گا۔ یہ بات دراصل اس نے بحیثیت وزیرِ اعظم اپنے شہزادے سے کہی تھی جس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنا تھی۔ اس نے شہزادے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ بلا خوف و خطر حکمرانی کرے تو سب سے پہلے اسے چاہیئے کہ وہ اُن اکابرینِ دربار سے نجات حاصل کرے جن کے بَل بوتے پر اس نے عنانِ اقتدار سنبھالی تھی وگرنہ وہ لوگ ہمیشہ اسے اپنے احسانات

کے بارے میں میرزا ادیب، انور سدید اور منظر علی خان نے جو کچھ تحریر کیا ہے بڑا دلچسپ ہے ۔ اسے پڑھ کر مشفق خواجہ کے بارے میں احترام کے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ ——————

—— جہاں تک انشائیوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اتنے اچھے اور اتنے زیادہ انشائیے پاکستان کے کسی ادبی جریدے میں نہیں چھپتے ۔ اس مرتبہ اکبر حمیدی صاحب نے تو کمال ہی کر دیا ہے ۔ نظام سقّہ کو اپنے انشائیے کا موضوع بنا کر اسے عظمت عطا کر دی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اقتدار کی خاطر انسانیت کو خون کے دریا میں ڈبونے والے حکمرانوں پر بھرپور طنز بھی کی ہے ۔ ارشد میر، سلیم آغا قزلباش، بشیر سیفی، رضا نقوی، علی اختر اور محمد ہمایوں، ان کے انشائیے بھی بہت پسند آئے ۔ —— حمید امجد مرحوم کے بارے میں گوشہ مخصوص کر کے آپ نے ایک سچے شاعر کی یاد کو تازہ کیا ہے ۔ وہ یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اسے بھلایا نہ جائے ۔ —— غزلیں سب کی سب اچھی ہیں کیونکہ ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور ہوتا ہے جو قاری کو متاثر کرے، اور پھر اوراق میں شائع ہونے والی غزلیں تو عصری آگہی کے اعتبار سے اور منفرد لہجے کے اعتبار سے بڑی معیاری ہوتی ہیں —— غلام الثقلین نقوی صاحب نے یادنگاری کے عنوان سے اپنے حالات لکھے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی ۔ مثلاً گونگا پہلوان کے بارے میں انہوں نے خوب لکھا ہے ۔ مقالات میں عبدالعزیز خالد صاحب کا مضمون بڑا معلوماتی ہے ۔ ان کی شاعری تو اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک عربی، فارسی اور ہندی لغات اپنے پاس نہ رکھی جائیں ۔ تاہم یہ مضمون واقعی بڑا معلوماتی ہے ۔ عرش صدیقی صاحب نے شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ موضوع بحث بن سکتا ہے شاید کوئی نقاد ان کے خیالات پر اظہارِ خیال کرے ۔ ذکاءالدین شایاں اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مقالات بہت اچھے ہیں ۔ ویسے تو سبھی مقالات بہت اچھے ہیں ۔ دوہا کے بارے میں شین کاف نظام کا مقالہ بڑے کام کا مقالہ ہے —— کتابوں پر تبصرے حسبِ معمول بہت اچھے ہیں ۔ انور سدید صاحب خوش قسمت ہیں کہ ان کو اتنی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور پھر قدرت نے نہیں اتنی قابلیت عطا کی ہے کہ وہ ان کتابوں کے بارے میں اظہارِ رائے بڑے بچے تلے انداز سے کر سکتے ہیں ۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

سالنامہ حسبِ روایت شاعری، تنقید اور افسانہ نگاری کے وقیع اور متنوع نمونوں سے مزین ہے ۔ مبارک باد ۔ اداریے میں آپ نے شعر گوئی کے ضمن میں ایک بہت ہی اہم اور توجہ طلب مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے، اُردو شاعری کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ طرح طرح کے کلیشوں کی شکار رہی ہے ۔ آپ نے لسانی اعتبار سے تراکیب کے کلیشوں کا ذکر کیا ہے ۔ ہمارے یہاں تو موضوعات بھی تکرارِ محض کے شکار رہے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نئی نسل کے اکثر و بیشتر شعرا روایت اور تقلید کو گلے کا ہار بناتے ہیں، اور طباعی اور جودتِ طبع سے کام نہیں لیتے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں روایتی اور مصنوعی شعراء کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی ہے، جبکہ جینوئن شعرا کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ۔ —— برادرم انور سدید نے ایک دلچسپ اور تحقیق طلب موضوع پر خود بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور دوسروں کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے ۔ میرا یہ خیال ہے کہ لاہور واقعتاً ایک منفرد دبستاں کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آزاد اور حالی نے انجمن پنجاب کے تحت جس طرح شاعری کو روایت زدگی سے بچنے اور اسے موضوعیت اور سماجی معنویت عطا کرنے کی منظم مساعی کی، اور پھر اُردو شاعری کو جدید شعور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے فضا سازگار بنائی، اس کی بنا پر دبستانِ لاہور کا تشخص قائم ہو جاتا ہے، جو اُفتادِ وقت کے ساتھ ٹھوس شکل اختیار کرتا گیا —— انور سدید کے اشہبِ قلم کی جولانیاں دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوتی ہے ۔ برادرم مشفق خواجہ اور مجید امجد کے بارے میں اُن کی نکتہ افروز اور دلکش تحریریں پڑھ کر خوشی ہوئی ۔ مشرون کمار ورما کا افسانہ جدید، نمائشی اور

مشکانگی دور میں انسانی قدروں کی پامالی کا ایک موثر فنی اظہار ہے، منشایاد کے افسانے "پنچ کلیان" میں دیہی فضا پوری سادگی اور پیچیدگی کے ساتھ رچی بسی ہے۔ شہزاد منظر، طارق محمود، جتندر بلو، سلیم آغا قزلباش، نگہت سیما اور محسنہ جیلانی کے افسانے بھی دلچسپ ہیں۔

محمد افسر ساجد

"اوراق" کا سالنامہ اس کے ادبی معیار کا آئینہ ہے۔ پہلے ورق میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ادب اور زبان کی آویزش کو نہایت مدلل طریقے سے واضح کیا ہے۔ شاعری میں کلیشے کی تکرار کے بارے میں ان کا مؤقف وزنی ہے ——— "کیا لاہور ایک دبستان ادب ہے؟" پر بحث خیال افروز ہے اور اسے عمدگی سے سمیٹا گیا ہے۔ نظموں کے حصے میں تخت سنگھ، بلراج کومل، تبسم کاشمیری، افتخار نسیم، اعجاز فاروقی، حیدر قریشی اور وزیر آغا کی تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔ میری نظم کی آخری لائنوں میں "نفس نفس" کی بجائے "نقش نقش" پڑھا جائے ——— افسانوں میں محمد منشا یاد، علی تنہا، طارق محمود، سلیم آغا قزلباش اور محمد سعید شیخ کی تحریریں منفرد ہیں۔ ——— مشفق خواجہ اور مجید امجد پر گوشوں کی تزئین میں ڈاکٹر انور سدید کا بڑا عمل دخل ہے ——— انشائیے خوب ہیں، یاد نگاری کا سلسلہ دلچسپ ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے پوری ایک تہذیب کو محیطِ قلم کیا ہے۔ اگلی قسط کا شوق سے انتظار ہے ——— غزلیں بہت لکھی جا رہی ہیں اور اسی تناسب سے کلیشے بڑے زور شور سے استعمال ہو رہے ہیں، تاہم پریم کمار نظر، پرتو روہیلہ، ذوالفقار احمد تابش، شہناز نبی، خاور اعجاز، قمر رضا شہزاد اور وزیر آغا کی غزلوں میں تازگی اور ندرتِ خیال و بیان ہے۔ فرحت نواز کی آزاد غزل متوجہ کرتی ہے ——— مقالات کے حصے میں فیاض تحسین کی شاعری پر عرش صدیقی کا مقالہ ENLIGHTENING ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور شین کاف نظام کے مقالات ان کی تحقیقی استعداد کے مظہر ہیں ——— بحیثیت مجموعی "اوراق" کا سالنامہ ایک عمدہ تخلیق ہے اور ادب کی بہت بڑی خدمت بھی!

رفعت نواز

سالنامہ میں مشفق خواجہ اور مجید امجد کے خصوصی گوشوں میں ان حضرات کے فن اور شخصیت کے بارے میں اچھے اچھے مضامین پڑھنے کو مل گئے۔ اس بار بیس افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ سب ہی افسانے قابلِ مطالعہ اور جاندار ہیں۔ ان دنوں کسی ایک شمارے میں بیس منتخب افسانے پڑھنے کو کہاں ملتے ہیں۔ یہ کمال آپ کر دکھاتے ہیں۔ یوں تو سب ہی افسانے عمدہ ہیں پھر بھی شرون کمار ورما، منشا یاد، نگہت سیما، عوض سعید، اے خیام، تقی خسرو، سلیم آغا قزلباش جتیندر بلو، محسنہ جیلانی، قدسیہ انصاری اور انور خان کے افسانوں نے زیادہ متاثر کیا ——— شہزاد منظر کا مضمون (افسانے میں کہانی کا عنصر) گو مختصر ہے مگر کارآمد ہے۔ شہزاد منظر اردو افسانے کی تفہیم کے سلسلے میں اچھے مضامین لکھ رہے ہیں ——— غلام الثقلین نقوی نے بچپن کی یادوں کا بستہ کھولا تو اپنے بچپن کی بھی کتنی بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئی ہیں، اور برسوں پہلے کے مناظر اور چہرے آنکھوں کے آگے آ گئے ہیں، اور نقوی صاحب کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ قاری حال کو بھول کر ماضی میں کھو سا جاتا ہے اور لگتا ہے اپنی ہی یادوں کی پارینہ کتاب پڑھ رہا ہے ——— حامی سعید کا شملہ انٹرویو بہت دلچسپ اور پُرلطف ہے۔

حیدر قریشی

"اوراق" کا موجودہ شمارہ اپنی بیشتر اچھی روایتوں کے ساتھ آیا ہے۔ "سوال یہ ہے" کے تحت ڈاکٹر انور سدید نے "دبستانِ لاہور" کے وجود کا سوال اٹھایا ہے۔ سہیل بخاری اور میرزا ادیب نے اسے دبستان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جبکہ شہزاد احمد نے نیم برہمی کے عالم میں دبستان کی اصطلاح سے دامن چھڑایا ہے۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، رشید امجد، غلام جیلانی اصغر اور آپ نے لاہور کو دبستان تسلیم کیا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ صورت بن گئی ہے کہ لاہور سے باہر کے ادبا تو لاہور کو دبستان تسلیم کرتے ہیں اور لاہور کے ادبا اسے دبستان کہتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ ——— بلراج کومل نے جاپانی صنف TANKA کو متعارف کرانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اسے انہوں نے اردو میں "تینکا" لکھا ہے۔ میرا خیال ہے اسے "ٹانکا" لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایک تو اس لیے کہ انگریزی میں تلفظ یہی بنتا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ "ٹانکا" کو اردو میں رائج کرنے میں خاصی آسانی ہو جائے گی کیونکہ ہمارے ہاں "رفوگری" اور "بخیہ گری" کی روایات موجود ہیں اور "ٹانکا" ان سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔ ویسے تلفظ کا مسئلہ پرویز پروازی، تبسم کاشمیری اور عبدالعزیز خالد بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔ نظموں کے حصہ میں تبسم کاشمیری، رشید نثار، اعجاز فاروقی، کمار پاشی، محمد افسر ساجد، سیما شکیب، اور فرحت نواز کی نظمیں اچھی لگیں۔ "دیوارِ گریہ" اور "انگیٹھی" سب سے زیادہ پسند آئیں۔ مقالات میں ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، عرش صدیقی، حسن رضا جعفری اور ڈاکٹر انور سدید کے مضامین اچھے لگے۔ شہزاد منظر نے اپنے مضمون کے آغاز میں ہی لکھا ہے کہ "افسانے میں کہانی پن کے مسئلے سے بحث کرنے سے قبل اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ کہانی کسے کہتے ہیں؟" ——— ان کی خوبی یہ ہے کہ مضمون کے آخر تک انہوں نے یہ نہیں وضاحت فرمائی کہ کہانی کسے کہتے ہیں۔ غزلوں کے حصے میں عرش صدیقی، اظہر جاوید، پنہاں بی بی، شوکت راز، افتخار عارف، اکبر حمیدی، انور سدید، اظہر ادیب، تسلیم الٰہی زلفی، شہناز نبی، فرحت نواز اور آپ کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔ شہناز نبی پہلے شعرا کی آخری صف میں ہوا کرتی تھیں اب "صفِ اوّل" والے شعرا کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ فرحت نواز کی آزاد غزل چونکانے والی چیز ہے۔ اظہر جاوید عام زندگی میں تو کسی خاص رکھ رکھاؤ کے عادی نہیں ہیں لیکن ان کی غزل (سر کس کے کاندھے پر رکھ کر آنسو آج بہاؤں میں) پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ محبت میں بڑے رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں۔ ہم تو ایسے حالات میں اپنے ہی کندھے پر سر ٹکا لیتے ہیں اور رومال سے کام چلا لیتے ہیں، آج کل بھی یہی حال ہے۔ ——— شوکت راز کی غزل ——— "یہ غلط فہمی یہ آپس کا کھچاؤ ختم ہو" پوری غزل میرے حسبِ حال ہے اس لیے بہت اچھی لگی ——— علامہ اقبال، مجید امجد اور مشفق خواجہ کے لیے جو گوشے سجائے گئے ہیں ان میں مشفق خواجہ کا گوشہ زیادہ جاندار ہے۔ میرزا ادیب نے ان کے کمال کے حافظے کا ذکر کیا ہے۔ مجھے خود اس کا تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں جب میں بالکل ہی نوآموز تھا کراچی گیا تو وہاں غالب لائبریری میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب ۱۹۸۷ء میں کراچی گیا اور خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے شدید حیرت ہوئی کہ خواجہ صاحب کو نہ صرف وہ ملاقات یاد تھی بلکہ اس ملاقات کی وہ جزئیات بھی یاد تھیں جو میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں ——— انشائیوں میں سلیم آغا، ارشد میر، جمیل آذر اور اکبر حمیدی کے انشائیے پختہ انشائیہ نگاروں کے انشائیے کہے جا سکتے ہیں، لیکن دوسرے نئے انشائیہ نگاروں کے ہاں بھی بڑی تازگی اور تخلیقی قوت محسوس ہوتی ہے، بالخصوص اور علی اختر کے۔ نثریوں میں اس دفعہ بڑی زرخیزی نظر آتی ہے ——— اس دفعہ آپ نے چھ ہائیکو نگاروں کی تخلیقات کے ساتھ خط بھی شائع کیا ہے۔ میں بھی اب ہائیکو کے حق میں ہو گیا ہوں۔ (مبارکباد) یہ بہت اچھا تجربہ ہے کیونکہ اس سے

ورنہ خاطرہ ہو رہا ہے ـــــ فرحت نواز کے خط کا جواب بڑا مزیدار بن سکتا ہے لیکن میں یک طرفہ طور پر سینز فائر کا اعلان کرتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی ناہید سلطانہ کی طرح خط لکھنا ہی ترک کر دیں۔ خطوط کے صفحات پر انور سدید کی واپسی خوش کن ہے، اگر وہ پھر ان صفحات سے غائب نہ ہو گئے تو ہنگامے میں مزید اضافہ ہوگا۔

ایم۔ ڈی۔ شاد

اوراق کا خاص نمبر پڑھا، اداریہ ہمیشہ کی طرح نہایت فکر انگیز ہے ـــــ سوال یہ ہے کے تحت اوراق نے بڑی دلچسپ اور خیال انگیز بحث شائع کی ہے۔ بحث میں موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں نے خوب رونق پیدا کی ہے، جہاں تک دلائل کا تعلق ہے لاہور کو ایک ادبی دبستان ثابت کرنے والوں کا پلڑا بھاری ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی موافقت، ڈاکٹر حسن اختر، غلام جیلانی اصغر، رشید امجد اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑے ٹھوس دلائل سے کی ہے، جب کہ میرزا ادیب، ڈاکٹر سہیل بخاری اور شہزاد احمد نے کمزور مخالفت کی ہے۔ وقتاً فوقتاً ایسی بحثیں اوراق میں شائع ہوتی رہیں تو ادب کی یہ بڑی خدمت ہوگی۔

سعید شباب

میں "خدوخال اقبال" کے بارے میں ہاشمی صاحب کا تفصیلی تبصرہ بھی پڑھ چکا ہوں اور نعیم صدیقی صاحب کا مضمون بھی۔ "خدوخال اقبال" میں بلاشک اختلاف کی خاصی گنجائش موجود ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو سچ ہیں اور جنہیں عام طور پر سامنے نہیں آنے دیا جاتا۔ ہاشمی صاحب نے جو اعتراض اٹھائے ہیں میں ان کا براہ راست جواب دینے کی بجائے بالواسطہ طور پر نعیم صدیقی صاحب کے اس کتاب پر کیے گئے تبصرے سے چند نتائج پیش کر رہا ہوں ۔ (اقبال کے مالی معاملات میں) "بلاشبہ ان کے خیالات کی بلندی کے ساتھ ان کے حوصلوں کی پستی سامنے آتی ہے" "بعض لوگوں نے یہ واسطہ نکالا کہ اپنے اور خدا اور رسولؐ کے درمیان اقبال کو حائل کر لیا۔ ساری محبتیں اور عقیدتیں اب اس شخصیت پر نچھاور کر دی جاتی ہیں ـــــ (اقبال کے فکری سرچشمے کی بابت) " اسی معاملے میں اقبال ایک بچے کی طرح ہے جس کو گھر کا پتہ نہ مل رہا ہو اور وہ جس بھی دروازے کو دیکھے اس کی طرف لپک جائے " ـــــ یہ وضاحت محض تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کے لیے کی گئی ہے۔ اقبال کے بارے میں ہمارے محض جذباتی رویوں کی ایک تازہ ترین مثال سردار عبدالقیوم کا ناردے کا خطاب ہے۔ میرے خیال میں جو لوگ اقبال سے کسی زاویے سے اختلاف کرتے ہیں ان کا موقف بھی سامنے آنا چاہیئے۔ اس میں کوئی ڈر کی بات نہیں۔ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کسی نوعیت کے اختلاف سے بھی بآسانی منہدم ہونے والی نہیں ہے اور اقبال اپنا دفاع خود کر سکتے ہیں۔

سیّد ضیاء شبنمی

"اوراق کا اداریہ بصیرت افروز ہے اس کے بعد "سوال یہ ہے" کے تحت "محرک بحث اور شرکائے بحث" کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لاہور صرف اور صرف دبستان زندہ دلاں ہے اور بس ـــــ نظمیں، غزلیں، گیت اور ہائیکو تمام کے تمام خوب ہیں، لیکن گوشۂ اقبال، گوشۂ مشفق خواجہ اور گوشۂ مجید امجد اس دفعہ کے "اوراق" کی جان ہیں خصوصاً مشفق خواجہ کے گوشہ نے مجھے بہت لطف دیا۔ منظر علی خان اگر امروہوی اور

گیلوں کے ذائقے میں زیادہ نہ اُلجھتے تو ان کا مضمون بھی اچھا ہو سکتا تھا ۔ ——— مجید امجد مرحوم پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے لیکن "اوراق" کے علاوہ کسی دوسرے مدیر (ادبی رسالے کے مدیر مراد ہے) نے اس طرف ابھی تک توجہ نہیں دی، خود میرے پاس مجید امجد مرحوم کے بارے میں بہت کچھ مواد ہے مگر کیا جائے مکروہاتِ دوراں نے اس قدر اُلجھا یا ہوا ہے کہ پل بھر کے لیے جم کر نہیں بیٹھ سکا جبکہ مکاتیب امجد کے سلسلہ میں تمام کام مکمل ہو چکا ہے ۔ ——— عبدالعزیز خالد کا مضمون پسند آیا مگر آج کل اس کی چنداں ضرورت ادب کا کوئی بھی طالب علم محسوس نہیں کرتا ۔ عرش صدیقی نے فیاض تحسین کی شاعری کے بارے میں خوبصورت مضمون لکھا ہے ۔ "ہومر کے لافانی رزمیے" "تھامس ہارڈی" "دوہا ....." اور "ڈی۔ ایچ لارنس کے خطوط" بہت بالدار مضامین ہیں ۔ غلام الثقلین نقوی نے استاد اور شاگرد کے سلسلہ میں بہت خوبصورت یادنگاری کی ہے ۔

رشید قیصرانی

تیری یادوں کی شکنوں میں لپٹا ہوا نقشِ گمنام تھا، وہ مرا نام تھا
وہ سُخن در سُخن تیرے ہونٹوں پہ جو حرفِ ابہام تھا، وہ مرا نام تھا

وہ بگولہ کہ جو اَبر بن کے اُڑا، چھا گیا دفعتاً اور برسا تو پھر
بھیگتے دشت میں دُھوپ دیوی کے لب پہ ہری رام تھا، وہ مرا نام تھا

وہ جو آیا اُسے مَیں نے سجدہ کیا، آنکھ اُٹھائی تو مَیں دَم بخود رہ گیا
اُس کے ماتھے پہ کندہ بحرفِ جلی وہ جو اک نام تھا، وہ مرا نام تھا

مَیں سراپا نظر اور کرن در کرن، تُو کہ ملفوف دل اور خُفتہ بدن
شہرِ اعصاب میں وہ جو اک زلزلہ وجۂ کہرام تھا، وہ مرا نام تھا

تیری پلکوں کے اُس پار اک منجمد لہر آباد تھی، وہ مری یاد تھی
خواب محلوں میں جو اک ہیولا سا رقصاں لبِ بام تھا، وہ مرا نام تھا

تیری ہر بات کی تہہ میں اک اَن کہی بات کا عطر تھا، وہ مرا ذکر تھا
بند کلیوں پہ خوشبو کا جو اوّلیں حرفِ الہام تھا، وہ مرا نام تھا
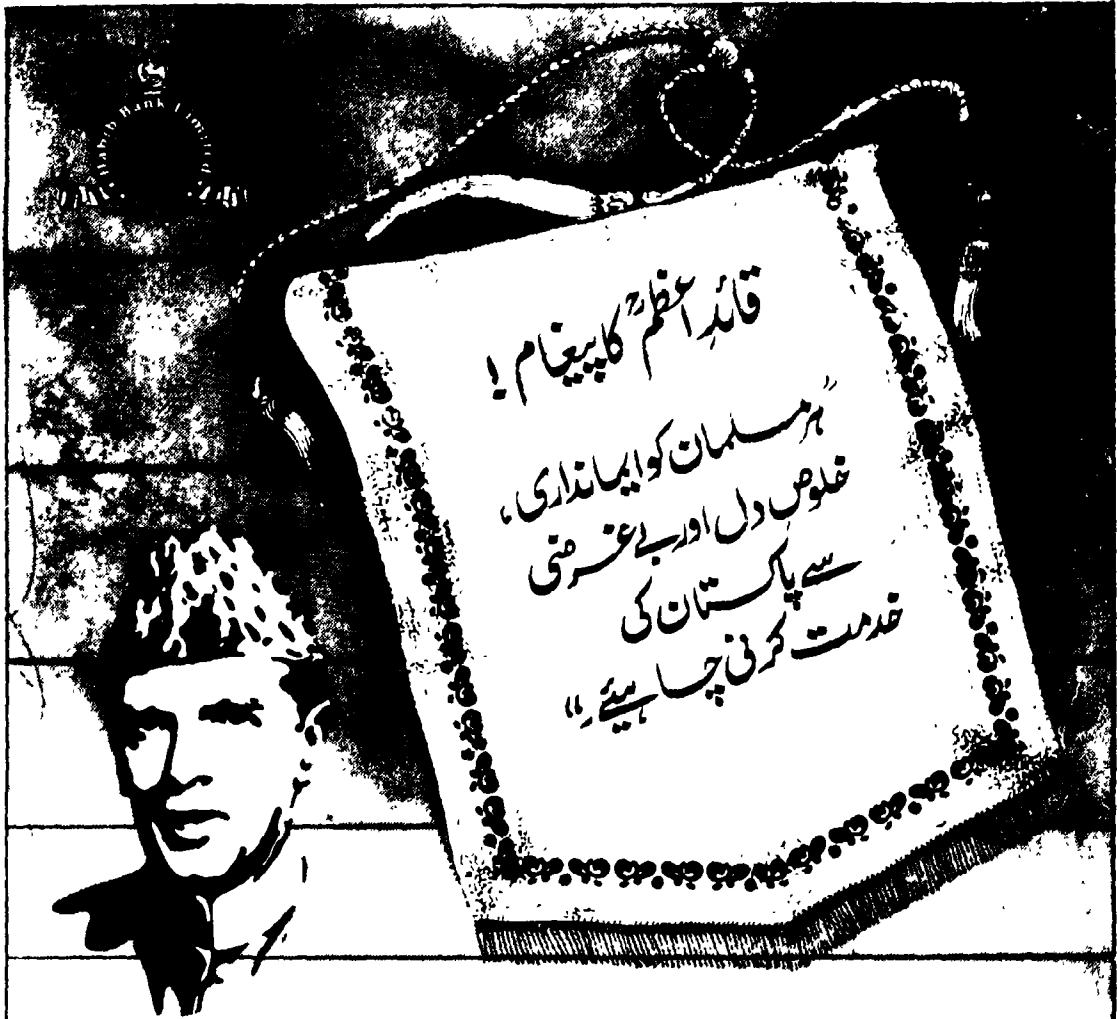
قائد اعظمؒ کا پیغام ہمیں دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور متحد ہو کر ایمانداری، خلوص دل اور بے غرضی سے ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔

اسلامی جمہوریت کے استحکام۔ مساوات پر مبنی معاشی نظام کے فروغ۔ بدعنوانیوں کے خلاف جہاد۔ جہالت کے خاتمے اور قومی اتحاد کو مضبوط بنانے کے لئے ہمارے وزیر اعظم جناب محمد خان جونیجو کے پانچ نکاتی پروگرام پر عمل کرنا اور عمل کروانا ہم سب پاکستانیوں کا فرض اولین ہے۔ حبیب بینک اس کی تکمیل میں تندہی سے سرگرم عمل ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

کے بوجھ تلے رکھ کر اسے مطلق العنان حاکم کی حیثیت سے کام نہیں کرنے دیں گے ۔ یہ فلسفۂ حکومت اتنا مقبول ہوا کہ آج بھی دُنیا کے عظیم مطلق العنان حکمران اسی نظریۂ سیاست پر عمل پیرا ہیں یعنی جونہی وہ اقتدار سنبھالتے ہیں اپنے محسنوں کو احسان کرنے کا مزہ چکھا دیتے ہیں ۔

ان رونگٹے کھڑے کر دینے والے اور خون منجمد کر دینے والے نتائج کے باوجود میں تو یہی کہوں گا کہ آپ احسان اور نیکی ضرور کریں بلکہ کرنی چاہیئے لیکن ہمیشہ بزرگوں کے اس قول کو سامنے رکھ کر "نیکی کر دریا میں ڈال"۔ اگر آپ کے سامنے یہ تصور نہیں تو پھر آپ کے سامنے کاروباری اور مادی نظریۂ اخلاق ہوتا ہے جس کے نتائج کی ساری ذمہ داری خود آپ پر ہے جب آپ نیکی اور احسان کو دریا میں ڈالتے چلے جائیں گے تو آپ کی نیکی کبھی رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ لازوال اور وسیع تر ہوتی چلی جائے گی ۔ بعض ناداں حضرات نے اس مقولے کے غلط معنی نکالے ہیں کہ نیکی برباد گناہ لازم ۔ یہ سراسر جذباتی اپروچ ہے ۔ حالانکہ دریا تو یہاں ایک گہری وسیع اور پیچ در پیچ علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے ۔ دریا ایک دیانت دار مظہرِ کائنات ہے ۔ جب آپ کوئی شے اس میں ڈالتے ہیں تو وہ نہایت خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر جذب کر کے سمندر تک لے جاتا ہے جس میں گر کر وہ خود بھی ایک بڑی علامت میں بدل جاتا ہے ۔ دریا اگر آپ کے انفرادی لاشعور کی علامت ہے تو سمندر آپ کے اجتماعی لاشعور کی علامت ہے ، یوں آپ کی ایک نیکی جو دریا میں گر کر آپ کے انفرادی لاشعور کے حوالے ہوگئی تھی اب اجتماعی لاشعور کا جُزو بن کر آفاقیت کی حامل ہو گئی ہے ۔

نیکی ، دریا اور سمندر کی اس گمبھیر وسعت پذیری اور بوقلمونی کو دیکھ کر جب میں اپنی ذات کے غار میں جھانکتا ہوں تو نہ صرف خالقِ کائنات بلکہ عظیم برگزیدہ ہستیوں کے احسانات اور نیکیوں کے ثمرات سے اپنے تئیں مستفید پاتا ہوں ۔ آج جو میں مہذب اور متمدن ماحول میں زندگی گزار رہا ہوں تو یہ اُن غیر معمولی عقل و دانش کے حامل انسانوں کا عطیہ ہے جنہوں نے مسلسل محنتِ شاقہ اور بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے بعد ہمیں نیکی اور بدی ، روشنی اور تاریکی ، سچ اور جھوٹ ، اخلاق و بے راہ روی ، انسانیت اور حیوانیت میں تمیز کرنا سکھایا ، جنگل کی حیوانی زندگی سے نجات دلا کر مدنی زندگی کا شعور بخشا ۔ میں جب اس وسیع تر تناظر میں اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتا ہوں تو متعدد مرئی اور غیر مرئی شخصیات کے احسانات سے میرا سر تسلیم خم ہو جاتا ہے ۔ میرے گھر کی ایک ایک اینٹ ، دیواریں ، دروازے ، فرش ، ماڈرن غسل خانے ، کچن اور سامانِ آرائش و زیبائش پکار پکار کر میری توجہ اُن تمام نفوس کے احسانات کی طرف مبذول کراتے ہیں جنہوں نے یہ سب کچھ میرے لیے مہیا کر دیا ۔ یہ صحیح ہے کہ ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے میں نے معاوضہ ادا کیا لیکن میں نے یہ معاوضہ صرف ایک مرتبہ ادا کیا جبکہ اس کے بدلے میں سکون و راحت کا ثمر مجھے مسلسل مل رہا ہے ۔

یہ روٹی جو میں کھا رہا ہوں اس کے عقب میں وقت کی پُراسراریت ، کسان کی سحر خیزی ، اور مزدور کے پسینے سے لے کر میری شریکِ حیات کی محنت اور ریاضت کا دخل ہے ۔ ان سب کے گراں قدر احسانات میں بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں ! یہ آج جو میں دو لفظ لکھنے کے قابل ہوا ہوں اس میں میرے اس پرائمری کے سکول ماسٹر کا جہاں بہت بڑا احسان ہے جس نے مجھے "و" اور "م" لکھنا سکھایا وہاں ان مشرقی اور مغربی دانشوروں کا بھی دخل ہے جنہوں نے میری سوچ میں کشادگی اور رفعت بخشی ۔ میں اُن دوستوں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے زندگی گزارنے کا سلیقہ اور فن عطا کیا ——— میں نے اپنی شریکِ حیات کو مطمئن کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور یہ بھی کہا کہ احسان کا علم اس عظیم انسان (GREAT MAN) کو ہمیشہ ہوتا ہے جو آپ کے دل کے اندر براجمان ہے اور آپ کو اس کا اجرِ عظیم بھی وہی عطا کرتا ہے ۔ کسی کے احسان کو تسلیم کرنے کے لیے سمندر کی سی وسعت ، گہرائی اور ظرف چاہیئے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے ——— لیکن میری بیوی نے مسکرا کر صرف اتنا کہا "جناب یہ آپ کی شاعرانہ سوچ اور فلسفیانہ انداز ہے ۔ اور یہ باتیں سب کتابی ہیں ۔ آپ اخلاقی حقیقت پسندی کے برعکس اخلاقی رومانیت پسندی کے سحر میں سرگرداں ہیں ۔ آخر آپ بھی تو کولہو کے بیل کی طرح دن رات کام کرتے ہیں ——— میں حیرت سے اُس کا مُنہ تکنے لگتا ہوں ۔

مُوڈ

ارشد میر

مُوڈ وہبی ہے یا اکتسابی اس کے بارے میں حتمی رائے دینا بہت مشکل ہے۔ البتہ اسے دستِ قدرت کا ادنیٰ سا عطیہ تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ایسا عطیہ جو رجائیت اور یاسیت سے بھی ماورا ہے، اس کو محض جذباتی اور جبلّی سطح پر نہیں پہچانا جاتا بلکہ عقلی اور شعوری تناظر میں ہی دیکھا جا سکتا ہے اور مثبت یا منفی رنگ میں بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے گویا ایک لحاظ سے ایٹم کی مانند ہے جو توانائی اور تباہی ہر دو صورتوں میں اپنی حیثیت کا لوہا منوانے کا ڈھنگ بخوبی جانتا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کی پیمبرانہ رجائیت کے پسِ پردہ مُوڈ کی قوسِ قزح ہی کارفرما نظر آتی ہے۔ غالب کے خطوط اس کے شگفتہ مُوڈ کا کرشمہ دکھائی دیتے ہیں۔ اور میر کی غم انگیزی اس کے افسردہ مُوڈ کا عکس نظر آتی ہے۔

مُوڈ کے جلالی، جمالی اور مثالی پہلوؤں پر کسی حد تک گفتگو ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کیفیات کی رُونمائی کے لیے تاریخ کی ورق گردانی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر دیو جانس کلبی کا سکندرِ اعظم کو دھوپ کی خاطر سامنے سے ہٹانا مُوڈ کے جلالی پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایڈورڈ ہشتم کا ایک مطلقہ خاتون کا حلقہ بگوش ہو کر تاجِ برطانیہ کو ٹھکرا دینا جمالی صورت کا عکاس ہے۔ جبکہ ہمایوں کا نظام سقہ کو ایک دن کا سلطان بنانا اور اس کا چام کے دام چلانا مثالی مُوڈ کا شاندار مظہر ہے۔

مُوڈ جامد نہیں ہے، حرکت میں برکت کے جوہر سے مزیّن ہے، اس کے تیور اور اندازِ تاثر ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو چند سیکنڈ پیشتر خوشگوار مُوڈ میں ہشاش بشاش نظر آتے ہیں ناگہاں کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر ناگوار مُوڈ کے باعث حزن و یاس کا پیکر دکھائی دیتے ہیں جس سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مُوڈ جزوقتی سطح پر لمحاتی کیفیت کا نام ہے جو ایک وقت میں کسی ایک کا بیڑہ پار اور کسی دوسرے لمحے کسی دوسرے کا غرق کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں اوّل الذکر مُوڈ صحت مندانہ اثرات کا حامل قرار پایا ہے اور مؤخر الذکر آدم بےزاری کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔

قیافہ شناسی اور موقع شناسی میں دسترس ہو تو اکثر یہ حیاتِ مستعار مزے سے گزر جاتی ہے۔ چنانچہ قیافہ شناسی کے فن میں یکتا خواتین ماتحت اپنے باس کے نادر شاہی مُوڈ کے عین مطابق بھیگی بلی بنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور محض ایک کے منظورِ نظر ہو کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے دوسرے رفقا کو خود ساختہ مُوڈ کے شکنجہ میں کس کر ورنہ پھر صاحب کو حسبِ منشا پٹی پڑھا کر تگنی کا ناچ نچاتے ہیں۔

موقع شناسی کی سب سے روشن مثال اس ساربان کی ہے جس نے جانسن کے لااُبالی مُوڈ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اُوپر یاس و حسرت کا بے محابا مُوڈ طاری کیا۔ اور مشرف بہ زیارت امریکہ ہوا جہاں عالمی شہرت یافتہ رسالہ ٹائم کے کارپردازان نے ترنگ میں آکر اس کی بے ربط بات چیت کو رُباعیات کا درجہ دے دیا۔ اس ضمن میں دوسری گنجینۂ عبرت صورت حال موجودہ والدین کی ہے جن کا چنگیز خانی موڈ کسی زمانے میں بچوں کو اُف تک کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا اور اب مرورِ ایام کے ہاتھوں بچوں کے ہٹلری مُوڈ کے مطابق پروگرام مرتب کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

چہرہ شناسی کی شدبُد ہو تو آنِ واحد میں مُوڈی حضرات کا کچا چٹھا کھولا جاسکتا ہے۔ مثلاً

مُسکراتی آنکھیں خود اعتمادی کے مُوڈ کا پردہ سرکاتی ہیں۔ پیشانی کی تیوریاں ٹال دینے کے مُوڈ کا جیتا جاگتا ثبوت ہوتی ہیں۔ پُھلائے ہوئے نتھنے خود غرض افراد کے مُوڈ کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ ہونٹوں کا کانپنا کسی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے بھی بُزدلی کے مُوڈ سے وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ زیرِ لب مسکراہٹ لائٹ مُوڈ کا چرچا کرتی ہے۔ قہقہوں کے فوارے بے نیازی کے مُوڈ کو ظاہر کرتے ہیں۔ کھسیانی ہنسی ہنسنا شرمساری پر پردہ ڈالنے کے مُوڈ کا داعی نظر آتا ہے۔ ناک کو اُوپر کی جانب سکیڑے رکھنا احساسِ کمتری اور سراسیمگی کے مُوڈ کی غمازی کرتا ہے۔ کانوں کا یکایک کھڑا یا سُرخ ہوجانا کرخت مُوڈ ——— کا اعلان کرتا ہے زبان کو دانتوں تلے دبائے رکھنا قوتِ برداشت اور درگزر کرنے کے مُوڈ کی شہادت دیتا ہے۔ چہرے پر اُڑتی ہوئی ہوائیاں اور بار بار ہونٹوں کو چھوتی ہوئی زبان CONTEMPLATED MOOD کا بھرم کھولتی ہے۔ امتحانات کا ذائقہ چکھنے کے شوق میں ہاتھوں میں ایزی (EASY) گائیڈوں سے لیس نالائق طلبا کے رخِ انور ایزی مُوڈ یا ہالی ڈے مُوڈ کو آشکار کرتے ہیں۔ تنی ہوئی بھوئیں کئی مرتبہ مُوڈ سے خطرناک فعل کو سرزد کرانے کا موجب بنتی ہیں۔ چنانچہ بسترِ مرگ پر نزعی بیان میں بعض منچلے توبے گناہ مخالفین کے نام لکھانے سے بھی نہیں چُوکتے گویا ایک لحاظ سے پانچوں حسیات کا مُوڈ سے گہرا اور براہِ راست فنی رابطہ ہے جس کے منقطع ہونے سے کئی فنی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں جب کہ چھٹی حس ان سب سے ڈائرکٹ ڈائلنگ کی مانند منسلک ہے اور وقتاً فوقتاً ہدایات کے بُلیٹن جاری کر کے کنٹرول آفس کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

ان تفاصیل کا یہ مطلب ہے کہ مُوڈ چہرے کو مسخ کرنے یا شرانگیزی کو پروان چڑھانے کے خطرہ سے آگاہ کرنے والا خود کار آلہ ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کے حوالے سے ایک چٹپٹا سا فقرہ یا برمحل شعر اس کے خالق کو حیاتِ جاودانی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ یہی نہیں اس نوع کے چُست کیے گئے فقرے یا شوخ و تُند اشعار قومی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر ضرب الامثال کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ مثلاً ——— ——— ڈیگال نے دیکھا دیکھی "سارتر فرانس ہے" کا مژدہ سُنایا۔ شاہ فاروق نے دُنیا میں تاش کے چار بادشاہوں اور انگلستانی شاہ کی مبنی بر حقائق نوید دی۔ شعرا کے پیرِ مغاں حافظ شیرازی نے محبوب کے ایک خال کے بدلے سمرقند و بخارا کی قربانی دے کر سابقہ ریکارڈ توڑنے کا کارنامہ کیا۔ رہی سہی کسر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوانِ غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کا درجہ دے کر دی۔ لیکن ان سب سے مُوڈ کا وہ تاریخ ساز ثانیہ بازی لے گیا جب تاج محل کو دیکھتے ہی اس سے ملتے جُلتے شاہکار میں مدفن ہونے کی یقین دہانی پر ایک برطانوی وائسرائے کی بیگم نے جان تاج پہ قربان کرنے کی پیشکش کی تھی۔

مُوڈ کے پس منظر میں جذبہ اور نظریہ بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اعلیٰ و ارفع مقاصد پیشِ نظر ہوں تو جذبے میں ایک منفرد اور اچھوتی اُمنگ کا احساس پرورش پاتا ہے اور حسین و جمیل نظریے کی تکمیل میں ساحلِ مراد تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن اگر جذبہ

گھیلے، میں طفوت اور نظریہ دکھا دے سے عبارت ہو، تو انسانی مُوڈ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے سے کنی کتراتا ہے۔ سمت درست ہو تو اس کے توسط سے انسان ستاروں پر کمندیں ڈالنے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ چاند تک رسائی حاصل کرلیتا ہے اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کے لیے پر تولتا ہے۔ رفتار کا یہی عالم رہا تو وہ دن دُور نہیں جب جملہ آسمانی رفعتیں مُوڈ کی بارگاہ میں پا بجولاں دست بستہ ہوکر رہ جائیں گی۔ بعض حلقے تو تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم کو بھی اسی کا رہینِ منت قرار دیتے ہیں۔ ہم چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق اس امر کی تائید یا تردید کرنے کے مُوڈ میں نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں۔ جلالِ پادشاہی کے ساتھ جمہوری تماشا ہو اس کی پُشت پناہی میں بھی یہی پیش پیش دکھائی دیتا ہے۔ اور غالباً ممولہ شہباز سے اس کی شہ پر پنجہ آزمائی کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔

نکتہ آفرینی و نکتہ سنجی کا دار و مدار بھی کافی حد تک مُوڈ کے رحم و کرم پر ہے۔ نظریں پھیر لے تو ادیب ڈھب کا فقرہ اور شاعر مصرع طرح پر گرہ لگانے سے عاجز آجاتا ہے۔ شعلہ بیان مقرر کو سٹیج پر منہ کی کھانی پڑ جاتی ہے۔ پریس کانفرنس میں معتقد سیاسی رہنما کی رپورٹرز ایسی گت بناتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ گویا مُوڈ کے بغیر انسان کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے بغیر لائیسنس ڈرائیور، بلا دوائی مریض یا ڈاکٹر کا سٹیتھسکوپ، ماڈرن استاد کا ٹیوشن، دولہا کا شہ بالا، چارلی چیپلن بغیر واکنگ سٹک اور ہیٹ، چرچل بغیر سگار اور چیمبر لین بغیر چھتری کے متصور ہو۔

نام نہاد فنکار اپنے کھوکھلے فن پر پردہ پوشی کی خاطر مُوڈ نہ ہونے کا بہانہ کرکے اپنا بھرم قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن یارانِ حاشیہ خندۂ استہزا سے ان کا ڈھول کا پول کھول دیتے ہیں جس سے بعض اوقات صورت حال مخدوش ہونے کا احتمال بھی ہو جاتا ہے۔

مُوڈ کا دائرۂ کار انسانیت پر ہی محیط نہیں۔ حیوانات سے چل کر نباتات، اور جمادات بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے زیر اثر ہیں جن کا مشاہدہ عام طور پر طائرانہ اور گاہے گاہے ذرہ بین نگاہوں سے کیا جاسکتا ہے۔ اکثر ان کی حرکات و سکنات سے بھی مُوڈ کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے۔ بے زبان ہونے کے ناطے سے ہماری زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتے اس لیے ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ البتہ میاں نظیر اکبر آبادی کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وہ فرماتے ہیں ؎

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب ہیچوں ہیچوں کرتی ہیں

خدا جانے کب یہ عقدہ وا ہو، اور انہیں اپنے مُوڈ کی لن ترانیوں اور ہجولیوں کی کارستانیوں سے کما حقہٗ روشناس ہونے کی صورت نکل آئے۔ سرِ دست تو اس کے بارے میں کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مہد سے لحد تک ہر جاندار کے لمحاتِ زیست اس کی بے پایاں گرفت میں ہیں جن سے چھٹکارا پانا بظاہر ناممکن ہے۔ اس لیے حضور مُوڈ کی نوک پلک درست رکھیے۔ اس سے کام لینے میں بُخل سے کام نہ لیجئے کیونکہ اس میں آپ ہی کی نہیں، پوری زندگی کی بقا کا راز مضمر ہے۔ یوں بھی یہ سارا عالم رنگ و بُو ایک مُوڈ ہی کی تو تخلیق ہے!

اور دوسری تقاریب میں مدعو کرتے ہیں۔ جب مَیں ان میں شریک نہیں ہوتا تو ضمیر میرے اس رویّے پر مجھے سخت سُست کہتا رہتا ہے۔ حالانکہ ایسی تقاریب میرے آرام و آسائش میں مخل ہوتی ہیں اور میرا وقت ضائع کرتی ہیں!! ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ آگے بڑھ بڑھ کر لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ مصنوعی ہنسی ہنسنا پڑتی ہے، فضول اور بے مقصد طویل و عریض باتیں کرنی اور سننی پڑتی ہیں جبکہ یہ سب کچھ مجھے سخت ناپسند ہے۔ سوائے مخصوص احباب کے دوسرے لوگوں سے ملنا میرے لیے بہت پریشان کن ہے۔ بات بے بات بتیسی نکال کر اپنے آپ کو ہنس مکھ اور خوش اخلاق ثابت کرنا مجھے زہر لگتا ہے۔ لمبی لمبی باتیں خدا جانے لوگ کن موضوعات پر کرتے ہیں۔ مَیں تو ایسے موقعوں کے لیے اپنے آپ کو بہت غیر موزوں سمجھتا ہوں۔ اوّل تو مَیں ایسے مواقع پر شرکت کو حتی الامکان ٹالتا ہوں لیکن اگر کبھی نہ ٹال سکوں اور کسی تقریب میں شامل ہونا ہی پڑے تو ایک بات کے بعد دوسری کے لیے مجھے موضوع نہیں ملتا۔ اکثر میری گفتگو دو چار رسمی جملوں کے بعد اختتام کو پہنچ جاتی ہے اور مَیں مخاطب کا منہ تکنے لگتا ہوں۔ مَیں ریڈیو قسم کا آدمی نہیں ہوں کہ بولنے لگوں تو بولتا ہی چلا جاؤں۔

چنانچہ جب مَیں ایسی مخلصانہ دعوتوں میں شرکت سے انکار کرتا ہوں یا وعدہ کر کے بھی نہیں جاتا تو ضمیر میری طبعی مجبوری پسِ پُشت ڈال کر اخلاقی قدریوں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہو جاتا ہے حالانکہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ میرا طرزِ عمل ویسا ہی ہے جیسا میں خود ہوں۔ اس میں کوئی کھوٹ نہیں! تاہم آپ میری طبعی مجبوریوں پر بھی خاک ڈالیں۔ عمرِ دراز جو مجھے دو چار دن کے لیے ملی ہے میری اپنی ہے۔ مَیں کیوں دوسروں کی نذر کروں آخر میری عدم شمولیت سے کسی کو کیا تکلیف پہنچتی ہے ــــــ پھر ضمیر مجھ سے مجرموں اور گناہگاروں کا سا سلوک کیوں کرتا ہے؟ آخر میں نے کون سا جرم کیا ہے، کون سے گناہ کا ارتکاب کیا ہے؟ میں تو گھر بیٹھ کر اپنے شر سے دوسروں کو محفوظ رکھتا ہوں ــــــ مگر اس بات پر مَیں کسی نیک نامی اور شاباش کا طلبگار نہیں ہوں ــــــ بات بے بات نیک نامی اور شاباش کی خواہش میرے نزدیک بنیا پن ہے۔ ضمیر مجھے اسی بنیا پن کی ترغیب دیتا رہتا ہے!! ۔

یہ اور اسی قسم کے بے شمار معاشرتی کام ہیں جن میں مَیں بوجوہ شرکت نہیں کر سکتا مگر ضمیر ہمیشہ مجھ سے ایک سخت مزاج ناصح اور سخت گیر محتسب کا سا سلوک کرتا ہے۔ حالانکہ نہ تو مَیں نے کسی کو ناصح بننے کی اجازت دی ہے اور نہ ہی کسی کو بطور محتسب کے قبول کیا ہے۔ مَیں خوف کی نہیں اصول کی زندگی پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہے جو میرے ماحول کو خوف سے بھر دے۔ میری زندگی کا اصول بے خوف شخصی آزادی ہے!!

ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ہم لوگوں نے ضمیر کو اس قدر کیوں سر پہ چڑھا رکھا ہے اور اس کی نصیحتوں پر عمل کرنا کیوں ضروری سمجھ لیا ہے۔ ضمیر کی آواز کوئی خدائی آواز تو نہیں ہے جس کے سامنے ہم بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیں۔ ضمیر روایتی معاشرتی قدروں کی پیداوار ہے جو اچھی بھی ہیں اور بُری بھی۔ جیسا معاشرہ ہو گا ویسا ہی ضمیر ہو گا۔ ممکن ہے جن باتوں پر مشرق کا ضمیر ملامت کرتا ہو انہی باتوں پر مغرب کا ضمیر خراجِ تحسین پیش کرتا ہو۔ جن باتوں کو برِصغیر میں بداخلاقی یا ناشائستگی سمجھا جاتا ہو انہی باتوں کو کسی دوسرے معاشرے میں خوش اخلاقی اور شائستگی کی علامت خیال کیا جاتا ہو۔ آپ ذرا اقوامِ عالم کی عمرانی زندگی پر ایک طائرانہ نظر تو ڈال کر دیکھئے۔ دُور نہ جائیں اسی بات پر غور فرمائیں کہ آج سے سو دو سو سال قبل برِصغیر میں ہی ضمیر جن باتوں کو انتہائی ناپسندیدہ اور ناقابلِ معافی سمجھتا تھا آج انہی باتوں کو ضمیر انتہائی پسندیدہ اور ضروری سمجھتا ہے۔ مختلف زمانوں کی بدلتی ہوئی اخلاقیات میری بات کی سچائی ظاہر کر دیں گی!!

مختلف زمانوں، مختلف معاشروں، مختلف خاندانوں بلکہ مختلف افراد کا ضمیر مختلف ہو گا ــــــ بلکہ مَیں تو یہ کہوں گا کہ جس طرح کوئی

انسان ذہنی طور پر اپنے معاشرے سے آگے نکل سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کوئی انسان ذہنی طور پر خود اپنے ضمیر سے بھی آگے نکل سکتا ہے!
اور پھر اس طرح اپنے ضمیر سے منحرف ہوتے میں حق بجانب بھی ہو سکتا ہے!! پرانی معاشرتی قدریں نئے زمانے میں آخر کہاں تک چلیں گی!!؟

انہی دنوں مجھے ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ میرے محلے کی انجمن اصلاحِ معاشرہ والوں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے مجھے اس کا صدر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک صبح اس کا ایک وفد میرے پاس آیا اور مجھ سے انجمن کی صدارت قبول کرنے کی درخواست کی۔ جب میں نے انکار کیا تو انہوں نے انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کر کے اسے خلقِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے بہت مفید ثابت کیا۔ میاں ضمیر تو اسی موقع کی تلاش میں تھے جھٹ سے مجھے ہدفِ ملامت بنا لیا کہ میں خلقِ خدا کی فلاح و بہبود نہیں چاہتا اور اس نیک کام کے لیے کوئی زحمت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں! ہر چند میں نے اپنی صفائی پیش کی کہ میں اس منصبِ جلیلہ کے لیے موزوں نہیں ہوں کیونکہ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں مگر ضمیر چونکہ روایتی لاشعور کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے انفرادی اور شخصی نقطۂ نظر کو قبول کرنا اس کے لیے شاید ممکن ہی نہیں!!

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس دوران میں میری ملاقات اپنے دیرینہ دوست مرزا سے ہو گئی۔ حالانکہ عام حالات میں مرزا سے ملاقات کو میں ہرگز خوش قسمتی پر محمول نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے اپنا مسئلہ مرزا کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ کسی طرح مجھے انجمن اصلاحِ معاشرہ کی صدارت سے بچاؤ۔ مرزا نے کہا بندۂ خدا تم یہ صدارت قبول نہ کرو! میں نے کہا مرزا یہ معاملہ اب اتنا آسان نہیں۔ ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں خلقِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی وقت نہیں دینا چاہتا۔ مرزا بولا اکبر حمیدی تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ ادیب ہو۔ شاعر ہو اور اپنے محاذ پر کام کر رہے ہو —— دوسروں کے محاذ پر جا کر کام کرنا تم پر فرض نہیں ہے —— تمہارا ضمیر غلطی پر ہے —— میں نے کہا مرزا کیا کہا ایک مرتبہ پھر کہنا —— مرزا بولا بھئی اس معاملے میں تمہارا ضمیر غلطی پر ہے یہ تمہارا محاذ نہیں ہے۔ تمہارا محاذ ادب ہے!! خبردار کسی کے جھانسے میں نہ آجانا!!

تب مرزا کے فرماتے ہوئے کو میں نے بطور سند پیش کر کے ضمیر کا منہ بند کیا —— سو مجھے ضمیر سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ اس نے کبھی میری شخصی آزادیوں اور طبیعت کے میلانات کو ملحوظ نہیں رکھا اور ہمیشہ مجھ ایسے نئے آدمی کو پرانے معیاروں کی صلیب پر لٹکایا ہے!!

میرے بارے میں آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں میں یہ نہیں کہتا کہ انسان اجتماعی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرے۔ میرا موقف صرف اس قدر ہے کہ اس سے الگ تھلگ ہر انسان کی ایک اپنی زندگی بھی ہے جس پر صرف اس کا اپنا حق ہے۔ یہ حق چھیننے کا کسی کو حق نہیں۔ شخصی زندگی کے اس تصور نے مجھے ایسے انتہائی اذیت ناک موقعوں پر سہارا دیا ہے —— بلکہ مجھے زندہ رکھا ہے۔ مثلاً قومی، معاشرتی یا خاندانی المیوں کے موقعوں پر جب اذیت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے تو میں نے شخصی آزادی کی پناہ گاہ میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر محفوظ کر لیا ہے کہ میری ایک شخصی اور ذاتی زندگی بھی ہے جسے بہر حال بسر کرنے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔ مجھے دوسروں سے انتہائی تعلق سہی، میں ان کے تعلق سے ان کے دکھوں کا سزاوار سہی، مگر یہ تو نہیں کہ میں خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لوں —— اس طرزِ فکر کے ذریعے میں ہر بار ناقابلِ برداشت اذیت سے بچ گیا ہوں!

ممکن ہے ضمیر اسے خود غرضی پر محمول کرے مگر یہ خود غرضی نہیں ہے کیونکہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ ہاں شخصی آزادی کے اس طرزِ فکر نے ہمیشہ میری حفاظت کی ہے۔ یہ سنہری جملہ میں ہر انسان تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ میری ایک شخصی زندگی بھی ہے جسے گزارنے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔ اس حق کو میں انسانی حقوق میں شامل کرنا چاہتا ہوں تاکہ صدیوں پرانے ضمیر کی معاشرتی گرفت سے آزاد ہو سکوں۔ تمام اقوام

میں عورت ہمیشہ کمزور طبقہ رہی ہے اس لیے زندگی اور زندگی کی مسرتوں کے حق سے ہمیشہ محروم کی جاتی رہی ہے۔ خاوند کے ساتھ عورت کا ستی ہونا، شادی نہ کر سکنا، خاوند کی موت کے بعد عمر بھر کے لیے سیاہ پوش یا سفید پوش ہو جانا معاشرتی ضمیر ہی کے بنائے ہوئے شاخسانے ہیں۔ ویسے بھی ضمیر اکثر کمزور طبقوں کو شکار کرتا ہے!!

دوسرے کے غم میں اپنی جان ہلکان کرنا قربانی اور ایثار نہیں کیونکہ اس طرح آپ ایک ایسے شخص کی مانند ہیں جو ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے سے پہلے اس کے غم میں خود ڈوب جاتا ہے!

میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ضمیر کی ساری باتوں پر کان نہ دھریں اور ایسا بوجھ نہ اٹھائیں جو آپ کی طاقت سے زیادہ ہے! ہر صورتِ حال میں اپنی زندگی کو بچانے جانے کا آپ کو پورا پورا حق حاصل ہے!!

عام آدمی

حامد برگی

میں ایک عام آدمی ہوں، میرے کتنے دن، کتنے مہینے کتنے برس اس فکر میں گزرے ہیں کہ میں ایک خاص آدمی کیوں نہیں ہوں؟ میرے اس فکر کا آغاز اس وقت ہوا جب میں نے ماں کی آغوش میں آنکھ کھولی اور ماں کی شفقت بھرے چہرے کو ٹکر ٹکر دیکھا۔ وہ مجھے بہت بڑا بہت خاص آدمی دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے لوریاں گنگنائیں اور میرے کانوں میں خاص آدمی بننے کا رس گھولا۔ اس نے دودھ کی بوند بوند کے ساتھ میرے رگ و ریشے میں ایک عظیم اور خاص آدمی بننے کا جوہر سرایت کیا۔ میں کھیل کے میدان میں اُترا تو میرے احباب نے مجھ سے یہی توقع رکھی کہ میں سب کو لتاڑ پچھاڑ کر آگے نکل جاؤں گا۔ پڑھائی کے میدان میں میرے باپ نے مجھے کبھی دوسرے نمبر پر بھی گوارا نہیں کیا یہ کہہ کر کہ: جو اوّل آیا ہے وہ آسمان سے اُترا ہے؟ وہ دس روٹیاں کھاتا ہے جو تم نہیں کھاتے؟ اس کے دو سر ہیں دو دماغ ہیں اور تمہارا ایک؟ وہ آدمی کا بچہ نہیں یا ہے" وغیرہ۔ میں بھی سوچتا اوّل تو مجھے ہی آنا چاہیئے تھا جو میں نہیں آیا۔

خوش شکل ہونا بھی خاص ہونے کی بڑی علامت ہے۔ بیسیوں بچوں میں آپ کا بچہ شکل و صورت کے اعتبار سے ممتاز اور خاص نظر آئے جو دیکھے بڑھ کے چوم لے اور رفتہ رفتہ بچے میں بھی اپنے خاص ہونے کا احساس جڑ پکڑ لے اور وہ اپنے آپ کو خاص آدمی سمجھنے لگے۔ میں اس اعتبار سے بھی عام آدمی تھا، اس سلسلہ میں مجھے کوئی بڑھاوا نہ ملا دوسروں کی جانب سے نہ اپنی طرف سے، بھلا میں خاص آدمی کیسے ہو سکتا ہوں، میں تو پیدا ہی عام آدمی ہوا ہوں۔

زندگی ملی بھی تو وہ بھی عام آدمیوں جیسی، موت فوت، جینا مرنا، ملنا بچھڑنا، محبتوں سے محرومی، کامیابیاں ناکامیاں، خوش حالی تنگ دستی، سازگار و ناسازگار حالات کا سامنا، تمنائیں آرزوئیں، آدرش، ان کا تعاقب، حصولِ مقصد ہوتا بھی رہا اور اگلی منزلوں کی طرف سفر جاری بھی رہا، پا پیادہ!

میں خاص آدمی نہ بن سکا، اب تک نہیں بن سکا، نہ جانے خاص آدمی کا کیا تصور میرے ذہن میں تھا اور ہے اور جس کی گرد تک بھی میری رسائی نہیں ہو سکی۔ شاید میں اپنے باپ کی طرح مدبّر، مفکر اور جہاندیدہ بننا چاہتا تھا جو میں نہ بن سکا۔ شاید میں بچپن میں پڑھی ہوئی کہانیوں کا پری زاد شہزادہ بننا چاہتا تھا جس تک میری رسائی ممکن نہ ہوئی، شاید میں فلمی دُنیا کا کوئی مقبول فلم سٹار بن کر روشن ہونا چاہتا تھا جس کا امکان میری زندگی میں نہ تھا، شاید میں کوئی شاعر ادیب فنکار بن کر شہرت و ناموری حاصل کرنا چاہتا تھا مگر میرے جوہر صیقل نہ

ہو سکے !!

جدید دَور کی ایجاد ٹیلی ویژن ہمارے گھر آیا تو دُنیا بھر کے مشاہیر لے آیا، کیا کھلاڑی کیا سیاست دان، کیا شاعر و ادیب اور کیا ڈرامائی اداکار و فن کار، گلوکار، سارنگی ساز، طبلہ و موسیقی اور ان سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے گھرانے سب ہی اپنے اپنے ہُنر لیے، سازو سازندوں سمیت میرے گھر محفلیں برپا کرنے چلے آئے۔ خاص لوگوں سے اتنا قریبی واسطہ پڑا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ سارے ہی خاص لوگ اپنی تمام تر خاصیتوں کے باوجود خاص نہیں، سب میرے توجۂ خاص کے محتاج ہیں۔ میں ایک عام آدمی ہوں مگر یہ سب میرے دروازے پر کھڑے مجھ سے عنایات چاہتے ہیں، ان کی تمام تر ناموری میری 'واہ واہ' میں ہے۔ مَیں جب چاہوں انہیں اپنی نظروں سے گرا دوں، ایک ذرا سی جنبش سے انہیں اپنی نظروں سے دُور کر دوں۔ ان کو درخورِ اعتنا نہ جانوں، وہ اپنی تمام تر بوالعجبیوں سے مجھے بہلانا چاہیں مَیں ایک جنبشِ ابرو سے ان سے اپنی توجہ ہٹا لوں۔ وہ اپنی تمام حرکات و سکنات، خوش کلامی و خوش گلوئی سے میرا دل رام کرنا چاہیں مَیں ایک بے نیاز مسکراہٹ سے ان کی کوششوں کو سراہوں یا اپنے بے مزہ ہونے کا اظہار کھُلے بندوں کر کے اُٹھ جاؤں اور یہ تمام خاص لوگ میرا مُنہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔

مَیں ایک عام آدمی ہوں مگر خلاقِ عالم نے یوں معلوم ہوتا ہے مجھے ہی خاص بنایا ہے۔ یہ تو دُنیا والوں نے خاص و عام کی تمیز میں اُلجھن پیدا کر دی ہے، وقت کے فرمانروا میرے ہی لیے حالات و واقعات کو سنوارنے میں لگے ہیں، ادیب و دانشور میرے ہی سامنے اپنے ادب و دانش کے پھُول دان کر رہے ہیں، شاعر میرے ہی دل کی بات اچکنے اور میرے سامنے میرے مافی الضمیر کو حسین لفظوں کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے، مقرر اپنی خطابت کے جوہر سے میرا ہی دل موہ لینا چاہتا ہے، مصوّر مجھے ہی اپنے فن پاروں سے محظوظ اور مبہوت کرنا چاہتا ہے، اداکار رنگا رنگ رُوپ دھار کے مجھے ہی متاثر کرنا چاہتے ہیں، گلوکار مجھ سے ہی داد و تحسین لینے کا تمنائی ہے، میں جو ایک عام آدمی ہوں یہ ساری بساط میرے ہی لیے سجائی گئی ہے، مَیں نہ ہوں تو ان کی یہ ساری کاریگری یہ فنکاری دھری کی دھری رہ جائے، اور یہ سب خاص لوگ کتنے عام ہیں اور کتنے محدود بھی، میری زندگی کے محض کسی ایک گوشہ کی آبیاری میں لگے ہیں، مَیں کتنا وسیع ہوں دامنِ کائنات کی وسعتوں میں پھیلا ہوا جبکہ یہ خاص لوگ سمٹ سمٹا کر اپنی اپنی ذات کی مخصوص ہُنر منڈلیوں میں گم ہیں، اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں، مَیں کوئی راگ نہیں الاپ رہا، مَیں ان بُوقلمونیوں کا تماشا کر رہا ہوں۔

تخصیص کار کے اس دَور میں تخصیص کاری مجھے بھلی نہیں لگی، یہ زندگی کو مختلف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹنے کے مترادف نظر آتی ہے۔ مَیں اپنی طبیعت کی ناسازی کے عالم میں کسی ایسے طبیب کے پاس جانا چاہتا ہوں جو میری طبیعت کی تمام کیفیات اور ناسازگاری کی تمام وجوہات کو یکبارگی سمجھنے میں کامل عبور رکھتا ہو بجائے اس کے کہ میرے وجود کے بتنے پانچ کرکے سوچے اور میرے ہر عضو سے [illegible] نے والے مرض کے لیے میری رہنمائی ایک مختلف طبیب کی جانب کرے، میرے وجود سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی دُکھ میرے پورے وجود کا دُکھ ہے، ایک دُکھ، مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ میرے اس ایک دُکھ کو بانٹنے کے لیے کتنے لوگوں نے رات دن محنت کی ہے، عمرِ عزیز کا ایک معتد بہ حصّہ لگایا ہے اور ایک کثیر سرمایہ خرچ کیا ہے محض میری آنکھ کو درست اور روشن رکھنے کے لیے یا میرے کانوں کو قوّتِ سماعت سے محرومی کے عذاب سے بچانے کے لیے یا میرے دل کی رفتار و کارکردگی کو صحیح رکھنے کے لیے کوئی

ور طالب علم محض اس لیے رات دن محنت کی اذیت میں مبتلا رہا ہے کہ شاید اپنے محدود وسائل اور بلند آرزوؤں کے مطابق اپنے گھر بار کی تعمیر و تکمیل کے سلسلے میں مجھے اس کی مہارت کی ضرورت ہو تو وہ مجھے اس کا خاکہ تیار کر کے دے سکے۔

میں پُر رونق بازاروں کا رُخ کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ بازار کے بازار میری ضرورتوں سے منسوب ہیں، جگمگاتی دکانوں میں ہر دکاندار ایک خاص دکاندار ہے اور میری ضرورتوں کا کوئی نہ کوئی سامان سجائے بیٹھا میری آمد کا منتظر ہے تاکہ مجھے اپنی ضروریات کی فراہمی کے لیے غیر ضروری دوڑ دھوپ نہ کرنی پڑے۔ میرے لباس میرے وضع قطع کو درست رکھنے کے لیے ماہرین خصوصی اپنی عمر بھر کی مشاقی اور اپنے اوزاروں سے لیس اپنی چشم انتظار وا کیے میری ہی راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور اپنی زندگی کے بیشتر کام از خود نہیں کر سکتا نہ کھیتوں میں سبزیاں اُگا سکتا ہوں۔ نہ پھلدار باغ لگا سکتا ہوں نہ غلہ اناج پیدا کر سکتا ہوں مگر میری ضرورت کی یہ ساری چیزیں ان اشیاء سے متعلق خاص لوگ مجھے بلا میرے خاص تردد کے مہیا کر دیتے ہیں میری پسند ناپسند کا خیال رکھ کے!

میں ایک عام آدمی ہوں، ایک عام آدمی کی طرح جدھر مُنہ اُٹھتا ہے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ مجھے کوئی خدشہ نہیں کہ مجھے دیکھ کر راہ چلتے لوگ ٹھہر جائیں گے، ٹریفک کچھ دیر کے لیے معطل ہو جائے گی، حادثے ہوتے ہوتے بچیں گے۔ لوگوں کی انگلیاں میری جانب اُٹھ رہی ہوں گی۔ بچے حیرت و استعجاب کی نظروں سے میری جانب گھور رہے ہوں گے اس تعارف پر کہ یہ ہے وہ شخص جس نے فلاں فلم میں کام کیا ہے، فلاں ریڈیو یا ٹیلیویژن ڈرامہ میں آیا ہے۔ یہ فلاں مشہور گائک ہے فلاں شاعر یا فلاں ناول نگار ہے۔ میں آزادی سے جہاں جاہے گھومتا ہوں کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ کوئی میری رفتار، چال ڈھال پر غور نہیں کرتا میں بھرے بازار میں چنے کی چاٹ یا رس ملائی کھاتا ہوں۔ سستے بازاروں سے اپنی من پسند چیزیں سستے داموں خریدتا ہوں، دکانداروں سے تکرار کرتا ہوں اور ان کے مُنہ مانگے دام دینے کی بجائے اپنے من پسند دام چکاتا ہوں مجھے کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کوئی خدشہ لاحق نہیں ہوتا کہ میرے آس پاس میری ہر جنبش پر غور کرنے اور تنقیدی نظریں رکھنے والے لوگ موجود ہوں گے۔ اجنبی ہونا بھی کیا مزے کی بات ہے!

میں نے زندگی کا سارا سفر ایک عام آدمی کی طرح طے کیا ہے، سُست رفتاری مگر مستقل مزاجی کے ساتھ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی دوڑ جیت لی ہے، یہ اور بات کہ اس دوڑ میں اور کوئی میرے مد مقابل نہ تھا۔ خرگوش کی دوڑ دوڑنے والے نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے، نہ جانے کہاں پڑے خوابِ خرگوش میں غرق ہوں، مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں، میں تو اپنی دوڑ دوڑ رہا ہوں، اپنی بساط کے مطابق، میرے رگ و پے میں ویسی ہی سکت ہے جو دوڑ کے آغاز میں تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی، دوڑنے میرے قویٰ کو کچھ اور بھی جلا اور قوت بخش دی ہے اب میں اس میدان کا مردِ میدان ہوں اور دوڑ رہا ہوں، منزل میری نظر میں ہے اور جیت یقینی!

زندگی خاص آدمیوں میں کوئی سُرخاب کے پر نہیں لگاتی، کوئی ایسا پَر جو مجھ عام آدمی میں نہ لگا ہو، شہرت اور ناموری کی معراج پر پہنچنے والے بھی اپنے پرستاروں اور چاہنے والوں کا ایک دائرہ رکھتے ہیں، اس سے باہر انہیں کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ کم از کم ان کی عظمت کو نہیں جانتا۔ ان کے لیے وہ مشاہیر بھی عام لوگ ہیں۔ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے پیشواؤں کو رہنما نہیں مانتے، ایک قوم کے ہیرو اور بہادر دوسری قوم کی نظر میں دشمن اور غدار سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتے، شیکسپیئر، ملٹن، دانتے کا مقام ایک سائنس کے طالب علم یا دستکار، ہُنر مند کی نگاہ میں کیا ہے؟ لیونارڈو ڈاونسی، ریمبراں، پکاسو کے نام اور کام سے

بھی آدمی سے زیادہ دُنیا ناواقف ہے ۔ سائنس کی دُنیا کے جلیل القدر لوگوں کے کارنامے تو ہماری روزمرہ زندگی کا حصّہ ہیں مگر ٹیلی فون، بجلی، ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز، قلم، قرطاس کے موجدوں کے نام ہمارے لیے "کوئز" پروگراموں کے گمبھیر سوال ہیں۔ کتنے ہیں جو ان بجھارتوں کو صحیح بوجھ سکتے ہیں؟ علم و فضل کے انبار کتابوں کی صورت میں لگانے والے، اپنے خونِ جگر سے خیال و فکر کی شراب کشید کرکے سربمہر شیشوں کی بوتلوں میں بند کرنے والے اور لائبریریوں کی فضاؤں میں صف آرا، کتنے لکھنے والے ہیں جو ہماری دن رات کی زندگی میں ایک بار بھی ہمیں یاد آتے ہیں، ہم اپنی نگاہِ تصور سے ان لوگوں کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھیں تو کتنی جان جوکھم سے انہوں نے اپنے فن کی تخلیق کی تھی مگر آنے والے وقتوں نے انہیں لائبریریوں عجائب گھروں کی کہنہ الماریوں میں سجا دیا جو ایسا ہی ہے جیسے قبرستانوں میں دفن کر دیا، ان سے فیض یاب ہونے والے معدودے چند وہ ہیں جو برکت اور حصولِ ثواب کی خاطر بلندیٔ درجات کی دعائیں مانگنے کبھی کبھار ان قبروں پر حاضری دینے چلے آتے ہیں، جو اس دُنیا سے گزرا گزر گیا، اس کے لیے خاص و عام کی تمیز ختم ہوگئی، خاص و عام کی تمیز تو ان کے لیے ہے جو حال میں موجود ہیں اور حال میں موجود عام آدمی خاص آدمی سے کہیں بڑھ کر زندگی کی رنگا رنگی، ہما ہمی، تنوع اور دلچسپیوں سے سرشار ہے جبکہ خاص آدمی اس عام آدمی کے لیے مصروفِ کار نظر آتا ہے، اس کی توجہ، اس کی داد، اس کی ستائش کا خواستگار، اپنے اپنے رنگ میں اس کے دل بہلانے کی فکر میں مبتلا دکھائی دیتا ہے ۔

میں ایک عام آدمی ہوں، زندگی کی دھوپ چھاؤں سے میں بھی اسی طرح مستفید ہوتا ہوں جیسے کوئی اور، زندگی کی دوڑ دھوپ میں میں نے بھی اسی طرح حصّہ لیا ہے جیسے کسی اور نے، رات میرے لیے بھی آرام و استراحت لے کے آئی ہے، زندگی کی آسائشوں سے میں نے بھی حصّہ پایا ہے، رنگا رنگ کھانوں کے مزے جانتا ہوں، سرد و گرم کپڑے سے میں نے بھی اپنے بدن کو آرام پہنچایا ہے، اپنی زینت کا سامان کیا ہے، مقدس اور محترم پیار کے رشتوں کو بھی جانتا ہوں۔ جنس کی لذتوں سے بھی آشنا ہوں، بچوں کے پیار و شفقت سے بھی محروم نہیں، زندگی میں بلند آرزوؤں کی تکمیل کے سلسلہ کو ہمیشہ جاری سمجھتا ہوں۔
خواب دیکھتا ہوں، اور خواب کی تکمیل کی سعی و جستجو میں زندگی بتا دینا چاہتا ہوں، اپنے بعد بھی اپنے خوابوں کی تکمیل کے سفر کو رواں دواں دیکھتا ہوں، اپنی زندگی کو نئی شکلوں میں ڈھلتا، پھیلتا، بڑھتا محسوس کرتا ہوں، اپنے بعد بھی اپنے آپ کو موجود پاتا ہوں، اندھیرا نہیں اُجالا دیکھتا ہوں ۔

میں عام آدمی ہوں، میں موجود ہوں، میں زندہ ہوں، میں سانس لے رہا ہوں، میرے قوائے جسمانی کام کر رہے ہیں، میں چل رہا ہوں میں پھر رہا ہوں، میں سوچ رہا ہوں، میں خوشی کی بات پر خوش اور غم کی بات پر غمزدہ ہو جاتا ہوں، میرے وجود کے اندر کتنے ہی نظام کارفرما ہیں جو میرے ارادے کے بغیر میرے اندر کام کر رہے ہیں، دل دھڑک رہا ہے، خون میرے نظامِ جسمانی میں بہتی ندیوں کی طرح رواں دواں ہے، میرا نظامِ تنفس فرحت بخش ہوا کو جذب کر رہا ہے اور جسم کو تازہ دم کر رہا ہے، نظامِ ہضم طرح طرح کی رغبتیں پیدا کرتا ہے ان سے محظوظ ہوتا ہے اور ان کو میرے جسم کی روئیدگی و آبیاری کے لیے تیار کرتا ہے، آنکھ دیکھ رہی ہے کتنی پیاری صورتیں، کتنے دلچسپ مناظر، کتنی ضروری اشیاء، کان سُن رہے ہیں، زبان بول رہی ہے، ہاتھ پاؤں لمس و حرکت کے مزے لے رہے ہیں، میں سوتا ہوں، میں جاگتا ہوں، میں فرائضِ منصبی ادا کرتا ہوں، میں دلچسپیوں میں حصّہ لیتا ہوں، میں زندگی کے لطف و گداز سے آشنا ہوں، میں زندگی کی نعمتوں کا شمار کرتے کرتے نم آلود نگاہوں سے بن مانگے یہ سب کچھ عطا کرنے والے کی عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں ـــــــ میں عام آدمی ہوں مگر اپنے آپ کو مرکزِ کائنات محسوس کرتا ہوں، لگتا ہے پوری کائنات میرے ہی گرد گھوم رہی ہے ۔

فُل سٹاپ

انجم نیازی

فُل سٹاپ دیکھنے میں میری طرح بھولا بھالا، شرمیلا اور بے ضرر نظر آتا ہے۔ دوسروں کے معاملات میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے والا اور دوسروں کی خوشیوں میں بھنگ ڈالنے والا ہرگز ہرگز دکھائی نہیں دیتا۔ وہ لفظوں کے ہجوم میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر اس طرح موجود رہتا ہے جیسے فُٹ پاتھ کے عین وسط میں کوئی مجذوب آنے جانے والوں کے قہقہوں، سسکیوں، محبتوں اور نفرتوں سے بے نیاز اپنی ٹانگیں پھیلا کر آرام فرما رہا ہو۔ نہ وہ خود کسی سے راستہ مانگتا ہے اور نہ کسی کو راستہ دینے کے لیے اپنی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو سمیٹنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا مگر کسی کو اپنی بے ضرر اور معصوم خواہشات کی آزادی میں بھی مخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح فُل سٹاپ بھی درویشانہ مزاج کا حامل ہے۔ دوسروں کے جمہوری حق کو نہ چیلنج کرتا ہے اور نہ ان کی آزادیوں میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کوئی ساری کائنات پر قبضہ کرے خواہ کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر قناعت کرے اُسے کوئی اعتراض نہیں مگر وہ اپنے حق سے دستبردار ہونے کے لیے کسی صورت تیار نہیں۔ جتنی جگہ اُس کو چاہیئے اتنی جگہ ضرور گھیرتا ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کو بھی کو رعایت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اُسے کس وقت کہاں موجود ہونا چاہیئے۔ وہ جس وقت چاہے جہاں چاہے کسی سے پیشگی اجازت لیے بغیر حاضر ہو جاتا ہے۔ صفحۂ قرطاس پر وقت بے وقت اُس کے نمودار ہونے سے اس کو نہ چرچل روک سکا ہے، نہ ہٹلر۔ ارسطو اپنی ساری دانائی کے باوجود اس کا راستہ روکنے میں ناکام رہا اور افلاطون کو بھی اس کے سامنے چاروں شانے چت ہونا پڑا۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنی ڈھیر ساری کامیابیوں اور فتوحات کے باوجود اس کے فقیرانہ مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اپنے اوپر نہ عاجزی کو غالب آنے دیتا ہے نہ وہ غرور کے آگے سر جُھکاتا ہے۔ جب میرے پاس عینک نہیں ہوتی یا میں عینک کے پاس نہیں ہوتا تو بسا اوقات میری نظریں فُل سٹاپ کے اُوپر سے گزر جاتی ہیں اور مجھے اس کا چھوٹا سا گول مٹول وجود نظر نہیں آتا اور آئے بھی کیسے؟ اگر عینک کا تعاون حاصل نہ ہو تو گھر کے اندر مجھے اپنے تخلیق کردہ چھوٹے چھوٹے چلتے پھرتے فُل سٹاپ بھی نظر نہیں آتے جو میری زندگی کی خوبصورت کتاب کی خوبصورت عبارت کا حصہ ہیں اور جن کو دیکھے بغیر زندگی کا کوئی مفہوم اور کوئی خواب سمجھ میں نہیں آتا۔ جن کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے اپنے وجود کو کتابِ زندگی کی نت نئی تحریر میں تحلیل کرنا پڑتا ہے۔

جب میری نظریں فُل سٹاپ کو ارادی یا غیر ارادی طور پر نظر انداز کر کے آگے گزر جاتی ہیں تو فُل سٹاپ میرے اس غیر شریفانہ رویّہ پر کوئی احتجاج یا شکایت نہیں کرتا مگر لفظوں کے پیارے خوشے اور ان کی ساری خوشبوئیں نچوڑ کر اپنی مٹھی میں بند کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے

جا بابا جا ہمیں تجھ سے کیا کام ۔ تم نے ہمیں نظر انداز کیا، ہم تمہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ جتنی دُور جاؤ گے اتنی ہی دُور سے ہماری چوکھٹ پر لوٹ کر آنا پڑے گا کیونکہ لفظوں پر ہماری حکومت ہے۔ ان پر ہمارا ہی سکہ چلتا ہے۔ وہ ہماری اجازت کے بغیر نہ بول سکتے ہیں، نہ خاموش رہ سکتے ہیں نہ مسکرا سکتے ہیں، نہ قہقہہ لگا سکتے ہیں۔ لفظوں کی اس پھلواری کے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو تمہیں ہم سے اجازت لینا ہی پڑے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سڑک پر چلنے والی گاڑی خواہ بڑی ہو خواہ چھوٹی اُس کو ٹائی راڈ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ وہ بے سمتی کا شکار ہو جاتی ہے اور جو چیزیں اپنی سمت گم کر بیٹھتی ہیں وہ کٹی پتنگ کی طرح ڈانواں ڈول رہتی ہیں۔ دوسروں کو منزل تک پہنچانا تو درکنار ان کے لیے خود اپنی منزل تک پہنچنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں اپنی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں انہیں فٹ بال کی طرح ہر کس و ناکس کے آگے آگے بھاگنا پڑتا ہے۔ تحریر کسی نامور آدمی کی ہو خواہ میری طرح کسی گمنام آدمی کی، فل سٹاپ کے بغیر اُدھوری ہی رہتی ہے۔ کسی عبارت کی گاڑی فل سٹاپ کے ٹائی راڈ کے بغیر چل نہیں سکتی۔

فل سٹاپ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہ بڑے بڑے جرنیلوں اور بڑے بڑے تیس مار خانوں کے آگے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک ایک قدم آگے نہیں جانے دیتا جب تک گرین سگنل آگے جانے کا اشارہ نہ کر دے۔ اس کو نہ بائیسکل روند سکتی ہے، نہ فوجی ٹینک۔

اس میں اور سنگِ میل (MILE STONE) میں بظاہر کافی مماثلت پائی جاتی ہے، مگر ان دونوں کے مزاج میں وہی فرق ہے جو سچے صوفی اور دُنیا دار آدمی میں ہوتا ہے۔ سچا صوفی روکنا چاہے تو صدرِ مملکت کی گاڑی کو دن دہاڑے شہر کے سب سے مصروف ترین چوک پر روک لے اور گھنٹوں روکے رکھے اور در گزر پر آئے تو کسی خوانچہ فروش کی ٹوٹی پھوٹی ریڑھی کو اپنے وجود کے اُوپر سے گزرنے کی اجازت دے دے۔ مگر دُنیا دار آدمی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ صدرِ مملکت تو کجا اُس کے کارندوں کی بارگاہِ نیاز میں بھی ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔

اسی طرح سنگِ میل چلتے مسافروں کے پاؤں کی ٹھوکر سے بچنے کے لیے سڑک کے وسط میں ڈیرہ ڈالنے کی بجائے سڑک کے کنارے مسافروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے دامن کو ان کی گرد سے بھی دُور رکھتا ہے، اُس کے چہرے پر لکھے ہوئے لفظ اُس کی ملکیت نہیں ہوتے اور ان کا مفہوم اُس کی گرفت سے آزاد ہوتا ہے۔ گویا وہ پبلک پراپرٹی ہوتے ہیں۔ ہر کسی کے استعمال میں رہتے ہیں اور ہر کسی کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ لفظ نہ سنگِ میل سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں نہ مشورہ ضروری سمجھتے ہیں، دراصل کوئی چہرہ ہو یا تحریر جب تک اس میں تخلیقی گہرائی اور گیرائی پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک وہ سطحیت کا شکار رہتی ہے جس طرح کم گہرے پانی میں سمندر کا سکوت اور جلال پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح کم گہرے چہروں اور تحریروں میں بھی سطوتِ سکندری کی اور پیغمبرانہ سنجیدگی کا نُور نظر نہیں آتا۔

سنگِ میل کے سپاٹ چہرے کے برخلاف فل سٹاپ کی شخصیت میں باطنی گہرائی اور ظاہری جلال بدرجہ اتم موجود ہے۔ فل سٹاپ پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کے وجود کے چاروں طرف کوئی ایسا دروازہ دکھائی نہیں دے گا جس کے رستے آپ فل سٹاپ کی ذات کے اندر داخل ہو کر اس کے باطن کو ٹٹول سکیں یا اس کی پُر اسراریت کی وسعت اور گہرائی کو فتح کر سکیں۔ اپنی ساخت کے لحاظ سے یہ دُنیا کا سب سے پست قامت پہاڑ ہے۔ مگر دُنیا کے بلند ترین پہاڑوں سے کہیں بڑھ کر مضبوط اور کہیں زیادہ وزنی ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسا پہاڑ باقی نہیں رہا جس کو کوہ پیماؤں کے بھاری جوتوں نے روندا نہ ہو مگر فل سٹاپ چھوٹا ہونے کے باوجود ایک ایسا سنگِ گراں ہے کہ ابھی تک ناقابلِ تسخیر چلا آ رہا ہے۔ جب خالقِ کائنات نے تخلیقِ کائنات کا ارادہ فرمایا تھا اور جس وقت کوئی دوسرا وجود موجود نہیں تھا تو اُس وقت کُن اور فیکون کے درمیان فل سٹاپ اپنی پالکی میں بیٹھ کر

تخلیق کائنات کے عمل سے مختلف انداز ہو رہا ہوگا۔ گویا تخلیقِ کائنات کے واقعہ یا حادثہ کا پہلا اور آخری گواہ فُل سٹاپ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میری طرح کا کوئی بھی غیر ذمہ دار آدمی آنکھیں بند کر کے کہہ سکتا تھا کہ ابھی تک تخلیقِ کائنات کا عمل شروع نہیں ہوا مگر اتنے مضبوط اور معتبر گواہ کی موجودگی میں تخلیقِ کائنات کے عمل اور اس کے دورانیہ سے انکار ممکن نہیں۔

عام طور پر لوگ فُل سٹاپ کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ فُل سٹاپ سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا آ رہا ہے اور زندگی بسر کرنے میں ان کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ زندگی کا آدھے سے زیادہ بوجھ اس نے از خود رضا کارانہ طور پر اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ اس کے لیے نہ کبھی اُس نے کسی سے معاوضہ طلب کیا ہے اور نہ کبھی احسان جتلایا ہے۔ مثال کے طور پر جب میں تقریر کرنے لگتا ہوں تو وقفہ وقفہ سے اس کی مدد حاصل کرتا رہتا ہوں۔ اگر فُل سٹاپ نہ ہوتا تو مجھے ایک ہی سانس میں تا مرگ بولنا پڑتا۔ اسی طرح پشاور سے چلنے والی ریل گاڑی کو روکنے کے لیے ریلوے سٹیشن کی صورت میں رستہ پر کئی فُل سٹاپ آڑے نہ آتے تو ریل گاڑی ایک دفعہ چلنے کے بعد اس وقت تک چلتی رہتی جب تک نیلا سمندر آگے بڑھ کر اُسے اپنی پُر عافیت آغوش میں نہ لے لیتا۔ دُنیا میں جتنی بھی مادی اشیاء ہیں خواہ وہ جاندار ہیں خواہ بے جان سب کی سب فطرتاً نان سٹاپ ہیں۔ جب سے زمین معرضِ وجود میں آئی ہے گھوم رہی ہے۔ کسی نے اس سے نہیں پوچھا کہ بڑی بی آخر تمہیں تکلیف کیا ہے۔ صدیوں سے بے مقصد کیوں گھرے جا رہی ہو۔ اسی طرح سورج جب سے دیکھا ہے چل رہا ہے۔ پتہ نہیں اس کے پیچھے کون لگا ہوا ہے جو اس کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیتا۔ سمندر اپنی ذات کے اندر سفر کر رہا ہے۔ کبھی دائیں طرف بھاگتا چلا جاتا ہے کبھی بائیں طرف، عرصہ ہوا کناروں کی طرف لپکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پتہ نہیں کناروں پہ کیا رکھا ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بھلا ہو فُل سٹاپ کا جس نے بہت سی چیزوں کو بلا مقصد بھاگے جانے اور مسلسل دوڑے جانے سے روک رکھا ہے ورنہ کئی لوگ شادی کرنے پر آتے تو کرتے ہی چلے جاتے، روتے تو روتے ہی چلے جاتے۔ بے اہتمام قہقہوں اور بے انجام سسکیوں سے انسانی زندگی بوجھل ہو کر رہ جاتی۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ فُل سٹاپ کا کام صرف چلتی چیزوں کے تسلسل میں غیر ضروری تعطل اور جمود پیدا کرنا ہے یہ فُل سٹاپ کے صاف ستھرے کردار کی غلط توجیہہ ہے۔ در اصل فُل سٹاپ کا کام کسی چلتی ہوئی چیز کو مزید تیز ہونے کے لیے ایک لمحۂ عافیت عطا کرنا ہے تاکہ وہ تھوڑے سے ٹھہراؤ کے بعد اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے توانائی اور تازگی حاصل کر سکے۔ اس کا کام ایمپائر یا ٹریفک سارجنٹ کی طرح اپنا فیصلہ ٹھونسنا اور منوانا نہیں۔

یوں تو ہر فُل سٹاپ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے، خواہ وہ عبارت کے آغاز میں ہو، درمیان میں ہو یا آخر میں، مگر دو فُل سٹاپ اس لحاظ سے زیادہ اہم ہیں، ایک وہ جس نے اس کائنات کو تخلیق ہوتے دیکھا تھا اور ایک وہ جو اس کائنات کے لیے آخری فُل سٹاپ ثابت ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کائنات نے اسی چھوٹے سے فُل سٹاپ کے اندر سے جنم لیا ہے اور جب اس کی تخلیق نقطۂ عروج پر پہنچے گی تو اس چھوٹے سے فُل سٹاپ کے اندر دوبارہ اپنے پھیلے ہوئے پَر سمیٹ کر داخل ہو جائے گی تاہم اتنی بڑی کائنات کو اپنے اندر جذب کر لینے کے باوجود فُل سٹاپ کی جسامت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

سوچنا

انجم نیازی

اللہ میاں نے انسانوں کو پیدا کرتے وقت بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ جہاں ایک پیدا کرنا تھا وہاں چار پیدا کیے۔ مگر ان کو جو کچھ دیا حسبِ ضرورت دیا۔ ہوا، پانی، دھوپ چھاؤں اور دوسری اشیاء کا تو ذکر ہی کیا، بنیادی طور پر ہر کسی کو ایک ایک کی بجائے دو دو کان دو دو آنکھیں، دو دو ہاتھ، دو دو ٹانگیں اور دو دو دماغ بغیر کسی مطالبہ کے دے دیئے تاکہ کوئی کسی کی بات سننا چاہے تو کان استعمال کر سکے۔ کوئی کسی منظر سے لطف اندوز ہونا چاہے تو آنکھیں۔ چیز کو چھونا یا ٹٹولنا چاہے تو ہاتھ اور چلنا یا ٹھوکر لگانا چاہے تو بلا تکلف دونوں ٹانگیں استعمال کر سکے۔ مگر دو دماغ اس لیے دیئے کہ ان کو باری باری استعمال کر سکے۔ سوچنا چاہے تو ایک اور نہ سوچنا چاہے تو دوسرا۔

آپ مجھ سے اختلاف کر سکتے ہیں کہ سوچنے کے لیے تو یقیناً ایک عدد دماغ کی ضرورت پیش آتی ہے: مگر نہ سوچنے کے لیے دماغ کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوتا اور صرف سوچنے کے لیے دماغ کی ضرورت پیش آتی تو جو لوگ عمر بھر سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ان کی کھوپڑیوں میں دماغ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ میاں کو ان کی کھوپڑی بناتے وقت کم محنت کرنا پڑتی اور اس طرح بہت سا وقت بھی بچ جاتا۔ جواب بالکل واضح ہے کہ اگر سوچنے کے لیے دماغ کی ضرورت ہے تو نہ سوچنے کے لیے بھی کسی نہ کسی کل پرزے کی ضرورت ہوگی، ورنہ سوچنے والے دماغ کو سوچتے رہنے سے کون باز رکھ سکے گا۔ فرض کیا کہ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے آپ کو سوچتے رہنے کی مشقت سے بچانا چاہتا ہوں۔ مگر میری اس شدید اور جائز خواہش کے باوجود میرا دماغ اپنی ٹک ٹک بند نہیں کرتا۔ گھڑی کی دو سوئیوں کی طرح اپنے محور کے گرد گھومتے رہنے پر اصرار کرتا ہے، تو ایسی ہنگامی صورت حال میں میرے آرام کرنے کی ضمانت کون دے گا۔ سکون اور بے سکونی کی دو محارب قوتوں کے درمیان سیز فائر کون کرائے گا کیونکہ جب تک دماغ کی کھڑکی کھلی رہے گی کائنات اور اس کی ساری بدعات بلا اجازت میری پرائیویسی PRIVACY کی دہلیز پر آکر اندر جھانکتی رہیں گی۔ اور جب تک میرے گھر میں ان بن بلائے مہمانوں کے ورودِ نامسعود کا سلسلہ جاری رہے گا مجھے جھٹکے محسوس ہوتے رہیں گے، اور ذہن بار بار مسنگ MISSING کرتا رہے گا۔ میں سکون سے نہ بیٹھ سکوں گا نہ سو سکوں گا۔ حاصلِ کلام یہ کہ انسان کو نہ سوچنے کے لیے ایک اور دماغ کی ضرورت ہے جو بوقتِ ضرورت سوچنے والے دماغ کا بٹن آف کر کے اُس کو پسپائی پر مجبور کر سکے۔ اس کی تمام کھڑکیاں بند کر سکے، اور اس کی ٹک ٹک کرتی سوئیوں کو کچھ وقت کے لیے خاموش رکھ سکے۔ ورنہ نہ سوچنے کے ساتھ ساتھ سوچنے کا عمل بھی جاری رہے تو انسان کے سارے گیئرز (GEARS) ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ بعض لوگ

یری طرح دونوں دماغوں کو باری باری مناسب وقتوں پر مناسب وقفوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ایک چوری کے وقت اور دوسرا سینہ زوری کے وقت۔

مثلاً جب مجھے کسی کو کچھ قرض واپس کرنا ہوتا ہے تو میں سوچنے والے دماغ کی چرخی گھما دیتا ہوں اور اس کو اتنی تیزی سے گھماتا ہوں کہ منٹوں اور سکنڈوں میں دوسرے اور تیسرے آسمان پر پہنچ جاتا ہوں۔ قرض وصول کرنے والے آدمی کو میری پیشانی کے رن وے RUNWAY پر سپیڈ بریکر کی طرح ابھری ہوئی سلوٹوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ سراغ رسانی کے مقصد کے لیے میرے ذہن کی جس کھڑکی سے اندر جھانکنا چاہتا ہے اُسے وہی کھڑکی مقفّل ملتی ہے۔ جس کسی کھڑکی پر بھی دستک دیتا ہے، اُسے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس طرح وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ اور میں آہستہ آہستہ زمین پر لینڈ کرنا شروع کر دیتا ہوں۔

دماغ کا معاملہ دوسرے انسانی اعضاء سے ذرا مختلف ہے۔ مثلاً دونوں ٹانگیں ایک ہی کام کرتی ہیں۔ اسی طرح دونوں کان ایک ہی کام کے لیے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔ ایک کان بند ہو جائے تو دوسرا کان ڈبل شفٹ کے طور پر ہمہ وقتی ذمّہ داری سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح آنکھ اور ٹانگ اپنی اپنی ذمہ داری نبھاتی ہیں، مگر دو دماغوں میں سے کوئی ایک دماغ بھی معطّل ہو جائے تو سارا نظام کار درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یا تو آدمی سوچنے کی خودکار مشین بن جاتا ہے اور بغیر کسی وقفہ کے سوچتا چلا جاتا ہے۔ یا آدمی نہ سوچنے کے عمل میں اس طرح گُم ہو جاتا ہے کہ برف کے تودے کی طرح پگھلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جس آدمی کی سوچنے کی صلاحیت ضائع ہو جائے لوگ اُسے اپنی زبان میں فاترالعقل کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ آدمی مسلسل سوچتے رہنے کی دلدل میں پھنس جائے تو اُسے فلسفی یا مجذوب کہنے لگتے ہیں۔ مجذوب وہی ہوتا ہے جو اپنی نہ سوچنے کی صلاحیت سے از خود دست بردار ہو جاتا ہے۔ دُنیا عموماً اُس سے کسی قیمتی شے کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ دنیا کو قیمتی شے دینے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس لیے وہ شخص اپنے اوپر گہری چُپ اور لمبی سوچ کی بے رنگ چادر اوڑھ لیتا ہے۔ اس کی سوچ ایک بار ٹیک آف (TAKE OFF) کر لے تو پھر عمر بھر لینڈ کرنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کا مادی جسم زمین پر کھڑا یا پڑا نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں۔ وہ دُور بہت دُور نیلگوں آسمانوں پر پرواز کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہوش میں نہیں۔ پھر اسی بلند پروازی کے دوران میں کسی ایسی کھڑکی میں داخل ہو جاتا ہے کہ اُس کی واپسی عالم موجودات میں ناممکن ہو جاتی ہے۔ دُنیا کو اس کی تبدیلی کا اس وقت احساس ہوتا ہے جب اُس کا جسم بوسیدگی کی انتہا تک پہنچ کر اچانک گر پڑتا ہے، اور گرتے ہی ان گنت کرچیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور بظاہر سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر دراصل وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوتا۔ بلکہ وہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ وقت گزاری کے لیے کیا سوچا جائے۔

اسی قسم کے تلخ تجربے سے میں کئی دفعہ دوچار ہو چکا ہوں۔ اس کرب سے بچنے کے لیے میں اکثر دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کیونکہ دوستوں کو خط لکھنے کا عمل ایسا عمل ہے کہ اس سے آدمی کو سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ اور آدمی نہ سوچنے کی تکلیف دہ کیفیت سے بھی صاف بچ کر گزر جاتا ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی والی بات ہے۔ کچھ لوگ میرے بھی استاد نکلے ہیں۔ اور فطرت کی دی ہوئی امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ ان کو ایک انجانا سا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اللہ میاں نے جتنی قیمتی چیزیں اُن کے سپرد کی ہیں اُن کو استعمال کرنا خیانت سے مترادف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ میاں کے ہاں پیشی ہو تو کہہ سکیں کہ باری تعالیٰ ہم نے تیری کسی امانت میں خیانت نہیں کی۔ بلکہ اعضاء ویسے تھے ویسے ہی واپس لے لیے ہیں۔ اگرچہ عرصہ تک تیری دی ہوئی آنکھیں ہمارے قبضے میں رہی ہیں، مگر ہم نے اُن کو قطعاً استعمال نہیں کیا۔ کسی خوشنما یا بدنما منظر کو دیکھنے میں ان کی بینائی خرچ نہیں کی۔ اچانک نظر پڑ گئی تو پڑ گئی۔ ہم نے اُس کی گہرائی میں جانے کی

کوشش نہیں کی کہ مبادا خیانت کے مرتکب ہو جائیں۔ اسی طرح دونوں کان صحیح سلامت واپس لے آئے ہیں، ان پر جوں تک نہیں رینگنے دی۔ کسی کی بات کو غور سے نہیں سُنا۔ جب سُنا ہی نہیں تو سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاتھوں میں پوری قوت موجود رہی مگر ساری عمر اس لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ کہ گھِس گھِس کر چھوٹے نہ ہو جائیں۔

جب ہاتھ کان آنکھ اور ٹانگوں جیسی عام چیزوں کے استعمال میں اس قدر احتیاط برتی تو دماغ جیتی نفیس اور خوشبو کی طرح خرچ ہو جانے والی چیز کے لیے احتیاط کیونکر نہ برتتے۔ اس لیے ہم نے دماغ کے استعمال میں بھی احتیاط برتی اور خوب برتی، حتیٰ کہ اُسے دُنیا کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ سینکڑوں غلافوں میں اس کو لپیٹ کر رکھا جب بھی کسی سے بات کی۔ جب بھی کوئی منصوبہ بندی کا موقع آیا جہاں دماغ کا استعمال ناگزیر ہوتا تھا تو ہم نے خود غرضی سے کام لیتے ہوئے دوسروں کا دماغ استعمال کیا۔ دوسروں کے ذہن پر بوجھ ڈالا۔ عمر بھر بغیر دماغ کے کام چلاتے رہے۔ مگر اپنے آپ کو بد دیانتی کے طعنہ سے بچائے رکھا۔ اسے باری تعالیٰ جتنا دماغ دیا تھا، جیسا دیا تھا ———— ویسے کا ویسا واپس لے آئے ہیں۔ ٹھونک بجا کر دیکھ لیجئے۔ کمی بیشی کے ہم ذمہ دار ہیں۔ ویسے ہمارا اعمال نامہ بھی اسی بات کی نشاندہی کرے گا کہ ہم نے تمام کے تمام کام دماغ کو استعمال کیے بغیر سرانجام دیے۔

یہ تو ان لوگوں کی باتیں تھیں جو سوچنے کے معاملہ میں فضول خرچی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ مگر میرا مسئلہ ان سے مختلف ہے۔ مجھے سوچتے رہنے کی پرانی عادت ہے۔ اور پُرانی عادتیں آسانی سے ترک نہیں کی جا سکتیں۔ جب سوچتا ہوں تو سوچتا ہی چلا جاتا ہوں۔ بسا اوقات میری سوچ کی سرحدیں مجذوبیت کی سرحدوں سے جا ملتی ہیں۔ کبھی میں زمین کو چھتری کی طرح سر پر تان لیتا ہوں۔ اور کبھی آسمان کو زمین سمجھ کر نیچے بچھا لیتا ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں آسمان پر آوارہ گردی کرنے میں مصروف ہوتا ہوں اور لوگ مجھے زمین پر تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی میں زمین پر زمین کے قضیئے چکانے میں مصروف ہوتا ہوں اور آسمانوں کے باسی مجھے وہاں تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ میں نہ آسمان پر ہوتا ہوں نہ زمین پر۔ ایسی حالت میں میں اپنے آپ کو تلاش کرنے میں خود بھی دقت محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں مداری کی اٹھنی کی طرح خود کو اپنی جیب میں ڈالتا ہوں مگر برآمد کسی اور کی جیب سے ہوتا ہوں۔ غرض جتنا زیادہ سوچتا ہوں اتنی زیادہ کیفیتیں بدلتا رہتا ہوں۔ مگر میں اس دن اور اس سوچ کا منتظر ہوں جس دن میں اپنی جیب میں داخل ہو کر اپنی ہی جیب سے برآمد ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں اُسی دن کی طرف پیش قدمی کر رہا ہوں اور اُسی دن کے لیے زندہ ہوں۔

گھڑا

اظہر ادیب

میں اُن دنوں دسویں جماعت کا طالب علم تھا جب ابا جان نے شہر سے سات آٹھ میل دُور ایک گاؤں میں چھوٹا سا قطعۂ اراضی ٹھیکے پر لیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور چونکہ مجھے اور کوئی کام نہیں تھا لہٰذا میں ناشتہ کر کے سائیکل سنبھالتا اور گاؤں کی سمت روانہ ہو جاتا۔ یہ قطعۂ اراضی ہماری اُمیدوں کو مادرِ مہربان کی طرح پال رہا تھا۔ میں اپنی پھلتی پھولتی اُمیدوں کو دیکھنے کے لیے جیسے ہی شہر کی پتھریلی فصیل سے باہر نکلتا، کچی سڑک کسی الہڑ ناری کی طرح لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور میں کھٹ مٹھی گولیوں کے ذائقے چکھتے چکھتے گاؤں تک پہنچ جاتا۔ مسافت کٹنے کا احساس تب ہوتا جب گاؤں کنارے لگی چکی کی دھک دھک اس ناری سے میرا ہاتھ چھڑا لیتی۔ میں دو چار گھنٹے گاؤں میں گزارنے کے بعد لوٹتا تو یہ الہڑ ناری آگ اُگلتے سورج اور اردگرد پھیلے ریت کے تپتے ٹیلوں کی باتوں میں آکر مجھ سے برہم ہو چکی ہوتی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا ان تینوں کا بلڈ پریشر بڑھنا شروع ہو جاتا۔ میرے جسم کے سارے مسام کھل کر میرے اندر کی طراوت کو باہر آنے کا راستہ دے دیتے۔ آدھا سفر کٹتے کٹتے میرے اندر بگولے رقص کرنے لگتے۔ قریب ہوتا کہ میں ان بگولوں کی زد میں آکر کاغذ کے کسی حقیر پرزے کی طرح چکرا جاؤں کہ اچانک کیکروں کا ایک جھنڈ میری مدد کو لپکتا اور میں اس کے دامن میں پناہ لے لیتا۔ اس جھنڈ میں کسی دریا دل شخص نے ایک گھڑونچی پر تین چار کورے گھڑے پانی سے لبالب بھر کر رکھے ہوتے۔ روح کی پیاس تو ان تر بتر سوندھی سوندھی باس میں ڈوبے گھڑوں کو دیکھ کر ہی بجھ جاتی البتہ جسم کی پیاس بجھانے کے لیے مجھے اُس کورے آبخورے کا سہارا لینا پڑتا جسے گھڑونچی میں ایک لکڑی ٹھونک کر اس پر امن و آشتی کے جھنڈے کی طرح لٹکا دیا گیا تھا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کا پہلا گھونٹ ہی میرے اندر اُٹھنے والے بگولوں کی دہشت کو کم کر دیتا اور اس پانی سے اُٹھتی ہوئی مٹی کی مہک زمین سے میرا ٹوٹتا رشتہ پھر سے بحال کر دیتی۔ آج بھی جب کوک کی یخ بوتل یا روح افزا کا ٹھنڈا گلاس پیتے ہوئے مجھے اُن کورے گھڑوں اور مہکتے سنسناتے آبخورے کا خیال آتا ہے تو مشروب میرے گلے میں اٹکنے لگتا ہے۔

کولر اور فریج نے اگرچہ گھڑے سے اُس کا مقام چھین لیا ہے اور حکمرانی کا تاج اپنے سر پر سجا لیا ہے۔ لیکن ان کی حکمرانی کو کم از کم میرے جیسے آدمی نے اُسی طرح تسلیم کیا ہے جیسے چنگیز خان کے مفتوحہ علاقوں کے لوگ اُس کی بادشاہت کو آسمانی سمجھتے تھے۔

گھڑے کا اپنا ایک کنبہ ہے۔ صراحی اس کی چھوٹی بہن ہے جو گلے میں موتیا اور چنبیلی کے ہار پہن کر کسی نازنین کی طرح شرماتی لجاتی رہتی ہے اور جب اسے ہاتھ لگائیں تو اس کے نازک ہونٹوں سے معصوم قہقہے چھلکنے لگتے ہیں۔ چاٹی شاید ماں ہے جس نے اسے اور صراحی کو جنم دیا

ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہماری زمین کے گرد پھیلا ہوا دکھائی نہ دینے والا دائرہ بھی تو چاٹی ہی کی طرح ہے جس میں فطرت نے صدیوں مدھانی چلائی ہے۔ اور یہ زمین ؟ شاید اس چاٹی میں تیرتا ہوا مکھن کا پیڑا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ چاٹی ٹوٹ گئی تو...... ؟

کہتے ہیں گھڑے کے مسام ہوتے ہیں۔ ان مساموں سے اُٹھنے والے بخارات ہی پانی کو ٹھنڈا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اگر یہ مسام بند کر دیئے جائیں تو گھڑے کا پانی اُبلنے لگے بالکل اُسی طرح جیسے کسی انسان پر پابندی لگا دی جائے تو اُس کے مسام بند ہو جاتے ہیں اور وہ اندر سے اُبلنے لگتا ہے۔ اگر جلد ہی اُس کے اندر اُٹھنے والے بخارات کو باہر کا راستہ نہ ملے تو وہ پھٹ جاتا ہے۔ اور پھر اُن کی یہ ٹوٹ پھوٹ اُسی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایٹم کی ٹوٹ پھوٹ کی طرح پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کے مسام کھُلے رکھے جائیں۔ گھڑا صرف اپنے اندر اُٹھنے والے بخارات کو ہی باہر نکلنے کا راستہ نہیں دیتا بلکہ آسمان کے ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن کچھ گھڑے اپنی چکنائی کی وجہ سے جذب کرنے کی قوت کھو چکے ہوتے ہیں۔ سب کچھ اُن کے اُوپر اُوپر سے گزر جاتا ہے۔ آج کل ایسے گھڑوں کی بازارِ سیاست میں بڑی مانگ ہے۔

یہاں مجھے ایک تاریخی گھڑا بھی یاد آ رہا ہے۔ یہ گھڑا ایک زندہ رہنے والی داستان کا اختتامیہ ثابت ہوا تھا۔ میں آج تک اس گھڑے کے کردار کے بارے میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اُن دوستوں کی طرح سمجھوں جو عین وقت پر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں یا اُس پہریدار کی طرح جو اپنے جیون کا بلیدان دے کر مالک کے ناموس کو بچا جاتا ہے۔

ماضی کو فراموش کرنے والے کبھی بھی مستقبل کی اقلیم فتح نہیں کر سکتے۔ ہمارے ماضی کا کچھ حصّہ تو کتابوں میں محفوظ تھا۔ لیکن ایک بڑا حصّہ ایسا بھی تھا جس تک رہنمائی کتابوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ماضی کے اس حصّے سے ہمیں متعارف کرانے کا سہرا گھڑے ہی کے سر جاتا ہے۔ ثبوت کے لیے آپ کسی بھی عجائب گھر سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جہاں گھڑا ہمارے ماضی کے زندہ حوالے کے طور پر یقیناً موجود ہوگا۔ گھڑے نے نہ صرف ماضی سے ہمارا رشتہ جوڑا ہے بلکہ ہم نے جو مسافتیں طے کی ہیں اُن کی داستان بھی ہمیں سُنائی ہے۔ آج ہم سینہ پھُلا پھُلا کر ماضی کے جن کارناموں کا ذکر کرتے نہیں تھکتے اُن سب کا راوی گھڑا ہے۔

کسی زمانے میں لوگ پانی ڈھونے کے لیے عجیب طریقہ استعمال کرتے تھے۔ ایک لکڑی کے دونوں کناروں پر لگی زنجیروں کو دو بھرے ہوئے گھڑوں میں اٹکا کر اُسے بہنگی کی طرح کندھے پر رکھ لیا جاتا تھا۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر ہمیشہ میزانِ عدل کا خیال آتا تھا۔ اب کہ یہ میزانِ عدل ماضی کا فسانہ بن گئی ہے، عدل و مساوات بھی قصّۂ پارینہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہم سب ہوش سنبھالتے ہی ایک گھڑا اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیتے ہیں، اور پھر عمر بھر اس کے سہارے مستقبل کے سنہرے خواب بُنتے رہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی ٹھوکر کی وجہ سے یہ گھڑا گِر کر ٹوٹ جائے تو ہمارے خواب کرچی کرچی ہو جاتے ہیں۔

گھڑا شادی بیاہ کے موقعوں پر تمام دن ساقی کے فرائض سر انجام دینے کے بعد رات کو گھنگھروؤں والے نازک پیروں اور حنائی ہاتھوں کا بھی بھرپور ساتھ دیتا ہے۔ اس کی صدا پر جوان دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں اور جاگتی آنکھوں میں اجنبی دیسوں کے خواب بسیرا کر لیتے ہیں۔

گھڑا تو ایسا جان نثار دوست ہے جو ہر حال میں آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ اُسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اُس کی زندگی کا واحد مقصد بغیر کسی صلے کی پروا کیے آپ کے کام آنا ہے۔ آپ کسی پیاس کے صحرا سے گزر رہے ہوں تو وہ آپ

کو زندگی کی ضمانت مہیا کرتا ہے اور اگر کسی ناراض دریا کی وحشی لہروں سے مقابلہ ہو جائے تو یہ آپ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ مگر آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ تو وہ ساتھی ہے جو مرنے کے بعد بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا جیسے ہندو عورتیں اپنے پتی کے ساتھ زندہ جل کر وفا شعاری کی عظیم داستان چھوڑ جاتی تھیں۔ اسی طرح گھڑا بھی انسان کے ساتھ دفن ہو کر دوستی کی اَنمٹ کہانی چھوڑ جاتا ہے، اب یہ علیحدہ بات ہے کہ مرحوم کے پسماندگان اُس کے ساتھ بھی مرحوم جیسا سلوک روا رکھیں اور مٹی میں اُتارتے ہی اسے اور مرحوم دونوں کو ذہن سے بھی اتار دیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ بعض گھڑوں نے بھی اپنا مزاج بدل لیا ہے۔ لہٰذا اب ضروری نہیں کہ پانی سے شرابور دکھائی دینے والے ہر گھڑے کے اندر ٹھنڈا میٹھا پانی بھی ہو۔ موسم جس طرح انسانوں کے مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں اُسی طرح گھڑے کے مزاج پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ ٹھنڈے موسم میں بنائے گئے گھڑے کا پانی ہمیشہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ٹھنڈے دل و دماغ سے کیے گئے فیصلے دُور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ گھڑے نے کچھ لوگوں کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ آپ نے سُنا ہوگا فلاں فلاں مٹکے والے اور ہمنوا ــــــ

اگر آپ نے گُڑ بنتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑے سے کڑاہ کے کنارے پر ایک گھڑا رکھا رہتا ہے جس میں سوراخ کر کے اُسے گنے کی پوری سے بند کر دیا جاتا ہے۔ پکتے ہوتے رس پر آنے والی میل کو ایک چھلنی سے اُتار اُتار کر اس گھڑے میں ڈالتے رہتے ہیں اور پھر گھڑا بھر جانے پر گنے کی پوری سوراخ سے نکال لی جاتی ہے۔ اس طرح میل کے ساتھ گھڑے میں جانے والا رس اس سوراخ کے راستے کڑاہ میں واپس آجاتا ہے، جبکہ میل گھڑے کے اندر رہ جاتا ہے۔ فنکار کا لاشعور بھی اس گھڑے کی طرح ہوتا ہے۔ یہ اس کے تجربات اور مشاہدات کی میل کو علیحدہ کر کے اسے تخلیق کے لیے خالص خام مواد مہیا کرتا ہے۔

ایک دن ایک کوچے سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر ایک دُکان پر پڑی اور پھر دُکان کے منظر نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی اور میری نظروں کو جکڑ لیا۔ ایک کمہار چاک پر مٹی کے تودے رکھتا اور پھر تیزی سے چاک کو گھماتا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی فنکار انگلیاں ایک پُراسرار سے عمل میں مصروف ہو جاتیں۔ چند منٹوں میں مٹی کا بے صورت تودا ایک خوبصورت گھڑے کی ابتدائی شکل اختیار کر لیتا۔ تب فنکار ایک ڈوری سے اس کو چاک سے علیحدہ کرتا اور احتیاط سے ایک طرف رکھ دیتا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے لگا کہ مَیں بھی تو ابھی تک چاک پر گھوم رہا ہوں اور کوئی پُراسرار قوت اپنی مرضی سے میرے نقوش بنانے اور بگاڑنے میں مصروف ہے۔ پھر مَیں نے سوچا کہ مَیں ہی کیا ابھی تو پوری کائنات ہی چاک پر گھوم رہی ہے۔

مَیں اِس وقت ایک ایئر کنڈیشنڈ ریستوران میں بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے میز پر کوکا کولا کی یخ بوتل رکھی ہوئی ہے۔ لیکن میرے اندر بگولے ناچ رہے ہیں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ مَیں فوراً یہاں سے نکلوں اور سائیکل لے کر فصیلِ شہر عبور کر جاؤں۔ لیکن مَیں ایسا نہیں کر پا رہا۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ اب شہر سے نکلتے ہی کچی عمر کی الھڑ ناری میرا ہاتھ تھامنے کے لیے موجود نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک کچی پکی پاٹھی اور کھائی کھیلی سیاہ رُو عورت زنِ بازاری کی طرح اپنے عشوے اور غمزے لُٹا رہی ہوگی، ایک زنجیر اُس کے ناز و ادا کا خراج وصول کرنے کے لیے راہ میں حائل ہوگی اور یہ ہر خراج ادا کرنے والے ایرے غیرے سے ہم آغوش ہونے کے لیے تیار ہوگی، کچھ لوگ کیکروں کے جھنڈ کی دلالی کر کے اپنے منہ

پر کالک مل چکے ہوں گے اور دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ چکی کی "دُھک دُھک" کے بجائے برقی موٹر کی "گھرر گھرر" سمع خراشی کر رہی ہوگی، گوبر سے گھڑوں کی مہک کی بجائے ہوٹل کے جلتے ہوئے پتیلے سے اُٹھتی، بار بار اُبلی ہوئی پتی کی بساند فضا کو آلودہ کر رہی ہوگی اور گھڑونچی پر ان کے پرچم کی طرح لہراتے ہوئے آبخورے کی جگہ ایلومینیم یا کانچ کے میلے اور بد وضع گلاس سجے ہوں گے۔ سو اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ میں اپنے سُلگتے ہوئے ہونٹ بوتل کے سرد ہونٹوں پر رکھ کر بہکتے، سسکتے ماضی کی یادوں سے اپنا دل بہلاؤں۔

سرگوشی

محمد اقبال انجم

سیاسی جلسہ پورے جوش و خروش سے جاری تھا۔ سارا پنڈال خوبصورت جھنڈیوں، رنگ برنگے بینروں اور تیز روشنیوں سے آراستہ تھا۔ ملک کے ایک معروف وزیر اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ایک بلند سٹیج پر رونق افروز تھے۔ ہجوم دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا شہر جلسے میں اُمڈ آیا ہے۔ یہ بھی ہمارے لوگوں کی فطرت ہے کہ جلسہ چاہے کسی مخالف کا ہو اپنی شرکت سے اُسے ضرور کامیاب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت سی سیاسی پارٹیاں وجود میں آچکی ہیں کیونکہ سب کو سامعین اور نعرے باز آسانی سے میسر آجاتے ہیں ...... مقررین اپنی اپنی سیاسی وابستگیاں استوار کرنے کے لیے گلے پھاڑ پھاڑ کر تقریریں کر رہے تھے، اور سامعین ان سے زیادہ بلند آواز میں نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ لیکن اس تمام ہنگامے اور شور و غل سے بے نیاز ایک شخص وقفے وقفے سے دبے پاؤں سٹیج پر چڑھتا اور وزیر موصوف کے کان میں سرگوشی کرتا اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لیے واپس آجاتا۔ سرگوشی کرنے والے کی آواز تو سنائی نہیں دیتی۔ لیکن سننے والے کی آنکھوں کے اشارے اور چہرے کے تاثرات سے مختلف لوگ مختلف مفہوم اخذ کر لیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر لوگ دوسروں پر اپنے تعلقات کا رعب جمانے کے لیے بھی اہم شخصیتوں سے بار بار کانا پھوسی کرتے ہیں۔ جس سے دوست احباب تو خوش ہوتے ہیں مگر مخالفین مزید بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میری نظر میں یہ سرگوشی بھی ایک قسم کا تجریدی آرٹ ہے جس سے کئی مفہوم اور نتائج پیدا اور اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ لبوں کی یہ بے صدا جنبش اپنے اندر ایک جہانِ معنی چھپائے بیٹھی ہے۔

پردہ پوشی، راز داری اور سکوت سرگوشی کو جنم دیتے ہیں۔ سرگوشی، پُر اسراریت کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ پُر اسراریت تجسس کو بیدار کرتی ہے اور اگر تجسس کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو شک کی اس زرخیز زمین سے بدگمانی کا ایسا پودا سر نکالتا ہے جو لمحوں کی رفتار سے بار آور ہوتا ہے اور آکاس بیل کی طرح ذہنوں پر چھا جاتا ہے۔ اگر لفظ سرگوشی پر غور کریں تو یہ 'سر' اور 'گوش' کا مرکب دکھائی دیتا ہے۔ اگر 'سر' پر زبر ہو تو اس سے محض سر اور کانوں کی یکجائی کا تصور ابھرتا ہے۔ اور اگر 'س' کے نیچے زیر ہو تو کسی راز کو کانوں تک پہنچانے کی تصویر بنتی ہے۔ اگر محفل میں دو افراد ایک دوسرے کے کانوں میں گھستے چلے جا رہے ہوں اور ساتھ ساتھ اُن کے بھینچے ہوئے ہونٹوں اور ناک کے راستے گھٹے گھٹے قہقہے بھی پھسل رہے ہوں تو سمجھ لیں کہ کوئی تیسرا اُن کی زد میں ہے۔ ہم کسی بھی محفل میں سرگوشیوں کا بیج بو کر بدگمانیوں کی فصل تو آسانی سے کاٹ سکتے ہیں لیکن اس اندازِ گفتگو کے روشن پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کر جاتے ہیں، ہم یہی کیوں تصور کر لیتے ہیں کہ ہر سرگوشی کرنے والا مخالفت پیشہ شخص ہے۔ سرگوشی فقط غلط فہمیوں کو جنم دینے کی محرک ہی بن کر کیوں رہ گئی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی سے اپنا دکھ بیان کر رہا ہو۔ کوئی کسی کو شرمندگی سے

بجا کر نصیحت کر رہا ہو۔ کوئی اپنی آپ بیتی کا ورق اُلٹ رہا ہو۔ محفل میں بیٹھے کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کسی راز کی گرہ کشائی میں مصروف ہو یا کسی نکتے کی وضاحت کر رہا ہو۔ ویسے بھی سرگوشی کرتے ہوئے دو افراد بہت اچھے لگتے ہیں، کیونکہ سرگوشی دامنِ سکوت کی عفت کو پامال نہیں ہونے دیتی۔ سرگوشی سماعت کے ایوانوں میں کورنش بجا لاتی ہے، وہ نازنین ہے جو شور و غل کے ہجوم میں لجاتی شرماتی کانوں کے راستے دل میں اتر جاتی ہے۔ اگر تمام لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنا شروع کر دیں تو دُنیا سے شور و غل کم ہو جائے اور کائنات امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔

مَیں نے ایک دفعہ ایک پامسٹ کو فٹ پاتھ پر خوشخبریوں کے سائبان کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ محبت میں ناکامیوں کے مارے۔ شادی کے سلسلے میں مختلف رکاوٹوں میں پھنسے ہوئے اور مایوسیوں کی دلدل میں کھوئے ہوئے راہگیر ان خوشخبریوں کی پناہ میں آنے کو بے تاب رہتے۔ جب بھی کوئی شخص دوسرے راہگیروں سے نظریں چُرا کر پامسٹ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا تو میرے اندر کا تجسس بُری طرح دھڑکنے لگتا۔ مَیں پامسٹ کی حرکات و سکنات سے ان کے درمیان ہونے والی باتوں کا اندازہ لگانے کی بہت کوشش کرتا۔ لیکن وہ سرگوشی ہی کیا جسے دُور کھڑا ہوا کوئی شخص سُن یا سمجھ سکے۔ سرگوشی رازداری اور گفتگو کے ازدواج کی اولاد ہے جسے گود لینا اتنا آسان نہیں، چنانچہ پامسٹ کی سرگوشیاں میری جستجو کے اسفنج کو ہمیشہ تشنہ رکھتیں جس طرح طبیب اپنی بیماری کا علاج کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور دوسروں کو مشوروں سے نوازنے والے خود اکثر عاقبت نا اندیشی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، اسی طرح یہ فٹ پاتھیے پامسٹ خود اپنے مستقبل سے بے خبر ہونے پر بھی دوسروں کو سہانے خواب دکھانے میں بڑے مشاق ہوتے ہیں اور اس کی کامیابی میں اُن کی سرگوشیوں کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ جنہیں وہ بوند بوند اپنے گاہکوں کے کانوں میں یوں ٹپکاتے رہتے ہیں کہ ایک مایوس اور شکستہ دل آدمی بھی اپنے چہرے پر اُمید اور خوشی کی پرچھائیں لے کر اٹھتا ہے۔

صرف انسان ہی نہیں دُنیا میں اور بہت سی چیزیں سرگوشی کے عمل سے گزرتی ہیں۔ درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی چونچیں ملائے اکثر سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ چمن زاروں میں کھلے ہوئے پھول گردنیں اٹھا اٹھا کر اپنی ہستی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے حالِ دل کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُونچے اُونچے پربت صدیوں سے اپنے سروں پر برف کی پگڑیاں باندھے موسموں کی خبر لانے والے بادلوں سے سرگوشیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ صبح کے وقت بادِ صبا کا کوئی شریر جھونکا کلی کے کان میں سرگوشی کی صورت میں کیا پیغام دیتا ہے کہ وہ خوشی سے کھلکھلا اُٹھتی ہے۔ بعض دفعہ کوئی شاعر کسی خوبصورت خیال کو قلمبند کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ کوئی سائنس دان کسی نئے فائدہ کی دریافت میں سرگرداں ہوتا ہے۔ کوئی فلاسفر کسی عقدے کو حل کرنے کی تگ و دَو میں ہوتا ہے لیکن اُسے کچھ نہیں سوجھتا۔ وہ اپنی سوچوں کے دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ اپنے خیالات کے تانے بانے میں ہی اُلجھا رہتا ہے کہ اچانک فطرت اُس کے وجدان میں سرگوشی کرتی ہے تو اُس کے تصوّرات کے نہاں خانوں میں حقیقت کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عمدہ خیال، انوکھی تجویز اور ابھرتی ایجاد فطرت کی سرگوشی ہی سے سوجھتی ہے جو وہ فضا میں گردش پذیر نادیدہ قوتوں سے حاصل کر کے تخلیق کار کے حاسۂ انتقاد میں پھونک دیتی ہے۔ پرندوں کو اڑتے دیکھ کر انسان کے دل میں ہوائی جہاز بنانے کا خیال آیا ہوگا۔ شفاف پانی کے ذخیرے میں اپنا چہرہ دیکھ کر آئینہ بنانے کا تصوّر اُبھرا ہوگا۔ پہاڑوں کے قدرتی غاروں نے اُسے مکان اور رہائش گاہوں کی تعمیر کی ترغیب دی ہوگی، درختوں کی چھال اور مختلف پھلوں کے چھلکوں نے اُسے لباس کا شعور دیا ہوگا۔ جب مَیں وائرلیس یا ٹیلیفون کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان ایجادات کے پس منظر میں سرگوشی کا عمل ہی کارفرما نظر آتا ہے کیونکہ ٹیلیفون کے ذریعے بھی لبوں کا پیغام رازداری سے کانوں تک پہنچانا اتنا ہی سہل ہے جتنا سرگوشی کے ذریعے بلکہ ٹیلیفون کا ایک اور فائدہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سرگوشیاں کرنے سے دوسرے لوگ بدگمانیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

میں نے بہت سے لوگوں کو چلتے پھرتے اپنے آپ سے بھی سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے۔ وہ نہ جانے کس اندرونی اُدھیڑ بن میں ہوتے ہیں کہ انہیں باہر کی کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا وہ اپنے شعور و لاشعور کی جنگ میں گرد و پیش کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دراصل وہ لوگ نفسیاتی دباؤ، اُن کے منفی رویوں اور حالات کے کھچاؤ کے تحت اس حد تک بے یقینی اور بے اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی ذات کے سوا کسی پر یقین ہی نہیں رہتا، وہ اپنی ہی ذات میں گم ہو جاتے ہیں، خود ہی سائل و مسئول بن جاتے ہیں اور خود ہی سے سرگوشیوں میں منہمک رہتے ہیں۔

فخر کے مقابلے میں عجز بھی ایک قسم کی سرگوشی ہے۔ فخر اپنی قوت، اقتدار اور ذاتی اوصاف کے اظہار کا نام ہے، لیکن عجز اپنی ذات و صفات کی نفی کرتا ہے۔ عجز ہی انسان کو دُعا کی طرف مائل کرتا ہے۔ دُعا خالق و مخلوق کے درمیان بندہ و آقا کا رشتہ استوار کرتی ہے، اور بہترین دُعا وہ ہے جو سرگوشیوں کی صورت میں کی جائے۔ اس کے الفاظ آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہے ہوں اور آواز سسکیوں میں ڈھل چکی ہو۔ عجز اور دُعا لازم و ملزوم ہیں۔ دُعا عجز کا سہارا اور اس کی محافظ ہوتی ہے اور عجز، دُعا کا ساتھی ہے۔ دونوں کا رشتہ سرگوشی کے دو سروں سے بندھا ہوا ہے۔

سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی روایات کی طرح کانوں کان سفر کرتی ہوئی سرگوشیاں اکثر شور مچاتی تصویروں اور بلند آوازوں سے زیادہ مؤثر اور بارآور ہوتی ہیں، کیونکہ تقریر، آواز و انداز کا مجموعہ ہوتی ہے جسے آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں، جبکہ سرگوشی کرنے والا گفتگو کو اپنے شخصی لمس کی مٹھاس اور خوشبو میں بسا کر براہِ راست حواس کے سپرد کر دیتا ہے۔ بلند آوازیں کسی شخص کی عقل اور جذبات کو اپیل کرتی ہیں لیکن سرگوشیاں حواس کے راستے وجدان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سرگوشی لبوں کے پیکر سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا ایسا امرت ہے جو دلوں کی ویران سرزمین میں محبت کے پھول کھلا سکتا ہے۔ بہت سی تحریکیں سُلگتے ہوئے فیتے کی طرح سرگوشیوں کی زبان میں انسانوں کے درمیان سفر کرتی رہتی ہیں۔ جہاں کہیں سرگوشی کا سلسلہ ٹوٹتا ہے وہیں تحریکیں دم توڑ دیتی ہیں، جب انسانوں کے درمیان سرگوشی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو مغائرت کا رشتہ ابھر آتا ہے۔ پھر وہ ایک دوسرے پر غرّانے لگتے ہیں۔ اتنا چیختے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔

سوال

معشہ خان

آج جب میں امتحان کا آخری پرچہ دے کر گھر لوٹی تو بہت سکون محسوس کر رہی تھی چلیئے کچھ عرصے کے لیے ہی سہی لیکن سوال اور جواب کے اس لامتناہی سلسلے سے تو جان چھوٹی۔ ہر صبح جب امتحان کو سر پر لاد کر میں کمرۂ امتحان میں داخل ہوتی، تو میرا ذہن بوجھل ہوجاتا۔ اور گھر آتی تو اگلے دن کا امتحان ایک عذاب نظر آنے لگتا۔ لیکن آج ایسے لگا جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کو میں نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے زمین بوس کر دیا ہے۔ شرپا تن سنگھ نے تو یہ اونچا پہاڑ سر کیا ہی تھا لیکن میں نے پہاڑ کو اپنے قدموں میں گرا لیا تھا۔ میری کامیابی تن سنگھ سے بڑی تھی لیکن حیرت ہے کہ سوائے میرے کسی کو اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ میں خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئی تو اپنے آپ کو پھول کی طرح سبک محسوس کر رہی تھی، لیکن جونہی اندر قدم رکھا سوالوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ "کیسے سوال آئے تھے"، "کتنے صحیح کیے؟"، "اس سوال کا جواب کیا لکھا ہے؟"، "یوں کیوں نہیں لکھا؟" مجھے محسوس ہوا کہ ٹکڑے ٹکڑے ماؤنٹ ایورسٹ نے پھر مجتمع ہونا شروع کر دیا ہے، اور ہر سوال ایک بڑا پتھر بن کر میرے سر پر گر رہا ہے۔ ابھی ان سوالوں سے فرار کے لیے پر پھڑپھڑا ہی رہی تھی کہ میری ایک ہمسائی اپنے ننھے سوال ٹرے میں سجا کر لے آئی اور بڑی تمکنت سے بولی "اب آگے کیا ارادہ ہے؟" یہ اس خطرے کا اعلان تھا کہ ابھی زندگی کے کئی انوکھے امتحان باقی ہیں۔ لگتا ہے سوال اکاس بیل کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین میں پیوست نہ بھی ہوں تو ان کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ فطرت کا بڑا اصول تو یہ ہے کہ جہاں جواب کا بیج گرتا ہے، وہیں سے نیا شجر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن سوال تو شجر کو کھا جانے پر ہی آمادہ ہوجاتا ہے، اور پھر پتہ پتہ بوٹا بوٹا اپنا حالِ زار بیان کرتا جاتا ہے۔

مجھے سوال سے نفرت نہیں ہے۔ سوال کا نقطہ تو میری پیدائش کے ساتھ رونما ہوا تھا، اور پھر میرے شعور کے ساتھ دائرہ در دائرہ بڑھتا رہا۔ میرے تجربات اور مشاہدات سوالات کو کم کرنے کی بجائے انہیں تقویت بہم پہنچاتے رہے۔ میری عقل کہتی ہے کہ اگر ایک سوال کے جواب میں ایک اور سوال نہ ابھرتا تو میری ذہنی ترقی پہلی ہی منزل پر منجمد ہوکر رہ جاتی۔ یہ سوالوں کا لامتناہی سلسلہ ہی تھا جس نے میرے ذہن کی گرہیں کھولیں مجھے آگے بڑھنے کا رستہ دکھایا۔ اور اب تو مجھے یقین ہے کہ ہر ذی شعور کے شعور کو سوال ہی روشنی کی لکیر دکھاتا اور اس کے فکری اُفق کو مطلعِ تاباں بناتا ہے۔

سوال ہمیں اطمینان پہنچانے کے بجائے متجسس کرتا ہے۔ ہم دن بھر سوال کے ساتھ سرگرداں رہتے ہیں اور جواب تلاش کر لینے کے بعد جب مسرت سے ہمکنار ہوجاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے دل نے نئے موسیقی نواز انداز میں دھڑکنا شروع کر دیا ہے — یا جیسے اماوس کی رات کے بعد سارا عالم بقعۂ نور بن گیا ہو۔ یہ جواب کی مسرت ہی تو ہے، جو ہمیں کسی نئے انداز میں کسی نئے سوال سے نبرد آزما ہونے کے لیے پھر آمادہ کر لیتی ہے اور یہ سلسلہ زندگی بھر جاری

رہتا ہے۔

سوال کی داغ بیل تو اسی دن پڑ گئی تھی جس دن یہ دنیا وجود میں آئی تھی۔ یہ ستارے جو کہکشاں کی صورت بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ چاند جو آسمان میں آویزاں ہے ——— اور یہ سورج جو ہر صبح مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ سب کائنات کے عظیم سوالات ہیں، اور انہیں سوالوں سے نبرد آزما ہو کر حضرت ابراہیم نے معرفتِ حق حاصل کی تھی۔ کائنات کے یہ سب مظہر روشنی کے ماخذ ہیں اور ان کے پس منظر میں بھی یہ مقصد کارفرما ہے کہ انسان کہیں تاریکی میں اپنے گرد بکھرے ہوئے سوالوں کو بھول نہ جائے۔

میرے نزدیک سوال محرک ہے اور ہمیں حرکت میں رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ سوال کی تحریک پر ہی انسان عظیم کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ سوال کولمبس کے ذہن میں ابھرا تو امریکہ دریافت ہو گیا۔ نیوٹن کے ذہن میں پھوٹا تو کششِ ثقل کا نظریہ ایجاد ہوا۔ ڈارون نے انسان کی پیدائش کا سوال اٹھایا تو نظریۂ ارتقا ظہور میں آیا۔ سائنس داں اگر چاند پر چرخا کاتنے والی بڑھیا کے بارے میں نہ سوچتے تو وہ آکاش کی بلندیوں پر کس طرح پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ سوال نے ہی انسان کو زمین کے مدار سے نکلنے اور چاند کی دنیا دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔

چاند کو چھوڑیں بھی تو زمین پر چلتا ہوا ہر چہرہ ایک مجسم سوال لگتا ہے۔ جس طرح ہر چہرہ دوسرے چہرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ویسے ہی ان چہروں پر سجا ہوا ہر سوال دوسرے چہرے کے سوال سے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ کوئی سوال محفل کا تقاضا کرتا ہے۔ کوئی تنہائی چاہتا ہے۔ ایک چہرے پر یہ سوال رقم ہے کہ اسے چشمِ بینا کیوں نہ دی گئی۔ دوسرا سوال کرتا ہے کہ اس کی طبع کو روشنی کیوں دی گئی ہے کہ آزارِ جاں بن گئی ہے؟ حد یہ ہے کہ خدا کے محبوب بندے بھی سوال کی دستبرد سے بچ نہیں سکے اور وہ خدا کے جلال و جمال کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کا سوال کرنے لگے۔

ابلیس جب تک سوال اٹھانے کی قوت سے محروم رہا اس پر جمود طاری رہا۔ لیکن جونہی انسان کو معرضِ وجود میں لانے کا سوال سامنے آیا تو ابلیس کا انکار خود خالقِ انسان کے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا، اور یہ سوال ہی ابلیس کو ایک قابلِ اعتنا ہستی بنا گیا۔ لیکن اس سے یہ بھی تو ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کو نئے سوال سے ہی نہیں نیا سوال اٹھانے والوں سے بھی گہری دلچسپی ہے۔

تنہائی

امجد طفیل

پہلا انسان جس نے آنکھ کھول کر اس دُنیا کو حیرت سے دیکھا، کیا اُس نے خود کو تنہا محسوس کیا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ شخص ایسا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے تو اپنی ذات کو بھی اپنے ارد گرد بکھرے درختوں، پرندوں اور جانوروں کی طرح ہی محسوس کیا ہوگا۔ اپنی ذات کو باہر پھیلے کُل کا ایک جزو سمجھا ہوگا۔ فطرت اور اُس کا رشتہ اتنا کچا اور مصنوعی ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اپنی ذات میں فطرت کو شریک نہ کر پائے۔ تنہائی اُس کا مسئلہ نہیں تھا۔ تنہائی کا احساس تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے جیسے لوگوں کو اپنے ارد گرد گھومتے پھرتے دیکھتا ہے۔ اُن کو باتیں کرتے، قہقہے لگاتے پاتا ہے۔ لیکن وہ ان سب باتوں میں خود کو شریک نہیں کر سکتا۔ اگر وہ کبھی ان چیزوں کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو یہ رشتہ مضبوط اور کھرا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تصنع اور بناوٹ ہوتی ہے۔ کیونکہ آج کا انسان کسی دوسرے کو اپنے وجود کا حصّہ بنانے سے ڈرنے لگا ہے۔ وہ اپنی ذات میں کسی کو شریک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ ساری دُنیا سے رشتہ توڑ کر اُس نے فقط اپنی ذات اور انا کو اپنا راہنما بنایا ہے۔ اب اگر کسی مقام پر اُسے احساس ہو کہ جس ذات کے بل پہ وہ ساری دُنیا سے لڑنے نکلا تھا اُس پر بھی اُس کا کوئی اختیار نہیں تو اُس کا پریشان ہونا اور اس دُنیا میں بے یار و مددگار رہ جانے کے کرب میں مبتلا ہونا یقینی امر ہے۔ جب انسان نے ابھی اپنی ذات کے گرد مصنوعی خول اتنی مضبوطی سے نہیں چڑھایا تھا تو وہ اپنے ارد گرد پھیلی اشیاء سے رشتہ قائم رکھتا تھا۔ اس رشتے کی بنیاد محبت اور خلوص پر تھی، اُسے یقین تھا کہ اُس کے ارد گرد پھیلی ساری کائنات اس کی ہے اور وہ اس ساری کائنات کا مالک و مختار ہے، لیکن جب یہ رشتہ کمزور پڑنے لگا، اور اُس نے اپنی ذات اور باہر پھیلی کائنات میں دُوری محسوس کی تو ایک سوال نے اُسے ستایا کہ وہ کیا ہے اور یہاں کیوں ہے۔ اس سوال کی تلاش میں اُس نے حاتم طائی کی طرح سات سفر کیے، سندباد جہازی کے ساتھ دُور دُنیاؤں کی مسافت طے کی کولمبس کے جہاز پر امریکہ جا نکلا مگر کسی جگہ بھی اُسے اپنے سوال کا تسلی بخش جواب نہ ملا۔ تب اُسے لگا جیسے وہ اس طویل و عریض کُل کا ایک جزو نہیں بلکہ اس سے علیحدہ کوئی چیز ہے سو اُس کے اور اشیاء کے درمیان رشتہ بیگانگی کی بنیاد پر استوار ہوا، اسی بیگانگی کی بنیاد پر تنہائی سے دوچار کیا۔

تنہائی کا عفریت کافی عرصہ تو رسوم و رواج اور اعلیٰ اقدار کی بوتل میں بند رہا کہ ان چیزوں نے ایک انسان کا رشتہ اس کے گرد افراد سے اور اس کے معاشرے سے مضبوطی سے استوار کر رکھا تھا، مگر جب عقل کو لامتناہی اختیارات کی حامل قرار دے کر سارے عالم کی حکمرانی اُسے سونپ دی گئی تو شک نے یقین کی جگہ لے لی۔ ماننا اور جاننا ضروری نہ رہا۔ ہاں جاننے کے بعد شک کرنا سب سے افضل فعل قرار پایا۔ اس شک کے دیمک نے انسان

کے چٹان جیسے مضبوط عقائد کو ملیامیٹ کر دیا۔ رفتہ رفتہ اُن کے اندر کے گودے کو کھا کر انہیں کھوکھلی لکڑی میں تبدیل کر دیا۔ انسان کی زندگی کے مضبوط سہارے ذہن سے چھن چھین لیے گئے اور اُسے اس بھیانک اور دشمن کائنات میں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ نہ فطرت اُس کی دشمن تھی اور نہ خدا کو اُس سے کوئی بیر تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کرۂ ارض پر زندگی اتنی آب و تاب سے جلوہ فرما نہ ہوتی بلکہ کبھی کی اندھے طوفان کی نذر ہو کر تاریک وادیوں میں گم ہو چکی ہوتی۔ ہزار ہا آفات کے بعد بھی اگر اس زمین پر زندگی پہلے سے زیادہ بھرپور انداز سے براجمان ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے گرد فطرت اور اس کارخانۂ فطرت کو چلانے والا اُس کا مخالف نہیں۔ ہاں جب انسان ماننے اور جاننے کی حد سے نکل کر جاننے اور شک کرنے کی حد میں داخل ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے وجود سے لے کر کائنات کی ہر ادنیٰ اور اعلیٰ چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، چونکہ بزرگوں کا قول ہے کہ شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا سو اس لاعلاج مرض کے سہارے انسان اپنے اندر اور باہر ایسی دیواریں تعمیر کر لیتا ہے کہ اس دُنیا کی ہر چیز اُسے خود سے جدا اور حریف نظر آتی ہے۔

تنہائی کا احساس اُس فرد کو زیادہ ہوتا ہے جو دوسرے لوگوں سے خود کو منفرد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انفرادیت جہاں انسان کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتی ہے وہاں یہ احساس کہ اس کے ارد گرد لوگ اُس جیسے نہیں، کے باعث ایک عذاب سے بھی دوچار کر دیتی ہے۔ لوگ منفرد ہونے کے شوق میں تنہا ہوتے جا رہے ہیں، ہر آدمی صرف اپنی ذات کو منوانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کوشش میں اُس کو دُکھ، کرب اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں ملتا، تب وہ سوچتا ہے کہ میرے ارد گرد گھومنے پھرنے والے لوگوں کا رہن سہن، رسوم و رواج، زبان، کلچر یہ سب تو میرے جیسا ہے پھر میں انہیں اپنی ذات میں شریک کرنے سے کیوں کتراتا ہوں، کیا مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر میں نے ان لوگوں کو اپنی ذات میں شامل کر لیا تو میری انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ میں اس سیلِ رواں کا ایک حصہ بن جاؤں گا۔ اُس لہر کی طرح جو اپنا وجود رکھتے ہوئے بھی بحر کے حوالے سے ہی شناخت کی جاتی ہے، اسی بات کی فراموشی نے لوگوں کو بے دست و پا کر دیا ہے اگر اکیلی لہر یہ چاہے کہ وہ دُور دُور تک پھیل جائے تو یہ کس طرح ممکن ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس دُنیا میں ایسے افراد بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ تنہائی میں گزارا اور پھر اس دُنیا کو ایسے گنج ہائے گراں مایہ سے نوازا کہ آج بھی دُنیا ان سے فیض حاصل کر رہی ہے۔ بات درست ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اُن افراد کے معاشرے سے تعلق توڑ کر اپنی ذات کے کھوج میں نکلنے اور پھر دُنیا کو بے بہا خزانوں سے سرفراز کرنے اور آج کے انسان کا اپنی ذات کی کھوج میں نکلنے اور ایک کربِ لادوا میں گرفتار ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ وہ لوگ تو اپنے اور دوسرے افراد کے درمیان گم ہوتے ہوئے تعلق کی بازیافت کے لیے تنہائی اختیار کرتے تھے۔ اُن کی ذات اُن کے راستے کا پتھر نہیں راستہ طے کرانے والا رخش ہوتی تھی جو انہیں اُن منزلوں تک لے جاتا تھا جہاں پہنچ کر وہ ساری دُنیا کو راہنمائی کرنے کے لیے ایک بار پھر اسی دُنیا میں لوٹ آتے تھے۔ انہوں نے اپنے اندر کے شجرِ سایہ دار کو اتنا پھیلا دیا تھا کہ ایک دُنیا اُن کے سائے میں عافیت محسوس کرتی تھی مگر آج کے انسان کے لیے تو دوسرا آدمی اُس کا جہنم ہے۔ جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے اندر ڈوب جانا چاہتا ہے لیکن اُسے اس بات کی بالکل خبر نہیں کہ اصل جہنم تو اُس کے اپنے اندر ہے جس کی تپش نے اُسے جھلسا دیا ہے۔ اُس کے من میں موجود میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اب نہ وہ خود آرام حاصل کر سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے راحت کا باعث بن سکتا ہے۔

جب زندگی سُست روی سے بسر ہوتی تھی تو اقدار اور عقائد بھی مضبوطی سے ایستادہ تھے۔ لیکن جیسے جیسے زندگی تیز رفتار ہوتی گئی تبدیلی کا عمل بھی تیز تر ہوتا چلا گیا۔ پہلے جو تبدیلی سالوں اور صدیوں میں آتی تھی اب دنوں اور مہینوں میں آتی ہے۔ نئے فلسفے یا تھیوری کے مطابق فرد خود کو ابھی معاشر کے ساتھ جوڑنے میں مصروف ہوتا ہے کہ یکایک کسی جانب سے اعلان ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ تو محض بےکار تھا اصل اور حقیقی سچائی تو اب اُس نے دریافت کی ہے، کرب اور دُکھ کی آگ میں جلتے لوگ اس نئے سراب کو بھی تریاق سمجھ کر اس کی طرف بھاگتے ہیں لیکن مسافت طے کرنے کے بعد

انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ تو غلط سمت میں محوِ سفر تھے۔ اپنے اندر کے خلا کو بھرنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی دیکھ کر مایوسی اُن کا احاطہ کر لیتی ہے اور یہ مایوسی انہیں اس دُنیا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس دُنیا میں ملنے والی چھوٹی چھوٹی ناکامیاں اُس کے سامنے زندگی کے تاریک پہلو کو زیادہ نمایاں کر دیتی ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کو اپنا دوست اور ہمدرد دیکھنے کی بجائے انہیں اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ یوں تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

تنہا آدمی کی مثال طویل و عریض سمندر میں ایک چھوٹے سے جزیرے جیسی ہے جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہونے کے باوجود اپنے ہونے کے ثبوت کے طور پر پانی سے سر باہر نکالے کھڑا رہتا ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کے دوسروں سے ایک الگ اپنی ذات کو منوانے کے جنون میں اس بات سے بے خبر کہ اس سمندر سے اٹھنے والی ایک لہر ہی اُسے ڈبونے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے بے شمار جزیرے موجود ہیں۔ نہ یہ جزیرے مل کر خشکی کا ایک بڑا قطعہ بنتے ہیں اور نہ خود کو سمندر کی نذر کرتے ہیں۔ ایسے جیسے چند مرلے زمین پر بہت سی دیواریں کھڑی کر دی جائیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی دیواریں جن کے ملنے سے چند فٹ زمین ایک اکائی میں ڈھل جاتی ہے لیکن اس کا رشتہ ایک بڑی اکائی سے کٹ جاتا ہے۔ آج کے انسان نے بھی خود کو بڑی اکائی سے کاٹ کر کئی چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ اب ہر آدمی اپنے خانے میں دوسرے سے بے خبر پڑا ہے۔ صرف اس خوف سے کہ اگر اُس نے خانے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اُس کی شناخت ختم ہو جائے گی۔ اپنی اس مختصر شناخت کو بچانے کے لیے وہ ایک بڑی اور ہمہ گیر شناخت سے منہ موڑ رہا ہے۔ تنہائی کے اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان خود کو کُل میں جذب کر دے۔ جذب تو کر دے مگر کیا ایسی صورت میں وہ "کُل" بن کر دوبارہ تنہا نہیں ہو جائے گا۔ یقیناً! لیکن یہ تنہائی اجتماعی نوعیت کی ہوگی۔ جس میں وہ دُکھ اور کرب نہیں ہوگا جو شخصی سطح کی تنہائی میں از خود نمودار ہو جاتا ہے۔ مرگِ انبوہ اگر جشن ہے تو اجتماعی تنہائی بھی ایک جشن ہے جس میں اکلاپے کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔

ضرب + تفریق + تقسیم = لا

رشید احمد گودیجہ

میرا چھوٹا بیٹا سکول سے آیا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ موسم کی شدت نے اس پر اضمحلال طاری کر دیا ہے۔ میرے تجسس نے میری
شفقت کی چادر سے منہ نکالا اور باہر جھانک کر اس کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم کسی شے کو جاننا چاہتے ہیں تو وہ اپنے
اُوپر اسرار کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ چنانچہ میری کوشش کے نتیجے میں مجھے اس بچے کے گرد بھی وہ چادر غیر مرئی طور پر لپٹی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں
براہ راست بچے سے مخاطب ہو کر اس کے اضمحلال کا سبب جاننے کی کوشش کرتا ہوں تو ممکن ہے ناکامی ہو۔ بچے اپنے معاملات میں بڑوں کو اعتماد میں
لینا پسند نہیں کرتے۔ میرا المیہ یہ ہے کہ میں جب بچوں کے پاس جاتا ہوں تو ایک مصنوعی سی سنجیدگی اپنے اُوپر طاری کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے بچے اندر سے میری
سنجیدگی پر ہنستے ہوں، لیکن میں مجبور ہوں کہ جب اپنے بچوں کے سامنے جاؤں تو اپنے بزرگوں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے ایک باپ کی طرح باوقار اور
بارعب سا نظر آؤں۔ باپ کا یہ سخت گیر اور مرعوب کن تصور مجھے اپنے باپ سے وراثت میں ملا ہے۔ اور ممکن ہے اُن کو ان کے باپ کی طرف سے ملا ہو۔ یہ
نہیں کہ مجھے اپنے باپ کی وراثت سے صرف پدرانہ رعب اور سنجیدگی ہی ملی ہے۔ کبھی کبھی اس پدرانہ رعب کی سخت چٹان میں چھوٹی سی دراڑ بھی نمودار ہوتی ہے
اور اس سے ایک محبت کرنے والا، شفقت کرنے والا باپ بھی جھانکنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر میرے بچے میرے قریب آ کر مجھے سمجھنے اور جاننے
کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی دراڑ اس وقت بھی نمودار ہو چکی تھی۔ میرا بیٹا میرے قریب آیا اور کہنے لگا "ماسٹر صاحب نے ریاضی کی پوری مشق حل کرنے کے لیے
دی ہے۔ آپ میری مدد کر دیں تو مشکل آسان ہو جائے گی؟" بچہ اپنی اُداسی کی گیند میرے کورٹ میں پھینک کر خود سبکدوش ہو گیا۔ ہم بڑے بھی تو یہی
کرتے ہیں کہ اپنی مشکلات کسی اور کی گود میں پھینک کر خود کو سبکدوش سمجھنے لگتے ہیں اور بچے بہرصورت بڑوں کے اچھے وارث ہوتے ہیں۔
میرے لیے ریاضی کا سمجھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے خلا میں چھلانگ لگانا یا چاند پر پہلی قدمی کرنا۔ جس طرح میں خلا میں چھلانگ لگانے سے گریزاں ہوں اسی
طرح میں ریاضی سے بھی گریزاں ہوں۔ زمین سے جست لگا کر خلا میں جانے سے تو میں اس [illegible] کرتا ہوں کہ مجھے زمین سے بہت محبت ہے۔ زمین کی مٹی
میرے وجود کو اس طرح چمٹائے ہوئے ہے کہ بالآخر میں مٹی ہی کے سینے سے چپک کر اس کا ایک جزو بننے کو خلا میں جانے کی نسبت ترجیح دیتا ہوں۔ زمین اور
آسمان کی وسعتوں کے درمیان ایک وسیع خلا ہے اور میں ہنستے بستے انسانوں سے نکل کر خلا میں جانا کبھی پسند نہیں کروں گا خواہ اس کی اگلی منزل آسمان کی
نعمتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ ریاضی کی مشق میرے اعصاب کے لیے کبھی خوش آئند ثابت نہیں ہوئی اسی لیے میں ہمیشہ اس مضمون میں کمزور رہا ہوں۔ گنتی اور ضرب
ج، تفریق اور تقسیم کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن اس سے آگے وہ لامکاں آ جاتا ہے جہاں انسان کے بھی پر جلتے ہیں۔ میں ریاضی کو آج تک نہیں سمجھ سکا، یہ

مضمون (اگر اسے مضمون سمجھا جائے تو) ہمیشہ میری سمجھ سے بالاتر رہا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ ہندسوں کے پیچھے بھاگنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ صدیوں پہلے رہنے والا آدمی کتنا خوش نصیب تھا کہ اسے ہندسوں کا علم نہیں آتا تھا۔ دراصل ہندسے انسان کے دُکھ میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ ہندسے انسان کی خواہشات میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ جس طرح ہر صفر ہندسوں میں اضافہ کرتا جاتا ہے اسی طرح ہر ہندسہ انسان کی خواہشات میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔

بات صرف اگر ریاضی کی ہو تو ممکن ہے اس قدر جان لیوا نہ ہو لیکن اس کے ساتھ الجبرا اور جیومیٹری بھی لگے ہوئے ہیں جو شخص ریاضی کا اقرار کرتا ہے اسے الجبرا اور جیومیٹری کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے اور جو ان تینوں کا اقرار کرتا ہے اس کے دلوں کا چین اور دل کا قرار جاتا رہتا ہے مجھے تو اپنی پوری زندگی اور دُنیا کی ہر شے ریاضی، الجبرا اور جیومیٹری کے خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ پوری دُنیا حاصل ضرب، حاصل تقسیم اور جمع تفریق میں منقسم ہے، کچھ لوگ ہمیشہ حاصل ضرب کے چکر میں رہتے ہیں، ان کی زندگی کا ہر لمحہ حاصل ضرب کی طرح ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی پوری زندگی کا حاصل ایک ضرب ہے اور وہ مضروب ہو کر کراہتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر ضرب کا حاصل کسی اور کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ کسان کی ہر ضرب پودوں کو کونپلوں سے باہر نکالتی ہے۔ گندم کا ہر خوشہ ایک دانۂ گندم کی ضرب کا حاصل بن کر اپنے دامن میں اَن گنت دانے لے کر آتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ تقسیم کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تقسیم کا یہ عمل کچھ اس طرح تیزی سے واقع ہو رہا ہے کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل رہا اور وہ تقسیم ہوتے چلے جا رہے ہیں، ایک اچھا بھلا رستا بستا گھرانہ تقسیم ہو کر فرد فرد ہو جاتا ہے، زمین مربعوں سے ایکڑوں اور ایکڑوں سے مرلوں اور مرلوں سے فٹوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے تھے ان کے آنگن ایک ایک ایکڑ پر پھیلے ہوتے تھے اور اس وسیع آنگن میں گائیں بھینسیں بندھی رہتی تھیں، پھر یہ حویلیاں وارثوں میں تقسیم ہوتی گئیں اور تقسیم ہوتے ہوتے سات اور تین مرلہ سکیموں میں ڈھل گئیں۔ تقسیم کے عمل نے مالک کو جنم دیا۔ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے انسان تقسیم ہو گئے۔ یہ اسی تقسیم کا کرشمہ ہے کہ اب انسان کا پھیلاؤ زمین پر کم ہو کر آسمان کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔ ریاضی کا المیہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں اور زمینوں کو تقسیم کرتے کرتے صفر کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کوئی قوم صفر ہونا چاہتی ہے تو وہ تقسیم کا فارمولا اختیار کرتی اور اپنے تشخص سے محروم ہو کر صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتی ہے۔ ویسے کہتے ہیں کہ صفر ریاضی کا سب سے طاقتور ہندسہ ہے بشرطیکہ یہ کسی دوسرے ہندسہ کے دائیں طرف لگا ہوا ہو۔ بائیں طرف کے صفر نہ صرف اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں بلکہ اس ہندسہ کا وقار بھی ختم کر دیتے ہیں جس کے بائیں طرف یہ صفر لگتے ہیں۔

نفع نقصان کے سوال کی طرح یہاں ہر شخص نفع نقصان کی کسوٹی پر زندگی کے جذبوں کو پرکھتا ہے، لوگ اپنے تعلقات کی بنیاد اسی پہ رکھتے ہیں کہ کس شخص کے ساتھ مل بیٹھنے میں نفع اور کس کے ساتھ ملنے میں نقصان ہے چنانچہ دوستی کی بنیاد بھی نفع نقصان پر رکھی جاتی ہے۔ نفع کا لفظ بڑا پُرکشش ہے۔ ہم میں سے ہر شخص نفع کی خاطر کام کر رہا ہے۔ طالب علم اپنے نفع کے حصول کی خاطر محنت کرتے ہیں یہ نفع ڈگری یا سند کی صورت میں انہیں ملتا ہے۔ عبادت گزار عبادت کرتا ہے کیونکہ اس کا نفع بہت پُرکشش ہے جو جنت الفردوس کی صورت میں ملنے والا ہے۔ تاجر پیشہ لوگوں کی تو ساری تگ و دو اسی کے لیے ہے۔ ذخیرہ اندوز ذخیرہ بھی اس لیے کرتے ہیں۔

زندگی بعض اوقات اقلیدسی شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً محبت ہمیشہ تثلیث کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلث کے ضلعوں کی طرح اس کے تینوں اضلاع برابر ہوتے ہیں، محبوب اور محب اس کے اُفقی اضلاع ہیں۔ رقیب عمود ضلع پر ہوتا ہے جب محبت پروان چڑھتی ہے تو کہیں سے رقیب اس کھیل میں داخل ہوتا ہے اور محبت کی مثلث مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا سرمایہ دارانہ نظام بھی زاویہ قائمہ کی طرح ہے اس کے نچلے سرے پر مزدور اور اُوپر کے سرے پر سرمایہ دار بیٹھا نظر آتا ہے۔ زاویہ قائمہ مزدوروں کے سر پر کھڑا ہوتا اور سرمایہ داروں کی صورت میں اُوپر ہی اُوپر اُٹھتا رہتا ہے۔ اس کا وجود نچلے سرے

رہے۔ اگر نچلا سرا اپنی جگہ چھوڑ دے یا ڈگمگا جائے تو سارا زاویہ قائمہ ہی بگڑ جائے۔ زندگی میں کئی لوگ دائرے کی مانند ہوتے ہیں گول مول، جن کی باتوں کا بھی سرا نہیں ملتا۔ کچھ لوگ، اپنے محور کے اندر گھومتے رہتے ہیں اور اسی کو اپنی دنیا سمجھتے ہیں۔ پہیہ صفر کی ترقی یافتہ شکل ہے، جس پر ساری دنیا بھاگتی پھرتی ہے۔

کچھ لوگ الجبرا کے قاعدوں کی سی زندگی گزارتے ہیں، الجبرا میں فرض کیا لا سے بات شروع ہوتی ہے اسی طرح ان کی زندگی فرض کیا سے شروع ہوتی ہے۔ یہی فرض کیا ایسا ہو تو ویسا ہو جائے۔ اسی طرح ان کی پوری زندگی امکانات کے لا میں گزرتی ہے۔ لا بہت بڑا طلسم ہے، جس طرح پرانی داستانوں میں کوئی لفظ کوئی ایک منتر انسان کے پاؤں زمین میں گاڑ دیتا ہے، اسی طرح لا انسان کو زمین میں گاڑ دیتا ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ لا زمین پر گاڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ لا تو وہ منتر ہے جو جادو کے منتر سے پتھر کیے ہوئے انسانوں کو متحرک کرتا ہے، کیونکہ لا کے بعد الجبرا کا اصل سفر شروع ہوتا ہے اور انسان کا اصل سفر بھی لا سے شروع ہوتا ہے اور پھر یہ لا کتابِ زندگی بن جاتا ہے۔ جو لوگ لا کے اس طرف ہیں وہ گویا ابھی ازل میں ہیں لا کے دوسری طرف ابد ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک نادریافت شدہ بھید کی مانند برزخ ہے جہاں روحیں ٹکرا رہی ہیں۔ لا کا لفظ پڑھنے کے بعد جو مسئلہ درپیش ہوتا ہے اسے کھولنا ہر شخص کا مقدر ہے۔ کیونکہ لا کہنے کے بعد پھر اس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ اس کے بعد پھر دوسرا لفظ الا لازماً آتا ہے جو انسان کا ایمان بنتا ہے اس لیے الجبرا کا علم تو پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اگر لا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

میں سوچتا ہوں کہ زندگی کی مشکلات کی طرح ریاضی کی مشکلات سے گھبرا کر میں اس کو برا بھلا کہنے لگتا ہوں۔ اس کم کوش سہل انگار انسان کی مانند جو زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کی بجائے ان سے فرار حاصل کرتا اور کسی قبر پر دھونی رما کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح میرے اندر کا انسان زیادہ ریاضت پسند نہیں کرتا اس لیے ریاضی کو ایک بے کار علم سمجھتا ہے۔ اگر ریاضی کا علم نہ ہوتا تو زندگی بہت بور اور خشک ہوتی۔ شاید یہ دن رات ماہ و سال بھی نہ ہوتے۔ میرا خیال ہے پھر انسانوں کو اپنی زندگی کا حساب بھی نہ آتا۔ یہ ریاضی ہی ہے جس نے انسان کی سوچ کو پیمانہ عطا کیا اور اس پیمانے سے قطرہ قطرہ لفظ ٹپک کر شعر و شاعری اور موسیقی کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ زندگی میں عمر کا حساب ریاضی ہی سکھاتی ہے، ورنہ ہمیں علم ہی نہ ہوتا کہ کب دنیا میں آئے اور کب رخصت ہو گئے۔ ریاضی ہی تاریخ، فلسفہ، نفسیات کی بنیاد ہے کہ سب اعداد و شمار ریاضی ہی کی بدولت ہیں۔

پھر میری سوچ پر ایک ضرب پڑتی ہے کیا ہے ریاضی؟ کیا احسان کیا ہے اس علم نے ہم پر؟ یہی نا کہ اس علم نے انسان کو مشین بنا دیا ہے۔ اسے گھڑی کی سوئیوں میں قید کر دیا ہے۔ پوری کائنات کو دن رات میں تقسیم کر کے زندگی کا حساب نفع و نقصان کی صورت میں لگانا سکھا دیا ہے، انسان جو پہلے ایک اکائی تھا اب فرقوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اگر ریاضی کا علم نہ ہوتا تو انسان کتنا خوش ہوتا، نہ اس کے بازو پر گھڑی ہوتی، نہ اسے صبح سویرے بستر سے اٹھنا پڑتا۔ اگر اٹھتا تو ہوا کے بے پروا جھونکے کی طرح زندگی گزارتا۔ کوئی اسے یہ بتانے والا نہ ہوتا کہ اب اتنے بج گئے ہیں اسے دفتر جانا ہے یا دکان پر پہنچنا ہے۔ جب جی چاہتا سوتا جب جی چاہتا جاگتا۔ وہ عمر کو دنوں مہینوں کے حساب سے نہ ناپتا، اسے اس بات کا غم نہ ہوتا کہ اس قدر عمر گزر گئی ہے اور اس قدر باقی ہے، نہ اسے گزرتے لمحوں کا حساب رکھنا پڑتا نہ آنے والے دنوں کے لیے پریشان ہو [illegible] غار میں بسنے والا انسان کس قدر خوش تھا کیونکہ اس کی زندگی میں ایٹم بم کا دھماکا نہیں تھا۔ وہ جب سو کر اٹھتا ہو گا تو بادِ بہاری اس سے اٹھکھیلیاں کرتی ہو گی، اور وہ بادِ بہاری سے یہ نہ کہتا ہو گا کہ جا راہ لگ مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے سارے دکھ، سارے بوجھ گنتی [illegible] ضرب، حاصل تقسیم اور نفع نقصان کی پیداوار ہیں؟

گرگٹ

علی اختر

شہرت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی ہر کوئی کوشش کرتا ہے۔ اب یہ الگ بات کہ وہ برفیلے اور ناساز گار موسموں کے ہاتھوں راستے ہی میں رہ جائے۔ مگر ہر آدمی یہ کام اپنا فرض سمجھ کر کرتا ہے۔ بعض اوقات تو انسان شہرت سے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے تو شہرت کسی مغرور حسینہ کی طرح سامنے سے کترا کر نکل جاتی ہے۔ اور انسان اپنی جگہ کھڑا اُس کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ مگر بعض دفعہ انسان شہرت سے اپنا پلو بچانے کی کوشش میں ہوتا ہے تو یہ مصافحہ کی بجائے معانقہ پر آمادہ نظر آتی ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان شہرت کے لیے لاکھ جتن کرے مگر ہر بار شہرت کی چوٹی سے پھسل کر گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہے۔ اور کبھی کبھار وہ شہرت کے لیے سوئمبر رچاتا ہے اور شہرت کی دیوی ہزاروں دوسروں کی موجودگی میں اپنی مالا اُس کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور یوں وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر جا بیٹھتا ہے —

کہتے ہیں اہلِ فن اس کے زیادہ متلاشی ہوتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کے لیے صفحات کالے کرتے رہتے ہیں۔ وہ ساری کی ساری زندگی مصرعے گھڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ مگر زندگی انہیں بڑی آسانی سے گھڑ جاتی ہے — کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض لوگوں سے نادانستگی میں کوئی مصرعہ یا فن پارہ قلم بند ہو گیا — تو وہ آناً فاناً شہرت کی مٹی پر جا کر ایسے بیٹھے — کہ پھر انہوں نے نیچے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا — لیکن اکثر یہ دیکھنے میں آیا کہ شہرت کے حصول کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلے گئے — سو جتن کیے گئے۔ اور لمحہ بہ لمحہ رنگ بھی بدلے گئے — مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات نکلا —— سیلنے کہتے ہیں۔ کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو شہرت کا چمچہ منہ میں لے کر اس دُنیا میں آتے ہیں۔ وہ اس قابل ہوں یا نہ ہوں — لیکن وہ کتابوں اور لوگوں کی زبانوں پر بین الاقوامی سچائی بن کر چڑھ جاتے ہیں۔ بلکہ محاورتاً ہم سب کی چھاتیوں پر مونگ دلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر وہ ہزاروں رنگ بدلیں۔ ہزار رُوپ بدل کر ہمیں حیرانی کے کھنڈرات میں لے جائیں۔ لیکن وہ [illegible] سے ہمارے ذہنوں سے چپک کر رہ جاتے ہیں کہ اتارے بھی نہیں اترتے۔ رنگ بدلنے کا محاورہ نہ جانے کس کی ایجاد ہے۔ مگر [illegible] آہنگ اور تصوراتی سج دھج کے ساتھ یہ ہمارے ذہن کے اردگرد کچھ اس طرح اپنے ناجائز تجاوزات بنا کر بیٹھا ہے کہ ہم ہزار نفرت او[illegible] بلڈوزر سے اسے ڈرانے کی کوشش کریں — اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہیں ہوتا — رنگ بدلنے کا ذکر ہو — تو ہمارے ذہن فوراً گرگٹ کی طر[illegible] جاتے ہیں۔ گرگٹ بھی شاید محاوراتی دُنیا کی پیداوار ہے۔ اپنی نظروں سے تو شاید ہی کسی نے اسے دیکھا ہو — مگر محاوروں کی دُنیا میں اس کا [illegible] ہمیشہ ہیرو کا رہا ہے اور ویسے بھی یہ اپنی دُنیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گرگٹ کو ایسی خوبیوں سے نوازا ہے جو کسی دوسرے جانور کے پاس نہیں۔ یہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلنے پر پوری طرح قادر

ہے۔ یہ جس تیزی سے اپنا رنگ بدلتا ہے اتنی تیزی سے تو شاید آسمان بھی رنگ نہیں بدلتا۔ گرگٹ کی ہمہ گیریت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسے سکیورٹی کونسل سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ سکیورٹی کونسل میں تو کچھ لوگوں کو ویٹو کا حق بھی حاصل ہے۔ مگر گرگٹ کے پاس اس قسم کی کوئی ویٹو پاور نہیں ہے اور اسی بات نے اس کی شہرت کو چار چاند بھی لگا دیئے ہیں کہ وہ بلا شرکت غیرے اپنی پالیسی کا خود مالک ہے جسے وہ جب چاہے بدل سکتا ہے۔ اور یوں بھی اس پر کسی سُپر پاور کی پالیسی نہیں چلتی —

ہمارے ایک ملنے والے اس فن کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ لمحہ لمحہ رنگ بدلنے اور ہَوا کی طرف ہر وقت اپنا جھکاؤ رکھنے میں وہ خاصے ماہر ہیں۔ ایک بار میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ اور ہر بازی جیتنے کے لیے لمحہ بہ لمحہ رنگ کیوں بدلتے ہیں۔ آخر اس کا کچھ تو سبب ہوگا۔ تو انہوں نے ہنس کر فرمایا۔

صاحب اس پُر آشوب دَور میں ہر کسی سے کام نکالنے کے لیے کایاں ہونا اوّلین شرط ہے اور اس فن کو ہر کوئی نہیں جانتا — آپ اپنے اِرد گرد نظر دوڑا لیں۔ آپ کو ہر آفس، ہر جگہ اور ہر کونے میں ایک آدھ آدمی ایسا ضرور نظر آئے گا جو اس فن کا ماہر ہوگا — اور اسی سبب وہ دوسروں سے آگے نکلتا ہوا نظر آئے گا — اور آپ کو ہر میدان میں زمین چاٹنے پر مجبور کر دے گا — وہ اپنے باس کی ہاں میں ہاں اور اس کے موڈ کے ساتھ اس طرح بدلے گا کہ لوگ اس طرح نظریں بھی نہیں بدلتے — اس طرح وہ وقت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ترقی کرنے والے ہراول دستے کی اگلی صفوں میں گویا سپہ سالاری کرتا نظر آئے گا۔۔ اسے اپنا رنگ بدلنے کا فن اس قدر آتا ہے کہ اس کی ان حرکتوں سے بے چارہ گرگٹ بھی شرما کے رہ جاتا ہے۔

گرگٹ نے ایک لحاظ سے بڑی درویشانہ زندگی پائی ہے۔ گرگٹ نے انسان کو تصوّف کا ایک بہت بڑا سبق سکھایا ہے۔ گرگٹ تزکیۂ نفس کا بہت بڑا داعی ہے کہ وہ اپنے نفس پر پوری طرح کنٹرول رکھتا ہے۔ انسان تو رنگ بدلتے ہوئے کہیں نہ کہیں پکڑے بھی جاتے ہوں گے۔ مگر گرگٹ جب چاہتا ہے اپنا رنگ بدل لیتا ہے اور اس خوبی سے کہ کوئی جان نہیں پاتا کہ اس نے ایسا کیا ہے۔

شہرت سے جلنا انسان کے خمیر میں رچا بسا ہے اور اسے کسی قیمت پر بھی یہ گوارہ نہیں کہ کوئی اس سے آگے نکل جائے — ویسے کسی کو آگے نکلتا دیکھ کر اس کی ٹانگ کھینچنا بھی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ گرگٹ شہرت میں اُس سے آگے نکل گیا ہے اور کسی طور اس کی ٹانگ بھی نہیں کھینچی جاسکتی تو اس نے حسد کے مارے اپنے ذہن کی بانجھ زمین کو ٹٹول کر گرگٹ کے متبادل ایک اور کردار تخلیق کر لیا۔ یہ گرگٹ کی ٹسٹ ٹیوب بےبی ڈپلومیسی تھی۔

گرگٹ اس لحاظ سے بہت عالی ظرف ہے کہ اس نے انسان کی بات کا بُرا نہیں منایا۔ انسان نے اپنی تمام تر خصلتیں اس سے ادھار لے کر بھی واپس نہیں کیں — اُنہیں اپنے اُوپر پوری طرح منطبق بھی کر لیا، اور اس کی طرح نظر بھی آنے لگا۔ لیکن جب دوسروں نے اُسے گرگٹ کہا تو بُرا مان گیا — لیکن گرگٹ اس لحاظ سے انسان سے کہیں زیادہ عالی ظرف نکلا — ادھر انسان نے اُس کی فطرت کا چولا اپنے بدن پر فٹ کر لیا۔ ادھر گرگٹ نے ٹسٹ ٹیوب بےبی ڈپلومیسی کو بڑی فراخدلی سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں انسان کی کم ظرفی دیکھیے کہ اس نے گرگٹ کی تمام صلاحیتیں نقل کر لیں۔ لیکن اس سے فراخ دلی نہیں چھین سکا۔ انسان آج کل رنگ بدل کر لمحہ بہ لمحہ اپنی زندگی کے احوال تو درست کرتا نظر آتا ہے مگر جونہی آپ اسے گرگٹ کہہ کر پکاریں گے۔ وہ پنجے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ جائے گا — آپ اس کی اس عادت پر اُسے تنگ نظری کا طعنہ دیں تو وہ آپ کی اس بات کو تھوڑی ترمیم کے بعد یہ کہہ کر قبول کرے گا —

" بھئی یہ گرگٹ ۔۔ گرگٹ کیا ہوا۔ بھائی اسے ڈپلومیسی کہتے ہیں، اور ڈپلومیسی تو اقوامِ متحدہ تک میں چلتی ہے ۔۔!"

گرگٹ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ طعنوں کی دنیا میں رہ کر بھی بڑی بہادری اور بلند ہمتی سے زندہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ یقیناً بہادروں کی صف میں بھی شامل ہے۔ اور بہادری کے سب سے بڑے تمغے کا مستحق بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

گرگٹ نے ویسے بھی انسانی طبیعت پائی ہے۔ (اگر میں اس کے الٹ کہوں تو یہ توہینِ انسانیت ہوگی۔ جس کا کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتا) اگر تحقیق کی لیبارٹری میں اس پر ریسرچ کی جاتی یا کوئی سرپھرا تاریخ کے بوسیدہ اوراق کو کھنگالتا، تو وہ ڈارون کی تھیوری کو یہ کہہ کر رد کر سکتا تھا کہ انسان کی ابتدائی شکل بندر سے ملا کر ڈارون نے توہینِ انسانیت کی ہے بلکہ اس نے انسانیت کا مذاق اڑایا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ عادات و خصائل تو گرگٹ سے ملتے جلتے ہیں۔ آباؤ اجداد کا سلسلہ تو عادات و خصائل سے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آکر ڈارون کی تھیوری اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات گرگٹ کے لیے باعثِ فخر بن گئی کہ انسان نہ سہی ۔۔۔ کم از کم وہ تو انسان سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں شرافت اور حیا پن بھی انسان جیسا ہے ۔۔۔ حیا اور شرمیلا پن بھی انسان سے زیادہ اس کی گھٹی میں رچا بسا ہے، گو یہ چیزیں اب انسان میں بھی نہیں رہیں۔ ۔مگر گرگٹ میں تو موجود ہیں۔

گرگٹ کی ایک خوبی مجھے بے انتہا پسند ہے وہ یہ کہ وہ جو کچھ اوپر سے ہے وہی کچھ اندر ۔۔۔ سے بھی ہے۔ اگر اس میں رنگ بدلنے کی خوبی موجود ہے تو وہ عملاً اس کا مظاہرہ بھی کرتا رہتا ہے، گویا وہ جو کچھ نظر آتا ہے وہی کچھ اندر سے بھی ہوتا ہے، جبکہ انسان اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ ظاہر اور باطن میں ایک نہیں ہے، نجانے وہ کس مقام اور کس جگہ پر آکر آپ کے اعتماد کو دھوکہ دے کر اپنا رنگ بدل جائے۔ اس کے علاوہ انسان کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جبکہ گرگٹ کی منکسر المزاجی ملاحظہ ہو، کہ وہ بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی نمائش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو نظرِ غیر کو بھی اپنے تنِ نازک پر برداشت نہیں کر سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ایک روز میں نے گرگٹ سے پوچھا کہ تم اتنے مشہور ہونے کے باوجود کم کم نظر آتے ہو، تو اُس نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں تو تمہارے ارد گرد، زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہوں۔!"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب ۔۔۔!!!"

اُس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" انسان نے جب میری ہر خصلت اور ہر عادت چرا لی ہے تو اُس کے ہوتے ہوئے اب میری کیا ضرورت ہے ۔۔!!"

اُس نے یہ کہا اور بڑی پھرتی سے جھاڑیوں میں جا گھسا ۔۔۔ وہ دن ۔۔۔ اور آج کا دن ۔۔۔ میں نے زندگی کے ہر شعبے میں گرگٹ تو ضرور دیکھے ہیں مگر کسی جھاڑی سے نکلتا ہوا گرگٹ نہیں دیکھ سکا۔

خوف کھانا

قمر اقبال

نہیں جناب یہ کوئی مٹھائی نہیں ہے جسے دیکھتے ہی آپ کے منہ میں پانی بھر آئے۔ یہ تو ایک غیر مرئی شے ہے جو بظاہر نظروں سے اُوجھل ہوتی ہے مگر جس کا احساس اس جہان کے ہر باسی کے ذہن یا دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمہ وقت آرام فرما ہوتا ہے۔

خوف اور انسان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سنگ سنگ چلتے ہیں اور جب تک انسان کا ہاتھ خوف کے ہاتھ میں رہے وہ ہر قسم کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے بچا رہتا ہے مگر جونہی اُس کا ہاتھ خوف کے ہاتھ سے نکلا تو سمجھئے اب بے خوفی کے سبب وہ لمبی لمبی چھلانگیں لگانا شروع کر دے گا اور ایک نہ ایک دن کچھ زیادہ ہی لمبی چھلانگ کسی ایسے مقام پر لگا بیٹھے گا جہاں سے واپس آنا اُس کے بس میں نہیں ہوگا۔

مجھے تو اب خوف کھانے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ میں ہر وقت کسی نہ کسی شے سے خوف کھاتا رہتا ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شے سے خوف کھانے کی اس عادت نے ہر معاملے میں میری رہنمائی کی ہے اور مجھے بغیر سوچے سمجھے اور بے خوف و خطر کھیلے جانے والے کھیلوں سے بچائے رکھا ہے۔

کبھی کبھار ایسا موقع ضرور آجاتا ہے کہ ان چھوٹی موٹی چیزوں کا خوف دب سا جاتا ہے، مگر چونکہ مجھے اپنا انسان ہونا بہت عزیز ہے لہٰذا ایک ہستی ایسی ہے جس کا خوف ہمہ وقت میرے قلب و ذہن پر طاری رہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ اگر یہ خوف جاتا رہا تو میں انسان نہ رہ سکوں گا۔ میں فرعون کے نام، کام اور انجام سے بخوبی واقف ہوں۔

صبح سویرے میں جب سیر کے لیے گھر سے باہر جاتا ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی پُرکیف ہَوا کے جھونکے میرے بدن سے ٹکراتے ہیں تو مجھ پر عجب سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور جب میں قریبی باغ میں پہنچتا ہوں جہاں پرندے چہچہا رہے ہوتے ہیں اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا معطر ہوتی ہے تو عجب سماں ہوتا ہے۔ ایسے میں مکمل طور پر میں قدرت کی اس رنگا رنگی میں کھو جاتا ہوں اور مجھ پر خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اس خود فراموشی کے عالم میں بھی میرا ہاتھ مسلسل کسی شے کو گھمائے جا رہا ہوتا ہے —— جی ہاں یہ میری سیر کی چھڑی ہے۔ مگر اس پُرکیف، دلکش اور خود فراموشی کے عالم میں چھڑی کا کیا کام! چھڑی تو کسی شے کے خوف سے یا کسی ممکنہ خطرے کے باعث رکھی جاتی ہے۔ شاید مجھے کسی کا خوف ہوتا ہے! کتوں کا، کسی مافوق الفطرت شے کا یا کسی اور شے کا ——!!

میرے دن کی ابتدا خوف کھانے سے ہوتی ہے، اور پھر میں دن بھر چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے کاموں سے خوف کھاتا رہتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے، یہ یوں نہ کر دے، وہ یوں نہ کر دے، یہ بھی ناراض نہ ہو اور وہ بھی خوش رہے۔ میں سانپ سے بھی

خوف کھاتا ہوں اور اُسے مارنا چاہتا ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ مَیں لاٹھی ٹوٹ جانے سے بھی خوف کھاتا ہوں۔

میرا دوست "ش" کہتا ہے کہ انسان کو کسی چیز سے خوف نہیں کھانا چاہیئے اور انسان کو بے خوف ہونا چاہیئے جبکہ میرا خیال یہ ہے اور مَیں اکثر دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہر شے سے تھوڑا بہت خوف ضرور کھایا کریں، کبھی کبھی یہ بہت فائدہ پہنچا جاتا ہے۔ حد سے زیادہ بے اچھی نہیں ہوتی۔

اب شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سُورج دن بھر آسمان کے ساتھ رہنے کے بعد جب اُسے داغِ مفارقت دے جاتا ہے تو آسمان اُس کی جُدائی کے غم میں رو رو کر اپنی آنکھیں سُرخ کر لیتا ہے، تو رات اس پر ترس کھاتی ہے اور اپنی گھنگھور گھٹاؤں ایسی سیاہ زلفیں شفق پر بکھیر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میرے خوف میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ رات کی سیاہ زلفوں کی قُربت سے آسمان کی بے قراری کو تو قرار آجاتا ہے اس کی آنکھوں میں تو کیا پورے وجود پر تارے سے چمکنے لگتے ہیں مگر مَیں شاید دن بھر ہر شے سے خوف کھانے کا عادی ہو چُکا ہُوا ہوں۔ لہٰذا رات سے بھی خوف کھانے لگتا ہوں۔ اب مَیں سارے کام کاج چھوڑ کر بستر پر دراز ہو جاتا ہوں اور اپنے نرم گرم ولائتی کمبل کو پوری طرح اوڑھ لیتا ہوں جیسے کوئی بچہ کسی انجانی شے سے ڈر کر اپنی ماں کی گود میں دبک جاتا ہے۔ ویسے کچھ عرصہ قبل مَیں رات سے اتنا خوف نہیں کھایا کرتا تھا مگر اب نجانے کیوں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔

مجھے تو اس سارے جہان میں چار سُو خوف ہی جلوہ فرما دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی یہ رونق، چہل پہل، غم خوشی، قتل و غارت اور دنگا فساد عمل کے پسِ پُشت خوف ہی کی کارفرمائی ہے۔ مزدور کارخانے میں کام پر جُتا ہوا ہے یا آگ برساتے سورج کے نیچے اپنے پسینے سے دھرتی کی آبیاری کر رہا ہے تو صرف بھوک کے خوف سے، سپاہی اپنے خون سے دھرتی کو لالہ زار بناتا ہے تو صرف اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں لُٹ جانے کے خوف سے۔ سڑکوں کی رونق اور بازاروں کی چہل پہل بھی خوف ہی کے دم قدم سے قائم و دائم ہے۔ سڑکوں پر تیز تیز چلتے کلرک اور بازاروں میں بھاگتے دوڑتے خوانچہ بردار سب کسی نہ کسی خوف ہی کے زیرِ اثر رواں دواں ہیں۔ مجھے تو محراب و ممبر سے پانچ وقت بلند ہونے والی اذانوں کے پیچھے بھی خوف ہی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ جو فرشتے دن رات خدا کی اطاعت گزاری میں سرگرداں ہیں اور جہان کے چپّے چپّے پر اُس کے سامنے سر بسجود ہیں اور اس کا ہر حکم بلا چُون و چرا بجا لاتے ہیں میرے خیال میں تو اُنہیں بھی خوف ہی درپیش ہے کیونکہ وہ ابلیس کے انجام سے باخبر ہیں۔

بہرحال کوئی خوف کھائے یا نہ کھائے، کم از کم مَیں تو ہر شے سے خوف کھانے کا عادی ہوں۔ خاص طور پر مستقبل سے! مستقبل تو خوف کا گہوارہ ہے۔ جانے اس کی دبیز چادر میں کیا کیا شے چھُپی ہوئی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ مستقبل کا سارا حُسن اس کے خوابوں میں ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اس کا سارا حُسن اس خوف میں ہے کہ کہیں خواب حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائیں۔

دراصل ہم سب ہر بات اور ہر شے سے تھوڑا بہت خوف ضرور کھاتے ہیں۔ شاید آپ نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا ہو چلیئے کوئی بات نہیں۔ کسی دن بیٹھ کر سوچیئے۔۔۔ اور اگر آپ محسوس کریں کہ آپ کسی شے سے بھی خوف نہیں کھاتے! تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے دل میں زندہ رہنے کی کوئی رمق تک نہیں رہی۔

قاری

خیرالدین انصاری

میں ایک قاری ہوں۔ اخباروں، رسالوں اور کتابوں کا قاری۔ اخباروں کے مطالعہ سے میں جو مسرّت اخذ کرتا ہوں اس کی مثال اس
ئے بچے کی سی ہے جو گہری جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے کنول کے پھولوں کو دیکھ کر کلکاریاں مارنے لگتا ہے اور رسالوں میں شامل مضامین
زنر پڑھ کر میری حالت اس دوشیزہ کی سی ہوتی ہے جس کا محبوب چپکے سے اس کی دراز سیاہ زلفوں میں گلاب کا پھول ٹانک
ہو اور کتابوں کی سطور میں اترتے وقت میں اپنے تئیں اس ماہر غوّاص کی مانند محسوس کرتا ہوں جو گہرے سمندر میں چھلانگ لگا کر اس کی
ک اندر سے ایسا دُرِ نایاب نکال لانے میں کامیاب ہو گیا ہو جس کی آب و تاب کے سامنے دُنیا میں موجود سارے موتی ہیچ ہیں۔

یں ایک باقاعدہ قاری ہوں اس لیے کتب بینی کی تمام تر مشکلات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ اس راہ میں دو چار ہی
ں بلکہ ہزاروں ایسے سخت مقام آتے ہیں جہاں اگر راہرو آنکھیں کھول کر راہ چلنے کا عادی نہیں ہے تو اس کے مارے جانے کا خطرہ
ندم پر لاحق رہتا ہے۔ ویسے اگر آپ اس پُر خار وادی کے مسافر ہیں تو کوئی زیادہ دل ہولا کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے اگر ایک
ادھر کو جانے والی راہ مقتل سے گزر کر جاتی ہے تو دوسری طرف یہی راہ سیدھی جنّت کو بھی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا بھید ہے جس سے صرف
ی واقف ہوں۔ آپ جاننا چاہتے ہیں تو ذرا اپنا کان میرے منہ کے قریب لے آئیں تاکہ میں اس میں راز کی بات ڈال سکوں
لیکہ آپ اس راز کو اپنے تک محدود رکھنے کا یقین دلائیں کیونکہ راز کلی میں بند خوشبو کی طرح ہوتا ہے جسے نادان کلی اپنے آپ
اہر کرنے کے شوق میں پھول بن کر ضائع کر بیٹھتی ہے اور پھر اس متاعِ گم گشتہ کو دوبارہ پا لینے کی تمنا میں پہلے تو غم میں گھل گھل کر اپنا
زرد کرتی ہے۔ پھر سوکھ کر کانٹا بنتی ہے۔ بالآخر کوڑا بن کر خاک کا رزق بن جاتی ہے اور یوں اپنے پیچھے وجود و عدم کی وہ حسرتناک
ستان چھوڑ جاتی ہے جس کی گتھیوں کو سلجھانے میں دُنیا بھر کے سیانے روزِ ازل سے سر دُھنتے چلے آ رہے ہیں۔

یں جب کتاب پڑھ رہا ہوتا ہوں تو میرا انہماک دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں یہ احساس جنم لیتا ہے کہ مصنّف کے الفاظ، فقروں اور
ت سے پورا پورا انصاف کر رہا ہوں۔ وہ نہیں جانتے کہ میں اُس دنیا میں نہیں ہوتا جہاں کتاب کا مصنّف مجھے لے جانا چاہتا ہے —
کتاب کا مصنّف یہ نہیں جانتا کہ اب کتاب اس کی باندی نہیں رہی۔ اب یہ سراسر میرے قبضۂ اختیار میں ہے۔ یہ مجھے وہی شے دینے
ر ہے جو میں اس سے طلب کرتا ہوں۔

غرض فرصت کے ان لمحات میں، میں کتاب نہیں پڑھ رہا ہوتا بلکہ ایک نئی کتاب تصنیف کرنے میں لگا ہوتا ہوں، گو اس وقت میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا اور نہ ہی میز پر صفحہ قرطاس پھیلا ہوا ہوتا ہے جس پر میں اپنے جذبات و خیالات کی لہروں کی تصویریں بنا سکوں لیکن میرے سامنے تخیل کی ایک اتنی طویل و عریض سیمیں چادر پھیلی ہوتی ہے جس پر کون و مکان کی ساری وسعتیں رکھ کر پھر بھی اتنی ساری جگہ بچ جاتی ہے کہ وہاں کتنی ہی کہکشاؤں کو آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ ان قیمتی لمحات کو میں اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا کہ ان کا حق ہے۔ میں تخیل کی اس سیمیں چادر پر اپنی پلکوں کی جھالر سے وہ تحریر رقم کرنے میں لگا رہتا ہوں جو کسی دوسرے کے ذہن میں نہیں آ سکتی۔ اس طرح میں ایک ہی وقت میں کتاب کا قاری بھی ہوتا ہوں اور اس کا مصنف بھی۔ میرے مطالعے میں کسی سیاسی مفکر کی کتاب آتی ہے تو میں اس کے ہر فقرے کو جھٹلا کر اس کی جگہ نیا فقرہ رکھ دیتا ہوں۔ اگر کتاب نقد و نظر کی ہے تو میں مصنف کے خیالات کی پستی کو بلندی میں بدلنے کی کوشش میں لگ جاتا ہوں اور اگر کتاب کا موضوع دو جوان دلوں کی دھڑکنوں پر محیط ہے تو میں کتاب کے صفحات پر سے ہیرو کو مار بھگا کر خود محبت کی پینگ پر ہلکورے لینے لگتا ہوں۔ یہ لمحات مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس لمحے مجھے لگتا ہے جیسے شیکسپیئر نے سارے ڈرامے میرے ہی کردار کو اجاگر کرنے کے لیے لکھے تھے اور فردوسی نے محض میری بہادری کا سکہ بٹھانے کے لیے شاہنامہ میں رستم و سہراب کی داستان رقم کی تھی اور وارث شاہ نے ہیر کے کردار کو محض اسی لیے تخلیق کیا تھا کہ میں دنیا میں ہی لافانی حسن کا نظارہ کر سکوں۔

میں زندگی بھر کے غور و فکر اور کتابوں کے وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ مسافِ زندگی میں حقائق کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کی عادت ڈال لیں پھر دیکھیں کہ آپ پر کیسے کیسے عجیب و غریب اسرار کھلتے ہیں۔ آپ کو ساری کائنات ایک کتاب کی صورت میں نظر آئے گی جس کے بکھرے ہوئے اوراق پر ایسی ایسی بے ربط تحریریں نظر آئیں گی جو تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ایک بے مثال رابطہ رکھنے والی بن جائیں گی۔ دھرتی کا سپاٹ بستہ بھی اپنے اندر کے رازوں کو اگلتا ہوا نظر آئے گا۔ اس پر اُگے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کی شاخوں اور پتوں پر کردگار کی معرفت کے اسباق پڑھنے کو ملیں گے۔ آسمان کی طرف نظر اُٹھے گی تو اس کی نیلگوں وسعتوں میں اِدھر اُدھر تیرتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے آپ کو تشبیہوں اور استعاروں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آئیں گے اور رات کے وقت ستاروں کے ٹیڑھے میڑھے حروف قدرت کے عجیب و غریب اسرار پر سے پردہ اٹھا دیں گے۔ آپ کی نظر سمندر کی طرف اُٹھے گی تو اس کی سطح پر بکھری ہوئی لہروں کی تحریر کو پڑھ کر آپ سمندر کے ساتھ ایک نیا رشتہ استوار کر لیں گے۔

غرض انسان جب صحیح معنوں میں قاری بن جاتا ہے تو دُنیا کی ہر شے ایک کتاب بن کر اُس کے سامنے آ جاتی ہے جس سے اُس کا ذوقِ جستجو بڑھتا ہے۔ پھر اسے کنواں سے چہروں کے عقب میں کتنے ہی الوان و اقسام کی کہانیاں جلوہ ریز دکھائی دینے لگتی ہیں اور حسیناؤں کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی چاندنی میں ایسے وہ منظر دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن تک رسائی ان کتابوں کے مصنفین کی نہیں ہو سکتی۔

میری علم و ادب کی سیاحی میں ساتویں پشت تو نہیں ہے اس لیے اپنے فرمائے ہوئے کو مستند کہہ کر مضامین کے انبار لگا دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں تو قیس کی طرح اپنے گھرانے کا واحد فرد ہوں جسے صحرا کی خاک چھاننے کی بجائے کتابوں کے جنگل میں مسلسل بادیہ پیمائی کرتے رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اب اس دیوانگی نے مجھ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ کتابوں کا قاری ہونا اتنا عبث فعل نہیں ہے جتنا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو تو کتابوں کا مصنف بننے سے زیادہ بہتر ان کا قاری ہونا ہے۔ لیکن یہ وہ دقیق نکتہ ہے جو کسی مشائی یا اشراقی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ بلکہ ہر کارے و ہر مردے کے مصداق اس جدید کے رُخ پر سے وہی قاری

گے گھمٹ اٹھا سکتا ہے جو میری طرح صحیح الذوق ہو۔ کیا آپ نے کبھی کسی ادب پارے کا مطالعہ کرتے وقت اس کی سطور کے حروف کے زاویوں، دائروں، قوسوں اور نقطوں کی زیریں سطح پر اپنے وجود و احساس کی تنویر کو جلوہ فگن ہوتے دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو آج دیکھنے کی کوشش کریں۔ یہی تو وہ شے ہے جو کسی بھی ادب پارے کو آپ کی نگاہوں میں وقیع بناتی ہے ـــــ اس طرح ایک غیر فانی فن پارے کے ادب میں اس کا قاری بھی کسی شہید کی طرح زندہ ہوتا ہے۔ گو کہ آپ کو اس کا احساس نہیں ہے۔

اقبالیات کے موضوع پر جگن ناتھ آزاد کی تصانیف

(۱)

اقبال اور اس کا عہد

چوتھا ایڈیشن

ناشر: ادارۂ انیس اُردو، چوک الہ آباد (یو۔ پی)

پاکستان میں: مکتبۂ قوسین، سرکلر روڈ، لاہور

(۲)

اقبال اور مغربی مفکّرین

اتر پردیش اُردو اکیڈیمی کی طرف سے اوّل انعام پانے والی کتاب

ناشر: مکتبۂ جامعہ لیمٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۶

پاکستان میں: مکتبۂ عالیہ، اُردو بازار، لاہور

(۳)

اقبال کی کہانی

ننھے مُنّے بچوں کے لیے آسان اور دلکش زبان میں اقبال کی مکمل داستانِ حیات

بہار اُردو اکیڈیمی کی طرف سے اوّل انعام پانے والی کتاب

ناشر

ترقّی اُردو بورڈ، ویسٹ بلاک ۸ راما کرشنا پورم، نئی دہلی ۲۲

(۴)

اقبال اور کشمیر

اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب

آل انڈیا اکیڈیمی کی طرف سے اوّل انعام پانے والی کتاب

ناشر

میسرز علی محمد اینڈ سنز، بک سیلرز اینڈ پبلشرز، لال چوک، سری نگر (کشمیر)

ایک فلسفی نہ ہوتے ہوئے

رابرٹ لنڈ
سلیم آغا قزلباش

"کیا تم نے ایپکٹیٹس (EPICTETUS) کا مطالعہ کیا ہے؟"

"نہیں تو"

"ارے! پھر تو تمہیں اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ وہ ٹامی ہے نا! پہلی بار مطالعہ کر رہا ہے اس کا ــــ اور تشویشناک حد تک پُر جوش نظر آرہا ہے۔"

مجھے اس مکالماتی گفتگو کی بھنبھناہٹ ایک ہوٹل کے لاؤنج میں اپنی ساتھ والی میز پر سے سنائی دی۔ لہٰذا میں بڑا مشتاق اور متجسس ہو گیا، کیونکہ میں نے ایپکٹیٹس کو کبھی نہیں پڑھا تھا۔ ہر چند کہ میں نے اُس کی تصانیف کو اکثر و بیشتر کتابوں کی الماری میں سجے ہوئے ضرور دیکھا تھا ــــ اور شاید میں نے اس کا کبھی حوالہ بھی دیا ہو ــــ چنانچہ میں بڑا حیران ہوا کہ بالآخر مجھے ایک ایسی عقل و دانش سے مملو کتاب کا پتہ چل ہی گیا کہ جس کی تلاش میں زمانہ طالب علمی سے ہی میں سرگرداں رہا تھا۔ میں اپنے اس ابتدائی عقیدے سے کبھی دست کش نہیں ہوا ہوں کہ دانائی کہیں نہ کہیں کسی کتاب میں موجود ہے، اُسی آسانی سے جس سے گھونگا ریت میں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔ دانائی حاصل کرنے کا میں اتنا ہی متمنی ہوں جتنے حضرت سلیمانؑ تھے لیکن یہ دانائی لازماً ایسی صورت میں ہو کہ جسے بہ آسانی حاصل کیا جا سکے ــــ ایسی دانائی جسے کسی وبائی مرض کی طرح پکڑا جا سکے۔ میرے پاس فلسفے کی تھکا دینے والی تلاش کے لیے نہ وقت ہے نہ ہمت۔ میری تمنا ہے کہ فلسفی حضرات اپنی اس مشقت طلب تگ و دو کو جاری رکھیں اور انجام کار مجھے اپنی کاوشوں کے ثمار سے بہرہ مند کر دیں، جس طرح میں کسان سے انڈے حاصل کرتا ہوں، پھل اُگانے والے سے سیب لیتا ہوں اور دوا فروش سے ادویات اسی طرح میں فلسفیوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ مجھے چند سکوں کے عوض دانائی سے مالا مال کر دیں گے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے کبھی تو ایمرسن کو پڑھا اور کبھی مارکس اوریلیس کو، اور انہیں پڑھتے ہوئے مجھے اُمید تھی کہ میں ان کا مطالعہ کر کے دانشمند ہو جاؤں گا، لیکن میں دانشمند نہ بن پایا۔ ان کو پڑھنے کے دوران میں ان کے فرمودات سے کُلی اتفاق کرتا تھا، لیکن جب اُن کو پڑھنا ختم کر چکتا تو میں کم و بیش ویسا ہی آدمی بن جاتا جیسا کہ میں ان کو پڑھنے سے قبل تھا ــــ یعنی اُن اشیاء پر نگاہ مرتکز کرنے کے ناقابل کہ جن پر اُن کے خیال کے مطابق مجھے توجہ مرکوز کرنا چاہیئے تھی یا پھر اُن چیزوں کے بارے میں لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتا تھا کہ جن کے سلسلے میں اُن کے نزدیک مجھے غیر جانبدار ہونا چاہیئے تھا۔ بایں ہمہ میرا کتابوں پر سے ایمان نہیں اُٹھا ہے۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ کہیں نہ کہیں ایسے چھپے ہوئے مواد کا وجود ہے جس میں سے دانائی اور کردار کی شکتی کو میں بازوؤں والی ایک آرام دہ کرسی میں بیٹھے ہوئے سگریٹ نوشی کے دوران ہی جذب کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہ

سی طبیعت کی ترنگ کا شاخسانہ ہے کہ میں نے ہوٹل کے لاؤنج میں ہونے والی گفتگو کو سننے کے بعد ایپکٹی ٹس کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اُسے پڑھ کر میں نہایت پُر جوش ہوگیا۔ وہ اس نوع کا فلسفی ہے جسے میں پسند کرتا ہوں جو زندگی کو اس طور پیش نہیں کرتا کہ وہ اپنی بہترین صورت میں محض ایک ایسی دلیل لگے جسے پُرجوش زبان میں بیان کیا گیا ہو، بلکہ دوسری اشیاء کے بیچ رہتے ہوئے وہ اس پہلو پر اظہار خیال کرے کہ آدمی کو روزمرّہ کی زندگی کے معاملات میں کس طرح کا رویّہ اپنانا چاہیئے۔ علاوہ ازیں جو کچھ اُس نے کہا تھا مجھے اس ضمن میں تقریباً اس کی کہی ہوئی ہر بات سے اتفاق ہے۔ اذیّت، موت اور افلاس سے بڑے اعتنائی ——— کافی پسندیدہ شے ہے۔ کسی بھی ایسے معاملے میں جس پر کسی کا بس نہ چلے فکرمند نہ ہونا چاہیئے چاہے یہ عالم کی بربریت ہو یا رسمی زلزلوں کا خوف و خطر ——— اس مجبوری کے سلسلے میں بھی گویا ایپکٹی ٹس اور میں ہم خیال ہیں۔ تاہم جتنی مماثلت ہم دونوں کے خیالات میں نظر آتی ہے، میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ جب میں یہ پڑھتا ہوں کہ ایپکٹی ٹس اپنے خیالات کو قائم رکھنے میں برحق تھا اور میں ہر چند کہ انہیں آزاد کا قائل ہوں لیکن برحق نہیں ہوں۔ میں ان آزاد کو قبول کرنے کے باوجود عملی طور پر انہیں ایک لمحے کے لیے بھی بروئے کار لانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں موت، اذیّت اور افلاس سچ مچ کے عضویت ہیں سوائے اس ایک لمحے کے جب میں آرام کرسی میں لیٹے لیٹے کسی فلسفی کی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں۔ اس دوران اگر فلسفہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے زلزلہ آجائے تو ممکن ہے کہ میں فلسفہ کی کتاب کو پڑھنا بھول جاؤں اور صرف زلزلہ پر دھیان دوں اور لرزہ براندام دیواروں اور چمنیوں سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچوں اور یہ سب کچھ اس بات کے باوجود ہوگا کہ میں سقراط، پلنی اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا نہایت پکا ثناخواں ہوں۔ مانا کہ میں کرسی نشین فلسفی کی حیثیت سے اپنی جگہ مضبوط ہوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ بحران کے لمحے میں روح اور جسم دونوں ناتواں ثابت ہوتے ہیں۔

میں زندگی کی ادنیٰ چیزوں کے معاملہ میں بھی ایپکٹی ٹس مکتبِ فکر کے ایک فلسفی کی طرح خود کو تشفی نہیں دے سکا ہوں۔ تاہم مثال کے طور پر جب وہ اس بات کی نصیحت کرتا ہے کہ ہمیں کس طرح دیوتاؤں کے آگے بھینٹ چڑھانی چاہیئے حتیٰ کہ دوپہر کا کھانا چُننے کے دورانیہ کی غیر تسلی بخش کارکردگی پر بھی ہمیں انتہائی حد تک صبر و تحمل سے کام لینے کی ضرورت ہے تو یوں لگتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ سب کچھ کہنے کا مطلب ایک روحانی رویّے کو اپنانے کے مترادف ہے لیکن جس کو شرفِ قبولیت بخشنا میری فطرت کے منافی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب آپ کو گرم پانی کی حاجت ہو اور نوکر آپ کے حکم پر کان نہ دھرے یا اگر دھرے بھی تو یوں کہ آپ کو نیم گرم پانی لا دے۔ یا اگر وہ گھر ہی سے غائب ہو تو آپ کو غصّے سے اجتناب کرنا چاہیئے اور چیخ نہیں پڑنا چاہیئے، کیا یہ بات دیوتاؤں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ کن پر حکمرانی کرتے ہیں ——— وہ جو آپ کے خویش و اقارب ہیں، فطری طور پر آپ کے بھائی بند ہیں اور یہ کہ وہ زیوس کے جگر گوشے ہیں۔ یہ سب حرف بہ حرف بجا ہے اور مجھے ایسا آدمی بننے میں بڑی مسرّت محسوس ہوتی جو کسی ریستوران میں بیٹھ کر بڑی بُردباری اور فلسفیانہ انداز سے مُسکرا سکے جب کہ بیرا تمام غلط چیزیں لے آئے یا سرے سے کچھ لانا ہی بھول جائے۔ لیکن صبر آزما حد تک انتظار کرنا مجھے مشتعل کر دیتا ہے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں کہ مجھے مشروبات کی فہرست تین بار طلب کرنی پڑے۔ میں آگ بگولا ہو جاتا ہوں جب پون گھنٹے کی تاخیر کے بعد مجھے مطلع کیا جاتا ہے کہ سیلری؎ CELERY ختم ہوگئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں ایسے موقعوں پر کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کرتا، (مجھ میں ایسا کر گزرنے کا حوصلہ ہی کب ہے)۔ میں لعن طعن کا اتنا ہی قلیل مقدار میں استعمال کرتا ہوں جتنا کہ ایک فلسفی کرتا ہے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ میرے اندر کی ہذیان بکنے والی روح میرے چہرے کے نقوش میں خود کو لاناً اجاگر کرتی ہے۔ واقعی میں خود کو یوں بمانے کا سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ خدمت گار

؎ PLANT WITH EDIBLE CRISP STALKS.

میرا رشتہ دار ہے، یا یہ کہ وہ زیوس کی اولاد ہے علاوہ ازیں اگر وہ ایسا ہی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ زیوس کی یہ اولاد خدمت گاری کے معاملے میں اتنی نااہل ہو۔ ایپکٹیٹس نے کبھی ریستوران میں کھانا تناول نہیں کیا تھا ـــــ پھر بھی اس بات کا امکان ہے کہ اگر وہاں اس کا صبر و تحمل اس کے کام آ جاتا تو پھر مجھ میں اور ایپکٹیٹس میں کتنا بُعد القطبین ہوتا؟ اگر مَیں اتنے حقیر معاملات میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے اس کے شانت رویے کا تتبع نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں یہ کہاں ممکن ہے کہ مَیں زلزلوں اور ظالموں کی موجودگی میں ایک فلاسفر کا رول ادا کر سکوں؟

ایک اور مقام پر جب ایپکٹیٹس مال و متاع کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں ان سے بے نیاز رہنے کی تلقین کرتا ہے تو گویا ہمیں اُن کے چوری ہو جانے پر بھی قطعاً معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ اصولاً مجھے اس سے اتفاق ہے، تاہم مَیں عملی طور پر اس کی اس بات کو تسلیم کرنے سے معذور ہوں۔ اس سے زیادہ حتمی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ایسا شخص جس کی مسرت کا دارو مدار محض اس کے مال و متاع پر ہو خوش و خرم نہیں رہ سکتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ایک دانا آدمی قلیل روزینے پر بھی ہنسی خوشی گزر بسر کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایپکٹیٹس کے مطابق یا میرے نقطہ نظر سے شادمانی کو زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ لیکن کم از کم ایپکٹیٹس ثابت قدم رہنے والے ایک آئیڈیل پر بھروسہ تو کرتا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ہم اسے حاصل کر لیں گے اگر ہم مادی اشیاء پر اتنی کم توجہ صرف کرنے لگیں کہ یہ ہمارے لیے اس حد تک کوئی مسئلہ ہی نہ رہیں کہ کوئی ان کو چُرا لے جاتا ہے یا نہیں۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ اپنے لباس کی تعریف کرنا چھوڑ دو اور تم دیکھو گے کہ تمہیں اس شخص پر غصّہ ہی نہیں آئے گا جو ان کو چرانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ نیز وہ چور کے سلسلے میں مائل بہ ترغیب مسلسل فکر مندی کا اظہار اس پیرائے میں کرتا ہے:

"وہ اس بات سے نابلد ہے کہ آدمی کی اصل نیکی کن باتوں پر مشتمل ہوتی ہے، تاہم اس کا گمان ہے کہ وہ عمدہ لباس کے حصول پر مشتمل ہوتی ہے، بالکل اُسی قسم کی خوش فہمی کہ جس سے آپ خود بھی لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔"

تب ایسی صورت میں کیا وہ اگر اُنہیں اڑا نہیں لے جائے گا؟ ہاں منطقی حوالے سے میرا بھی یہی اندازہ ہے کہ اُسے یہی کرنا چاہیئے اور اس کے باوجود مَیں اُس لمحے ایسا نہیں سوچ سکتا کہ جس وقت پتہ چلتا ہے کہ دعوت میں مدعو کوئی مہمان میرا نیا نویلا سرپوش اڑا لے گیا ہے اور اپنا پرانا والا سرپوش اس کی جگہ چھوڑ گیا ہے۔ اس وقت خود سے یہ بات کہتے ہوئے مجھے تسکین نہیں پہنچتی کہ:

"وہ نہیں جانتا کہ آدمی کی اصل نیکی کن باتوں پر منحصر ہوتی ہے بلکہ اُسے گمان ہے کہ یہ چیز میرا سرپوش حاصل کر لینے میں مضمر ہے۔"

نہ مجھے خود اپنے ہی گھر پر ہونے والی دعوت میں مدعو کسی مہمان سے اس قسم کی صورتِ حال کے پیش آنے پر ایسے ہمدردانہ فلسفہ پر مبنی اظہار کی جرأت کرنے کا سوچنا ہی چاہیئے۔ نئے نویلے سرپوش کو یوں کھو دینا نہایت تکلیف دہ ہے بلکہ کچھ بھی گنوا بیٹھنا باعثِ آزار ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ اس کی چیز کو جان بوجھ کر اڑا لیا گیا ہے، مَیں محسوس کرتا ہوں کہ مَیں ایپکٹیٹس کی پیروی کر سکتا تھا، اگر مَیں ایک ایسی دُنیا میں زندگی بسر کرتا جہاں کچھ وقوع پذیر نہ ہوتا، لیکن ایک ایسی دُنیا میں جہاں اشیاء نقصان، چوری چکاری یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے تلف ہو جاتی ہیں اور جہاں بدمزہ کمہنے، بُرے خدمت گاروں کے ذریعے بیشتر طعام خانوں میں چُنے جاتے ہیں اور جہاں دیگر ہزاروں ناموافق چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں تو ایسی صورت میں ایک عام آدمی کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ چہل قدمی والے جوتے پہن کر کوہ ہمالیہ کو سر کرنے کے لیے روانہ ہو جائے نہ کہ تمام عرصہ ایک فلسفی کی طرح زندگی بسر کرے۔

تاہم اس کے باوجود ہم میں سے بیشتر یہ یقین کیے بنا نہیں رہ سکتے کہ فلسفی حضرات حق بجانب تھے ـــــ حق بجانب تھے جب وہ اپنے تمام اختلافات کے باوجود اس بات کا دعویٰ کرتے کہ بہت سی چیزیں جن کے متعلق ہم سر کھپاتے ہیں قطعاً اس لائق نہیں کہ ان کے متعلق تردّد کیا جائے۔

... ہے اپنی حماقت پر یقین سے آنا نسبتاً سہل ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اسے سچ نہ مانے تو وہ یقیناً دُنیا کا سب سے بڑا احمق ہوگا۔ کم و بیش سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ سقراط اور ایپکٹی ٹس جیسے لوگ خارجی اشیا سے بے اعتنائی برتنے کے سلسلے میں حق بجانب تھے، وہ لوگ بھی جو دس ہزار ڈالر سالانہ کما رہے ہیں اور مزید کمائی کے لیے کام میں جُتے ہوئے ہیں اس بات کو تسلیم کریں گے، تاہم اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم سے زیادہ تر لوگ چونک اٹھیں گے اگر ہمارے دوستوں میں سے کوئی ایپکٹی ٹس کے فلسفہ کی پیروی کرتے ہوئے اس پر پوری طرح کاربند ہو جائے۔ وہ شے جسے ہم ایپکٹی ٹس کے ہاں دانائی متصور کرتے ہیں اُسے ایک واقف کار کے ہاں پاگل پن قرار دیں گے یا پھر شاید ایک واقف کار کے ہاں نہیں بلکہ کم از کم ایک قریبی رشتہ دار کے ہاں ضرور قرار دیں گے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر مَیں دولت، آسائش اور دیگر خارجی اشیاء کے سلسلے میں اتنا ہی لاتعلق ہو جاتا جیسے ایپکٹی ٹس تھا اور اسی کے نقوشِ پا پر چلتے ہوئے جائیداد اور نقب زنوں کے متعلق مُسکرا مُسکرا کر دلیل بازی سے کام لیتا تو ایسی صورت میں میرے متعلقات اور بھی زیادہ پریشان کُن ہو جاتے بہ نسبت اس بات کے ــــ کہ مَیں بہت زیادہ مادی فلسفے کا حامل ایک کامیاب نوعیت کا کمپنی کو بڑھاوا دینے والا شخص بن جاتا۔ مثال کے طور پر ایپکٹی ٹس کی اس چور اُچکّے کے بارے میں درجِ ذیل دلیل پر توجّہ فرمائیے جس نے اس کے لوہے کا شمع دان چُرا لیا تھا۔

"اُس نے خطیر رقم صرف کرکے ایک شمعدان خریدا تھا، اس ایک شمعدان کے لیے وہ ایک چور بنا، اس ایک شمعدان کی خاطر وہ بے ایمان ہوگیا، اس ایک شمعدان کی بنا پر وہ بدکار کہلایا۔ اس میں کیا یہی چیز اُسے سُود مند نظر آئی؟"

دلیل بڑی معقول ہے تاہم نہ تو انفرادی طور پر اور نہ ہی اجتماعی حوالے سے ہم جائیداد کی اس تکذیب کو قبول کرتے ہیں۔ کچھ اللہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لیکن بالآخر کار میں وہ بھی اپنے دوست احباب کے لیے نہایت پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ جب دُنیا عام طور سے مسرور اور پُرسکون ہو تو ہم اس قولِ متناقض پر ایمان لے آتے ہیں کہ فلسفی حضرات دانا لوگ تھے، جب کہ اُن کا تتبّع کرنا حماقت ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جہاں فلسفی قابلِ مطالعہ ہیں وہاں خارجی اشیا قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم دانائی سے بطور ایک "فقرہ" لطف اندوز ہوں ــــ اسٹیج پر ہونے والا ایک ایسا پُرفن منظر کہ جس پر یلغار کرنے کی کوشش کرنا ناظرین کے لیے کارِ دارد ہے! کیا یونانی اور رومی مختلف قسم کی مٹی سے بنائے گئے تھے! کیا سقراط اور ایپکٹی ٹس کے ثنا خوانوں نے واقعی فلسفی بن جانے کی سعی کی تھی یا کیا وہ ہماری طرح دانائی کے حصول کے سلسلے میں پُرامید تھے؟ عملی طور پر نہیں بلکہ اس امرت دھارے کی مدد سے جو ان سے زیادہ عقل مند آدمیوں نے مہیا کیا تھا! بغیر کسی کاوش کے دانش مند بن بیٹھنا مثلاً کسی آواز کو سُن کر یا کسی کتاب کو پڑھ کر، ایک وقت سب سے زیادہ ہیجان انگیز اور سب سے زیادہ تسکین بخش خوابوں میں سے ایک خواب تھا اور ایسے ہی ایک خواب میں میرا ایپکٹی ٹس سے ہوا اور دیکھو کہ وہ تو محض ایک خواب تھا۔

انشائیہ کیوں اور کیسے؟

اکبر حمیدی

اگر سوال یہ ہو کہ انشائیہ کیوں؟ تو میرا جواب ہوگا انشائیہ کیوں نہیں!

ویسے میرا خیال ہے کہ "کیوں" کا لفظ وہ پہلا لفظ ہے جسے انسان نے سنِ شعور کو پہنچتے ہی زبان سے ادا کیا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو میں اسے انسان کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ اس نے "کیوں" کے لفظ سے نہ صرف اپنے شعور کا اعلان کیا بلکہ اپنی اس عظمت اور احساسِ برتری کا بھی اعلان کیا جو "کیوں" کے لفظ میں پوشیدہ ہے اور جو "کیسے" کے لفظ میں نہیں۔ "کیوں" میں مسترد کرنے والی بے پناہ قوت کا اظہار ہے جبکہ کیسے میں محض استفسار جھلکتا ہے۔ میرا خیال ہے جب بھی کوئی نئی ہیئت انسان کو دکھائی دیتی ہے وہ کیوں کے ذریعے اس کا جواز بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے منظر، پس منظر اور پیش منظر میں بھی جھانکتا ہے اور پھر اسے قبول یا مسترد کرتا ہے۔ ادب میں بھی یہی صورت حال ہر دور میں پیش آتی ہے اور میرے خیال میں یہ ایک مثبت اور فعال صورتِ حال ہے۔ ادب میں جب بھی کوئی صنف آغاز ہوتی ہے، کوئی تحریک چلی ہے، کوئی نیا خیال، کوئی نئی صورت، نیا تجربہ پیش آیا ہے "کیوں" کا لفظ ابھر کر پھر سے سامنے آگیا ہے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنا بے حد اہم اور ضروری ہے، ویسے ہی جیسے کبھی آزاد نظم کیوں؟ علامتی و تجریدی کہانی کیوں؟ جیسے سوالات اُٹھائے گئے تھے۔

بات یہ ہے کہ ہمارے ادب کی کہانی ہمارے سماج کی کہانی ہے! ایک وقت تھا جب ہمارا سماج پنگھوڑے میں لیٹا خواب گوں آنکھوں سے چاند کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا تھا۔ جب وہ روتا تھا تو رونے کا باعث بتا نہیں پاتا تھا، ہنستا تھا تو ہنسنے کا سبب بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ہمارا ادب بھی ایسا ہی تھا۔ وہ روتا بھی تھا ہنستا بھی تھا مگر رونے ہنسنے کے سرچشموں سے یا تو واقف نہیں تھا یا اسے بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا، ہماری ابتدائی شاعری کے نمونے میرے بیان کی گواہی دیں گے۔ پھر جب سماج غوں غاں سے آگے بڑھا تو دادی اماں کی آغوش میں جا چھپا۔ تب اُس کی بیدار ہوتی ہوئی حسیات کو دادی اماں کی کہانیوں نے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کی، یہ جنّوں پریوں دیووں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے قصوں کا زمانہ ہے۔ پھر جب نوجوانی کا خون لہریں لینے لگا تو شاعری خصوصیت سے غزل اور مثنوی نے دھومیں مچا دیں، مذہب کے حوالے سے مقدس انسانی کردار ناٹک کے ذریعے ادب میں رواج پائے اسی طرح سماج پر مسلسل زوال، کم علمی اور غیر ملکی تسلط نے ایک طویل عرصے تک ادب کو علمی اور سیاسی شعور سے محروم رکھا۔

نئے خیالوں، نئے جذبوں، نئے تجربوں اور عصری علوم کو ادبی آہنگ میں لانے کے لیے جہاں مروجہ اصناف میں ہیئت کی تبدیلیاں ہوئیں، وہاں انشائیہ جیسی نئی اصناف کا آغاز بھی ہوا۔ یہ بات نہ صرف نئی اصناف کے پھلنے پھولنے کے لیے بھی ضروری تھی بلکہ ان حقائق سے ہمیں تخلیق کاروں کی تخلیقی سچائیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے!

شاعری کے ذریعے سے ہمارے سماج نے اپنے شعری آہنگ کا اظہار کیا۔ کہانی کے وسیلے سے اُس نے اپنے تجربوں اور وقوعوں کا قلم بند کیا۔ ڈرامے کے ذریعے اُس نے اپنے مزاج کے ڈرامائی عنصر کو ظاہر کیا، غزل نے جگر لخت لخت کا نام پایا، نظم نے اُس کے ذہنی فکری تسلسل کا ثبوت فراہم کیا۔ سفرنامے اس کے شوقِ سیاحت کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حمد و نعت، مرثیہ و قصیدہ نے اس کے فطری رجحانات اور ہنگامی ضرورتوں کو تسکین بخشی۔ یہی حال باقی چھوٹی موٹی اصناف کا ہے!

ہاں اگر کسی چیز کا اظہار نہیں ہو رہا تھا تو وہ ہمارے سماج کے انٹیلکٹ کا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت تک ہمارے سماج کی ذہنی سطح یا علمی سطح اس بڑے معیار تک نہیں پہنچتی تھی جہاں اس کا انٹیلکٹ اظہار کی ضرورت محسوس کرتا کیونکہ یہ انسانی مزاج کا ہی حصہ ہے کہ جب بھی اُس کی کسی حِس نے اظہار کی ضرورت محسوس کی ہے اُس نے اظہار کے راستے تلاش کر لیے ہیں، رائج اصناف میں سب اور نئی اصناف کے رواج سب سماجی اظہار کے تقاضے تھے جو اپنے اپنے وقت پر پورے ہوئے۔ گزشتہ نصف صدی کے علوم و فنون نے ہمارے سماج کی ذہنی سطح کو جس تیزی سے سربلند کیا ہے انشائیہ اس کے انٹیلکٹ کے اظہار کا نام ہے۔ یہی اس کی ضرورت ہے یہی اس کا جواز اور یہی انشائیہ کیوں کا جواب ہے! آج کا عہد ہمارے سماج کے انٹیلکٹ کا عہد ہے اس لیے مجھے کہنے دیں کہ یہ انشائیے کا عہد ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ اس انٹیلکٹ کا اظہار نظم، غزل، فکشن اور ڈراما تک میں ہو رہا ہے مگر انٹیلکٹ ان میں سے کسی صنف کا بنیادی عنصر یا پہچان نہیں ہے، انشائیہ ہی ایک ایسی صنفِ ادب ہے جو آج کے انٹیلکٹ کے اظہار کی خاطر معرضِ وجود میں آئی ہے!— انٹیلکٹ سے میری مراد وہ غیر معمولی ذہانت ہے جو چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھتی ہے۔ ایسے نئے زاویے سے دیکھتی ہے جس سے کسی خیال یا پرانے خیال کا نیا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے، انشائیہ کی بنیاد اور پہچان اس کا نیا خیال ہے، نیا تجربہ ہے، نیا مشاہدہ ہے، نیا جذبہ ہے، نئی کیفیت ہے۔ یہ ساری باتیں دراصل نئے خیال ہی کی ضمن میں آتی ہیں، اب یہ تخلیق کار کا کمال ہے کہ وہ اس نئے خیال کو کس طرح پیش کرتا ہے؟ جتنے نئے، دلکش، مؤثر اور بلند سطحی انداز میں وہ اپنی بات کہے گا اتنا ہی بڑا انشائیہ نگار بن کر سامنے آئے گا۔

انشائیے کے بارے میں میرے کچھ ذاتی خیالات ہیں جن کا اظہار اس موقع پر ضروری ہے کیونکہ یہ بھی انشائیہ کیوں کے جواب میں ہیں،

انشائیہ کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں پرتیں نہیں کھولی جاتیں بلکہ اس میں موضوع کے مختلف پہلو پیش کیے جاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ محض کسی موضوع کے چند پہلو گِنوا دینا انٹیلکٹ کا اظہار نہیں ہے، انشائیہ نگار کا منصب تو یہ ہے کہ وہ آئس برگ کے اس بڑے حصے کی ہمیں سیر کرائے جو ہمیشہ پانی میں ڈوبا رہتا ہے اور اس طرح ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے، گویا انشائیہ نگار موجود کو دجود میں لاتا ہے، ایک ایسے موجود کو جو موضوع کی پرتوں کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں پوشیدہ ہے یا خود انشائیہ نگار کے انٹیلکٹ کا حصہ ہے، میرے خیال میں انشائیہ سطح پر پھیلتا یا بکھرتا کم ہے بلندی کی طرف جست اور گہرائی میں غوطہ زیادہ لگاتا ہے!!

انشائیہ کو لوز سیلی آف مائینڈ یا آزاد ترنگ کے نام بھی دیئے گئے ہیں، اس اندازِ فکر کے نتیجے میں انشائیے کو ایک غیر سنجیدہ بلکہ غیر معقول صنفِ ادب سمجھ لیا گیا، یہ بھی کہا گیا کہ انشائیہ زندگی کے پُر مسرت لمحوں کی پیداوار ہے یا انسان کے داخل کی محض نشاطیہ کیفیتوں کو

پیش کرتا ہے جس کے نتیجے میں انشائیہ کو ایک غیر متوازن صنف کہہ کر نظر انداز کرنے کا رجحان پیدا ہونے لگا ، اس طرح ابتدائی دور میں انشائیہ کے مضحکہ خیز عنوانات نے بھی انشائیے کو ہدفِ مذاق بنایا ، میں سمجھتا ہوں کہ دوسری اصناف کی طرح انشائیہ بھی زندگی کی تمام نشاطیہ اور حزنیہ کیفیتوں کا آئینہ دار ہے اور اسے کسی ایک کیفیت یا چند موضوعات تک محدود کرنا ممکن نہیں ۔ گزشتہ ربع صدی میں انشائیہ نے جس تیزی سے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے اور مقبولیت کی منزلیں طے کی ہیں ، اس کے پیشِ نظر اسے مستقبل کی بڑی اور سب سے بڑی نثری صنف ادب کہنا چاہیئے ۔ انشائیہ اس نوجوانی کے عالم میں بھی بہت سی پرانی اور ترقی یافتہ نثری اصناف سے آگے نکل گیا ہے ۔ خصوصیت سے نئی نسل نے اس صنف کو کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ انشائیہ نے خیال کی تازگی ، اندازِ نظر کے نئے پن اور اسلوبِ بیان کی بلندی مگر غیر پیچیدگی کے باعث نئی نسل کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا ہے !

انشائیہ کا وجود تو ادب کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ہے ۔ آج کے زمانے میں معقولات اور مسلمات نے ہر شعبۂ حیات میں کلیشے بنا دیئے ہیں ، انشائیہ مسلمات ، معقولات اور روایات کی شکست اور آزاد خیالی کے احیا کی خاطر معرضِ وجود میں آیا ہے ، دوسری اصنافِ ادب میں تقریر کی لذت اس بات میں ہے کہ تخلیق کار ہمارے دل کی بات کرے اور ہم سُن کر یہ محسوس کریں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا لیکن آنکہ در گفتار فخر تُست آں ننگِ منست کے مصداق انشائیہ میں قاری کے دل کی بات کہنا انشائیہ کو دوسرے درجے کا بنا دیتا ہے ۔

چنانچہ میں سمجھتا ہوں آج کے فکری جمود کے عہد میں انشائیہ نئی نسل کو غور و فکر کے نئے راستے دکھائے گا اور نئی نسل کے انٹیلکٹ کی ذہنی سطح کو مزید بلند کرے گا ۔

آج کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ، مہذب اور نئے دور کا انسان اپنے سے باہر ہی نہیں اپنے اندر بھی ایک زندگی بسر کر رہا ہے ۔ وہ فکری سطح پر بھی زندگی کر رہا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آج کل کے انسان کی اصل زندگی تو وہ ہے جو وہ فکری سطح پر بسر کر رہا ہے ، بعض اوقات تو وہ خارجی زندگی کا تحفظ بھی اپنے فکر و فلسفہ کے ذریعے کرتا ہے ، میں سمجھتا ہوں اس فکری زندگی کی بقا کے لیے انشائیہ آج کے دور کی ضرورت ہے !

انشائیے کے بارے میں اگرچہ مضامین کی صورت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی بہت کم کتابیں سامنے آئی ہیں اس لیے ابھی تک وہ گرد باقی ہے جو ابتدا میں ہر صنفِ ادب پر پڑی ملتی ہے اب بھی جونہی انشائیے کا خیال آتا ہے عام بلکہ خاص قاری کے ذہن میں بھی کچھ سوالات اُبھرتے ہیں ، مثلاً انشائیہ کیا ہے ؟ اس کا آغاز کب ہوا ؟ انشائیے میں اور ایک عام مضمون میں کیا فرق ہے ؟ کیا انشائیہ کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر لکھا جاتا ہے اور اس کا اپنے عصر سے اور اس کے مسائل سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا ؟ کیا یہ غیر سنجیدہ گفتگو کا نام ہے ؟ آج کا انشائیہ اُردو ادب میں کیا اضافہ کر رہا ہے ؟ وغیرہ

انشائیے کے ناقدین کے طور پر یوں تو بے شمار نام سامنے آئے ہیں جنہوں نے دو ایک مضامین لکھ کر بھی انشائی تنقید میں اپنا حصّہ ڈال دیا مگر جن حضرات نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں ان میں ڈاکٹر وحید قریشی (اُردو کا بہترین انشائی ادب) مشکور حسین یاد (ممکناتِ انشائیہ) ڈاکٹر سلیم اختر (انشائیہ کی بنیاد) اور ڈاکٹر انور سدید (انشائیہ اُردو ادب میں) کے نام شامل ہیں ۔ مضامین لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا ، مشتاق قمر ، محمد ارشاد ، عرش صدیقی ، غلام جیلانی اصغر ، نظیر صدیقی ، احمد جمال پاشا ، ڈاکٹر سید محمد حسنین ، سجاد نقوی ، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ڈاکٹر جاوید وششت ، اختر اورینوی ، رشید امجد ، جمیل آذر ، مرزا حامد بیگ ، انور سدید ، حامد برگی ، سلیم آغا اور بہت سے لوگوں کے نام شامل ہیں ——
بشیر سیفی نے انشائیے پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مگر ابھی یہ مقالہ کتابی شکل میں سامنے نہیں آیا ، اس کے کچھ حصے اوراق ، ماہِ نو

وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ انشائیے کی بحث میں ڈاکٹر وزیر آغا کا حصّہ خاصا نمایاں ہے ایک تو اس لیے کہ انشائیے کا جو تصوّر ڈاکٹر وزیر آغا نے دیا اور پھر اپنے موقف کی حمایت میں جو مسلسل مضامین لکھے وہ سب سے زیادہ زیرِ بحث آئے، یوں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے کی بحث کو جاری رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں ذاتی طور پر بھی اور اپنے رسالے "اوراق" کے ذریعے بھی نمایاں حصّہ لیا۔

یوں تو انشائیے کی تعریف میں انگریزی اور اُردو میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اگر سب کو یہاں پیش کر دیا جائے تو ہماری گفتگو کسی اور طرف چل نکلے گی۔ ضمناً یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ابھی تک بہت سی اصنافِ ادب بلکہ خود ادب کی تعریف پر تمام ناقدین کا اتفاق رائے نہیں ہو سکا مگر وہ اصناف بھی لکھی جا رہی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں، اور تو اور غزل جیسی بڑی بلکہ سب سے بڑی اور سب سے مقبول صنف کی تعریف اور معیاروں پر ابھی تک اختلاف رائے چلا آ رہا ہے۔ سو اگر انشائیے کی تعریف پر اختلاف رائے چلا آ رہا ہے تو یہ ایک معمولی اور فطری بات ہے اس سے صنفِ انشائیہ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اب تک جو تعریف سب سے زیادہ قابلِ قبول ثابت ہوئی اور جس کو پیشِ نظر رکھ کر نیا انشائیہ لکھا جا رہا ہے وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پیش کردہ ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"

انشائیہ کا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسے کس طرح تاریخی، تنقیدی، اصلاحی، فلسفیانہ، سائنسی مضامین سے الگ کیا جائے؟ یہ مسئلہ پیش آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک انشائیے کو انگریزی "ایسے" کے متبادل کے طور پر پیش کرتے چلے آ رہے ہیں چونکہ انگریزی میں ہر قسم کے مضامین کو "ایسے" کہا جاتا ہے اس لیے انشائیہ کے بارے میں ایک سطح پر یہ ابہام ابھی تک چلا آ رہا ہے۔

ہمارے بعض ناقدین نے انگریزی کے "پرسنل ایسے" یا "لائٹ ایسے" یا دونوں کی امتزاجی کیفیت پر مشتمل تحریر کو انشائیہ باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انشائیہ میں واحد متکلم یعنی "مَیں" کے صیغے میں بات کی جائے تو وہ انشائیے کا اسلوب ہوگا۔ میرے نزدیک واحد متکلم کے صیغے میں بات کرنا کافی نہیں بلکہ انشائیے میں ذاتی خیالات و رجحانات، ذاتی جذبات و کیفیات کا اظہار بھی ضروری ہے۔ "مَیں" کا صیغہ استعمال کر کے کوئی اگر عامیانہ، سُنی سنائی یا پڑھی پڑھائی باتیں کرتا رہے تو وہ انشائیہ نہیں بنے گا۔ اس طرح "لائٹ ایسے" سے مُراد یہ لیا گیا ہے کہ مزاحیہ یا غیر سنجیدہ لب و لہجے میں بات کی جائے، اس تاثر نے انشائیے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مزاحیہ اور غیر سنجیدہ روش بعض اوقات انشائیے کی ضرورت بن جاتی ہے۔ جب کوئی سخت بات، سنجیدہ لب و لہجہ میں کہنا تہذیب و اخلاق کے منافی ہو یا معانی کی سنجیدگی اور گراں باری کو قابلِ برداشت بنانا مقصود ہو تو ہلکا پھلکا شگفتہ، مزاحیہ یا غیر سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ تاہم مزاح، طنز، غیر سنجیدگی انشائیے کے ضمنی اور وقتی عناصر ہیں جنہیں حسبِ ضرورت ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ انشائیہ بنیادی طور پر نئے خیالات، نئے علوم، نئے اندازِ فکر اور نئی کیفیات پیش کرنے کی صنف ہے جن کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایسی تحریریں پڑھ کر ہمیں محسوس ہو کہ ان باتوں کی طرف ہمارا دھیان نہیں گیا تھا۔

مختصر یہ کہ انشائیہ انگریزی "ایسے" سے مختلف قسم کی چیز ہے۔ بے شک اسے انگریزی "ایسے" ہی کو دیکھ کر شروع کیا گیا مگر اُردو میں آ کر اس نے نئے دیس کا بھیس اختیار کر لیا۔ یہی اس کی مقبولیت کا باعث بھی بنا ——— کسی تنقیدی، سائنسی، سیاسی، فلسفیانہ

مضمون میں اور انشائیے میں بنیادی امتیاز یہ ہے کہ ان تمام مضامین کو لکھنے والا براہِ راست اپنے علم و فضل اور معلومات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے موضوع سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتا جبکہ انشائیہ میں انشائیہ نگار ایک موضوع کے حوالے سے اس کے ساتھ منسلک بے شمار موضوعات پر آزادی سے مگر منضبط انداز میں خیال آرائی کرتا ہے اور ہرگز قاری کو احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ اپنے علم و فضل کا اظہار کر رہا ہے حالانکہ وہ دراصل اپنے علم و فضل ہی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ انشائیے میں علم و فضل کو جس صورت میں پیش کیا جاتا ہے اس کی جھلک مرزا یاس یگانہ کے اس شعر میں دکھائی دیتی ہے۔

علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

انشائیے کا آغاز کب ہوا؟ یہ ایک اور اہم سوال ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی "اُردو کا بہترین انشائی ادب" میں کہتے ہیں کہ انشائیے کا آغاز محمد حسین آزاد سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آزاد، نذیر احمد، سرشار، سرسید، ابوالکلام آزاد اور رستم کیانی اور بہت سے دوسرے مضمون نگاروں کو انشائیہ نگار قرار دیا ہے جن کے مضامین میں انشائی عنصر ملتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ ایسے ہی خیالات مشکور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد ارشاد کے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب "انشائیہ اُردو ادب میں" باب چہارم سے باب ہفتم تک چار ابواب میں اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انشائیہ باب ہفتم میں آکر جو موجودہ زمانہ ہے پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آیا۔ ان کے خیال میں مندرجہ بالا حضرات کے ذہن میں انشائیے کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا البتہ انہوں نے تراجم و اخذ کے ذریعے اچھے شگفتہ مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ موقف حقیقت سے زیادہ قریب ہے اگرچہ نامکمل ہے۔ اس سے انشائیے کی نمود سے اب تک تدریجی سفر کی منازل کا اندازہ سا ہوتا ہے۔

انشائیے کا اُردو میں آغاز کس نے کیا؟ یہ سوال بھی ایک اہم سوال ہے اور عرصے سے زیرِ بحث چلا آ رہا ہے۔ اس ضمن میں عمومی رائے یہی تھی کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو میں سب سے پہلے انشائیہ لکھنا شروع کیا۔ اس خیال کو یہ کہہ کر مسترد کیا جاتا رہا کہ انشائیہ تو محمد حسین آزاد ہی سے لکھا جانے لگا تھا چنانچہ محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک بہت سے مضمون نگاروں کو انشائیہ نگار کہا جاتا رہا۔ مغرب میں اب مونتین کو انشائیے کا بانی تسلیم کر لیا گیا ہے مگر انگریزی ادب کا مطالعہ کرکے آپ حیران ہوں گے کہ مونتین کے خلاف بالکل یہی موقف اختیار کیا گیا جو ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف اختیار کیا گیا۔ جب مونتین کو انشائیہ کا موجد قرار دیا گیا تو
GREAT ESSAYS OF ALL NATIONS
کے مرتب ایف۔ ایچ۔ پریچرڈ نے کہا کہ یہ تو "ایسے" کی قدیم صنف ہے۔ تب اس نے افلاطون، ارسطو اور فراسٹس تک کی تحریروں میں انشائیے کے نمونے ڈھونڈ نکالے۔ چنانچہ ایک عرصے تک گرد اڑتی رہی مگر پھر آہستہ آہستہ مونتین کو پہلا انشائیہ نگار تسلیم کر لیا گیا کیونکہ انشائیہ اپنے پورے خدوخال سمیت سب سے پہلے مونتین ہی کے ہاں نظر آیا۔ اُردو میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے کے مضمون نگاروں کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ علی اکبر قاصد، داؤد رہبر، جاوید صدیقی نے جو مضامین لکھے ان کی صورت حال بھی ان کے پیش روؤں سے زیادہ مختلف نہیں۔ میرے خیال میں جن بنیادوں پر مونتین کو انشائیے کا موجد قرار دیا جاتا ہے انہی بنیادوں پر ڈاکٹر وزیر آغا کو اُردو انشائیے کا موجد تسلیم کیا جا سکتا ہے، اس بات کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ آج نئی نسل نے جس انشائیے کو قبول کیا ہے اور جس کے تتبع میں انشائیہ نگاری شروع کی ہے یہ وہی انشائیہ ہے جو ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تین مجموعوں "خیال پارے" "چوری

سے یاری تک" اور " دوسرا کنارہ " میں دیا ہے۔

موجودہ انشائیہ نگاروں میں نئے اور پرانے سبھی نام دکھائی دیتے ہیں چند نام دیکھیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشکور حسین یاد، شہزاد احمد شہزاد، جمیل آذر، مشتاق قمر، اللہ سعید، سلیم آغا قزلباش، رام لعل نابھوی، حامد برگی، حیدر قریشی، بشیر سیفی، ارشد میر، محمد اسد اللہ، یونس بٹ، رضا نقی، سعشہ خان، جان کاشمیری، امجد طفیل، محمد اقبال انجم، محمد اسلم، محمد اسلام تبسم، اظہر ادیب، شمیم ترمذی اور بہت سے دوسرے۔

انشائیے کے بارے میں ایک سوال پتہ نہیں کیوں مگر اکثر ابھرتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انشائیہ عصری مسائل کو پیش کرتا ہے، یا کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر لکھا جاتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو سلیم آغا نے " اوراق " کے انشائیہ نمبر میں یہ کہہ کر دیا تھا۔

"سو یہ کہنا کہ انشائیہ " عصری آگہی " کے جوہر سے تہی ہے ایک لایعنی بہتان ہے البتہ یہ سوال ضرور قابل غور ہے کہ انشائیہ نگاروں نے عصری مسائل کے کینوس پر کون کون سے رنگوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔"

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ موجودہ انشائیوں میں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جائیں جن سے اس سوال کے جواز یا عدم جواز کو ثابت کیا جا سکے۔ سو چند اقتباسات حاضر ہیں۔

"اگر سپر طاقتیں اپنے اس نیک مشن سے دست کش ہو جائیں تو بہت سی جنگوں اور بکھیڑوں سے گلو خلاصی حاصل ہو سکتی ہے لیکن سپر طاقتیں بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں جس میں چودھراہٹ کے چھن جانے کا خطرہ ہو۔"

(انشائیہ گلی ـــــ سلیم آغا قزلباش)

"مسٹر رائٹ مین اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں نکال کر بڑے جوش سے بولا کہ مہنگائی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ یہ سب ہمارا واہمہ ہے۔"

(انشائیہ مسٹر رائٹ مین ـــــ جمیل آذر)

"اس نے دیکھا کہ قصیدے نے خوشامد اور مبالغہ آرائی کے علاوہ دستِ طلب دراز کرنے کی عادت بھی اپنا رکھی ہے سو اس نے ان تینوں کی مذمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ قصیدہ زہد و اتقا، عظمت و جبروت، بہادری اور فیاضی ایسی صفات کو پسند کرنے کا عادی تھا۔ غزل نے زہد کو للکارا۔ عظمت و جبروت کا منہ چڑایا۔"

(انشائیہ غزل ـــــ وزیر آغا)

"اگر کوئی آدمی آپ کے نیچے سے سیٹ کھینچ لے تو یہ عمل آپ کی ذات کو ترڑ دے گا لیکن اگر آپ خود ہی خوش دلی سے اٹھ کر ذرا پیچھے زیادہ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ جائیں تو یہ عمل باوقار بھی ہوتا ہے اور خوشگوار بھی۔"

(انشائیہ تسخیر کائنات ـــــ غلام جیلانی اصغر)

"اب ان کے ناموں کی تختیاں اتاری اور نئی نصب کی جا رہی ہیں۔ حیرت ہے سڑکیں جن ناموں سے منسوب ہوتی ہیں ان ناموں سے دوام حاصل کرنا نہیں چاہتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام ان سڑکوں سے دوام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سڑکیں شاید زمانہ

اور حالات کی دستبرد کا اس قدر شکار نہ ہوں جتنا ان ناموں کی مالک شخصیتیں ۔"

(انشائیہ ـــ سڑک ..... حامد برگی)

"ہر شخص میری طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ کوئی ایک بڑھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ میں اپنی موجودگی سے ان کے میز کی رونق بڑھاؤں کیونکہ میں ملک کا نامور شاعر ہی نہیں بہت بڑا افسر بھی ہوں ، ورنہ خالی خولی شاعروں کو کون پوچھتا ہے ۔"

(انشائیہ ـ نکٹائی ـــ ڈاکٹر بشیر سیفی)

"سقراط نے زہر پی کر ، حسینؓ نے شہید ہوکر اور منصورؒ نے سُولی قبول کرکے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے تھے بظاہر وہ اس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی ان کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا ۔ مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے ۔"

(انشائیہ ـ خاموشی ـــ حیدر قریشی)

"بسا اوقات تو مجھے ایسی شادیوں میں شامل ہونے کے لیے معاشرتی حربے استعمال کرتے ہوئے بڑی بڑی شخصیات کی سفارشوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے ۔ دراصل میں ہمہ وقت اس قسم کی شادیوں کی تاک میں رہتا ہوں کیونکہ ان میں شریک ہونے سے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔"

(انشائیہ ـــ دوسری شادی ـــ جان کاشمیری)

"افسوس کہ مغلوں نے برصغیر میں کرکٹ رائج کرنے کے بجائے اپنا ٹھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برصغیر کا طویل و عریض میدان انگریزوں کے لیے خالی کردیا تاکہ وہ ایل بی ڈبلیو ہوجانے کے خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بے تحاشا اور بے محابا کرکٹ کھیلیں ۔ گیند کو معمولی سا بلا دکھائیں اور جس سمت میں چاہیں ہمینک دیں ۔ اور پھر خود ہی باؤنڈری کی لکیر پار کرنے کا اعلان کردیں ۔"

(انشائیہ "کرکٹ" از ڈاکٹر انور سدید)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ کسی آئیوری ٹاور میں بیٹھ کر نہیں لکھا جارہا ہے بلکہ اُسی معاشرتی ، سماجی اور سیاسی پس منظر میں لکھا جارہا ہے جس میں دوسری اصناف لکھی جارہی ہیں ۔ آج کے انشائیوں میں سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور طبقاتی نظام کے افراط و تفریط کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں ۔ تاہم یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انشائیہ نگار کے اظہار کا انداز دوسرے مضمون نگاروں ، افسانہ نگاروں سے مختلف ہوتا ہے ، یہ کہنا درست نہیں کہ انشائیہ نگار ہمیشہ دوستانہ زبان میں بات کرتا ہے کیونکہ ایک سچے فنکار کی حیثیت سے وہ کسی بھی سماج دشمن قوت کا دوست نہیں ہوتا اور نہ اس سے دوستانہ لب و لہجہ میں گفتگو کرنا پسند کرسکتا ہے ہاں اس کا لب و لہجہ البتہ زیادہ مہذب ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے آج کے مہذب دور سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ۔

ڈاکٹر بشیر سیفی

کتابیاتِ انشائیہ

تعریف

"اُردو انشائیہ" کی اصطلاح انگریزی ایسے (ESSAY) کے مترادف ہے لیکن انشائیہ وہ ایسے نہیں جس کے تحت ہر قسم کی
ون نگاری آجاتی ہے بلکہ یہ ایسے کی ایک خاص قسم ہے جسے پرسنل ایسے (PERSONAL ESSAY) کہتے ہیں اور جس میں موضوع کا اسیر
ہ‌ئی بجائے موضوع کے حوالے سے آزادہ روی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ انشائیہ کی اس خصوصیت کے باعث جانسن نے اسے ذہن کی آزاد ترنگ
ہ دیا ہے عمومی ایسے یعنی مضمون میں اس آزادہ روی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انشائیے میں معروضیت کے بجائے موضوعیت پائی جاتی ہے یعنی
یں داخلی رنگ غالب ہوتا ہے۔ انشائیہ کا آغاز بھی غیر رسمی ہوتا ہے اور اختتام بھی، کیونکہ انشائیہ نگار نتائج تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا
عمومی ایسے میں تمہید بھی ہوتی ہے اور دلائل کا سلسلہ قائم کرکے نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہیں، سب سے اہم بات یہ کہ انشائیہ نگار موضوع
ایسے گوشے اُجاگر کرتا ہے جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ ذاتی اور انفرادی تجربات و محسوسات کو اولیت
ہے۔ انشائیے کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو اسے دیگر اقسام کے تخلیقی مضامین سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ بعض لوگ طنزیہ و مزاحیہ مضامین
ی انشائیہ سمجھتے ہیں جو درست نہیں۔ انشائیہ میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر تو ہو سکتے ہیں مگر مزاج کے لحاظ سے انشائیہ کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین
کوئی علاقہ نہیں ہے۔

پس منظر

اُردو انشائیہ کے منتشر اجزاء تو سر سید احمد خاں کے بعض مضامین مثلاً گزرا ہوا زمانہ، کاہلی، اُمید کی خوشی، انسان کے خیالات وغیرہ میں
ل جاتے ہیں کیونکہ اُردو میں مضمون نگاری انگریزی ایسے کی تقلید ہی میں شروع ہوئی تھی مگر حقیقتاً اُردو انشائیہ کا آغاز عبدالحلیم شرر کے بعض
ین سے ہوتا ہے جو ۱۸۸۷ سے ۱۸۸۹ء کے دوران "دلگداز" میں شائع ہوئے اور "مضامین شرر" کی پہلی جلد میں شامل ہیں۔ اس ضمن میں
کے مضامین گل، انتظار، لالۂ خود رو اور آسمان وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ میر ناصر علی اگرچہ شرر سے سینئر ہیں مگر ان کے جن مضامین میں

انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں وہ ۱۹۰۸ء کے بعد "صلائے عام" میں لکھے گئے اس لیے ادب میں زمانی تقدم کے باوجود انشائیہ کے حوالے سے ان کا ذکر شرر کے بعد ہی مناسب ہے ۔ ان کا ایک مضمون "مسکرانا" جدید انشائیے سے لگا کھاتا ہے ۔ ہم اور ہماری ہستی، مآلِ زندگی یادش بخیر اور بعض دیگر مضامین میں بھی انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں ۔ سجاد حیدر یلدرم کا ایک مضمون "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" بھی انشائیے کے ذیل میں آجاتا ہے ۔ یہ مضمون اگرچہ ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے مگر اس میں اس حد تک تصرف کیا گیا ہے کہ یہ خالصتاً اردو کی چیز بن گیا ہے ۔ جوش ملیح آبادی کے دو مضامین " نشہ اور بنی نوع انسان " اور " ایک رند کا اعلان جنگ " بھی انشائیہ کہے جا سکتے ہیں ۔ سجاد انصاری کے مضامین میں بھی انشائیہ کے بعض اوصاف موجود ہیں ۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما کے مضامین کو بھی انشائیہ سے اک گونہ نسبت ہے ان کے مضامین "میرا زینہ" "پچیس اور تیس" ، "الفاظ اور رنگ" اور پانی کا بلبلہ" انشائیہ کے ذیل میں آسکتے ہیں ۔ خلیقی دہلوی کا ایک مضمون "حریفِ رقص" بھی انشائیوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے ۔ آغا شاعر قزلباش کا ایک مضمون "کھلتا ہوا پتہ" میں بھی انشائی خصوصیات ہیں حجاب امتیاز علی ، قاضی عبدالغفار ، سر ذوالفقار علی ، مولوی عزیز مرزا اور شیخ محمد اکرم کے ہاں بھی انشائیہ نما تحریروں کا سراغ ملتا ہے ۔

طنز و مزاح نگاروں میں سے بھی بعض مصنفین کے ہاں انشائیہ کے نمونے مل جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں خواجہ حسن نظامی سرِ فہرست ہیں انہوں نے بعض ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے جو انشائیہ سے مخصوص سمجھے جاتے ہیں ان کے ایسے مضامین میں انشائیہ کے اوصاف بھی موجود ہیں مثلاً گلاب تمہارا کیکر ہمارا ، جھینگر کا جنازہ ، مچھر ، اُلو ، بیاری ڈکار وغیرہ ۔ اپنے ان مضامین کی وجہ سے وہ اُردو انشائیہ نگاروں کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" کے بعض حصوں میں بھی انشائیہ کا انداز موجود ہے بالخصوص چائے نوشی کے تجربات وغیرہ کا بیان مگر ان کے ہاں انشائیہ علیحدہ صنف کے طور پر موجود نہیں ۔ منفرد مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے بعض مضامین مثلاً دھوبی ، چارپائی اور ہر کا کھیت وغیرہ بھی انشائیہ سے خاصے قریب ہیں ۔ شوکت تھانوی کے مضامین میں سے "تکلفات" اور " پنشن" انشائیہ کی حدود میں داخل کیے جا سکتے ہیں ۔ کنہیا لال کپور کے دو مضامین "آگ جلانا" اور "بے قاعدگیاں" بھی انشائیہ کے معیار پر پورے اُترتے ہیں ۔ کرشن چندر کے مجموعۂ مضامین " ہوائی قلعے " کی نگارشات میں سے "بدصورتی" ، " رونا " ، "آنکھیں" اور "ہوائی قلعے" انشائیوں کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہیں ۔ امجد حسین کے مجموعہ مضامین "جملۂ معترضہ" کے اکثر مضامین میں انشائیہ کی خوبیاں موجود ہیں ۔ چھوٹے بھائی ، فراغت برائے فراغت ، غسل خانے ، عید کے فقیر اور میرے یہ سفید بال میں انشائی رویہ اتنا توانا ہے کہ انہیں انشائیہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے ۔ ایم ۔ آر کیانی کی تحریروں میں اگرچہ یہاں وہاں انشائیہ کا انداز جھلکتا ہے مگر مجموعی طور پر ان کی کوئی تحریر انشائیہ کے معیار پر پوری نہیں اُترتی ۔ مشتاق احمد یوسفی کے مضامین "پڑیئے گر بیمار" ، چارپائی اور کلچر ۔ اور صنفِ لاغر کو بھی انشائیہ ہی کہنا چاہیئے کیونکہ ان میں انشائیہ کا رنگ و آہنگ موجود ہے ۔ محمد منور کے مجموعۂ مضامین " اولادِ آدم " کے دو مضامین " باذوق " اور " باتیں " میں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں ۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کی کتاب "نسخہ ہائے وفا" کا ایک مضمون "ملے" بھی انشائیہ کے معیار پر پورا اُترتا ہے ۔ ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی کے مجموعۂ مضامین "غبارے" کی بعض نگارشات بھی انشائیہ کے دائرے میں آجاتی ہیں ۔

پیش منظر

اور جن تحریروں کو انشائیہ کہا گیا وہ انشائیہ کے نام سے پیش نہیں کی گئیں تھیں کیونکہ انشائیہ کی اصطلاح بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے اواخر میں
وزیر آغا کی تحریروں سے عام ہوئی جنہوں نے اس صنف کے خدوخال واضح کرنے کے لیے متعدد مضامین سپردِ قلم کرنے کے علاوہ وافر تعداد میں
معیاری انشائیے بھی تخلیق کیے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیے کے ضمن میں ان کا نام مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے انشائیے قاری کو اتنے غیر محسوس
طریقے سے فلسفیانہ نکات اور جبلتِ انسانی کے مخفی گوشوں سے روشناس کراتے ہیں کہ قاری ازخود زندگی کے عالم میں ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے۔
ان کے معاصر نظیر صدیقی کی کتاب "شہرت کی خاطر" کا دیباچہ انشائیہ فہمی میں تو اہمیت رکھتا ہے مگر اس کتاب کی نگارشات میں نکتہ آفرینی کا
میلان نظر نہیں آتا جو انشائیہ نگاری کی بنیادی خوبی ہے۔ وہ ان مضامین میں انشائیہ نگار کے بجائے طنز نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔
ہم وہ انشائیہ لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ دوست اور دوستی، پدرم فقیر بود اور شادی یقیناً انشائیے ہیں مگر مجموعی طور پر ان کے مضامین کا مزاج
مزاح ہی سے عبارت ہے۔ مشکور حسین یاد اگرچہ انشائیہ کے نام پر سنجیدہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ مگر چونکہ جوہرِ اندیشہ کی
تحریروں میں وہ شگفتگی موجود ہے جو بے ساختگی کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے انہیں انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ مشتاق قمر
طور پر تو یقیناً کامیاب انشائیہ نگار ہیں مگر پُر تصنع مزاح اور غیر ضروری طوالت نے ان کے انشائیوں کی قدر و قیمت کو نقصان پہنچایا ہے۔ جمیل آذر
بجز فکری موضوعات کے بجائے ایسے موضوعات پر انشائیے تحریر کیے ہیں جو عصری واقعات و مسائل سے بھی متعلق ہیں چنانچہ ان کے ہاں ایک
تازگی بھی نظر آتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی بنیادی صفت بے ساختہ مزاح ہے تاہم مزاح ان کے انشائیوں پر اس طرح حاوی
ہو جاتا کہ انشائی مزاج ہی دب کر رہ جائے۔ انور سدید کے انشائیوں کا وصفِ خاص تحریف سے شگفتگی پیدا کرنا ہے۔ سلیم آغا قزلباش
طور پر معمولی اشیاء کو موضوع بنا کر ان کے غیر معمولی پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کا مرکزی نقطہ انسان کی ذات
ہے۔ کامل القادری اپنے انشائیوں میں تہذیبی پس منظر کو موضوع بناتے ہیں۔ احمد جمال پاشا اگرچہ مزاح کے واسطے سے انشائیہ نگاری کی طرف
آئے مگر ان کے انشائیوں اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں ایک واضح حدِ فاصل موجود ہے۔ البتہ ارشد میر اپنے انشائیوں میں مزاح سے
دامن نہیں چھڑا سکے نیز ان کے انشائیے غیر ضروری طوالت کے حامل ہوتے ہیں۔ محمد اسد اللہ، جان کاشمیری، حامد برگی، اقبال انجم، یونس بٹ
عبدالرحمان، سلمان بٹ، طارق جامی، تقی حسین خسرو، شمیم ترمذی بھی اب معروف انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں
اسلام تبسم، حیدر قریشی، رشید گوریجہ، انجم نیازی، اظہر ادیب، امجد طفیل، رعنا تقی، سعشہ خان، فرح سعید رضوی، اور شعیب خالق کے
نام شامل ہیں۔ دیگر اصناف ادب کے جن ممتاز ادبا نے اس صنف کی طرف توجہ کی ان میں شہزاد احمد، غلام الثقلین نقوی، منشا یاد، جگندر پال
وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں اور روز بروز اس صنفِ ادب کے لکھنے والوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو اس صنف کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

انشائیوں کے مجموعے

آم کے آم — رام لعل نابھوی
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اوّل ۱۹۸۳ء
(پیش لفظ — از مصنف)

آمنا سامنا — سلیم آغا قزلباش
مکتبہ فکر و خیال لاہور اوّل ۱۹۸۷ء

جزیرے کا سفر - اکبر حمیدی
مکتبہ فکر و خیال لاہور اوّل ۱۹۸۵ء
(پیش لفظ - ڈاکٹر وزیر آغا)

جوہر اندیشہ - مشکور حسین یاد
مکتبہ اُردو ڈائجسٹ لاہور اوّل ۱۹۷۵ء
(ابتدائیہ - احمد ندیم قاسمی)

چاہِ حنظل - محمد یونس بٹ
مکتبہ داستان لمیٹڈ لاہور اوّل ۱۹۸۵ء
(دیباچہ - از مصنف)

چوری سے یاری تک - وزیر آغا
جدید ناشرین لاہور اوّل ۱۹۶۶ء
(پیش لفظ - مشتاق احمد یوسفی)
بارِ دوم موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۲ء

خیال پارے - وزیر آغا
اکادمی پنجاب لاہور اوّل ۱۹۶۱ء
(تقدیم - مولانا صلاح الدین احمد)
(انشائیہ کیا ہے؟ - از مصنف)
بارِ دوم مکتبہ اُردو زبان سرگودھا ۱۹۸۴ء

دوسرا کنارہ - وزیر آغا
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا ۱۹۸۲ء
(پیش لفظ - از مصنف)
بارِ دوم سیمانت پرکاشن دہلی ۱۹۸۵ء

ذکر اس پری وش کا - انور سدید
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۸۲ء
(پیش لفظ - جمیل آذر - پس منظر از مصنف)

سرگوشیاں - سلیم آغا قزلباش
مکتبہ اردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۸۰ء
(حرفِ اوّل - مشتاق قمر - حرفِ آخر - ڈاکٹر انور سدید)

سوچ زاویے، رشید احمد گریجہ
"قرطاس" فیصل آباد - اوّل ۱۹۸۶ء

شاخِ زیتون - جمیل آذر
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۸۱ء

ہم ہیں مشتاق - مشتاق قمر
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۷۰ء
(پیش لفظ انور سدید)

انشائیوں کے انتخابی مجموعے

اُردو انشائیہ - سید صفی مرتضیٰ
نسیم بک ڈپو لکھنؤ - اوّل ۱۹۶۱ء
(پیش لفظ - احتشام حسین - مقدمہ از مرتب)

اُردو ایسیز - ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی - اوّل ۱۹۵۸ء
(تعارف - نیاز فتح پوری - مقدمہ از مرتب)

اردو کا بہترین انشائی ادب ـــ ڈاکٹر وحید قریشی
میری لائبریری لاہور۔ اوّل ۱۹۶۴ء
(پیش لفظ از مرتب)

اردو کے بہترین انشائیے ـــ جمیل آذر
مکتبہ اردو زبان سرگودھا۔ اوّل ۱۹۷۹ء
(پیش لفظ بعنوان اردو انشائیہ کے سو سال از انور سدید)

انشائیہ ـــ ڈاکٹر آدم شیخ
رائیٹرس ایمپوریم لمیٹڈ بمبئی۔ اوّل ۱۹۶۵ء
(مقدمہ از مرتب)

انشائیہ ۱۹۸۱ء مرتبہ سلمان بٹ
سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور

صنفِ انشائیہ اور انشائیے ـــ ڈاکٹر سید محمد حسنین
ایوانِ اردو ـــ پٹنہ ۔ چہارم ۱۹۷۸ء

منتخب انشائیے ـــ سلیم آغا قزلباش
مکتبہ اردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۸۴ء
(پیش لفظ از مرتب)

تخلیقی مضامین کی کتب جن میں بعض انشائیے یا انشائیہ نما تحریریں موجود ہیں

ادبِ زریں ـــ حجاب امتیاز علی
عصمت بک ڈپو، دہلی۔ دوم ۱۹۴۳ء

ادبستان ـــ خلیقی دہلوی مرتبہ اختر شیرانی
کتاب منزل لاہور۔ سوم سن ندارد

اشارات۔ جوش ملیح آبادی
نگارستان ایجنسی دہلی۔ اوّل سن ندارد

انتخابِ مخزن۔ حصہ اوّل
شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ لاہور۔ سن ندارد

انشائیہ پچیسی ـــ ڈاکٹر جاوید وششٹ
تقسیم کار سلوچنا پرکاشن نئی دہلی بھارت۔ اوّل ۱۹۸۵ء

انشائیے ـــ فضل احمد صدیقی
اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کراچی ۱۹۶۷ء

اولادِ آدم ـــ محمد منور
مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور ۱۹۷۳ء

پھوار ـــ شمیم ترمذی
کاروانِ ادب ملتان۔ اوّل ۱۹۸۶ء

ترنگ۔ علی اکبر قاصد
ایوان اردو پٹنہ ۔ ۱۹۵۶ء

تین پیسے کی چھوکری ـــ قاضی عبدالغفار
ادارۂ نو لاہور۔ سن ندارد

جملۂ معترضہ ــــ امجد حسین
اردو بک سٹال لاہور۔ اوّل ۱۹۵۵ء

اک طرفہ تماشا ہے ۔ غلام الثقلین نقوی
مکتبہ فکر و خیال ۔ لاہور ۔ اوّل ۱۹۸۵ء

چراغ تلے ــــ مشتاق احمد یوسفی
مکتبۂ دانیال کراچی ۔ ۱۹۸۱ء

حماقتیں میرے مقدر کی ــــ صلاح الدین حیدر
مکتبہ کاروانِ ادب ملتان ۔ اوّل ۱۹۷۸ء

خبطی ۔ شوکت تھانوی
لارک پبلشرز کراچی ۱۹۶۲ء

خیالاتِ عزیز ــــ مولوی محمد عزیز مرزا
انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کراچی ۔ اوّل ۱۹۶۱ء

خیالستان ــــ سجاد حیدر یلدرم
فرمان علی اینڈ سنز لاہور ۔ سن ندارد

سفید بال ــــ سلمان بٹ
سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۔ اوّل ۱۹۸۶ء
(پیش لفظ ۔ ڈاکٹر سلیم اختر)

سیپارۂ دل ــــ خواجہ حسن نظامی
خواجہ اولاد کتاب گھر نئی دہلی ۔ ہشتم ۱۹۶۴ء

شہرت کی خاطر ــــ نظیر صدیقی
پاک کتاب گھر ڈھاکہ ۔ اوّل ۱۹۶۱ء

شیشہ و تیشہ ــــ کنہیا لال کپور
مکتبہ جدید لاہور ۔ دوم ۱۹۵۰ء

غبارِ خاطر ۔ ابوالکلام آزاد
میری لائبریری لاہور دوم ۱۹۶۲ء

غبارے ــــ ممتاز مفتی
مکتبہ اُردو لاہور ۔ اوّل ۱۹۵۴ء

گردِ کارواں ــــ کنہیا لال کپور
میری لائبریری لاہور ۔ پنجم ۱۹۷۰ء

محشرِ خیال ــــ سجاد انصاری
آئینۂ ادب لاہور ۔ سوم ۱۹۵۷ء

مضامینِ رشید ــــ رشید احمد صدیقی
مکتبہ اُردو ادب لاہور ۔ سن ندارد

مضامینِ سرسید ــــ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
مکتبہ خیابانِ ادب لاہور (اوّل ۱۹۶۷ء)

مضامینِ شرر ــــ عبدالحلیم شرر
عبدالرشید اینڈ برادرز تاجر کتب لاہور ۔ اوّل ۱۹۲۵ء
(جلد اوّل)

مقالاتِ ناصری۔ مرتبہ انصار ناصری
انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی اوّل ۱۹۶۹ء

نسخہ ہائے وفا ۔۔۔ ڈاکٹر داؤد رہبر
اکادمی پنجاب لاہور۔ اوّل ۱۹۵۸ء

نشاطِ خاطر ۔۔۔ حسنین عظیم آبادی
ایوانِ اُردو۔ پٹنہ دوم ۱۹۸۰ء
(پیش لفظ۔ کلیم الدین احمد)

ہوائی قلعے۔ کرشن چندر
اُردو بک سٹال لاہور اوّل ۱۹۵۶ء

انشائیہ پر مستقل تصانیف

ممکناتِ انشائیہ ۔۔۔ مشکور حسین یاد
پولیمر پبلیکیشنز لاہور اوّل ۱۹۸۳ء

انشائیہ اُردو ادب میں ۔۔۔ ڈاکٹر انور سدید
مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۴ء

انشائیہ کی بنیاد ۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر
سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۶ء

تنقیدی مضامین کے مجموعے جن میں انشائیہ پر مضامین یا انشائیہ کا ذکر موجود ہے

اختلافات ۔۔۔ ڈاکٹر انور سدید
مکتبہ اُردو زبان سرگودہا اوّل ۱۹۷۵ء

ادب اور تنقید ۔۔۔ ڈاکٹر سید شاہ علی
مکتبہ اسلوب کراچی اوّل ۱۹۶۲ء

ادب کا تنقیدی مطالعہ ۔۔۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی
میری لائبریری، لاہور۔ چہارم ۱۹۷۱ء

اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر
سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ پنجم ۱۹۷۸ء

اصنافِ ادب ۔۔۔ رفیع الدین ہاشمی
سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۶ء

بہترین مقالات (۱۹۷۸ء) مرتبہ سجاد نقوی
مکتبہ اُردو زبان سرگودہا ۱۹۸۰ء

تاثرات و تعصبات ۔۔۔ نظیر صدیقی
شعبہ تخلیق و اشاعت مدرسہ عالیہ ڈھاکہ اوّل ۱۹۶۲

تحقیق و تنقید ۔۔۔ اختر اورینوی
شاد بک ڈپو پٹنہ، سن ندارد

تنقید اور احتساب ۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا
جدید ناشرین لاہور اوّل ۱۹۶۸ء

تنقید و مجلسی تنقید ۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا
آئینۂ ادب لاہور۔ دوم ۱۹۸۶ء

دائرے اور لکیریں — ڈاکٹر وزیر آغا
مکتبہ فکر و خیال لاہور۔ اوّل ۱۹۸۶ء

سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ — ڈاکٹر سید عبداللہ
مکتبہ کارواں لاہور اوّل ۱۹۶۰ء

فاروقی کے تبصرے — شمس الرحمان فاروقی
مکتبہ شب خون الہ آباد ۱۹۶۸ء

فکر و خیال — انور سدید
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا۔ اوّل ۱۹۷۱ء

ماسٹر رام چندر اور اُردو کے ارتقاء میں ان کا حصّہ — ڈاکٹر سیدہ جعفر
اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد دکن اوّل ۱۹۶۰ء

مضامین نو — خلیل الرحمٰن اعظمی
ایجوکیشنل بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۷۷ء

مطالعے — سجاد نقوی
مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۷ء

نئے تناظر — ڈاکٹر وزیر آغا
آئینۂ ادب۔ لاہور اوّل ۱۹۸۱ء

نئے مقالات — ڈاکٹر وزیر آغا
مکتبہ اُردو زبان سرگودھا۔ اوّل ۱۹۷۲ء

نیاز فتح پوری — ڈاکٹر امیر عارفی
انجمن ترقّی اُردو دہلی ۱۹۷۷ء

وزیر آغا ایک مطالعہ — ڈاکٹر انور سدید
مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۲ء

ادب کے سالانہ جائزے جن میں انشائیہ کا ذکر موجود ہے

۱۹۸۰ء کا ادب — ڈاکٹر انور سدید
"اوراق" لاہور۔ فروری مارچ ۱۹۸۱ء
"امروز" لاہور جنوری ۱۹۸۱ء

۱۹۸۱ء کا اُردو ادب — ڈاکٹر انور سدید
"اوراق" لاہور۔ نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء
"جنگ" لاہور — جنوری ۱۹۸۲ء

۱۹۸۲ء کا اُردو ادب — ڈاکٹر انور سدید
"جنگ" لاہور جنوری ۱۹۸۳ء

۱۹۸۳ء کا اُردو ادب — ڈاکٹر انور سدید
"جنگ" لاہور جنوری ۱۹۸۴ء

۱۹۸۴ء کا اُردو ادب — انور سدید
"جنگ" لاہور۔ جنوری ۱۹۸۵ء
"کتاب نُما" دہلی فروری، مارچ ۱۹۸۵ء
"امروز" لاہور جنوری ۱۹۸۵ء

۱۹۸۵ء کا اُردو ادب — انور سدید
"جنگ" لاہور - جنوری ۱۹۸۶ء
"کتاب نما" دہلی - اپریل ۱۹۸۶ء

۱۹۸۶ء کا اُردو ادب — انور سدید
"جنگ" لاہور جنوری ۱۹۸۷ء

گزشتہ دس سال کی نمایاں نثری تخلیقات - میرزا ادیب
"امروز" لاہور دہ سالہ نمبر ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء

فنِ انشائیہ پر متفرق مضامین

ادب عصری آگہی اور انشائیہ - ڈاکٹر انور سدید
ماہنامہ "شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۷ - ۱۹۸۶ء

ادب کی ایک خاص صنف - ڈاکٹر سید محمد حسنین
"نگارِ پاکستان" کراچی اصنافِ ادب نمبر ۱۹۶۶ء

اُردو انشائیہ — انور سدید
"آہنگ" گیا - بھارت - اگست ۱۹۸۳ء

اُردو انشائیہ، ایک پھیلتا آفاق - راجہ محمد ریاض الرحمٰن
"اوراق" لاہور مارچ اپریل ۱۹۸۶ء

اُردو انشائیہ، پس منظر و پیش منظر - ڈاکٹر بشیر سیفی
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی، ستمبر ۱۹۸۷ء

اُردو انشائیہ کا ارتقائی سفر — راغب شکیب
"اُردو زبان" سرگودھا، انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۲ء

۸۶ء کا انشائی ادب — محمد اسلام تبسم
"امروز" لاہور ۲ جنوری ۱۹۸۷ء

اُردو انشائیے کا ایک سال — اکبر حمیدی
"اُردو ادب" راولپنڈی مارچ اپریل ۱۹۸۳ء

اُردو انشائیے کی ابتدا کے متعلق کچھ نئے حقائق - ڈاکٹر جاوید وششٹ
(پمفلٹ) ہریانہ، چندی گڑھ ۱۹۸۳ء

اُردو انشائیہ کی مزید بحث — ڈاکٹر انور سدید
"اُردو زبان" سرگودھا جنوری فروری ۱۹۸۳ء

اُردو انشائیہ کے خدوخال — مشکور حسین یاد
"فنون" لاہور نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء

اُردو انشائیہ کے خدوخال — سجاد نقوی
"اوراق" جنوری فروری ۱۹۷۷ء

اُردو انشائیہ کے عناصر — شمیم ترمذی
پندرہ روزہ "آہنگ" کراچی ۱۶ - اپریل ۱۹۸۲ء

اُردو کا پہلا انشائیہ نگار — ڈاکٹر بشیر سیفی
ماہنامہ "نیرنگِ خیال" راولپنڈی اگست ۱۹۸۶ء

اُردو کے گمُ شدہ انشائیہ نگار — ڈاکٹر انور سدید
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۳ء

انشائیہ — اطہر پرویز
"ہم قلم" کراچی جنوری ۱۹۶۳ء

انشائیہ — ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
"نیا دَور" کراچی شمارہ نمبر ۳۵ - ۳۶

انشائیہ — رام لعل نابھوی
مضمون (پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا)
اکادمی ہریانہ ۱۹۷۹ء

انشائیہ — جمیل آذر
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۷۸ء

انشائیہ — جمیل آذر
"تخلیقی ادب" کراچی شمارہ نمبر ۲

انشائیہ — احمد سہیل
"اوراق" لاہور نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

انشائیہ — سلیم آغا قزلباش
"چٹان" لاہور ۱۹ر جولائی ۸۲ء

انشائیہ — رضی عابدی
ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور دسمبر ۱۹۸۴ء

انشائیہ اُردو کی سب سے متنازعہ صنفِ ادب — ذوالفقار احمد تابش
"امروز" لاہور ۸ جون ۱۹۸۴ء

انشائیہ، اس اصطلاح کا موجد کون ہے — انور سدید
"چٹان" لاہور نومبر ۱۹۸۱ء

انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک — جمیل آذر
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ اور انشائے لطیف — ڈاکٹر بشیر سیفی
"ادبِ لطیف" لاہور گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۸۶ء

انشائیہ اور طنز و مزاح — ڈاکٹر بشیر سیفی
"ماہِ نو" لاہور جولائی ۱۹۸۶ء

انشائیہ اور نثری نظم — مشکور حسین یاد
"فنون" لاہور اگست ستمبر ۱۹۸۲ء

انشائیہ ایک تہذیبی صنفِ ادب — رشید نثار
کتابی سلسلہ "مطلع" خانیوال شمارہ نمبر ۲ — ۱۹۸۶ء

انشائیہ ایک عظیم صنفِ ادب — وزیر آغا
"اُردو زبان" سرگودھا ستمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء

انشائیہ ایک لطیف صنفِ ادب — جمیل آذر
"اوراق" لاہور شمارہ نمبر ۲ - ۱۹۶۹ء

انشائیہ پر ایک نوٹ — مرزا حامد بیگ
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۲ء

انشائیہ ایک ہمہ جہت صنفِ نثر — سلیم آغا قزلباش
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ تنقید کی زد میں — رشید نثار
"اُردو زبان" سرگودھا جنوری فروری ۱۹۷۸ء

انشائیہ پر ایک نظر — پروفیسر یوسف بلخی
"ہماری زبان" علی گڑھ یکم مئی ۱۹۶۲ء

انشائیہ چوتھے کھونٹ کی دریافت — طارق جامی
"اُردو زبان" سرگودھا جنوری فروری ۱۹۷۸ء

انشائیہ زندگی سے مربوط ہے — جمیل آذر
"اوراق" لاہور جون ۱۹۸۲ء

انشائیہ کا اسلوب — ڈاکٹر سلیم اختر
"فنون" لاہور نومبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ کا زوال — ڈاکٹر سلیم اختر
"ادبِ لطیف" لاہور گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۸۶ء

انشائیہ کا فکری بیک یارڈ — اقبال آفاقی
"اوراق" لاہور جولائی اگست ۱۹۷۸ء

انشائیہ کچھ خیالات — سید احتشام حسین
"ادیب" علی گڑھ انشائیہ نمبر ۱۹۵۹ء

انشائیہ کی اصطلاح — احمد جمال پاشا
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۲ء
"کتاب نما" دہلی اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء

انشائیہ کی پہچان — وزیر آغا
"اُردو زبان" سرگودھا شمارہ نمبر ۱۱ - ۱۲ - ۱۹۶۹ء

انشائیہ کی تکنیک — مسعود انور
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۳ء

انشائیہ کی تعریف — ڈاکٹر بشیر سیفی
"جنگ" راولپنڈی یکم دسمبر ۱۹۸۶ء

انشائیہ کی کونپل — مرزا حامد بیگ
"اوراق" لاہور جنوری فروری ۱۹۷۸ء

انشائیہ کے ابتدائی روپ — ڈاکٹر سیدہ جعفر
"ادیب" علی گڑھ انشائیہ نمبر ۱۹۵۹ء

انشائیہ کے چند پہلو — رشید نثار
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ چند مسائل — سلیم آغا قزلباش
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر مارچ اپریل ۱۹۸۲ء

انشائیہ کے لیے ڈاکٹر جانسن کی تعریف — ڈاکٹر انور سدید
کتابی سلسلہ "مطلع" خانیوال شمارہ نمبر ۳

انشائیہ کیا ہے — پیٹر ویسٹ لینڈ ترجمہ — مسعود ہاشمی
"ماہِ نو" لاہور جون ۱۹۸۰ء
"مفاہیم" گیا، ادب نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ کیا ہے — نظیر صدیقی
"نگارِ پاکستان" اصناف ادب نمبر ۱۹۶۶ء

انشائیہ کیا ہے — غلام جیلانی اصغر
"اوراق" لاہور مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

انشائیہ کیا ہے — ذوالفقار احمد تابش
"اوراق" لاہور انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ کیا ہے — ڈاکٹر بشیر سیفی
"اوراق" لاہور اکتوبر نومبر ۱۹۸۶ء

انشائیہ کیا ہے — ڈاکٹر وزیر آغا
"ہماری زبان" دہلی ۱۵ نومبر ۱۹۸۰ء
"اوراق" ستمبر اکتوبر ۱۹۸۰ء

انشائیہ کیا ہے — ڈاکٹر سید مقصود زاہدی
"اہلِ قلم" ملتان شمارہ نمبر ۲

انشائیہ کیا نہیں ہے — ڈاکٹر سلیم اختر
ماہنامہ "شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۷ — ۱۹۸۶ء

انشائیہ کیوں — سلیم اختر
"اوراق" مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

انشائیہ بحوالۂ ذات — خالد اقبال
"امروز" لاہور۔ ادبی ایڈیشن۔ اپریل ۱۹۸۳ء

انشائیہ میں خیال کی رو — انور سدید
"قرطاس" گوجرانوالہ

انشائیہ مقبولیت کی راہ پر — سعداللہ کلیم
"اوراق" لاہور مارچ۔ اپریل ۱۹۷۲ء

انشائیہ نفسیات کے آئینے میں — ڈاکٹر سلیم اختر
"فنون" لاہور جون جولائی ۱۹۸۶ء

انشائیہ نگار کی شخصیت — ڈاکٹر سلیم اختر
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی سالنامہ ۱۹۸۴ء

انشائیہ نگاری — سلیم اختر
"ماہِ نو" کراچی۔ مارچ ۱۹۶۶ء

انشائیہ نگاری — مشتاق قمر
"اوراق" لاہور اپریل مئی ۱۹۷۵ء

انشائیہ نگاری — ڈاکٹر انور سدید
"سب رس" کراچی۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ نما — ڈاکٹر قمر رئیس
"ادیب" علی گڑھ انشائیہ نمبر ۱۹۵۹ء

انشائیہ کا سراپا — رحیم طلب
کتابی سلسلہ "تحریر" جڑانوالہ شمارہ ۵

انشائیے کا فن — حامد برگی
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انگریزی انشائیہ پر ایک نظر — اندرجیت لعل
"ادیب" علی گڑھ انشائیہ نمبر ۱۹۵۹ء

ایسے اُردو ادب میں — حسن نور
"ادبِ لطیف" لاہور ستمبر ۱۹۵۸ء

ایسے مغرب میں — ڈاکٹر سلیم اختر
"نقوش" لاہور جون ۱۹۸۵ء

بہاولپور میں انشائیہ کی شام کا خطبۂ صدارت — ڈاکٹر انور سدید
"اُردو زبان" سرگودھا اپریل ۱۹۸۲ء

ذکر پھر انشائیہ کا — پرویز بزمی
روزنامہ "امروز" لاہور ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء

صنفِ انشائیہ کا مسئلہ — مشکور حسین یاد
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی اپریل ۱۹۸۳ء

کچھ اُردو انشائیہ کے بارے میں — ڈاکٹر وزیر آغا
"اُردو زبان" سرگودھا مئی جون ۱۹۶۸ء (سالنامہ)

کچھ انشائیہ کے بارے میں — پروین طارق
"نوائے وقت" راولپنڈی ۸ جون ۱۹۸۷ء

کچھ باتیں انشائیہ کے بارے میں — ذوالفقار احمد تابش
"امروز" لاہور ۱۱ مئی ۱۹۸۴ء (ادبی ایڈیشن)

کچھ انشائیے کے بارے میں — جمیل آذر
"نوائے وقت" راولپنڈی ۱۶ جولائی ۱۹۷۷ء

کچھ انشائیے کے بارے میں — شہزاد منظر
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنفِ ادب ہے — مشکور حسین یاد
"فنون" لاہور سالنامہ ۱۹۸۱ء

ممکناتِ انشائیہ یا کاروبارِ نکاہیہ — خامہ بگوش
روزنامہ "جسارت" کراچی ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ء

مؤتین انشائیہ اور انشائیہ نگار — محمد ارشاد
"فنون" لاہور جولائی ۱۹۸۲ء

میرے پسندیدہ انشائیے — ہرچرن چاولہ
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

وہی انشائیہ کی بات ــــ صلاح الدین حیدر
"چٹان" لاہور ۷ دسمبر ۱۹۸۱ء

انشائیہ نگاروں کے فن اور انشائیہ کی کتابوں پر تنقیدی مضامین

انشائیہ اور وزیر آغا ــــ یوسف ظفر
"اُردو زبان" سرگودہا اپریل ۱۹۷۲ء

انشائیوں کا ایک مجموعہ (خیال پارے) ــــ قیوم نظر
سالنامہ "اُردو زبان" سرگودہا مئی جون ۱۹۶۸ء

انور سدید کی انشائیہ نگاری ــــ مناظر عاشق ہرگانوی
"اوراق" لاہور ستمبر ۱۹۸۱ء
"توازن" بمبئی شمارہ نمبر ۷ - ۱۹۸۶ء

انور سدید کے انشائیے ــــ جمیل آذر
"اوراق" لاہور ستمبر ۱۹۸۱ء

انور سدید کے انشائیے ــــ اکبر حمیدی
"اوراق" لاہور۔ اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء

جمیل آذر کے انشائیے ــــ انور سدید
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی۔ مارچ ۱۹۸۲ء

شاخِ زیتون ــــ سجاد نقوی، رام لعل نابھوی
"اوراق" لاہور۔ نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

جمیل آذر کے انشائیے ــــ فتح محمد ملک
"نوائے وقت"۔ راولپنڈی ۲۱ جولائی ۱۹۸۶ء

جمیل آذر کے انشائیے ــــ ڈاکٹر بشیر سیفی
"نوائے وقت" راولپنڈی یکم دسمبر ۱۹۸۶ء

سرشار بحیثیت انشائیہ نگار ــــ ڈاکٹر احراز نقوی
"نقوش" لاہور جنوری ۱۹۶۶ء

غلام جیلانی اصغر کے انشائیے ــــ ڈاکٹر انور سدید
"اوراق" لاہور مئی جون ۱۹۸۳ء

کرشن چندر کے انشائیے ــــ ڈاکٹر سید محمد حسنین
"شاعر" بمبئی کرشن نمبر ۱۹۶۷ء

محمد یونس بٹ کی انشائیہ نگاری ــــ تحسین فراقی
"سیارہ" لاہور۔ اپریل مئی ۱۹۸۶ء

مشتاق احمد یوسفی۔ ایک انشائیہ نگار ــــ نظیر صدیقی
"سیپ" کراچی شمارہ ۱۲

ڈاکٹر وزیر آغا اور انشائیہ ــــ رشید نثار
"نگارِ پاکستان" کراچی ستمبر ۱۹۸۵ء

وزیر آغا کی انشائیہ نگاری ــــ جمیل آذر
"تخلیقی ادب" نمبر ۳۔ کراچی

وزیر آغا کے انشائیے — میرزا ادیب
"ادبِ لطیف" لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۱ء

وزیر آغا کے انشائیے — احمد سعید ہمدانی
"اُردو زبان" سرگودھا نومبر دسمبر ۱۹۷۲ء

وزیر آغا کے انشائیے — ڈاکٹر بشیر سیفی
"سیارہ" لاہور۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء

آم کے آم — (رام لعل نابھوی) — ڈاکٹر انور سدید
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید) ڈاکٹر سہیل بخاری۔
رشید امجد
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید) جمیل آذر
"امروز" (ادبی ایڈیشن) لاہور۔ ۷ جون ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (انور سدید) ڈاکٹر انور محمود خالد
روزنامہ "امروز" لاہور (ادبی ایڈیشن) ۲۷ نومبر ۱۹۸۴ء

انشائیہ اُردو ادب میں (انور سدید) صابر لودھی
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی اگست ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (ڈاکٹر انور سدید) جمیل آذر
"نوائے وقت" راولپنڈی ۳ جون ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (انور سدید) اکبر حمیدی
"حیدر" راولپنڈی ۸ مارچ ۱۹۸۵ء

انشائیہ اُردو ادب میں (انور سدید) خیر الدین انصاری
"اُردو زبان" سرگودھا۔ جنوری فروری ۱۹۸۷ء

انشائیوں کی پانچ کتابیں — محمد اسد اللہ
"اُردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء

پھوار (شمیم ترمذی) ڈاکٹر وزیر آغا
"اوراق" لاہور اپریل مئی ۱۹۸۷ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) ڈاکٹر بشیر سیفی
"اُردو ادب" راولپنڈی تبصرہ نمبر نومبر ۱۹۸۵ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) صابر لودھی
"ماہِ نو" لاہور۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اک [illegible] ی) نظیر صدیقی
"کتاب" لاہور مارچ ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) حامد برگی
"اوراق" لاہور۔ اپریل ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) محمد منشا یاد
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی سالنامہ ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) فرحت نواز
"نوائے وقت" ملتان ۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) حسن طاہر
"پاکستان ٹائمز" لاہور ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) سلیم آغا قزلباش
"نوائے وقت" راولپنڈی ۔ ۲۶ جون ۱۹۸۶ء

جزیرے کا سفر (اکبر حمیدی) حامد برگی
"مسلم" اسلام آباد ۔ ۶ جون ۱۹۸۶ء

جزیرے کے سفر کی دعوت ۔ جمیل آذر
"جنگ" راولپنڈی ۔ ۱۳ جنوری ۱۹۸۶ء

چاہ خنداں (محمد یونس بٹ) صابر لودھی
"سیارہ" لاہور ۔ اپریل مئی ۱۹۸۶ء

چاہ خنداں کی شگفتہ تحریریں (محمد یونس بٹ) اسرار زیدی
"اخبار جہاں" کراچی ۔ ۳ اکتوبر ۱۹۸۵ء

انشائیوں کی نئی کتاب (دوسرا کنارہ ۔ وزیر آغا) رشید امجد
"اردو زبان" سرگودھا، انشائیہ نمبر، مارچ اپریل ۱۹۸۳ء

ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید) فرحت نواز ۔۔ سجاد نقوی
"اوراق" لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

ذکر اس پری وش کا (ڈاکٹر انور سدید) ڈاکٹر خورشید رضوی
"اردو زبان" سرگودھا، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

ذکر اس پری وش کا (انور سدید) فرحت نواز ۔۔ رام لعل نابھوی
"جدید ادب" خان پور، مارچ ۱۹۸۳ء

ذکر اس پری وش کا (انور سدید) جوگندر پال
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

ذکر اس پری وش کا (انور سدید) کرنل غلام سرور
"اوراق" لاہور، اپریل مئی ۱۹۸۲ء

ذکر اس پری وش کا (انور سدید) عذرا اصغر
"تخلیق" لاہور، جنوری ۱۹۸۲ء

سرگوشیاں (سلیم آغا قزلباش) جمیل آذر
کتابی سلسلہ "خیابان" راولپنڈی شمارہ ۲

سرگوشیاں (سلیم آغا قزلباش) رام لعل نابھوی ۔ اکبر حمیدی
"اوراق" لاہور، فروری مارچ ۱۹۸۱ء

سرگوشیاں پر ایک نظر (سلیم آغا قزلباش) محمد منشا یاد
"جدید ادب" خان پور، ستمبر ۱۹۸۱ء

سفید بال (سلمان بٹ) اسرار زیدی
"اخبار جہاں" کراچی ۱۵ تا ۲۱ جون ۱۹۸۷ء

شاخِ زیتون (جمیل آذر) انور قدوس سیمی
"جنگ" راولپنڈی، ۱۹ اپریل ۱۹۸۲ء

شاخِ زیتون پر ایک نظر (جمیل آذر) ڈاکٹر وزیر آغا
نیرنگِ خیال راولپنڈی اگست ۱۹۸۴ء

منتخب انشائیے (سلیم آغا قزلباش) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ممتاز احمد خان
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

منتخب انشائیے (سلیم آغا قزلباش) ڈاکٹر انور سدید
روزنامہ "جنگ" لاہور - ۱۴ جون ۱۹۸۲ء

ممکناتِ انشائیہ (مشکور حسین یاد) سید مسعود ہاشمی
"فنون" لاہور - ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴ء

اردو انشائیے کا مارکو پولو (جمیل آذر) جمیل ملک
"اوراق" انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

قمرو مجاز کا خوش فکر شہزادہ (محمد یونس بٹ) حفیظ الرحمن احسن
"سیارہ" لاہور اپریل مئی ۱۹۸۶ء

یادِ خنداں میں دو ایک ڈبکیاں (محمد یونس بٹ) میرزا ادیب
"سیارہ" لاہور - اپریل مئی ۱۹۸۶ء

ممکناتِ انشائیہ (مشکور حسین یاد) متین فکری
"نیرنگِ خیال" راولپنڈی - اگست ۱۹۸۴ء

اوراق کے انشائیے — جمیل آذر
"اوراق" فروری مارچ ۱۹۸۱ء

اوراق کے انشائیے — رشید نثار — اکبر حمیدی
"اوراق" نومبر دسمبر ۱۹۸۴ء

بحثیں اور مذاکرے

انشائیہ ایک بحث
(شرکا) ڈاکٹر وحید قریشی، سجاد نقوی، نظیر صدیقی، رب نواز مائل، مشکور حسین یاد، سید احمد سعید ہمدانی، رشید نثار، انور سدید ڈاکٹر عبادت بریلوی۔
"اوراق" لاہور - مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

انشائیہ — ایک مذاکرہ (محرک اے خیام)
(شرکا) علی حیدر ملک، صبا اکرام، شہزاد منظر، محمد رضا کاظمی — ممتاز احمد خان، راغب شکیب۔
"اوراق" انشائیہ نمبر - اپریل مئی ۱۹۸۵ء

انشائیہ کا مسئلہ (بازگشت) - عرش صدیقی - وزیر آغا
"اوراق" لاہور - اکتوبر نومبر ۱۹۷۲ء

انشائیہ کیا ہے (بحث)
شرکا - غلام جیلانی اصغر، نظیر صدیقی، وزیر آغا۔
ادبی دنیا دورِ پنجم شمارہ ہفتم

انشائیہ کیا ہے — لطیف ساحل
ڈاکٹر وزیر آغا، مشکور حسین یاد، خواجہ محمد ذکریا، سلمان بٹ۔
"امروز" لاہور ۱۳، ۲۰ مئی اور ۳ جون ۱۹۸۳ء

سوال یہ ہے (انشائیہ) محرکِ بحث -- سلیم آغا قزلباش
شرکا) غلام الثقلین نقوی، جمیل آذر، اقبال آفاقی —
مرزا حامد بیگ -
"اوراق" لاہور ۔ سالنامہ جنوری فروری ۱۹۷۹ء

سوال یہ ہے (مذاکرہ) مدیر آغا، غلام جیلانی اصغر، انور سدید
سجاد نقوی، سلیم آغا قزلباش، انجم نیازی، صابر لودھی
"اوراق" لاہور، انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء

انشائیہ اردو ادب میں (انٹرویو) تنویر ظہور، انور سدید
روزنامہ "جنگ" لاہور ۳ جنوری ۱۹۸۵ء

رسائل و اخبارات کے خصوصی نمبر

"ادیب" علی گڑھ انشائیہ نمبر ۱۹۵۹ء

"اردو زبان" سرگودھا انشائیہ نمبر اپریل ۱۹۸۳ء
"اوراق" لاہور افسانہ و انشائیہ نمبر ۱۹۷۲ء
"اوراق" لاہور انشائیہ نمبر ۱۹۸۵ء
"امروز" لاہور (ادبی ایڈیشن) انشائیہ نمبر فروری ۱۹۸۵ء

ایم اے کا مقالہ

اردو انشائیہ اور انشائیہ نگاری — مظہر علی آغا
پنجاب یونیورسٹی لاہور

پی ایچ ڈی کا مقالہ

اردو میں انشائی ادب کا ارتقا — ڈاکٹر بشیر سیفی
پنجاب یونیورسٹی لاہور

اردو انشائیہ پر انگریزی مضامین

MUCH ADO ABOUT THE ESSAY	خالد احمد	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۹ اگست ۹۸۳
MUCH ADO ABOUT SOMETHING	غلام جیلانی اصغر	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۴ اکتوبر ۸۳
INSHAIYA: A REVOLUTION	محمد افسر ساجد	پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ کراچی	۲۱ اگست ۵
LIGHT ESSAYS IN URDU	ایریل (محمد علی صدیقی)	ڈان — کراچی	۱۴ اگست ۸۵
URDU INSHAIYA	احمد خلیل	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۶ ستمبر ۸۳
MUCH ADO ABOUT THE ESSAY	جمیل آذر	پاکستان ٹائمز لاہور	۲۷ ستمبر ۸۳
URDU INSHAIYA	احمد خلیل	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۶ ستمبر ۸۳
URDU ESSAYS AND PROSS	محمد کاظم	پاکستان ٹائمز لاہور	۳ ستمبر ۹۸۳
URDU ESSAY	پرویز بزمی	پاکستان ٹائمز لاہور	۲۲ ستمبر ۹۸۳
URDU ESSAY	اعجاز ناصر	پاکستان ٹائمز لاہور	۱ اکتوبر ۸۳

URDU ESSAY	جمیل یوسف	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء
MUCH ADO ABOUT THE ESSAY	ایک عام قاری	پاکستان ٹائمز لاہور	۲۱ ستمبر ۱۹۸۳ء
THE OLIVE BRANCH	کرنل غلام سرور	روزنامہ مسلم راولپنڈی	۱۲ نومبر ۱۹۸۳ء
THE ART OF ESSAY WRITING	لطیف جعفری	روزنامہ ڈان کراچی	۲۱ جنوری ۱۹۸۴ء
FORGOTTEN ESSAYIST MAULVI AHMAD DIN	خواجہ منیر احمد	پاکستان ٹائمز لاہور	۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء
THE DEFINITION OF INSHAIYA	انور سدید	پاکستان ٹائمز لاہور	۳۰ جون ۱۹۸۴ء
LIGHT ESSAY IN URDU	غلام جیلانی اصغر	پاکستان ٹائمز لاہور	یکم جولائی ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں کی کتابیں

۱۔ "ریگِ سیاہ" (شعری مجموعہ) دوسرا ایڈیشن۔ پاکستان میں شائع ہوگا۔
(زیرِ اہتمام خواجہ رضی حیدر)

۲۔ "زیرِ غور" تنقید کا پہلا مجموعہ (زیرِ طبع)

۳۔ "مقدمہ، اٹھارھویں صدی کی اُردو شاعری کی فرہنگ"
تحقیقی مقالہ (حصہ اوّل) (زیرِ طبع)

۴۔ "کشش" دوسرا شعری مجموعہ (زیرِ اشاعت)

اختر ہوشیارپوری

چھتریوں کے ہوتے بھی راستے میں بھیگے گا
ایسی سخت بارش میں کون گھر سے نکلے گا

موسموں کی تصویریں چشمِ تر سے بنتی ہیں
ورنہ سادہ کاغذ پر کس کا عکس اُترے گا

کیسی کیسی آوازیں شام سے ڈراتی ہیں
کون اَنا کے جنگل میں تا بہ صبح ٹھہرے گا

ٹہنیوں کو مت کاٹو یہ چمن کا زیور ہیں
ان کی اوٹ سے اِک دن آفتاب اُبھرے گا

اپنا تجربہ یہ ہے اپنی راہ خود ڈھونڈو
دوسروں کی راہوں پر جو چلے گا بھٹکے گا

دیپ کا جلانا کیا دیپ بجھ ہی جاتے ہیں
صبح ڈوب جائے گا رات کو جو چمکے گا

اب اُسے سمجھنے میں عمر چاہیے مجھ کو
چہرہ اُس نے بدلا ہے پیرہن بھی بدلے گا

ٹہنیوں پہ بُور آیا تو ثمر بھی آئیں گے
موسموں کی خوشبو سے سنگِ در بھی مہکے گا

اور کون ہے اختر ایک اپنا سایہ ہے
شہرِ زندگی میں جو میری راہ روکے گا

ادا جعفری

نہ کرامتیں کسی خواب کی، نہ کسی یقین کا سائباں
مرے روز و شب میں کہیں نہیں مرے روز و شب کی گواہیاں

انہیں پڑھ سکو تو کتاب ہیں یہ جو ریزہ ریزہ ہیں سسکیاں
انہیں چھو سکو تو گلاب ہیں یہ جو خار زار میں کلیاں

مرا غم بھی تُو ہے خوشی بھی تُو، سبھی راستے تری سمت ہیں
یہ بتا کہ کیوں مرے قد سے کم ہے مری زمیں مرا آسماں

کہیں کُنجِ دل میں ابھی تلک انہیں نکہتوں کا خرام ہے
کسی ایک لمحۂ درد نے جنہیں لکھ دیا سرِ داستاں

یہ جو انتظار کے رنگ ہیں یہ سبھی بہار کے رنگ ہیں
دلِ بے ہُنر کے نصیب میں نہ لکھا گیا ہے کبھی زیاں

یہ جہانِ دانش و آگہی، یہاں کون دل کے قریں
مگر آج بھی کوئی چشمِ نم، کسی چشمِ نم کی ہے رازداں

لبِ زخم سے جو ادا ہوئیں وہ حکایتیں ہی کچھ اور تھیں
یہ کہانیاں ہیں کچھ اور ہی جو سُنا گیا مرا قصہ خواں

عبدالعزیز خالد

جو حرفِ حق مری نوکِ زباں پہ آ نہ سکا
فساد بن کے مرے تن بدن میں پھیل گیا

زمیں کی سطح بنائی اسی نے ناہموار
کہ جس نے تفرقہ اہلِ زمین میں رکھا

جواب دیتا ہے اس کی پکار کا فوراً
پکارے جب اسے کوئی پکارنے والا؟

کرو زباں سے دیانت کے لفظ کو خارج
کہ اس کو راس نہیں اس نگر کی آب و ہوا

یہاں نہیں ہے مداوا بغیرِ دار و مدار
یہاں ہو زر کی چکا چوند، سچ نہیں چلتا

وہ بادشہ ہے میسر ہے جس کو مایحتاج
جو بے کہے سُنے کرتا ہے اپنا فرض ادا

انہی میں شہرہ ہُوا ہم سے ہُنر رسوں کا بھی
جنھوں نے اپنے دلوں کو فضول خرچ کیا

کہاں گئی وہ پیام و سلام کی ساعت؟
وہ حلف کیا ہوئے؟ وہ گفتگو و پیماں کیا؟

سنہرے تانبے کے مانند دمکے جلد کا رنگ
نئے سبوچے میں تازہ شراب کا نشہ

ہُوا یہ تذکرۂ غوثیہ سے علم ہمیں
فقیر دوست تھا غالب بدرجۂ اولیٰ

ہے میرا نام تو سرنامۂ جدیدۂ شعر
ہر ایک قافیہ پیما کا ہے یہی دعویٰ!

انور سدید

سانسوں میں مل گئی تری سانسوں کی باس تھی
بہکی ہوئی نظر تھی کہ پھر بھی اُداس تھی

بے شک شکستِ دل پہ وہ مبہوت رہ گیا
لیکن شکستِ دل میں بھی زندہ اک آس تھی

گر تُو مرے حواس پہ چھایا ہُوا نہ تھا
ہستی وہ کون تھی جو رگِ دل کے پاس تھی

بے چارگی کے کہر میں ڈوبا ہُوا تھا شہر
رونق تمام دل کی مرے آس پاس تھی

بارش سے آسمان کا چہرہ تو دُھل گیا
دھرتی کے ہونٹ پر ابھی صدیوں کی پیاس تھی

کونپل نے آنکھ کھول لی تو حیران رہ گئی
حدِ نظر تلک یہ زمیں بے لباس تھی

ہونٹوں پہ اک گلاب تھا تازہ کھلا ہوا
آنکھوں کے آئنوں میں تمنّا اداس تھی

انور سدید سوچتا رہتا ہوں ان دنوں
وہ کون تھا کہ جس کے لیے دل میں پیاس تھی

جمیل ملک

موجِ ہوا بھی اِک گرداب سی لگتی ہے
سینے پہ آکر مضراب سی لگتی ہے

جو بھی آتا ہے وہ ڈوبتا جاتا ہے
جو ساعت بھی ہے گرداب سی لگتی ہے

روک رہے ہیں اُلجھی سُلجھی سانسوں سے
دِل کی ہر دھڑکن سیلاب سی لگتی ہے

چھوڑ کے تنہا خود آگے بڑھ جاتی ہے
وقت کی چال مجھے احباب سی لگتی ہے

پھولوں کی رُت آنے کے دِن بیت گئے
اب تو ہر خواہش اِک خواب سی لگتی ہے

اوڑھ کے اِس کو پیاسا ہی سو جاتا ہوں
آسمان کی چادر، آب سی لگتی ہے،

جس صورت کو دل میں چُھپائے پھرتا ہوں
وہ صورت کتنی نایاب سی لگتی ہے!

میرا سارا رُوپ ہے اِس آئینے میں
مجھ کو یہ دھرتی مہتاب سی لگتی ہے

تیرے بدن کا لوچ مجھے یاد آتا ہے
سبزے کی چادر، کمخواب سی لگتی ہے

آؤ ہم بھی چاند کی کشتی میں ڈو لیں،
یہ پگھلی چاندی سیماب سی لگتی ہے

اُٹھتے بیٹھتے چہرے پڑھتا رہتا ہوں
اِک اِک صورت ایک کتاب سی لگتی ہے

اصغر سودائی

رُت کالی ہے ہولے ہولے چلتے رہنا
تیز ہَوائیں تنکا تنکا جلتے رہنا

گلیوں گلیوں گھومنا اس کے شہر میں لیکن
پاؤں پاؤں اپنی چاپ بدلتے رہنا

لوگ گھنے زخموں پر چُن چُن کر رکھتے ہیں
برف کے پھاہے جن کا کام پگھلتے رہنا

یہ آنکھیں تو اُن سپنوں کا ساتھ نہ دیں گی
ان کو پَل پَل بُجھتے رہنا جلتے رہنا،

دُنیا پیاری دُنیا دیکھنے والی شے ہے
کبھی کبھی دل سے باہر بھی نکلتے رہنا

یہ رُت ہے آنگن آنگن جوبن پھلواری
اس رُت کے اک اک سانچے میں ڈھلتے رہنا

تم گرمی کی تپتی رُتوں کی ڈال نہیں ہو
تم سردی کی گیلی دُھوپ میں پلتے رہنا

اندر جسموں کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں
باہر سے آوازہ آتی ہے سنبھلتے رہنا

ضبط کا بندھن ٹوٹنے کی تصویر بنا ہوں
آنسو پینا، منہ سے آگ اُگلتے رہنا

اصغر یہ ساری بستی ہے کنگالوں کی
سورج ہو تو سونا بن کے پگھلتے رہنا

مظہر امام

شکریہ تیرا کہ غم کا حوصلہ رہنے دیا
بے اثر کر دی دعا، دستِ دعا رہنے دیا

پاؤں سب کے توڑ ڈالے، قافلہ رہنے دیا
منزلیں ناپید کر دیں، راستہ رہنے دیا

منصفی کا شورِ محشر گونجتا رہنے دیا
سب دلیلوں کو سنا اور فیصلہ رہنے دیا

کچھ اشارے۔ اتنے مبہم، اتنے واضح، اتنے شوخ
داستاں ساری سنا دی، مدعا رہنے دیا

ایک نازِ بے تکلف میرے تیرے درمیاں
دوریاں ساری مٹا دیں، فاصلہ رہنے دیا

دلوں کے بیچ عجب، رابطہ ہے کتنی دیر!
وہ آشنا ہے، مگر آشنا ہے کتنی دیر!

نئی ہوا ہے، کریں مشعلِ ہوس روشن
کہ شمعِ درد، چراغِ وفا ہے کتنی دیر!

اب آرزو کو تری بے صدا بھی ہونا ہے
ترے فقیر کے لب پر دعا ہے کتنی دیر!

اب اس کو سوچتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں
کہ تیرے غم سے تعلق رہا ہے کتنی دیر!

ہے خشک چشمۂ صحرا، مریض وادی و کوہ
نگار خانۂ آب و ہوا ہے کتنی دیر!

ٹھٹھرتے پھول پہ تصویرِ رنگ و بو کب تک!
جھلستی شاخ پہ برگِ حنا ہے کتنی دیر!

شہرت بخاری

عالم جو آج دل کا ہے ایسا کبھی نہ تھا
حسرت تھی، بے کسی تھی، اندھیرا کبھی نہ تھا

لگتا ہے اب کے ٹوٹ کے جڑنا محال ہے
جتنا اداس آج ہوں، اتنا کبھی نہ تھا

سو مرتبہ ہوئی ہے ملاقات موت سے
پر جس طرح کا اب کے ہے نقشہ کبھی نہ تھا

جو کہنے والے کی بھی سمجھ میں نہ آ سکے
ذکر اپنا ایسا بے سر و بے پا کبھی نہ تھا

گھر میں بھی منہ چھپانے کو ملتی نہیں جگہ
مجھ سا کوئی بھی شہر میں رسوا کبھی نہ تھا

روشن ہے دل چراغ تمنائے مرگ سے
ایسا میں اطمینان سراپا کبھی نہ تھا

صحرا تھا اور دھوپ نہایت تھی خوف کی
شہرتؔ جہاں میں نام کو سایا کبھی نہ تھا

افتخار عارف

سرِ بام ہجر دیا بجھا تو خبر ہوئی
سرِ شام کوئی جدا ہوا تو خبر ہوئی

مرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

مرے سارے حرف تمام حرف عذاب تھے
مرے کم سخن نے سخن کیا تو خبر ہوئی

کوئی بات بن کے بگڑ گئی تو پتہ چلا
مرے بے وفا نے کرم کیا تو خبر ہوئی

مرے ہم سفر کے سفر کی سمت ہی اور تھی
کہیں راستہ کوئی گم ہوا تو خبر ہوئی

مرے قصہ گو نے کہاں کہاں سے بڑھائی بات
مجھے داستاں کا سرا ملا تو خبر ہوئی

نہ لہو کا موسمِ رنگ ریز نہ دل نہ میں
کوئی خواب تھا کہ بکھر گیا تو خبر ہوئی

میں وہ مہر ہوں کہ دو نیم ہو کے بھی سرخرو
میں غبارِ راہِ وفا ہوا تو خبر ہوئی

ضمیر اظہر

زنگ آلود قفل بولے گا
وقت اس کی زبان کھولے گا

شکل سارے مکاں کی بدلے گی
کمرہ کمرہ خوشی سے ڈولے گا

گنگنائیں گے بام و در — آنگن
رس میٹھے فضا میں گھولے گا

بستی بستی میں لوگ ناچیں گے
پنچھی پنچھی ہوا میں ڈولے گا

موتیوں کی تلاش میں اظہر
آنسوؤں کو نہ کوئی رولے گا

ذکاء الدین شایاں

حرف، لفظ و کتاب خاموشی
دل کا پہلا ہی باب خاموشی

غم نمائش، سوال شور و غل
اور تمہارا جواب خاموشی

خوف افزا حقیقت عالم
چاندنی خواب خواب خاموشی

آپ خوشبو میں تیرتے ہوئے حرف
بھیگی پلکیں، کتاب، خاموشی

شام، جیسے سکوت بعدِ کلام
صبح اک لاجواب خاموشی

کشور ادیب

رُک گیا تھا یاد بن کر، شام کی دہلیز پہ
چلتے چلتے ایک پیکر، شام کی دہلیز پہ

کشتیٔ عمرِ رواں کے بادباں سب کھول دے
سر بسجدہ ہے سمندر، شام کی دہلیز پر

خوف سے سہما ہُوا میں درد میں ڈوبا ہوا
لکھ رہا ہوں غم کے دفتر، شام کی دہلیز پر

حُسنِ قامت کی بلندی سے کبھی تو دیکھ لے
ڈوبتے سُورج کا منظر، شام کی دہلیز پہ

دیکھنا، سقراط بن کر پی سکے گا کون اب
زہر سے لبریز ساغر، شام کی دہلیز پر

مے کدے میں ہے سکوں نہ گھر میں ملتی ہے اماں
آگیا ہے غم کا لشکر شام کی دہلیز پر

گھر سے نکلا تھا گدائے رزق بن کر صُبحدم
آگیا ہوں اب پلٹ کر، شام کی دہلیز پر

ضیاء شبنمی

صبا اُسے ترے آنے کی جب خبر دے گی
وہ اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے گی

اداس دل! ترے آنگن میں جستجو اپنی
یوں ہی رہے گی تو جینے کا اک ہُنر دے گی

مَیں انتسابِ غزل اُس کے نام کر دوں گا
یہ اختیار اگر مجھ کو وہ نظر دے گی

غزل غزل مری سوچوں میں اک یہ سوچ بھی ہے
مری صدا ہی مجھے تحفۂ ہُنر دے گی

گلاب صبحوں کی خاطر لڑا ہوں راتوں سے
گواہی اس کی مری چشمِ تر بہ تر دے گی

مَیں تیری نذر کروں نقدِ جاں نگارِ وطن
یہ ظرفِ حرف مجھے میری ماں اگر دے گی

ہوائے شب نہ بھٹک تیرے ساتھ صحرا میں
کہ ساتھ تُو نے دیا بھی تو کس قدر دے گی

ضیا مَیں اُس کے در و بام جگمگا دوں گا
جو رات شبنمی پروانۂ سحر دے گی

سوز حجاز

وہ بھی اِک دِن تنہا ہوگا
اُس کا حال بھی مجھ سا ہوگا

سارے شہر کی دیواروں پر
میرا نام ہی لِکھّا ہوگا

تُم نے بھی حالات کا آخر
کوئی نام تو رکھّا ہوگا

جو کچھ بھی ہے دیکھے جاؤ
یہ مت پوچھو اب کیا ہوگا؟

یار حجاز وہ مِل جائے تو
بس پھر ایک تماشہ ہوگا

راسخ عرفانی

رگوں کے جبر میں سانسوں کے اختیار میں ہوں
کئی قرون سے زندانِ بے حصار میں ہوں
گئی رُتوں کا نوشتہ ہوں لوحِ عالم پر
پُرانا پیڑ ہوں شامل نئی بہار میں ہوں
جاؤں راہ بھی، قدموں کی ٹھوکریں بھی سہوں
سرِ دیارِ ستم نصب رہگزار میں ہوں،
قرارِ جاں کے تجسّس میں حادثوں کا سفر
کہیں خلا میں کہیں خلوتوں کے غار میں ہوں
وہ جس کو آنا تھا آیا بھی اور چلا بھی گیا
خبر نہیں کہ میں اب کس کے انتظار میں ہوں
لڑوں غموں سے کبھی خواہشوں سے جنگ کروں
بغیر فوج کے تنہا میں کارزار میں ہوں
زمیں بھی مجھ کو سکڑتی ہوئی لگے راسخ
فرازِ چرخ پہ جانے میں کس مدار میں ہوں

مظفر حنفی

اِن کا حصہ ، پھول چمن بھر
میری جھولی میں اُلجھن بھر

چھپکوں ، پھپکوں برسے آنسو ،
بوند نہیں ٹپکی ساون بھر

سوچو تو کو نین کی رونق
دِل کی معمولی دھڑکن بھر

دُنیا کو پھر جل تھل کرنا
پہلے آنکھوں کا دامن بھر

بھولا پنچھی واپس آیا
کیسا چونک پڑا گلشن بھر

پتھر پتھر پہ لکھا ہے
سارے شیش محل چھن چھن بھر

کھڑکی سے جھانکا کرتا ہے
میرا بھی ہے چاند کرن بھر

گہرے شعر منظفر جیسے
ناگن بِل سے باہر پھن بھر

احسن زیدی

اے کاش کوئی آئے جو اس کے ہنر کھولے
اس غار میں جا اُترے، اس ذات کے دَر کھولے

خیرات جو دیتے تھے وہ جا بھی چکے کب کے
کِس کے لئے بیٹھے ہو کشکولِ نظر کھولے

لَوٹ آئے تو ہیں لیکن، ہاں مُہر بہ لب سارے
اِک شخص نہیں ایسا جو رازِ سفر کھولے

تہ دار ہے ذات اس کی، بے حد ہیں جہات اس کی
سو بات نکل آئے اک بات اگر کھولے

وہ لوگ ہیں ہم اکثر لمحاتِ تصادم میں
غیروں سے تو کیا لڑتے اپنوں ہی کے سر کھولے

تعریف ہو کیا اس کی اور اس کے سوا احسن
اِک سانپ سا بیٹھا ہے گنجینۂ زر کھولے

اکبر حمیدی

تنے ہوئے وہ ابرو سے خمدار دکھائے
ہر بات پہ ظالم ہمیں تلوار دکھائے

نازاں ہے بہت حسن پہ اپنے وہ اُسے بھی
لے جا کے کوئی مصر کا بازار دکھائے

میں اُس سے رہائی کا طلب گار ہوں جس سے
پوچھے کوئی دروازہ تو دیوار دکھائے

آنکھوں کی بجائے ہمیں اخبار ملے ہیں
دیکھیں گے وہی جو ہمیں اخبار دکھائے

شہر کا ہے ارشاد کہ اکبر کی بھی غزلیں
چھاپیں گا مگر پہلے خریدار دکھائے

کرشن کمار طور

میں ہوں منظر، پس منظر سے میرا رشتہ بہت
آخر میری پیشانی پر سورج چمکا بہت

جانے کون سے اسمِ انا کے ہم زندانی تھے
تیرے نام کو لے کر ہم نے خود کو چاہا بہت

اِن سے کیا رشتہ تھا وہ کیا میرے لگتے تھے
گرنے لگے جب پیڑ سے پتے تو میں رویا بہت

کیسی مسافت تھی درپیش سفر تھا کیسا کہو
میں نے اس کو اس نے مجھ کو مڑ کے دیکھا بہت

کس کے دستِ سوال میں ہے اک لمبی چپ کا چراغ
جھانکتا ہے کیوں اک کھڑکی سے کوئی چہرہ بہت

اس نے بھی کسی اور کے غم میں مجھ کو رنج دیئے
میں نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر کھایا دھوکا بہت

ہے دریا کے لمس پہ نازاں اک کاغذ کی ناؤ
سورج سے سرگوشی کرتا ہے اک دریچہ بہت

اس نے اک اک حرف پہ میرے پانی پھیر دیا
دل کی دُھلی ہوئی تختی پر میں نے بھی لکھا بہت

ساری عمر کسی کی خاطر سولی پہ لٹکا رہا،
شاید طور مرے اندر اک شخص تھا زندہ بہت

آزاد گلاٹی

اب اس کے بعد اسی کا یہاں گزرنا کیا
چراغ اپنے دریچے پہ ہم نے دھرنا کیا،

محبتوں کا سفر تو ہے ساگروں کا سفر
کسی کا ڈوب گیا، اور پار اترنا کیا،

خوشیوں کے لئے کان جن کے بہرے ہوں
زبانِ حرف سے بھی اُن سے بات کرنا کیا،

ہم اشک ہیں تو ڈھلک کر زمیں پہ گر جائیں
کسی کی آنکھ میں، اِن چاہا سا، ٹھہرنا کیا،

جو عام سطح سے نیچے ہوں دوست اُن کے لئے
ہمارا اپنی بلندی سے بھی اُترنا کیا،

حیات بن گئی بے نام منزلوں کا سفر
کسی جگہ پہ کسی کے لئے ٹھہرنا کیا،

اگر سکت نہ ہو ساگر سنبھال رکھنے کی
تو بُوند بُوند سے کچے گھڑے کو بھرنا کیا،

گزرتے وقت کے ہاتھوں سبھی کے اے آزاد
بگڑ گئے ہیں یوں چہرے کہ اب سنورنا کیا،

سلیم گیلانی

اِدھر ہم چُپ اُدھر تم سرگراں، اچھا نہیں لگتا
یُونہی اٹھتا رہے دل سے دھواں اچھا نہیں لگتا

اِدھر کچھ دن سے لہجے میں ترے ہلکی سی تبدیلی
یہ کچھ ابہام سا اے جانِ جاں اچھا نہیں لگتا

مرے شکوے تو اب تک تم کو ازبر ہو چکے ہوں گے
میں دہراتا رہوں یہ داستاں، اچھا نہیں لگتا

وفائیں عمر بھر کی اک گھڑی میں بھول جاتے ہو
یہ ہر لحظہ نیا اک امتحاں، اچھا نہیں لگتا،

اگر ضد ہی کی ٹھانی ہے تو لو ہم مان جاتے ہیں
کوئی غیر آئے اپنے درمیاں اچھا نہیں لگتا،

یہ تم بھی جانتے ہو حُسن کے جلوے ہمیں سے ہیں
اگر یوسف بھی ہو بے کارواں، اچھا نہیں لگتا

کنایوں میں سُنایا حالِ دل اُن کو، تو کہتے ہیں
بیاں ذیل حدیث دیگراں اچھا نہیں لگتا،

ہمیں بھی اُن کی جانب سے سدا کی بدگمانی ہے
پر اُٹھتے بیٹھتے اس کا بیاں اچھا نہیں لگتا

تم آتے ہو تو کانٹے بھی بھلے لگتے ہیں شاخوں پر
تمہارے بعد تو کچھ بھی یہاں اچھا نہیں لگتا

زبیر رضوی

میں جو بچھڑ جاؤں تو بچھڑ جانے کا غم مت کرنا
دل کو افسردہ کبھی آنکھ کو نم مت کرنا

کچھ بھنور مجھ کو بھی پانی کے سفر میں دینا
اے ہوا، شورشِ امواج کو کم مت کرنا

اس کو چھو لوں تو یہی اس کا سراپا لکھ دوں
اس سے پہلے مرے ہاتھوں کو قلم مت کرنا

کل نہ ہو یہ کہ ترس جائے ہنسی کو چہرہ
خود کو اس طور سے وابستۂ غم مت کرنا

ہجر کے چاند نے اک بار کہا تھا یہ زبیر
دامنِ دل پہ کوئی نام رقم مت کرنا

خادم رزمی

وہی غبار، کڑی دھوپ، زخمِ پا اور ہم
نظر میں خواب سی منزل کا راستا اور ہم
وہی بسے ہوئے آنکھوں میں گرد گرد سے خواب
وہی لبوں پہ سسکتی ہوئی دعا اور ہم
امانتیں ہیں کسی گم شدہ قبیلے کی،
اکیلی رات کو جلتا ہوا دیا اور ہم
بغیر سمت مقرر کئے سفر میں ہیں
گئے دنوں کی طرح آج بھی ہوا اور ہم
مہکتے زخم بچھڑنے پہ تیرا خواب اور تو
دھواں دھواں سی فضا، چاند ڈوبتا اور ہم
سب ایک سے ہیں، ترے شہرِ رنگ و خوشبو میں
شجر سے ٹوٹ کے پتا گرا ہوا اور ہم
افق سے پھوٹتی گلنار رو، بکھرتی رات
خیال میں ترا چہرہ گلاب سا اور ہم
یہ کس کا عکس ابھرتا ہے درمیاں رزمی
جو روبرو کبھی ہوتے ہیں آئینہ اور ہم

بیدل حیدری

یہ بادِ صبا اور یہ جھونکے بھی اُسی کے
یہ صحن یہ آنگن اور یہ دریچے بھی اُسی کے

وہ جھیل میں اُترے کہ کسی صحن میں اُترے
ان چاند ستاروں کے یہ زینے بھی اُسی کے

وہ نیلم و یاقوت ہوں یا دُرِّ نجف ہو
وہ خاتمِ دوراں ہے نگینے بھی اُسی کے

ہر کُونج، ہر اک مور، ہر اک فاختہ اُس کی
وہ امن کا بانی ہے پرندے بھی اُسی کے

وہ صبح ہے اور صبح کی کرنیں بھی اُسی کی
وہ دھوپ ہے اور دھوپ کے تمغے بھی اُسی کے

میں جو بھی لکھوں صرف اُسی کے لیے لکھوں
غزلیں بھی اُسی کی، مرے نغمے بھی اُسی کے

اب سے نہیں، اوّل سے پرستار ہوں اُس کا
میں سجدے کیا کرتا تھا پہلے بھی اُسی کے

دریا میں ڈبو دے کہ کنارے پہ لگا دے
پتواریں بھی اُس کی ہیں سفینے بھی اُسی کے

پیکر بھی اُسی کا قد و قامت بھی اُسی کا
اور قاف کی وادی میں سفیدے بھی اُسی کے

وہ اطلس و کمخواب کا شہزادہ ہے بیدلؔ
شالیں بھی اُسی کی ہیں دوشالے بھی اُسی کے

اسعد بدایونی

مری انا مرے دُشمن کو تازیانہ ہے
اسی چراغ سے روشن غریب خانہ ہے

میں اک طرف ہوں کسی کنجِ کم نمائی میں
اور ایک سمت جہاندارئ زمانہ ہے

یہ طائروں کی قطاریں کدھر کو جاتی ہیں
نہ کوئی دام بچھا ہے کہیں نہ دانہ ہے

ابھی نہیں ہے مجھے مصلحت کی دھوپ کا خوف
ابھی تو سر پہ بغاوت کا شامیانہ ہے

مری غزل میں رجز کی ہے گھن گرج تو کیا
سخنوری بھی تو کارِ سپاہیانہ ہے

اکبر حیدرآبادی

بیکراں تنہائی جاں کا پتہ دینے لگے
تھا وہ سناٹا کہ سائے بھی صدا دینے لگے

شائبہ بھی تھا نہ کوئی ارتکابِ جرم کا
ہم ہجومِ خوف میں خود کو سزا دینے لگے

جی اُٹھا آئینہ خانہ کس کے عکسِ حسن سے
پل میں سارے آئینے خود کو جلا دینے لگے

جم چکی تھی جن پہ اب تک اَن گنت صدیوں کی گرد
کچھ سراغِ راہ اب وہ نقشِ پا دینے لگے

آسماں سے ارض کی جانب چلی اک جوئے نور
ابر و باد و کہکشاں سب راستہ دینے لگے

نقش پانی کا رہا کتنے زمانوں پر محیط،
ساحلوں کے سنگ پارے کچھ پتہ دینے لگے

دیکھ اکبر ازدحامِ فکر کی شانِ نزول
شعر خود مجھ کو ردیف و قافیہ دینے لگے

اکبر کاظمی

کیا بتاؤں زندگی کا سلسلہ
دشت میں جیسے ہو اِک جلتا دِیا

رُخ ہواؤں کا بھی تھا بدلا ہُوا
بادباں مَیں نے بھی تھا کھولا ہُوا

جس قدر اونچے مکاں بنتے گئے
اس قدر انساں کا قد گھٹتا گیا

آدمیت دیکھتی ہی رہ گئی،
شہر کا صحرا سے جب رشتہ ہُوا

بے طلب مانگا تو خود سے بھی گئے
ہاتھ پھیلا کر لیا تو کیا لیا،

کاظمی دیکھا تھا مَیں نے رات کو
دل کی مسجد میں کوئی روتا ہُوا

روحی کنجاہی

وہ بات ہوئی کیا کوئی سوچے کہ نہ سوچے
تصویر کا یہ رُخ کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے

ہوتے ہیں کچھ ایسے ہی جوانی کے تقاضے
یہ فاش حقیقت کوئی مانے کہ نہ مانے

اندازِ ملاقات بتا دیتا ہے سب کچھ
احوال کسی سے کوئی پوچھے کہ نہ پوچھے

دستک تو بہر حال صدا دیتی رہے گی
دروازہ ہوا پر کوئی کھولے کہ نہ کھولے

آنا ہی نہیں کوئی جواب اس کی طرف سے
ایسے میں کوئی خط اُسے لکھے کہ نہ لکھے

کہتا ہوں سدا دل کی سمجھتا بھی ہوں دل کی
جانے کہ نہ جانے کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے

مضمون تو کھل جاتا ہے بس پہلے ورق سے
اوراقِ دل و جاں کوئی اُلٹے کہ نہ اُلٹے

رُوحی کوئی پڑھتا نہیں چہرے کی بھی تحریر
سینے میں کسی کے کوئی جھانکے کہ نہ جھانکے

اظہر ادیب

خوش ہو نہ تُو کہ ختم ہوا دھوپ کا سفر
در کھٹکھٹا رہا ہے نیا دھوپ کا سفر

پہنا کے موم جسم مجھے بے نیاز نے
میری ہتھیلیوں پہ لکھا دھوپ کا سفر

صدیوں چلا ہوں پھر بھی سفر ناتمام ہے
سانسوں کا سلسلہ بھی ہوا دھوپ کا سفر

کالے سمندروں سے گذر کر بھی کیا ملا
تپتی زمین، گرم ہوا، دھوپ کا سفر

پوچھا شجر نے کیا ہے نئے موسموں کے پاس
جاتی ہوئی ہوا نے کہا "دھوپ کا سفر"

پھر آ پڑا ہے سر پہ مرے ہجرتوں کا بوجھ
پھر دے رہا ہے مجھ کو صدا دھوپ کا سفر

پیڑوں کے سائے لُوٹ لئے زرد لہر نے
لے دے کے اپنے پاس بچا دھوپ کا سفر

نیلاہٹیں گلاب بدن پر بکھر گئیں
اپنے نشان چھوڑ گیا دھوپ کا سفر

چھتری تو قرض خواہ کو اظہر چلی گئی
اور میرے وارثوں کو ملا دھوپ کا سفر

ستار الٰہ آبادی

گرد ہوں رہگذر میں رہتا ہوں
میں مسلسل سفر میں رہتا ہوں

ہر طرف اک سکوت کا ہے سماں
پتھروں کے نگر میں رہتا ہوں

اُن کے دل میں ہوں آبرو کی طرح
آب بن کر گہر میں رہتا ہوں

آسماں ہے مری نگاہوں میں
وسعتِ بحر و بر میں رہتا ہوں

میری پہچان ہے ستار یہی
ان صفاتِ بشر میں رہتا ہوں

کاوش پرتاپ گڑھی

سایہ سایہ سا ہمسفر رہا تھا
رُک رُک کر آنکھوں کو مَلا تھا

پہلے پہل جب شہر آیا تھا
بیچ سڑک کے میں چلتا تھا

دیکھا چاند ہے اب قدموں میں
کل ہم نے سپنا دیکھا تھا

دھو آیا ہوں پاپ سب اپنے
گنگا میں اشنان کیا تھا

رات کی رانی جاگ رہی تھی
جب سناٹا چیخ اُٹھا تھا

دیکھی آنکھوں سے دیکھا ہے
سورج کا جب قتل ہُوا تھا

ہم سخنوں کی بھیڑ میں غالب
آج بھی ہے کل بھی تنہا تھا

چھوڑو بھی کاوش کی باتیں
کہتے ہیں وہ دیوانہ تھا

جلتا ہُوا ٹائر

رام لعل

"سُنو جی! کیا کہہ رہی ہوں مَیں!"

"ٹفن پیک کر دیا ہے مَیں نے۔"

"ڈبّہ لے جاؤ نا اُٹھا کر اَب۔"

سُکھونت کور کی رسوئی سے آتی ہوئی مترنّم آواز کے ہر جُملے کے آخری لفظ کی ادائیگی میں ایک غیر معمولی طوالت بھی ہے۔ جیسے کوئی بچّہ ببل گم چباتے چباتے اُسے انگلیوں سے بار بار باہر کھینچ کر لُطف اندوز ہو رہا ہو۔

"سُن لیا حضور، سُن لیا۔ زیادہ مت چلاؤ مہربانی کر کے۔ جرسی کی زِپ پھنس گئی ہے ذرا۔ آتا ہوں۔"

یہ سردار بے انت سنگھ بھلّر ہے۔ فکسو سے تازہ تازہ جمائی ہوئی داڑھی پر ٹھاٹھا کسا ہوا جس کے دونوں سِرے اُس کی لال رنگ کی پگڑی کے عین اُوپر بندھے ہوئے ہیں۔ اُس کی پیشانی پر پگڑی کی خوبصورت تہوں کے نیچے لپٹے ہوئے پیلے پٹکے کی جھلک بڑی خوشنما لگ رہی ہے۔ اُسی رنگ کی آدھی آستین کی جالی کی جرسی، جس کی زِپ اُس نے اپنی ہڑبڑاہٹ میں پھنسا لی ہے۔ اُونچی ایڑھی کے سفید کاف کے بوٹوں سے ٹھپ ٹھپ کرتا ہوا رسوئی میں آ دھمکتا ہے۔

"اب کیا کروں بیلیئے، اسی کے لفڑے میں تو روز ہی گھر سے نکلنے میں دیر ہو جاتی ہے۔"

سُکھونت ذرا جُھک کر جائزہ لیتی ہے۔ بھلّر کا ہاتھ ہٹا کر اپنے ہاتھ سے جھٹ زِپ چڑھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور مصنوعی غُصّے سے کہتی ہے۔

"آپ کو تو بلاوجہ ہر چیز سے اُلجھنے کی عادت ہے۔ اُوپر سے مجھے بھی پریشان کر دیتے ہو۔"

ابھی وہ سیدھی کھڑی بھی نہیں ہونے پاتی کہ وہ خود کو اپنے مرد کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہے۔

"یہ، یہ کیا کر رہے ہو جی! اُفوہ! اب تو دیر نہیں نا ہو رہی ہے دفتر جانے کی؟ مَیں کہتی ہوں ہٹو بھی! نہیں تو بے بے کو بُلاتی ہوں —— بیبے!!"

وہ اُس کی آواز اُس کے حلق میں ہی دبا دیتا ہے —— "بے بے کی بچّی! بُھول گئی، اُنہوں نے تیرا انتخاب لاکھوں میں سے کیا تھا

ہی سوچ کر کہ تو اُس کے اکلوتے پُتّر کے لیے میٹھی برفی کی ڈلی ثابت ہو گی!"

"میں کہتی ہوں، اب جاتے ہو کہ نہیں!" وہ ہاتھ بڑھا کر گارڈ ریل پر سے اسٹین لیس اسٹیل کا بیلنا اُٹھا لیتی ہے۔ "دے مارو
ہے! پھر نہ کہنا۔"

"ہے امر، مار نا میری بلبل! مارتی کیوں نہیں ہو اب!" وہ پیٹھ گھمانے لیکن گردن موڑ کر اُس کی جانب بڑی شریر نظروں سے تاک
رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔ اپنے ہونٹوں پر جیسے لگی ہوئی مٹھاس کو بھی زبان بھی پھیر کر چاٹتا جا رہا ہے۔

سکھونت بے بس ہو کر بیلنا واپس اپنی جگہ پر رکھ دیتی ہے —— "آپ کو تو واہگورو ہی بخشے تو بخشے! اب جاؤ نا بھی، میں
کہتی ہوں، دس بجنے کو آگئے اور یہ ہیں کہ ابھی تک!"

وہ دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے اچانک رُک جاتا ہے۔ پلٹ کر پھر دیکھتا ہے اور کہتا ہے —— "جان کیا کروں، تیری
بے پناہ خوبصورتی دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

"میں بے پناہ خوبصورت لگ رہی ہوں آپ کو اس حال میں!" وہ اپنی مسلی ہوئی شلوار قمیص پر ایک نگاہ ڈالتی ہے۔ پھر چہرے
کے ارد گرد جھولتی ہوئی بالوں کی لٹوں کو چھوتی ہے۔ "نہائی نہ دھوئی۔ کنگھی تک نہیں پھیر پائی ابھی تک۔ اس پر بھی کہتے ہیں ——
(بُھلّر کی نقل اتارتی ہوئی) جان کیا کروں، سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ لو پکڑو اپنا ٹفن باکس اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ مجھے اور بہت سے
کام کرنے ہیں ابھی۔ سارے کمروں میں جھاڑو پوچا لگانا ہے، کپڑے بھی دھونے ہیں۔ کوئی نوکر کم بخت تو ملتا نہیں آج کل۔"

"تیری اس ادا نے تو بس مجھے! تو ہر حال میں بس غضب ہے، غضب!"

وہ پھر آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن سکھونت اپنی ہنسی کو بمشکل تمام روکتی ہوئی اُسے دونوں ہاتھوں سے باہر دھکیل دیتی ہے،
ساتھ ساتھ چلّا بھی اُٹھتی ہے —— "ہے ہے جی!"

بُھلّر اپنی ماں کے ڈر سے جلدی سے وہاں سے کھسک جاتا ہے۔ جو دوسرے کمرے میں آنکھیں بند کیے جپ جی کا پاٹھ کر رہی ہے۔
اپنے بہو بیٹے کی پیار بھری تکرار روز ہی سنتی ہے۔ آج بھی اس نے پہلے کی طرح سنی ان سنی کر دی ہے۔

سکھونت جیسے اچانک تنہا رہ جاتی ہے۔ سارا شور جو اس کے باہر اور اندر بپا تھا یکسر ختم ہو چکا ہے۔ کسی اور کام کی طرف
متوجہ ہونے سے پہلے کھڑی کھڑی کچھ سوچ رہی ہے۔ اُسے نیچے سے اسکوٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ جلدی
سے اپنے بال کھول کر انہیں پھر سے جُوڑے میں لپیٹتی ہوئی بالکونی میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ دو منزل نیچے جھانک کر دیکھتی ہے۔ بُھلّر
...ا کے مطابق اُس کے الوداعی دیدار کا منتظر ہے۔ دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو 'ویو' کرتے ہیں۔ اسکوٹر پارک کے گرد چکر لگاتی ہوئی
مکانوں کے پیچھے غائب ہو جاتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہی وہ کس قدر مہذب اور متوازن ہو جاتا ہے۔ صرف گھر کے اندر اور وہ بھی اُس
وقت جب وہ اکیلی نظر آجاتی ہے، وہ کتنا بے قابو ہو جاتا ہے۔ بالکل پانچ برس کے بچوں کی طرح، جن کا شیوہ ہر اچھی چیز کو دیکھ کر
مچل جانا ہوتا ہے۔

سکھونت کی نظر اچانک بغل والے فلیٹ کی بالکونی پر کھڑی ارچنا سرینواس کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ دونوں کی نظریں ملتی ہیں اور
بے اختیار مسکرا دیتی ہیں۔

"تمہارے وہ چلے گئے؟"

"ہاں وہ تو نو بجے ہی نکل جاتے ہیں۔ راستے میں ببلی کو اسکول میں چھوڑنا ہوتا ہے نا۔"

شکھونت اپنے پڑوسیوں کے اس معمول کو بخوبی جانتی ہے۔ اکثر اس طرح کی بات پوچھ بیٹھتی ہے اور کبھی شرمندہ بھی نہ ہوتی۔ اُس وقت بھی اُس نے اپنی دہرائی ہوئی بات پر غور نہیں کیا اور نیچے اور دُور تک کے موڑ تک نگاہ دوڑا کر پوچھتی ہے۔ "ابھی تک کوئی ترکاری بیچنے والا نہیں آیا آج؟"

"آیا تھا — کچھ خاص نہیں تھا اُس کے پاس۔ ابھی اور کوئی آئے گا تو آپ کو آواز دوں گی۔"

"اچھا ہاں۔ آج مجھے ردّی نکالنی ہے۔ دو مہینے سے بہت جمع ہو گئے ہیں اخبار وغیرہ۔ کم بخت ٹھیک طرح سے بھاؤ بھی تو نہیں بتاتے۔"

"مجھے بھی نکالنی ہے۔ میرے پاس تو گھی اور تیل کے بہت سے ڈبے جمع ہیں۔ بلب اور پلاسٹک کی پرانی چپلیں بھی ہیں۔"

"اچھا تم وہ جاپانی جارجیٹ کی ساڑی لے آئیں؟ کہہ رہی تھیں نا نیا بازار میں ایک جگہ دیکھی تھی۔"

"ابھی نہیں۔ دو مہینے بعد ان کی بہن کی شادی طے ہوئی ہے۔ حیدر آباد جانا ہوگا۔ تبھی لیں گے۔ کچھ اور کپڑے بھی لینے گے۔"

اچانک ساس کی پکار سُن کر وہ "آئی بے بے جی" کہتی ہوئی اندر چلی آتی ہے۔ وہ پاٹھ پورا کر کے ناشتے کا انتظار کر رہ شکھونت جلدی جلدی رسوئی سے پلیٹیں اور ڈونگے لا کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھنے لگتی ہے۔ ساتھ ساتھ پوچھتی بھی جاتی ہے "کل رات والی ماہ چھولے کی دال بھی نکالوں بے بے جی؟ مکھن اور ڈبل روٹی بھی ہے۔ صبح تھوڑا سا پنیر بھی بنا لیا تھا۔ وہ لے آؤں؟ ساتھ کیا لیجیے گا لسّی یا چائے؟"

شام کو چار بجے کے قریب جب وہ دُھوپ میں سُکھائے ہوئے ڈھیر سارے کپڑے اتار کر کمرے میں واپس آئی تو بے حد تھک چکی تھی۔ اب کوئی اور کام کرنے کی اُس کے اندر ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ اُس کی ساس دیوان پر لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے ہی کپڑوں کے ڈھیر پر سر ڈال دیا۔

پارک میں کرکٹ کھیلتے ہوئے بچّوں کے شور کی وجہ سے جلدی ہی اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ لیکن وہ جاگی تو پوری طرح تر و تازہ تھی۔ دس پندرہ منٹ کی گہری نیند نے اُس کی ساری تھکن دُور کر دی تھی۔ اُس کی ساس ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ جلدی جلدی دُھلے ہوئے کپڑوں کو تہہ کیا۔ بستر کی چادریں، تکیوں اور گدّیوں کے غلاف اور تولیے الگ کیے۔ قمیصیں و شلواریں اور بے انت سنگھ کی بشرٹیں و پتلونیں اُٹھا کر کمرے کے کونے میں لے گئی جہاں فرش پر بیٹھ کر انہیں پریس کرتی تھی۔ ایک گھنٹے میں یہ سارا کام کر چکی تو جلدی جلدی کپڑے بدل ڈالے۔ بالوں کو بھی سنوار لیا۔

جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی تو اُسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا اُس کی یہ ساری آرائش تھوڑی دیر میں بھلا کر پاگل بنا دے گی۔ وہ اُسے دیکھتے ہی ایک عجیب سے جوش میں بھر جاتا ہے۔ کسی بھی عورت کے لیے اپنے آدمی کے دل میں پیار کے ایسے شدید جذبے کو اُبل اُبل پڑنا باعثِ فخر ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنا پیار ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ

بازاری جملے زبان سے نکالتا ہے اُنہیں سُن کر سُکھونت کو بڑی اُلجھن ہونے لگتی ہے - بلکہ ایک صدمہ سا محسوس ہوتا ہے اُسے - وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے - اُس کا شوہر بھی فرٹیلائیزر کارپوریشن میں ایک جونیئر افسر کے عہدے پر فائز ہے - لمبا تڑنگا، خوبصورت پُروقار - لیکن پتہ نہیں کیوں اُس کے قریب آتے ہی اُسے کیا ہو جاتا ہے ! جان، غضب، میری لیلیٰ، میری ہیر، ہائے جانی، برفی کی ڈلی، ہائے میری بامانی - ہائے میری زینت امان، جیسے القاب سے نوازنے کے علاوہ کبھی کبھی وہ اس قسم کی گھٹیا باتیں بھی کہہ جاتا ہے -

"جی چاہتا ہے آج تجھے کچا چبا جاؤں !"

"آج تو تیرے بدن سے تازہ بھُنی ہوئی جوار کی خوشبو پھُوٹ رہی ہے - مرک مرک کرکے کھا جاؤں ؟"

یہ سب سُننا اُسے بے حد تکلیف دہ لگتا ہے - توہین آمیز بھی - جیسے گلی، بازار میں سے اُسے جاتا ہوا دیکھ کر کسی لوفر نے فقرے بازی کر دی ہو !

بہو کی ساس کے جاگنے کی آہٹ پا کر وہ اُس کے کمرے میں گئی تو وہ بھی اُسے دیکھتی سی رہ گئی - اس کی بوڑھی آنکھوں میں اپنی بہو کے لیے بے پناہ تعریف اور اپنائیت بھری ہوئی تھی - وہ شرما سی گئی — جلدی سے بولی، "بے بے، چائے بنا لاؤں ؟"

"میرا پُتر آگیا ؟" وہ اُس کی طرف ابھی تک اپنے بیٹے کی آنکھوں ہی سے دیکھ رہی تھی -

"آنے کا وقت تو ہو ہی گیا ہے !" وہ اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے وہاں سے ہٹ کر بالکونی میں چلی گئی - یہ سوچتی ہوئی، اِس ماں نے اُسے واقعی کچا چبا جانے کے لیے ہی اپنے بیٹے کے لیے انتخاب کیا تھا - بے شمار لڑکیوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد اُسے اس بات کے لیے ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا اُس کے لیے کتنے گندے گندے الفاظ زبان پر لے آتا ہے - وہ سب سُنتی اور سمجھتی ہے - شاید من ہی من میں خوش ہی ہوتی ہے ! ہر ماں اپنے بیٹے سے اُس کی پسند کا اعتراف اسی طرح چاہتی ہے - بھلے ہی وہ اپنی بیوی کا ناک میں دم کر دے !

بچے گلی ڈنڈا، اینٹوں کے وکٹ بنا کر ابھی تک کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے - دفتر میں کام کرنے والے واپس آرہے تھے —— سائیکلوں، اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور ہلکی پھلکی موپیڈوں پر - کئی لوگ بس سے اُتر کر ڈھیر سے ڈھیر سے پیدل بھی آتے ہوئے دکھائی دیے - ارچنا سرینواس کے آدمی نے اپنی نو برس کی بیٹی کو اسکوٹر کے پیچھے بٹھائے پارک کا موڑ کاٹا اور بی بلاک کے فلیٹوں کے سامنے پہنچ کر رک گیا - اس نے سر اُٹھا کر اُوپر دوسری منزل کی طرف دیکھا - ارچنا اپنے جُوڑے میں پن ٹھونکتی ہوئی اسی وقت اندر سے برآمد ہوئی تھی - دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بڑی خاموشی سے لیکن مسرور نظروں سے دیکھا - اُن کی بیٹی ہیلو ممی کہتی اور اپنے کتابوں سے بھرے ہوئے بیگ کو پیٹھ پر پھر سے لادتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی - آنے جانے والوں کی بھیڑ میں اُسے اپنا شوہر بھی آتا ہوا دکھائی دے گیا - اُس نے دُور سے سکھونت کو اپنے انتظار میں کھڑا ہوا دیکھا تو وہیں سے اپنے ہونٹوں پر ایک ہاتھ رکھ کر لہرا دیا - یہ اُس کے لیے ہوائی بوسہ تھا - وہی لوفروں والا انداز - نہ جانے کس کس نے اپنے فلیٹ سے یہ منظر نہ دیکھا ہوگا ! وہ بُرا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ گئی - اندر آکر سیدھی کچن میں چلی گئی - گیس پر اُبلنے کے لیے پانی چڑھا کر فوراً اُس کمرے میں آگئی جہاں اُس کی ساس موجود تھی - وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے انت اُوپر پہنچ کر اُسے تلاش کرتا ہوا کچن میں پہنچ جائے اور اُس کی وہ گت بنا کر رکھ دے جس کے تصور سے بھی اُس کی جان جاتی تھی -

وہ اندر آ گیا۔ لیکن وہ اس کی طرف نگاہ اٹھانے کے بجائے ڈبے کھول کھول کر بسکٹ وغیرہ نکالنے میں لگی رہی۔ اس نے ا
کے قدموں کی چاپ سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر بڑی بے چینی سے گھوم رہا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ اُس نے بس رسمی
ہی ایک دو باتیں کہہ سُن لی تھیں۔ اصل بات تو وہ اُسی سے کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک دو بار ہاتھ بڑھا کر اُس نے بسکٹ
اُٹھائے اور اُس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ لیکن وہ تیزی سے پلٹ کر رسوئی کی طرف جاتی ہوئی بولی —— "کپڑے نہیں بدلنے
ذرا ہاتھ منہ بھی دھو لیتے!"

اُس کا بس چلتا تو اُس وقت رسوئی میں کبھی نہ جاتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی وہ اُس کے پیچھے پیچھے ضرور لپکا ہوا چلا آئے گا۔ وہی ہو
وہ کھولتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ملا رہی تھی کہ پیچھے سے آ کر اُس نے اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا —— "سوہنیو! آج
ویسا لگتا ہے کہ تجھے کوئی دوسرا دیکھ لے تو میں تو تجھ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا!"

"اونہوں، اب چھوڑو بھی! میں کہتی ہوں چائے گر جائے گی اوپر۔ دیکھ نہیں رہے، کتنی گرم ہے"۔

"پر آج تو نے بن سنور کر میرے اندر جو اُبال پیدا کر دیا ہے، اُس کا کیا ہوگا!"

وہ بڑی مشکل سے چائے کی کیتلی اُٹھائے ہوئے وہاں سے نکل سکی۔ چائے پیتے وقت بھی وہ ماں کی نظریں بچا بچا کر ا
طرف تاکتا رہا۔ ماں نے اپنے پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی تپائی پر اپنے لیے چائے رکھوالی تھی۔ پتہ نہیں وہ اُن کی طرف دیکھ بھی رہی تھ
نہیں۔ لیکن سُکھونت سر جھکا کر چائے پینے میں لگی رہی۔ اُسے اپنی دلکشی پر پورا اعتماد تھا۔ جانتی تھی، وہ بے انت کی طرف توجہ
بھی دے گی تب بھی وہ اُس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتا۔

اچانک اُس نے سرگوشی کی —— "کہیں باہر چلیں! آج کوئی فلم ہی دیکھ آئیں ——!"

اُس کے شوہر کی دلچسپیاں بہت محدود تھیں۔ گھر سے، گھر کے باہر بچپر ہال تک بس کبھی کبھار ہی کسی جان پہچان والے کے یہاں
جب وہ چنڈی گڑھ میں تھی تو وہاں کے سینماؤں، آرٹ گیلریوں اور تھیٹر کی مصروفیات میں بے طرح مصروف رہتی تھی۔ صبح کا ا
دیکھتے ہی وہ معلوم کر لیتی تھی کہ اُسے شام کہاں گزارنی ہے۔ دعوت نامہ حاصل کر لینا تو اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اپنی فرینڈ
فون کر لیتی اور اُنہی کے جھرمٹ میں ہر جگہ پہنچ جاتی تھی۔ لیکن اس مرد کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد تو جیسے اُس کی ہر پسندیدہ سرگرم
بریک سا لگ گیا ہے۔ ایک اچھا اور آزاد گھر تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ صرف جسم اور سستی تفریح کے علاوہ کوئی دوسرا تصور نہ
ہے۔ پچھلی بار وہ مائیکے گئی تھی تو وہاں سے اپنی پسند کی خریدی ہوئی کتابوں کے ذخیرے میں سے کچھ کتابیں اُٹھا کر لے آئی تھی جو ا
کے بیڈ روم کے پاس بنے ہوئے ریک میں سجی ہوئی تھیں۔ گھر میں اس قدر کام رہتا ہے کہ اُسے ان کتابوں کو کھول کر دیکھنے کا
ہی نہیں ملتا۔ مطالعے کا تھوڑا سا شوق بے انت کو بھی ہوتا تو وہ اُس کے ساتھ اپنے تاثرات کی شرکت میں بے پناہ خوشی محسوس کر
لیکن وہ تو صبح کا اخبار تک بڑی بے دلی سے دیکھتا ہے۔ ٹی۔ وی پر جب خبریں سنائی جانے لگتی ہیں تو وہ اکثر سوئچ آف کر دی
کہتا ہے —— "کیا رکھا ہے، دنیا بھر کے ان لفڑوں میں ——! کچھ بھی تو بدلنے والا نہیں ہے۔ بدل بھی جائے گا تو ہمیں دال روٹی ما
رہے گی۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

بے انت سنگھ نے کچھ دیر کے لیے باہر چلنے کی تجویز رکھی تو وہ انکار نہ کر سکی۔ تھوڑی سی تبدیلی تو ضرور محسوس ہوگی۔ اُس۔

ویر سے ' ہوں ' کہہ کر اپنی ساس کی طرف دیکھا ۔ بے انت اُس کا اشارہ سمجھ کر اپنی ماں کے پاس گیا ۔۔۔ بولا ۔ " بے بے ہم ذرا ور کے لیے باہر جا رہے ہیں ۔ کھانا بھی کھا کر آئیں گے ۔ آپ کے لیے کیا لے آئیں ؟ تندور کی روٹی اور سُندر داس کی دکان سے مچھلی ! پ نے کئی روز سے مچھلی نہیں کھائی ہے ۔ ہم جلدی لوٹ آئیں گے ۔ "

اُس کی ماں نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہ دیا ۔ کوئی بات یاد کر کے بولی

" بتیندر کا کوئی خط نہیں آیا بہت دنوں سے ! واہگورو کرے ، خیر سے ہو ۔ "

اپنے چھوٹے بھائی کا اچانک ذکر سُن کر وہ چونک اُٹھا ۔ لیکن بڑے اطمینان سے بولا ۔۔۔ " وہ ٹھیک ہی ہوگا بے بے فکر والی کوئی بات نہیں ہے ۔ کل اُسے چٹھی ڈال دوں گا ۔ لکھ بھیجوں گا ، کسی روز آکر ہم سب سے مل جائے ۔ بے بے بہت یاد کر رہی ہے ۔ تمہاری ماں ! "

سکھونت نے محسوس کیا ، اُس کی ساس کو گھر میں تنہا رہ جانا اچھا نہیں لگتا ہے ۔ وہ اُنہیں ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے ہی رکھنا چاہتی ہے ۔ لیکن وہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر نکل آئی ۔ بے انت نے شہر جانے کے لیے ایک لمبا راستہ پکڑ لیا ۔ چوڑی اور فراخ رنگ روڈ کا جس پر کئی اور گاڑیاں بھی فل اسپیڈ پر بھاگی چلی جا رہی تھیں ۔ ہوا بہت اچھی تھی ۔ ٹھنڈی اور تازہ ۔ اُس نے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھے بیٹھے اُڑتے ہوئے دوپٹے کو اچھی طرح گردن کے گرد لپیٹ لیا ۔ بے انت نے اسکوٹر کی رفتار اور تیز کر کے گردن گھما کر اُس سے کہا ۔۔۔ " سکھونت ، اپنی باہیں میری کمر کے گرد باندھ لو تا ذرا خوب کس کے ۔ نہیں تو اُڑ جاؤ گی ۔ بتا دوں ! "

سکھونت نے ویسا ہی کیا ۔ اُن لمحوں میں وہ اچانک بے حد خوش ہو اُٹھی تھی ۔ اپنے آدمی کے پیچھے بیٹھ کر گاڑی پر جانا اُسے یوں بھی بہت اچھا لگتا تھا ۔ اُس کی مضبوط اونچی پیٹھ اس کے لیے ایک ڈھال بن جاتی تھی جس کے ساتھ چپک کر اور اُس کے اوپر سر رکھ لینے سے اُسے بڑا سکون ملتا تھا ۔ اُسے صرف اس کی باتیں ۔۔۔ اور باتوں میں تیسرے درجے کے حوالے ہرگز نہیں بھاتے تھے ۔ لیکن ان حوالوں سے بچنا بھی تو مشکل تھا ۔

سینما ہال کے اندر بھی بے انت سنگھ بھلر کا وہی رویہ رہا ۔ وہ ایک اچھے درجے میں بیٹھ کر سستے قسم کے لوگوں کی طرح فلم دیکھتا تھا ۔ زوردار قسم کے ڈائیلاگ سُن کر تالی بجا دینا ، اور رومانی یا ہیجان انگیز منظر کو دیکھ کر بے اختیار ' ہائے ' کہہ اُٹھنا اُس کا خاص شیوہ تھا ۔ آگے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ناچ ناچ کر گاتی ہوئی ہیروئن پر سکے بھی پھینک سکتا تھا اگر وہ اسکرین کے کہیں قریب ہوتا تو ۔

اُس روز سکھونت نے اُس کی کوئی سرزنش نہ کی ۔ اُس کی ہر ایک حرکت بڑے صبر کے ساتھ برداشت کرتی رہی ۔ اور سوچتی بھی رہی ۔ وہ اپنے آدمی کی یہ عادتیں کیسے بدل سکتی ہے ؟ اُس کے اندر کونسی ایسی کمی ہے جس کی بنا پر وہ اتنا حد سے گزر جاتا ہے ۔ یہ صحیح تھا کہ اس کی تعلیم و تربیت میں اُس کے آبائی گاؤں کا بڑا ہاتھ تھا ۔ لیکن گاؤں کے سارے لوگ تو ایسے ہرگز نہیں ہوتے ۔ اُس نے اپنی تعلیم کا ایک حصہ دہلی جیسے شہر میں بھی رہ کر پورا کیا تھا اور اسی شہر میں اب اُسے ایک مناسب ملازمت مل گئی تھی ۔ شاید اس لیے کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی ۔ اُس کے خاندان میں چچا زاد ، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں کا بھی ایک قحط تھا ۔ یہ کمی سکھونت نے بھی اُس کے گھر میں آکر محسوس کی تھی ۔ وہ اُس کی جھولی میں ایک ایسی نعمت کی طرح آگری تھی جس کا وہ ایک لمبے عرصے سے انتظار

کرتا رہا ہو۔ اُس نے اپنے رویّوں پر بھی غور کیا۔ وہ ایک صوبائی صدر مقام پر پَل کر بڑی ہوئی تھی۔ اُس کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں لڑکوں لڑکیوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا کوئی غیر متوقع واقعہ ہرگز نہیں تھا۔ اُس کے ڈیڈی ایک ریٹائرڈ منصف تھے جن کے مزاج میں تحمل، متانت، سنجیدگی اور غور و فکر کی عادتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے تین بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی ازدواجی زندگی میں پوری طرح آباد اور مطمئن تھے۔ آرٹ اور ادب کی طرف گہرے رجحان نے اُس کے اندر کی وہ شوخی عرصہ ہوا چھین لی تھی جو ایک لاڈلی بیٹی ہونے کی وجہ سے فطری طور پر اُسے ملی تھی۔ شادی کے بعد اُسے جس طرح کے تجربے سے گزرنا پڑ رہا تھا اُس کا اُس نے پہلے تصور نہیں کیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سے حالات میں کس طرح ڈھالے جو اس گھر کی دین تھے۔ یہ گھر خاصا آرام دہ تھا مگر حیرت ناک طور پر تنہا تنہا بھی لگتا تھا۔ اُس پر ایک بیوہ ساس اپنے ایک مسرور وجود کے باوجود بڑھاپے کی پرچھائیں زیادہ لگتی تھی۔ اُس کا چھوٹا بیٹا پنجاب کے ایک صنعتی شہر میں لڑکوں کے کل پرزوں کی ایک چھوٹی سی دُکان کا مالک تھا۔ اُس کا بڑا بیٹا سرکاری نوکری میں ایک ذمّہ دار عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی نجی زندگی میں بے حد بھولا واقع ہوا تھا۔ جیسے اُس کے لڑکپن کی عمر ضرورت سے زیادہ لمبی ہوگئی ہو۔

وہ رات کو گھر لوٹے تو بھلّر حسبِ معمول بے حد شوخ تھا۔ لیکن وہ اندر پہنچے تو بے بے ہاتھ میں ایک تار لیے بے حد اُداس بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ایک پڑوسی سے وہ تار کا مضمون پڑھوا کر سُن چکی تھی۔ تار پڑھ کر بھلّر اور سُکھونت بھی ہکّا بکّا رہ گئے۔ بے انت سنگھ کے چھوٹے بھائی ستونت سنگھ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس کی بیوی بلجیت کور نے بے بے کو فوراً آنے کے لیے لکھا تھا۔

سُکھونت جب پچھلی بار جالندھر گئی تھی تو اُس نے اپنے دیور کی سرگرمیوں کو خاصی شک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ایک تو وہ بہت سے اخبار پڑھنے لگا تھا۔ دوسرے کچھ لوگ اُس کے پاس رات کو چھُپ کر ملنے آتے تھے جن کے ساتھ وہ لمبی لمبی سیاسی بحثیں بھی کرتا تھا اور انہیں چندہ بھی دیتا تھا۔

جالندھر کی آخری گاڑی نکل چکی تھی۔ اب روڈ ویز کی کوئی بس بھی اُدھر نہیں جاتی تھی۔ آخر طے ہوا کہ صبح سویرے پہلی گاڑی سے بے انت اور بے بے دونوں جائیں گے۔

وہ رات بے بے نے پاٹھ کرتے ہوئے گزار دی۔ بے انت بھی رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ خاموش لیٹا ہوا چھت کو تکتا رہا تھا۔ سُکھونت اُس کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اُسی ڈبل بیڈ پر۔ اُسے حیرانی ہو رہی تھی کہ اُس کا سارا جوش و خروش کیسے آناً فاناً سرد پڑ گیا ہے۔ اگرچہ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کتنی بار اُس کا بازو تھام تھام لیا تھا۔

"میرا خیال ہے، اُس کی ضمانت بھی نہیں ہو سکے گی۔ گورنمنٹ منظور ہی نہیں کرے گی۔ میں جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے سی آئی ڈی نے ہمارا پتہ بھی اُس سے لے لیا ہو۔ میری سروس خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ بے بے کو وہاں نہ پہنچانا ہوتا تو میں تو وہاں جاتا ہی نہیں۔ اب بھی کوشش کروں گا، وہاں تھوڑی دیر رُک کر لوٹ آؤں۔"

جس روز بے انت سنگھ کو واپس آنا تھا اُس دن مسز گاندھی کو گولی مار دی گئی اور رات پڑتے پڑتے دلّی شہر فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ ارچنا سرینواس بھاگی بھاگی سُکھونت کے پاس آئی اور اس سے کہا — "تم یہاں اکیلی مت رہو۔ بڑا خطرہ ہے۔ چلو ہمارے گھر۔ وہاں کوئی تم کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتا۔"

سکھونت کور کو یہ تو معلوم تھا کہ دہشت پسندوں کے کچھ گروہ پنجاب کے خاص خاص ہندوؤں اور سکھوں کو گولی کا نشانہ بنا دیتے
ہیں۔ دربار صاحب پر حملے کے بعد تو یہ سلسلہ ہر روز کا ایک معمول سا بن گیا تھا لیکن اُسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز اچانک
پورے سکھ فرقے پر ایسا قہر ٹوٹ پڑے گا۔ کئی کالونیوں کو آگ لگا دی جائے گی اور کرفیو لگ جائے گا اور فوج بھیج دی جائے گی۔
رات کے کسی پہر میں اُس کے فلیٹ میں بلوائی گھس آئے اور سارا سامان اُٹھا کر لے گئے۔ فرج، ٹی وی، برتن، کپڑوں سے بھرے
ہوئے ٹرنک اور بھی بہت کچھ۔ باقی جو بچا اُسے جاتے جاتے آگ لگا گئے۔
اُس وقت وہ ارچنا سرینواس کے اسٹور میں چھپی ہوئی بیٹھی تھی۔ ارچنا اُسے پل پل کی خبر دے جاتی تھی۔ اور یہ دلاسا
بھی دلا جاتی تھی۔ "تمہاری موجودگی کی کسی کو خبر نہیں ہے۔ یہ اچھا ہوا تم رات پڑتے ہی چلی آئیں، نہیں تو وہ لوگ کچھ بھی کر سکتے تھے۔
کیا پتہ آگ میں بھی جھونک دیتے۔!"
سرینواس نے کہا ــــ "یہ سین تو ہو بہو ویسا ہے جیسا تقسیم کے وقت بنا تھا۔ میں نے اس زمانے کی ہسٹری پڑھی ہے
ہندو، مسلمان ایک دوسرے کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے تھے۔ کتنی گاڑیاں ختم کر دیں۔ ساری دُنیا میں تہلکہ مچ گیا تھا۔"
سکھونت نے رات بھر اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب اُس کی آنکھوں میں ایک بھی قطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں
ایک عجیب سی وحشت بھر گئی تھی۔ اُسے بار بار اپنے آدمی کا خیال آ رہا تھا، کہیں وہ سچ مچ جالندھر پہنچتے ہی واپس نہ چل پڑا ہو۔
اگلی صبح بہت سی بھیانک خبریں ساتھ لے کر آئی۔ دہلی میں کئی ہزار آدمی مار ڈالے گئے۔ دوسرے کئی شہروں میں بھی بلوے ہوئے ہیں۔
بلوائی گاڑیوں اور بسوں میں سے چُن چُن کر لوگوں کو مار رہے ہیں۔ وہ اسٹور کے اندر دبکی پڑی ہوئی باہر کی آوازیں سُنتی رہی۔ پارک کے
آس پاس کئی اسکوٹر اور موٹریں دُھوں دُھوں جل رہی ہیں۔ اچانک سرینواس کی بیٹی چیختی ہوئی اندر آ گئی ــــ "ایک سردار جی کے
گلے میں جلتا ہوا ٹائر ڈال دیا گیا ہے۔"
سکھونت اچانک اسٹور کی کنڈی کھول کر باہر نکل آئی اور بھاگتی ہوئی سی بالکونی میں جا پہنچی۔ بنا پگڑی کے کھلے ہوئے بالوں
والا ایک سکھ گلے میں آگ کی مالا پہنے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا اس کے کپڑے بھی آگ پکڑ چکے تھے۔ لوگوں کا
ہجوم اُسے کہیں رُکنے نہیں دیتا تھا۔
"میرے آدمی کو بچاؤ۔ میرے سردار جی کو بچا لو۔" وہ چیختی ہوئی نیچے کودنے پر تیار ہو گئی۔ لیکن ارچنا اور اس کا پتی اُسے
فوراً گھسیٹ کر پھر اندر لے گئے۔
"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ وہ تمہارا ہسبنڈ نہیں ہے۔ دیکھا نہیں، اُس کا قد کتنا چھوٹا ہے! تمہارا بھلّر صاحب تو بہت لمبا
اور ہینڈسم ہے!"
"اچھا ہوا کہ شور میں کسی نے تمہاری آواز نہیں سُنی۔ اب باہر مت نکلنا۔ نہیں تو ہم پر بڑی مصیبت آ جائے گا بابا!"
اُنہوں نے اسٹور کو باہر سے بند کر دیا۔ بالکونی کی طرف کھلنے والے دروازے کی بھی کنڈی چڑھا دی۔
"ہم سے نہیں دیکھا جاتا یہ سب! اِٹ از اِن ہیومن! اِٹ از ہاریبل!!"
"لگتا ہے آدمی لوگ پاگل ہو گیا! بالکل جنگلی کے موافق!"

"جیسے ہم آباد ہوا تھا، لاکھوں لوگوں کی جان ایسے ہی گیا تھا۔ پہلے انڈیا پاکستان، پھر پینسٹھ کی وار، اس کے بعد بنگلادیش، اب پنجاب کا نیا اسٹرگل!"

"اور بھی تو بہت بارے ہوئے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں پر جھگڑا فساد ہوتا ہے۔ ہائے رام، ہم کو شانتی کب ملے گا؟"

"دیکھو ارچنا، تم نے ہسٹری نہیں پڑھا۔ جب دھرتی پر انسان آیا اسی سمے سے اس نے لڑنا بھی سیکھا۔ سب سے پہلے دوسرے کے ہاتھ سے نوالا چھینا۔ وہ ابھی تک نوالا ہی چھین جھپٹ رہا ہے۔ چاہے اس کا نام بدل گیا۔ دھرم، جیون، آئیڈیالوجی، رنگ بھید یہ سب بہانہ ہے۔ وہی روٹی کا ٹکڑا چھیننے کا!"

شکمونت ان کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ گھٹنوں پر سر ڈال کر اور اپنے سر کے اوپر دونوں ہاتھ رکھ کر۔ جتنے آدمی اب تک مارے جا چکے ہیں ان میں اس کے آدمی جیسا تو ٹوٹ کر پیار کرنے والا ایک نہ ہوگا۔ وہ اس کے لیے کتنا بھوکا اور دیوانہ تھا! زچ ہوکر وہ اس کے ہاتھ جھٹک جھٹک دیتی تھی۔ کبھی کبھی دانتوں سے کاٹ بھی لیتی تھی۔ لیکن وہ تب بھی تو باز نہیں آتا تھا۔ وہ ابھی تک لوٹا کیوں نہیں ہے؟ پہلے دن سے ہی اس کے من میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔ وہ وہی تھا جو گلے میں آگ کی مالا پہنے بے تحاشا بھاگتا پھرتا تھا۔ ارچنا نے جھوٹ ہی کہا تھا وہ کوئی دوسرا ہے۔ وہ اسے کیوں نہ بچا سکی! اس صدمے سے وہ زندگی بھر نہیں نکل پائے گی!

آج تیسرا دن ہے۔ اب تو ساری خبریں پرانی لگنے لگی ہیں۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب تو جگہ جگہ امن کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ جلوس نکل رہے ہیں۔ نعرے گونج رہے ہیں۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی، سارے لوگ بھائی بھائی! امدادی کیمپ کھل گئے ہیں۔ کمبل بٹ رہے ہیں۔ اناج دیا جا رہا ہے۔ بیواؤں اور یتیموں کو معاوضہ مل رہا ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ آج شکمونت بھی پڑوسیوں کا فلیٹ چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آگئی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کتنا کچھ لٹا ہے اور کتنا کچھ بچ گیا ہے۔

باہر کا دروازہ منہ پھاڑے ہوئے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے سہمے سہمے اندر قدم دھرا ہے۔ پچکی ہوئی بالٹیاں اور ٹب، کڑاہیاں اور جگ، پرانے جوتے میں سے جھانکتا ہوا ایک چمچ، ربڑ پلانٹ، مارننگ گلوری، کیتا، پام، عشق پیچاں، پارچولیٹا اور کلیڈیم اور سفید گلاب کے ٹوٹے ہوئے گملے اور تیز ہوا سے ورق ورق ہو کر اڑتے ہوئے پرانے اخبار گیلری میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

یہ اُن کا بیڈ روم تھا۔ بستر اور پلنگ اُدھ جلے پڑے ہیں۔ اسی پلنگ پر اس نے اپنے پتی کے ساتھ پہلی رات کا ناقابل فراموش سمے گزارا تھا۔ بے انت سنگھ نے اس کے سرخ گالوں کو وحشیوں کی طرح ——— کاٹ کاٹ لیا تھا۔ صبح وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنی ساس سے منہ چھپائے چھپائے پھرتی رہی تھی۔

جس ریک میں اس کی پسند کی کتابیں سجی رہتی تھیں وہ فرش پر اوندھا پڑا ہوا ہے۔

اے ٹیل آف ٹو سٹیز
ڈاکٹر ژواگو
گورکی
چیخوف

بھوٹا یگ ، بیر وارث شاہ

پیرا ڈائیز لوسٹ

ساری کتابیں یہاں وہاں کھلی ہوئی سی پڑی ہیں۔ جیسے کوئی انہیں نہایت بے دردی سے اپنے پاؤں کے نیچے روندتا رہا ہو۔
وہ کسی چیز کو بھی نہیں چھوتی۔ کسی چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی جیسے خواہش ہی مر چکی ہو۔ وہ صرف دیکھتی ہے لیکن حیران بھی نہیں ہوتی۔ بالکل ٹھہری ہوئی سی دوسرے کمرے میں پہنچ جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی۔

یہ ہمارا ڈرائنگ روم ہی تو تھا۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چھوٹا سا خوبصورت قالین جو اس کے لیے اُس کی ماسی کینیڈا سے لے کر آئی تھی۔ صوفے، ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں اور شوکیس جو اُس کے دو بھائیوں نے مل کر تحفے کے طور پر دیئے تھے اور وہ نرم نرم گدے والا دیوان جس پر بیٹھ کر ہی وہ ساس سبح شام پاٹھ کرتی تھی اور اُسی پر سوتی بھی تھی۔

فرش پر بُدھ کی مورتی ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔ سر الگ، دھڑ الگ۔ اہنسا پرمودھرم کے خلاف دوسری بڑی جنگ جیسے اسی کمرے میں ہوتی رہی ہو۔ بُدھ مت کو صدیوں کے بعد پھر سے کھویا ہوا وقار حاصل ہونے لگا تھا۔ اب بُدھ یہاں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ صدیوں پہلے بھی اس کی مورتیوں کو اس دیش میں تہس نہس کرکے اسے ذلیل کیا گیا تھا۔

اُس کی نگاہ اچانک دیوار پر الٹے لٹکی ہوئی ایک فوٹو پر جاٹکتی ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے سیدھا کر دیتی ہے اور غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ حیرانی سے بھی۔ یہ دونوں چہرے کس قدر جانے پہچانے لگتے ہیں۔ مسرور اور پُر اعتماد۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، مسکراتے ہوئے۔

"سوہنیوں، تکو گے کہ مار ہی چھوڑو گے؟"

اپنے پیچھے آہٹ سُن کر اُسے یاد آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ارچنا نے کہا ۔ "تم چلو۔ میں پیچھے پیچھے آتی ہوں۔ مل کر جھاڑو لگائیں گے۔ گھر کو پھر سے چمکا دیں گے۔"

وہ فوٹو کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے ــــ "ارچنا، دیکھو تو! میرے سردار جی میری طرف کس طرح دیکھ رہے ہیں!"
وہ کوئی جواب نہ پاکر گردن گھماتی ہے اور ہکا بکا رہ جاتی ہے۔

یہ تو کوئی اور ہے! ارچنا نے کس کو یہاں بھیج دیا؟ ایک طویل قامت، کلین شیو بھرے بھرے جسم کا نوجوان۔ وہ اس قدر چپ کیوں کھڑا ہے؟ اُسے اتنی خاموشی سے ایک ٹک کیوں دیکھے جا رہا ہے؟۔ جس دن بے انت سنگھ کھلر یہاں سے جالندھر گیا تھا وہ بھی اسی طرح خاموش تھا۔ کیا دو آدمیوں کی خاموشی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔؟

اُس کے دونوں بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایک بازو گلے میں لٹکی ہوئی سلنگ میں پڑا جھول رہا ہے۔
وہ اُسے گھورتی ہوئی اُس کے پاس جاتی ہے۔ اُس کے بالکل سامنے کھڑی ہو کر اُس کے رخساروں کے دائیں بائیں پڑے ہوئے گڑھوں کو دیکھتی ہے اور اچانک چلا کر پوچھتی ہے۔

"یہ سب کیا ہوا؟ یہ سب تم نے کیوں کیا؟"

وہ ناسی اذیت سے پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک بازو اُٹھا کر اُس کے کندھے پر رکھ دیتا ہے۔
اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا تھا تمہاری خیر خبر معلوم کرنے کے لیے۔ واہگورو نے بڑی کرپا کی کہ تم سے پھر ملا دیا"
لیکن اُسے یقین نہیں آتا۔ اس بازو میں وہ گرمی کیوں نہیں ہے؟ پہلے جیسا زور کیوں نہیں ہے؟ اُسے ٹھیک طرح
جانچنے کے لیے وہ پھر سر اُٹھا کر دیکھتی ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے لگتی ہے۔

اوراق کے مستقل خریداروں کے لئے

خاص رعایت

اگر آپ اوراق کے مستقل خریدار بن جائیں تو

- آپ کو اوراق کا سالانہ چندہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں
- اس کے بجائے آپ کو اوراق کا ہر شمارہ بذریعہ وی۔پی۔ ارسال ہوگا۔
- ہر شمارہ پر آپ کو ۲۵ فیصد رعایت ملے گی۔
- ڈاک کے اخراجات دفتر اوراق ادا کرے گا
- آپ دفتر اوراق کو محض ایک کارڈ لکھ کر مستقل خریدار بن سکتے ہیں۔

سہولت اور تن آسانی کا پکا نوکری میں بہت مزا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ کوڑا کرکٹ مارتھی پھینکا کرتی تھی۔ پاپا یعقوب کی سویٹ ہارٹ مارتھی۔ سمارٹ طرح دار اور شرارہ قسم کی آتش لڑکی مارتھی۔ پاپا یعقوب کارپوریشن میں ٹرالی ڈرائیور کے عہدے پر فائز تھا، اور اپنی برادری کا پینچ بھی۔ بڑے پینچ سے دوسرے نمبر پہ۔ پاپا یعقوب کا مقام ملازمت یا بڑے ادارے کے تعلق کی وجہ سے نہ تھا بلکہ پینچی اُن کے خاندان میں کئی پشتوں سے وراثت کے طور پر چلی آرہی تھی۔ اُس کے گھر کی عورتیں مدت ہوئی پُرانا کام چھوڑ چکی تھیں۔ حتیٰ کہ اس کی بھتیجی مارتھی بھی ایسے شوقیہ شوقیہ ایک دو بڑے گھروں کا محض صفائی ستھرائی کا کام سنبھالے ہوئے تھی اور یہ اس لیے کہ یہ گھر پاپا یعقوب کے افسروں کے تھے۔ ان افسروں نے مارتھی کے دو بھائیوں کو باہر بھجوایا تھا جو ہر ماہ گھر والوں کو بنک ڈرافٹ اور طرح طرح کے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ مارتھی کو پاپا یعقوب بلاوجہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ایک شخصیت تھا منفرد اور نظر آنے والی۔ دیکھنے والے دُور سے پہچان لیتے تھے کہ پاپا یعقوب آرہا ہے۔

سردی ہو یا گرمی، مطلع ابر آلود ہو یا دھوپ چمک رہی ہو۔۔ پاپا یعقوب کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ برابر لگا رہتا۔۔ لباس میں زیادہ ردّ و بدل نہیں کرتا تھا۔ بوٹ جرابیں ہمیشہ پہنتا۔ اگر پینٹ کالی ہے تو ٹوپی اور ضرور کالے رنگ کا ہوگا۔۔ اوپر سفید مفلر.... گرمیوں میں سفید پینٹ گہرے تیز رنگوں والی بشرٹ۔ سفید کیمشن۔ یہ رنگا رنگ لباس پاپا یعقوب کی چمکدار سیاہ رنگت پر عجیب بہار دیتا تھا اور اُس کی شخصیت کو قابلِ توجہ بناتا تھا۔

بات ہو رہی تھی مارتھی کے کچرا پھینکنے کی۔ مارتھی کی دیکھا دیکھی باقی عورتیں بھی وہیں ڈھیر کر دیتیں۔ ہمیشہ کچرے کا مینارہ سا بنا رہتا۔۔ کارپوریشن کی ٹرالی آتی، کچھ اُٹھاتی کچھ بکھیرتی۔ یہ جا وہ جا۔ آس پاس رہنے والوں کی بار بار یاددہانی اور درخواستوں سے اس غلاظت ڈپو کو ختم کرنے کے احکامات جاری ہوتے رہتے۔ لیکن ان کو عملی شکل اختیار کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ پاپا یعقوب بارسوخ آدمی ہے وہی رکوا دیتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ اُن افسروں کی آڑ ہے جن کے ہاں مارتھی کام کرتی ہے۔ بہرکیف یہ ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ ایک خاصا مسئلہ تھی جس سے سب بیزار تھے۔

ہمارے یہاں کے دکاندار لوگوں کو غور و فکر کرنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ ملتے ہیں تو کھا پی کر ڈکار لیتے ہیں۔۔ ویسے تجارت پیغمبری پیشہ ہے، اس سے منسلک لوگ عام طور پر معصوم و مغفور ہوتے ہیں۔ غور و فکر کی کیا ضرورت پر دتّے دودھ دہی والے کو روایت سے بغاوت نے آلیا۔ کیا کہ پہلے تو آبائی پیشہ دودھ دہی فروشی چھوڑ کراہی سکے۔ برگر بوتلیں بیچنی شروع کر دیں۔ پھر نوجوانوں کو مزید کھینچنے کے لیے وڈیو کیسٹ بھی رکھ لیے، رنگین ٹی۔ وی اور وی۔ سی۔ آر کرائے پر دینے لگا.... دکان خوب سجائی چمکائی، انڈیا اور امریکہ کے ایکٹروں، گلوکاروں کے قدِ آدم پوسٹرز آویزاں کیے۔ نئے کاروبار کے رسمی افتتاح کے لیے کارپوریشن کے چیئرمین کو بلوایا۔ سپاس نامے میں سرِفہرست گزارش یہ رکھی کہ اس کی دکان کے ساتھ جو برس ہا برس پرانا غلاظت ڈپو ہے اس کو فی الفور ہٹایا جائے، اس کی وجہ سے اُس کے گاہکوں یعنی پبلک کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ علاقہ اب کافی ترقی کر چکا ہے، اگر چیئرمین صاحب علاقے کے لوگوں کا یہ دیرینہ مطالبہ مان کر اس ڈپو کا کہیں اور بندوبست کر دیں تو ہم ہمیشہ آپ کو ہر الیکشن میں یاد رکھیں گے۔

بات کہنے کا سلیقہ تھا۔ الیکشن سر پہ کھڑے تھے، وفا اور بقا کے وعدے تھے۔ گویا قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس تقریب کے اگلے روز صفائی ستھرائی کے احکامات جاری ہو گئے۔۔ اور ہفتے کے اندر اندر یہ ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ پوری پوری صاف ہو گئی۔ اگرچہ اس کے قریب سے گزرنے والے کے ساتھ بدبو کا بھبکا اب بھی مسخری کرتا تھا اور نفیس مزاج آدمی بلاتوقف تھوکنے پر مجبور ہو جاتا تھا مگر آنکھوں کی خیر ہو گئی تھی۔

اب علاقے کے دیدہ ور آدمی اس ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ پر آنکھ رکھ رہے تھے ... کہ ایک صبح میداں، کشور اور بسنتی نے مل کر یہاں اپنے ٹوکرے اُلٹ دیئے ... اب دِتے کو پھر تشویش لاحق ہوگئی۔ اُس کی دُکان کی شو ختم ہونے والی تھی — بہت سوچ بچار کے بعد دِتے نے بابا یعقوب کو اچانک ایک دوپہر اپنی دُکان میں مدعو کیا۔ برگر اور گرم گرم چائے سے تواضع کی۔ اور نہایت دردمند اور رازدارانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"چاچا .... دیکھ ..... تمہاری برادری نے پھر کچرا ڈھیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ کل کلاں کسی ڈاہڈے بندے نے اس جگہ پر قبضہ کر ہی لینا ہے تو بتا تجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا... یہ بیبیاں باز نہیں آتیں — میں کہتا ہوں تُو اس پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتا، موئے پوچھتے ہیں۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں —— تو اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھا سکتا ہے۔"

بابا یعقوب گرم چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے کچھ دیر تک ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچتا رہا، پھر دھیرے سے بولا۔

"چوہدری جی! آپ ہی کوئی راستہ نکالو .... برادری کو میں سنبھال لوں گا ...."

دِتے نے اپنا مُنہ بابا یعقوب کے کان کے قریب کر کے کوئی نہایت معقول تجویز پیش کی جس سے بابا یعقوب کی باچھیں کانوں تک کھل گئیں، اور وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح انسان کا جسم کئی قسم کی ہڈیوں، ماس بوٹیوں یا نفتوں سے مل کر بنا ہے اسی طرح اُس کے جذبات کے گُنجھے میں بھی بہت کچھ بھرا ہے۔ محبت کی رنگ برنگ کرنیں، خلوص کی کئی تہیں، وابستگیوں کے اُلجھے ریشمی دھاگے .... روایتوں اور رسموں کی سنبھال سیمنٹ کے گاڑھی ہوتی سوئیاں بلندیوں میں کئی پستیاں اور پستیوں میں کئی بلندیاں۔

بابا یعقوب بمشکل جذبات پر قابو پا سکا — پھر دھیمے سبھاؤ مگر جوش کے ساتھ بولا۔

"چوہدری جی —! مان گئے، مان گئے۔ آپ نے اندر خانے ساتھ دینا ہوگا"

"میں روشن خیال آدمی ہوں۔ چاچا ....." پھر کچھ توقف کے بعد دِتے نے پینترا بدلا۔

"جب سکیم ہی میری ہے تو میرے ہاتھوں پروان چڑھے گی انشاءاللہ تم قائم رہنا ..... میں نے اُوپر بات کر لی ہے۔ لین دین ہوگیا ہے بس تم کہنا ... مجھے خواب میں بشارت ملی ہے .... بیان نہ بدلنا .... تمہارا کام اتنا ہی ہے۔"

"واہ چوہدری جی ..... وہ جو کہتے ہیں ناکہ پیر بڑے سرداراں کے وہ سچ ہی کہتے ہیں ... اور اس پر اعتراض بھی کسی کو نہیں ہوگا۔ آپ شیداں کو نہ میداں کو .... نہ سردار مسیح کو نہ لال مسیح کو آپ پرسوں دیکھ لیں گے۔ کیسی صفائی ہوتی ہے .....آپ کی بہت بہت مہربانی"

بابا یعقوب سر سے پاؤں تک خوشی میں بھیگا کندھوں کو جھٹکتا اکڑتا گھر کی طرف چلا آیا۔ اُسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ جیتا جاگتا آسمان کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ اُس کے وجود کی تطہیر ہو چکی ہے —————— بدن کی بُو رفتہ رفتہ خوشبو میں بدلنے کو ہے۔ ساغرِ زندگی شراب سے لبریز چھلکنے کو ہے — وہ کوئی بہت ہی اچھا کام کرنے جا رہا ہے شاید زندگی میں پہلی بار جس سے ربّ اور اُس کے بندے ایک ساتھ راضی ہوں گے۔

تیسرے روز لوگوں نے دیکھا کہ اُس ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ کی نئے انداز سے صفائی ہو رہی ہے، میداں، مارتھی، کشور اور نہ جانے کون کون مرد عورتیں جوش و جذبے سے اس جگہ کو دھو رہے تھے۔ پانی کا پائپ چوہدری اللہ دِتہ نے مہیا کیا تھا۔ چھوٹے بچے کہیں سے اینٹیں ڈھو ڈھو کر لا رہے

تے۔ محلے والے اس خیال سے خوش کہ ان لوگوں کو از خود خیال آگیا — باپا یعقوب کی تعریف بلند آواز میں ہو رہی تھی۔

ماسٹر غلام اسحٰق جو گلی میں سے ایسے گزرتے جیسے نکی میں سے ہوا، آج کھڑے کھڑے ہو گئے، کچھ دیر دیکھتے مسکراتے رہے اور بولے

"شاباش بھئی شاباش...... اللہ جب ہدایت دے دے .... اُس کے گھر میں دیر ہے۔ اندھیر نہیں"

باپا یعقوب کے بارے میں تاثرات دیتے ہوئے کہا۔

"یعقوب اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ ایسے تو نہیں"

اس طرح جو بھی وہاں سے گزرتا معترفانہ نگاہ ڈالنے کے لیے رُکتا، اظہارِ خیال کرتا چلا جاتا۔ کام کرنے والوں کے حوصلے بلند ہو رہے تھے۔ —— اب دن ڈھل گیا تھا۔ سائے لمبے اور گہرے ہو رہے تھے۔ سارا دن گھٹ کر شام ہو گیا تھا .... بچوں اور بڑوں اور اس ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ کے دو طرف اینٹیں چن کر ایک طرف دروازہ سا بنا دیا تھا...... تب میاں دوڑی دوڑی گھر سے اپنے جہیز کی میز اٹھا لائی۔ اُس پر اپنے ہاتھ سے بنا ہوا کروشیے کا سفید میز پوش ڈال دیا۔ کشور کا منے کے پھولوں کا گلدستہ لے آئی۔ بچے کریانے کی دکان سے م میاں پکڑ لائے۔

پھر یعقوب جو برادری کا پنچ تھا، دوسرے پنچوں کے ساتھ اُس ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ پر نمودار ہوا — سرپنچ نے آگے بڑھ کر اپنی چادر کی گانٹھ سے ایک —— مجسمہ نکالا اور عقیدت و احترام کے ساتھ میز پر رکھ کر اُس کے آگے شمع روشن کر دی — پھر ہاتھ جوڑ کر میں منہ میں وہ کہہ رہا تھا۔

"اے مقدس روح! آج سے یہ جگہ تیرے نام کی برکت سے پاک ہے"۔ سرپنچ اور باقی پنچ باپا یعقوب اور دوسرے چھوٹے بڑے سبھی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اُن کے سر احترام کی وجہ سے جھکے ہوئے آنکھیں پاک تصور سے مندی ہوئیں اور حل الوہی تجربے سے گزر —— عورتوں پر تو جیسے رقت طاری تھی، جسم و جاں تطہیر کے عجیب مراحل سے گزر رہے تھے، اچانک ماحول میں نور پھیل گیا — سب کی آنکھیں ے کھل گئیں۔ اُنہوں نے یک نگاہ دیکھا میز کے عین اُوپر جہاں —— مجسمہ دھرا تھا مرکری ٹیوبز سے بنا کراس روشنی بکھیر رہا ہے۔ بچوں کی نظر میں یہ ایک کرشمہ تھا مقدس روح کا۔ عورتوں کے خیال میں خدا نے اُن کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔ اور مرد اپنی کامیابی پر نازاں تھے کہ وہ دین کی خدمت میں سرخرو ہوئے۔

۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ گزشتہ کچھ برسوں سے جوں کی توں صاف ہے —— مرکزی ٹیوب ہر رات اپنا نور پھیلاتی ہے۔ اب وہاں کوئی پھینکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہاں پہلی سی سیلن نہیں رہی۔ تعفن بھی نہیں —— نہ معلوم کیوں ڈیڑھ دیوار دو فٹ اونچی ہو رہی۔ سنا ہے چودھری کے ڈر سے کشور اپنی میز اٹھا کر لے گئی ہے۔ باپا یعقوب نے مجسمہ دوبارہ گھر کے طاقچے سجا لیا ہے۔

یہ بھی سنا ہے کہ علاقے کے لوگ کارپوریشن سے بات چیت کر رہے ہیں —— دتّہ چودھری اپنے طور پر کوشش میں ہے کہ یہاں ایک سا ریسٹوران بنا لے۔

معتبرین کا خیال اجتماعی مفاد کی طرف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس ۱۵ × ۲۰ فٹ جگہ پر ایک —— چھوٹی سی مسجد تعمیر کر دی جائے

اُوپر مسجد۔ نیچے دو دُکانیں اور استفادہ بن جائے۔

پاپا یعقوب کے پاس نواب والی دلیل بہت مضبوط ہے اور اُس کے پیچھے ایک مضبوط برادری بھی موجود ہے۔

تاہم مقدمہ دیوانی ہے۔ ابھی سیشن کورٹ میں چل رہا ہے —— حق کی لڑائی کئی میدانوں میں لڑی جا سکتی ہے —— ہائی کورٹ، سپریم کورٹ ہے...... پھر آخری اپیل بھی ہو سکتی ہے۔

زندگی کے سلسلے ہیں، حق کے معرکے ہیں، بقا کی دلیلیں ہیں۔

یار زندہ صحبت باقی۔

ایک لمحہ جو صدیاں ہوا

رشید امجد

یہ مزار بڑی سڑک سے مڑتے ہی تالاب کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ اس کی ٹوٹی منڈیر سے میں نے کتنے ہی موسموں کے پرندوں کو تالاب کے کنارے دھندلاتے اور روشن ہوتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو چیزیں دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہیں۔ دور خاک بادلوں کو چیرتا ایک خرقہ پوش شہر کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

تیری خاک اب اس شہر کی مٹی میں پیوست ہوگی۔

صدیوں کی دھول قبروں کے نشان مٹاتی چلی جاتی ہے۔

اپنی ہی قبر پر پاؤں رکھتا ایک نوجوان تیزی سے گزر جاتا ہے۔

میرا خمیر اسی شہر کی مٹی سے اٹھا ہے۔

شہر کی فصیل سے آخری تیر چلاتے ہوئے اس کا زخمی جسم آدھا لٹک جاتا ہے۔ موسم بھیس بدل کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دن اور رات اڑ اڑ کر وقت کی جھولی میں گرتے چلے جاتے ہیں —— خزاں بہار، بہار اور خزاں —— خوابوں کے پیچھے بھاگتا ایک اور نوجوان چائے خانے کی میز پر مکہ مارتے ہوئے کہتا ہے —— "خواب حقیقتیں ہیں"۔

میں ان سارے چہروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔

شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش، فصیل پر کھڑا تیر انداز اور چائے خانے کی میز پر مکہ مارتا نوجوان —— میں ان سے بہت [illegible] ہوں، دور سے خرقہ پوش کی آواز آتی ہے۔

یہ سب ایک دائرہ ہے۔

دائرہ در دائرہ —— جس کی ایک سطح پر تو پہنچا جا سکتا ہے لیکن دوسری سطح پر انقطاع ہو جاتا ہے اور تیسری حقیقۃ الحقیقۃ کے سکون کی سطح ہے جہاں سرگشتگی اور تحیر کے سوا کچھ نہیں ——!

پھر ایک نعرۂ مستانہ سنائی دیتا ہے —— جو راز ہے وہ راز رہے اور جو وارد ہو اسے بخوشی برداشت کر لے۔

میں پوچھتا ہوں —— "یہ راز مجھ پر کب منکشف ہوگا؟"

خرقہ پوش دُھند میں ڈوبتے ڈوبتے لمحہ بھر کے لیے سامنے آتا ہے — "راز اُس وقت منکشف ہوتا ہے جب واصف، موصوف اور وصف میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا"

دُھند آہستہ آہستہ گہری ہوتی چلی جاتی ہے،

شہر کی فصیل پر کھڑا تیر انداز، تیر نکالتا ہے، اُسے چلّہ میں جوڑتا ہے — "میری خاک اس شہر کی مٹی میں دفن ہے اور میں نے خرقہ اتار کر تیر کمان سنبھال لیے ہیں کہ سچ کی کوئی زبان، کوئی بھیس لباس نہیں ہوتا۔"

یہ شہر، خرقہ پوش، یہ سپاہی میرے وجود کے ملبے میں دُور کہیں دبے ہوئے ہیں، کبھی کبھی مجھے ان کی دھیمی دھیمی آوازیں اور دُھندلی دُھندلی شبیہیں دکھائی دیتی ہیں لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں اپنے وجود کی اس گہری کھائی کو عبور کرکے ان تک پہنچوں۔ میں تو صرف اس نوجوان تک ہی پہنچ پاتا ہوں جو دوستوں کے ساتھ فٹ پاتھ کے کنارے کسی چائے خانہ میں کبھی دوسروں سے اور کبھی اپنے آپ سے مکالمہ کر رہا ہے۔

وہ بھری بھری راتیں اور پھیکے پھیکے دن — دن کا وہی ایک معمول، صبح بغیر منہ دھوئے، بغیر شیو کیے آنکھیں ملتے دفتر کی طرف بھاگنا اور دن بھر فائلوں کی بنجر گود میں زندگی کا شگوفہ تلاش کرنا۔ لیکن راتیں بڑی زرخیز تھیں، شام ہوتے ہی کسی ویرانے سے چائے خانے میں اکٹھے ہونا، دیر تک سمجھ نہ آنے والی باتیں کرنا — اپنے آپ کو، دوسروں کو جاننے دریافت کرنے کی باتیں کرنا، پھر دیر تک شب گردی اُٹھ کی طرف تنہا اُٹھتے ہوئے ویران سڑکوں، درختوں اور کھمبوں سے مکالمہ — ایک عجیب مزہ تھا، لیکن اب تو ایک خاموشی ہے، پُر اسرار خاموشی، نہ صبح دفتر جاتے ہوئے کوئی انہونی بات نہ راتوں کی گود میں کوئی مہکتا شگوفہ — معمول اب بھی ہے صبح وقت پر اُٹھنا، شیو کر تیار ہو کر دفتر جانا اور دن بھر فائلوں پر لوگوں کے مقدر کی لکیریں کھینچنا — اور راتیں اب صرف سونے کے لیے ہیں — ہر طرف ایک خاموشی، گہری خاموشی، ایک ہلکا ارتعاش ہے تو اُس ایک لمحہ جب بڑی سڑک سے مڑتے ہی ٹیلہ پر یہ مزار دکھائی دیتا ہے۔ مزار سے آتی ڈھول آواز رینگتی ہوئی سارے وجود میں پھیل جاتی ہے اور لمحہ بھر کے لیے سارا وجود ملبہ کا ڈھیر بن جاتا ہے جس کے نیچے دبا ہوا سپاہی جو شہر فصیل پر کھڑا دشمن پر تیر چلا رہا ہے اور اُس کے پیچھے شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش سر اُبھارتے ہیں۔

کیا یہ جاننے کا عمل ہے؟

خرقہ پوش مسکراتا ہے، پھر کہتا ہے — "میرے شیخ نے مجھے ایک حکایت سنائی تھی، تم بھی سنو — ایک راہب روم کے کلیسا میں ستر سال سے گوشہ نشین تھا۔ شیخ اس کا ذکر سُن کر روم میں اس کے پاس پہنچے۔ راہب نے دریچے سے سر نکال کر کہا۔ اے شیخ تو یہاں کیا لینے آیا ہے، میں راہب نہیں ہوں بلکہ اپنے نفس کی جس نے کتے کی شکل اختیار کر لی ہے نگرانی کرتا ہوں اور اس کو مخلوق کے شر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ شیخ نے اس کے لیے دعا کی کہ اسے خدا اس کو ہدایت دے۔ راہب بولا — "مُردوں کی جستجو میں تم کب تک پھرتے رہو گے، گھر جا کر خود کو تلاش کرو اور جب اپنے آپ کو پا لو تو اپنے نفس کی نگرانی کرو۔"

یہ اپنے آپ کو پا لینا ہی تو ایک عذاب ہے، آدمی جتنا کم جانے اتنا ہی اچھا ہے۔

بڑ کے درخت کے نیچے موت کی ٹھنڈی انگلیوں نے آہستگی سے سوکھی ہڈیوں کو چھوا، لیکن اسی لمحہ زندگی بھرے ہاتھوں نے سوکھے ہونٹوں پر دُودھ کے قطرے چوائے — تازہ دودھ کی چند بوندوں سے سوکھی انتڑیوں اور خشک ہڈیوں میں زندگی کونپل کی طرح مسکرائی اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں،

"لاعلمی ایک نعمت ہے ؛"

نہ جاننے میں بھی ایک اسرار ہے ۔ خوابوں کے پیچھے بھاگتے جائیں ، دھند کے ساتھ دھند ہو جائیں ـــــ تین سمتوں کی پہچان اور چوتھی سمت کا اسرار ۔

ہرن کنوتیاں اُٹھا بھاگا ، شہزادہ افتاں و خیزاں پیچھے پیچھے ۔ راستہ کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا ۔ رات آگئی ، شب ماہ پورن ماسی کا چاند اور ہرن ہے کہ چوکڑیاں بھرتا چلا جاتا ہے ـــ دفعتہً جنگل ختم ہوا کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک پُر فضا باغ ہے جس کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری کہ ......

لیکن یہ جنگل تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا ، آخر پر پہنچتا ہوں تو پھر پہلا سرا آجاتا ہے ، ایک دائرہ ــــ

صبح چھ بج کر پندرہ منٹ الارم کے ساتھ اُٹھنا ، شیو ، دانت صاف کرنا ، ناشتہ ، بچوں کو سکول چھوڑنا دفتر ـــ ایک فائل دوسری ، تیسری ، بچوں کو سکول سے لینا ـــ گھر واپسی کھانا ، سونا ، اُٹھ کر ٹی وی دیکھنا ــــ رات سونا ، صبح پھر وہی چھ بج کر پندرہ منٹ پر الارم کی آواز ـــــ

ایک ہی راستہ ـــــ یوں ہی برسوں بیت گئے ہیں ،

لیکن بڑی سڑک کا موڑ مڑتے ہی ڈھول کی ہلکی سی آواز نے میرے سوئے وجود میں چٹکی سی لی ہے ۔ مَیں نے چونک کر دیکھا ، ایک پتھر پر جس کا ایک کونہ بڑی سڑک کی طرف باہر کو نکلا ہوا ہے کوئلہ سے لکھا ہے ـــ شیخ ابوالبختیار مشہدی ـــ میری نظریں اوپر اٹھتی گئیں ، مزار رنگ برنگی جھنڈیوں سے جگمگا رہا تھا ، مجھے تو آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا مزار ہے ؟ میرے قدم اُوپر اُٹھتے گئے ، تالاب کی سمت والی منڈیر پر ایک شخص جُھکا ہوا تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ میرے قدموں کی چاپ پر اُس نے سر اُٹھایا ، مَیں نے پوچھا ـــ "آپ کون ہیں ۔"

اُس کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار تبسم اُبھرا ـــ "مَیں ابوالبختیار مشہدی ہوں"

مَیں نے پوچھا ـــ "یا شیخ آپ مشہد سے یہاں پہنچے ، اتنی دُور ــــ مٹی نے کہیں آپ کے پاؤں نہیں پکڑے ۔"

شیخ ایک لمحے چُپ رہے پھر بولے ــــ "مٹی کی پکڑ بڑی سخت ہے لیکن یہ دل کی آواز عجیب چیز ہے ۔ اس کی لَے میں جو بے چینی اور اضطراب ہے وہ آدمی کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے ۔"

"بے چینی اور اضطراب" کوئی میرے اندر کسمسایا ۔

مَیں نے کہا ـــ "یا شیخ میرا اضطراب اور بے چینی کہاں گئے ؟"

شیخ بولے ـــ "ایک شخص تیس سال تک مُرشد کی صحبت میں حاضر رہا اور ایک دن عرض کی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود آپ کی تعلیم مجھ پر اثر انداز نہیں ہوئی ، مُرشد نے فرمایا کہ ایک ہی صورت سے تجھ پر اثر ہو سکتا ہے لیکن وہ تجھے قبول نہیں ہو گی ، اُس نے عرض کی کہ مَیں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا ۔ مُرشد نے فرمایا ، اپنے بال منڈوا کر ایک کمبل اوڑھ اور ایک تھیلے میں اخروٹ بھر لے اور ایسی جگہ جا بیٹھ جہاں بہت سے لوگ تجھ سے واقف ہوں اور بچوں سے کہہ دے کہ جو بچہ مجھے ایک تھپڑ مارے گا اسے ایک اخروٹ دوں گا ، بس یہی تیرا علاج ہے ، اس لیے کہ ابھی تجھے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہو سکا ۔"

مَیں نے شیخ سے یہ نہیں پوچھا کہ مرید نے مُرشد کو کیا جواب دیا ،

زندگی کے اس تسلسل میں ہر سوال کا جواب ضروری بھی نہیں ہوتا ـــــ زندگی ہے ہی عجیب شے، اتنی مضبوط کہ ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ، اور اتنی کمزور کہ ایک سانس کے بعد دوسرا سانس غائب ہو جائے تو سب کچھ ختم ـــــ کائنات کی اس وسعت میں زندگی کے کیا معنی ہیں؟ ایک ذرہ، یا شاید اس سے بھی زیادہ بے وقعت کیا معلوم یہ کائنات بھی کسی نقطہ پر جا کر ذرّے کی طرح بے وقعت ہو جاتی ہو، یا اپنے ہی ہاتھوں خود کو فنا کر لیتی ہو، ایک نئے آغاز کے لیے ـــــ تو یہ سب کچھ ایک سفر ہی ہے، ایک طویل سفر، شیخ مشہد سے یہاں پہنچے اور مٹی کہیں ان کے پاؤں نہ پکڑ سکی، لیکن کئی لوگ تو مٹی کی گرفت سے نکل ہی نہیں پاتے، ساری عمر انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں، جہاں پیدا ہوتے وہیں مرگئے، یا شاید جس لمحے پیدا ہوئے اُسی لمحے مرگئے۔

یہ ساری تگ و دو تو خود کو جاننے پانے کی ہے ـــــ سارا کھیل ظاہر اور باطن کا ہے ـــــ ایک پُر اسرار آنکھ مچولی،

ایک بار شیخ کو راہ میں ایک کتّا ملا۔ آپ نے دامن سمیٹ لیا۔ اس پر کُتّا بولا ـــــ آپ نے دامن کیوں بچایا۔ اس لیے کہ اگر میں بھیگا ہوا نہیں ہوں تو مجھ سے ناپاکی کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر بھیگا ہوا ہوتا تو آپ اپنے کپڑے پاک کر سکتے ہیں لیکن یہ تکبّر جس کا مظاہرہ آپ نے فرمایا یہ تو سات سمندروں کے پانی سے بھی پاک نہیں ہو سکتا، آپ نے فرمایا تُو سچ کہتا ہے اس لیے کہ تیرا ظاہر نجس ہے اور میرا باطن،

مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ میرے ظاہر اور باطن میں کون زیادہ نجس ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ظاہر بڑا پُر سکون اور خاموش ہے اور باطن میں نہ تھمنے والا طوفان ـــــ جس کی زد میں، میں ایک تنکے کی طرح ہوں، جیسے کائنات اوپر سے خاموش اور اپنے مرکز کی پابند دکھائی دیتی ہے،

شیخ ابوالبختیار مشہدی ٹوٹی منڈیر سے تالاب میں تیرتی بطخوں کو دیکھ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا ـــــ "اے شیخ یہ فنا اور بقا کا کیا فلسفہ ہے؟"

شیخ نے تالاب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو میں نے دیکھا ان کی ہتھیلی پر شعلہ پھڑپھڑا رہا ہے، پھر شیخ نے گرم تنور میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس میں زندہ مچھلی پھڑپھڑا رہی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا

وہ مسکرائے ـــــ "فنا اور بقا ایک ہی سلسلے کی دو سمتیں ہیں"

پھر ذرا توقف کے بعد بولے ـــــ "ایک شخص نے اپنے مُرشد سے کہا، حضور تنور گرم ہے، مُرشد نے جواب نہ دیا، اُس نے تین بار کہا حضور تنور گرم ہے، مُرشد نے جھلّا کر کہا تو جاؤ اس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ کچھ دیر بعد انہیں خیال آیا کہ اُنھوں نے کیا کہہ دیا ہے، فرمایا، جاؤ تنور میں جا کر دیکھو، جب تنور تلاش کر کے دیکھا تو وہ شخص اندر بیٹھا ہے اور آگ نے ایک بال بھی نہیں جلایا"۔

شیخ خاموش ہو گئے، پھر بولے ـــــ "اصل چیز وجود نہیں وجود کا احساس ہے۔"

لیکن خود کو محسوس کرنا کیا اتنا ہی آسان ہے؟

میں نے جب بھی خود کو محسوس کرنے کی کوشش کی ہے ایک عجیب طرح کی افراتفری نے آن گھیرا ہے، یوں لگا جیسے بہت سی چیزیں، کیفیتیں اور جذبے بکھرے پڑے ہیں، جنہیں زبان اور ترتیب دینا میرے بس میں نہیں ـــــ شہر کے دروازے پر دستک دیتا خرقہ پوش اور فصیلِ شہر پر خون بہاتا سپاہی مدھم ہوتے ہوتے دُھندلے نشانوں سے بھی کہیں پرے چلے گئے ہیں ـــــ ان کے آگے ایک بنجر میدان ہے جس میں کبھی کبھار

مُشتاق یادوں کے کچھ دیے روشن ہو جاتے ہیں ــــ ہرنی کی سی چال والی وہ، جس کے جُوڑے کا زرد پھول آج بھی یادوں کی جھیل میں تیرتا تیرتا میری آنکھوں کے کسی کونے میں نمی بننے لگتا ہے، وہ ہمیشہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے میرے سوال کی منتظر ہو ــــ میں اُس سے اپنا آپ واپس مانگنا چاہتا تھا، لیکن لفظوں نے کبھی میرا ساتھ نہ دیا، بوند بوند حرف اکٹھے کرکے لفظ بناتا لیکن یہ لفظ جُملے نہ بن پائے ــــ اور یوں ہی یونیورسٹی کے دو سال بیت گئے، وقت کے جواری ہاتھوں نے ہمیں پھینٹ کر زمانے کی شطرنج پر پھینک دیا۔ دیوار پر لگے کیلنڈروں کے کئی ہندسے ٹوٹ ٹوٹ کر وقت کی دَشت بن میں گر گئے، بہت سے چہرے دُھندلا گئے لیکن اب بھی آنکھوں کے کسی کونے میں ایک نمی سی محسوس ہوتی ہے جس کے شفاف بدن میں سے زرد پھول لمحہ بھر کے لیے جھانکنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کی مانوس خوشبو بھول گیا ہوں لیکن کل جب ایک دُکان سے نکلتے ہوئے وہ اچانک میرے سامنے آگئی تو وہی خوشبو، مانوس خوشبو مجھ سے لپٹ گئی، ہم دونوں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکے، پھر وہ اپنے بچّوں کو لے کر اندر چلی گئی، میں اپنے بچّوں کو لے کر باہر نکل آیا۔

اس شام میں نے شیخ سے پوچھا ــــ "اگر دریا ایک ہی ہے تو لہریں ایک دوسرے سے دُور کیوں ہو جاتی ہیں، کوئی آگے نکل جاتی ہے کوئی پیچھے رہ جاتی ہے۔"

شیخ نے تالاب سے نظریں ہٹائیں اور بولے ــــ "یہ تو صرف نظر کا فریب ہے۔"

میں نے کہا ــــ "اگر یہ محض فریب ہے تو پھر یہ بے چینی کیسی؟"

شیخ بہت دیر چُپ رہے پھر کہنے لگے ــــ "ایک شخص روتا ہوا مُرشد کے پاس آیا اور عرض کی کہ یا حضرت میں نے بڑی محنت، عبادت اور ریاضت کے بعد ایک خاص انجذابی کیفیت حاصل کی تھی، اس میں بڑی لذّت اور آسودگی تھی لیکن چند دنوں سے میں اس حلاوت بھرے جذب سے محروم ہو گیا ہوں،"

مُرشد نے فرمایا ــــ دُنیا چھوڑ دینے کے بعد تم پھر اس کے وسوسوں میں گھر گئے ہو اور غیر یقینی سوچوں نے تمہارے باطن کو ہلا دیا ہے" سُنسان سڑک، راستہ دُھندلایا ہوا، وسوسہ دبے پاؤں آتا ہے اور پلک جھپکنے میں چاروں طرف چھا جاتا ہے، خود کو محسوس کرنے کے لیے ایک لمبی چیخ، لیکن جواباً چُپ، گہری چُپ"!

مرید نے مُرشد سے سوال کیا، مُرشد خاموش رہا، مرید نے پھر سوال کیا، آپ نے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا، مُرشد نے جواب دیا، ایک وقت ہوتا ہے جب جواب دینے سے سوال حل ہو جاتا ہے، پھر ایک وقت وہ آتا ہے جب سکوت کرنا پڑتا ہے اور یہ بات سمجھ لو کہ نظر کے بعد خبر کی ضرورت نہیں رہتی، تب خبر اور وقت دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں،

رات گئے دروازہ کھولتے ہوئے بیوی کا وہی پُرانا جملہ ــــ "یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔"

مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا کہ گھر آنے کا وقت کون سا ہے اور گھر کیسے پاؤں پکڑتا ہے، یونیورسٹی کے زمانے میں دن پڑھنے میں گزر جاتا اور رات کو کسی چائے خانے میں سارے دوست اپنے اپنے زرد پھولوں کی یاد تازہ کرتے، رات گئے دروازہ کھولتے ہوئے ماں روز کا جملہ دہراتی ــــ "یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا" ماں کا خیال تھا کہ شادی کے بعد میرے پاؤں گھر میں رُک جائیں گے لیکن شب گردی اور سنسان سڑکوں پر درختوں، کھمبوں اور اپنے آپ سے مکالمہ کرنے کا نشہ عجب ہے کہ جاتے نہیں جاتا، معلوم نہیں تنہائی میں اتنی لذّت کیوں ہے، ایک بستر میں برسوں اکٹھے ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی لمحہ یا مقام ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں ترسیل نہیں ہوتی، اُس لمحہ، اُس مقام پر ہر ذات تنہا ہوتی ہے

اپنے دکھ کے ساتھ کسی زرد پھول، کسی رُخِ ثانی کی یاد کے ساتھ۔ لیکن یہ یاد تو تلوار کی طرح ہے جو ہمیشہ سر پر سونتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کسی بادشاہ نے مجنوں کو بلایا اور پوچھا تجھے کیا ہوگیا ہے اور تجھ پر کیا اُفتاد پڑی ہے کہ تو نے خود کو رُسوا کیا، لیلیٰ کیا ہے اس میں کیا خوبی ہے، آ میں تجھے حسین ترین دوشیزائیں دکھاؤں اور ان کو تجھ پر قربان کروں اور انہیں تجھ کو بخش دوں، جب یہ حسین ترین دوشیزائیں حاضر ہوئیں تو اپنی اداؤں میں سرمست تھیں، مجنوں اپنے حال میں تھا، اس نے نظر اُٹھا کر نہ دیکھا، بادشاہ نے کہا —— اب ذرا نظر اُٹھا اور ان دوشیزاؤں کو دیکھ، مجنوں نے جواب دیا —— میں ڈرتا ہوں کیونکہ لیلیٰ کا عشق تلوار سونتے کھڑا ہے۔ میں نے سر اُٹھایا تو وہ ایک ہی وار سے مجھے اُڑا دے گا، اور اے بادشاہ تو نے یہ جو پوچھا کہ لیلیٰ کیا ہے تو جان لے کہ لیلیٰ جسم نہیں نور ہے اور یہ بھی جان لے کہ اگر ساری دُنیا نور سے بھر جائے پھر بھی جب تک اپنی آنکھوں میں نور نہ ہو، نور نظر نہیں آئے گا۔ اور جب یہ نور نظر آنے لگتا ہے تو اپنے نام کی پکار سُنائی دیتی ہے۔

"یا شیخ —— یہ کیا اسرار ہے کہ پکارنے والا پکارے جاتا ہے لیکن سامنے نہیں آتا؟"

شیخ نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولے —— "پکارنے والا سُننے والے سے علیحدہ نہیں، اور اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے۔"

پروفیسر نے عینک ٹھیک کی اور کہنے لگے —— "ذہن کے دو حصے ہیں، دائیں طرف والا اور بائیں طرف والا، ایک پُرانا اور دوسرا نیا ذہن، پُرانا ذہن —————— پوری انسانیت بلکہ پوری کائنات کی تاریخ، ایک عظیم لائبریری، ایک دفینہ —— نیا ذہن جدید عہد اور نئے امکانات کی دُنیا ہے —————— دونوں کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ یا شاید ایک سنگِ لرزاں —— جب کبھی یہ سنگِ لرزاں اندر کی حدت سے پگھل جائے تو پُرانے ذہن سے چیزیں سرک کر نئے ذہن میں آجاتی ہیں، سارا معمول غیر معمول بن جاتا ہے، پُراسرار آوازیں سُنائی دیتی ہیں، چیزوں کے نئے چہرے، نئے معنی دریافت ہوتے ہیں —— کشف و کرامات —— اسرار، آوازیں —— جو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ باتیں —— جو سمجھ میں نہیں آتیں،

کیا ایک دوسرے کی باتیں سمجھنا ضروری بھی ہے؟ ہم سب زندگی کو اپنے اپنے دریچے سے گزرتے دیکھتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرکتیں کیا؟ اور کیوں؟ ایک نہ ایک لمحہ یا مقام تو ضرور ایسا ہے جو صرف اور صرف اپنا ہوتا ہے، جہاں کوئی دوست، ماں باپ، بیوی بچے شرکت نہیں کرتے، تنہائی کا ایک لمحہ، اپنا لمحہ۔

میں اس ایک لمحہ کی لذت میں گُم رہنا چاہتا ہوں، زندگی کی سُنسان سڑک پر خاموشی سے چلتے جانا اور ایک دن نیستی کی دُھند میں ڈوب جانا لیکن یہ جو کبھی کبھی مُڑ کر دیکھنے کی خواہش ہے، ماضی کے مشفق ہاتھ کی گرم گرم تھپک —— بڑی سڑک کے موڑ پر تالاب کے کنارے اُونچے ٹیلے پر یہ مزار، مزار سے اُٹھتی دُھول کی مہکتی بھاپ، منڈیر پر جھکے شیخ ابوالبختیار مشہدی اور تالاب میں ڈوبتے سُورج کا عکس،

"یا شیخ —— یہ ماضی، حال اور مستقبل کا کیا اسرار ہے، ہم کہاں زندہ رہتے ہیں اور کہاں فنا ہو جاتے ہیں؟"

شیخ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز پُراسرار تبسم اُبھرا، بولے —— "وقت ایک دریا کی مانند ہے جس کی لہروں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ دیکھنے میں وہ الگ الگ نظر آتی ہیں، ماضی کی گود سے حال، حال کی گود سے مستقبل اور مستقبل کی گود سے پھر ماضی طلوع ہوتا ہے ایک دائرہ جس کا ایک مرکزہ ہے اور اس مرکزہ کی کوئی زبان نہیں نہ کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا —— "تو اے شیخ اس دائرے کا تسلسل کیا ہے؟"

شیخ نے ذرا توقف کیا پھر کہا —— "فہمِ انسانی اس تسلسل تک رسائی نہیں رکھتا، اس کی رسائی تو عام درجے تک بھی نہیں ہو سکتی،

——— حقیقۃ الحقیقۃ اور حق الحقیقۃ تک اس کا پہنچنا ناممکن ہے، اس کے لیے نفس کو فنا کرنا پڑتا

میں اپنے نفس کو فنا نہیں کر سکا، اس لیے میں اس بھید کو نہیں پا سکا۔
میں نے پوچھا ——— "اے شیخ آپ نے تو اس بھید کو پا لیا ہوگا۔"
شیخ نے ٹھنڈی آہ بھری ——— "وہ خرقہ پوش مشہد کی خاک سے اٹھا اور مرشد کے حکم کے مطابق مسافتیں طے کرتا اس شہر کے
ـے پر پہنچا۔ اسی ٹیلہ پر اس نے چلہ کاٹا اور یہیں خاک میں مل کر خاک ہوا ——— برسوں بعد اسی خاک سے اس جواں مرد نے جنم لیا، شہر
ـفت کرتے فصیل پر جان دی، پھر اسی لہو سے ،ب برسوں بعد ———"
میں نے بے چینی سے پوچھا ——— "اور اب برسوں بعد ——— کون ——— اے شیخ کون؟"
شیخ کچھ نہ بولے۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے خرقہ پوش کی دستک سنی، فصیلِ شہر پر بہتے تازہ لہو کی مہک، چائے خانے کی میز پر ٹکہ مار
ـث کرتے جواں کی آواز ——— منظر سمٹ کر ایک نقطہ بن کر شیخ کے وجود میں سما گئے۔
میں نے کہا ——— "اے شیخ اگر وہ خرقہ پوش، وہ جواں مرد، وہ جوان سب آپ ہیں تو میں کیا ہوں؟"
شیخ نے مجھے دیکھا، بولے ——— "ایک مرتبہ کل جہان کے پکھیرو سی مرغ کی تلاش میں نکلے، برسوں بعد جب وہ تپتے صحراؤں،
ـی پہاڑوں اور موت کی سات وادیوں سے گزر کر کوہ کاف پر پہنچے تو لاکھوں میں سے صرف تیس باقی رہ گئے، یہ تیس پرندے مختلف
ـزوں سے گزر کر آخر کار ایک ایسے پردے کے سامنے پہنچے جس کے پیچھے سی مرغ پوشیدہ تھا، پردہ اٹھا تو انہوں نے دیکھا کہ ان
سامنے ایک آئینہ ہے جس میں ان کا اپنا عکس دکھائی دے رہا ہے۔"
میں نے سر اٹھایا ——— وہاں کوئی نہیں تھا،
"یا شیخ ——— یا شیخ"
لیکن شیخ ابوالبختیار مشہدی کا کچھ پتہ نہیں تھا، مزار سنسان پڑا تھا، نہ کوئی جھنڈا، نہ ڈھول کی تھاپ، ہر طرف ایک ویرانی اور اداسی
مدتوں سے وہاں کوئی نہیں آیا تھا اور میں نہ جانے کب سے ٹوٹی منڈیر پر جھکا اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہا تھا۔

پتھر کے پڑاؤ

علی تنہا

ماتھے پر سے اُڑے بالوں کو اُونی ٹوپی سے ڈھک کر اُس نے ہڈیالے ہاتھ گھٹنوں پر پھیلا دیئے۔ عبدالستار کا پھیکا چہرہ بڑا
حد تک ہنسنے اور رونے کی درمیانی کیفیت میں۔ بلند ناک اور اُدھ کھلی آنکھوں کی وجہ سے خاصا بگڑ گیا تھا۔ بے تکے کدو کی طرح مستطیل
سر پر چیت رسید کر کے عبدالغنی نے اُسے جگایا۔

"سو گئے ہو کیا"

"نہیں۔ نہیں ....."

"یہ بتاؤ کتنے عرصے بعد آئے ہو یہاں .... "

"عرصہ اب یاد نہیں "

"کیوں عرصہ کیوں یاد نہیں ... یہ کوئی بھولنے والی بات ہے!"

"میرے پاس وقت یاد کرنے کو بچا ہی کیا ہے عبدالغنی میاں ...." وہ پولے پولے ہنستا ہوا لوگوں کو بلندی سے گرنے کے بڑا
میں ایک طرف جھولتے دیکھ کر بولا۔

"اچھا وقت یاد نہیں ... لوگ کُل کتنے تھے اُس دن وہاں۔"

"لوگ ... تو لوگ کُل تھے نو ... اِن میں دو اوڑنیاں بھی آپ گن لیں ..."

"ان لوگوں میں تین مر گئے ... باقی زخمی ہوئے تھے۔ یہی ہے نا ...."

"ہاں ..."

"اب پہچان لوگے اُنہیں؟"

"کیا خبر؟" اس کی خبر میں گہرے پانیوں سی خاموشی اور پہنائی آگئی۔ "کوئی اس سے پوچھے۔ پہچاننے کو کیا ہے؛ مگر پہچان کی بڑا
وہ اپنی جھوٹی سنجیدگی پر کچھ نادم سا ہو کر عبدالغنی پر جُھک کر کہنے لگا۔

"بات یہ ہے عبدالغنی میاں۔ اللسائی دُھوپ میں، لوگ پاگلوں کی طرح دیواروں پر پل پڑے تھے۔ میری تو حیثیت منشی کی ہو، اب

اندر خانے ہوتی ہے ، اس کی خبر مجھے کون دے .... عبدالستار نے سر نکال کے ۔ بس کی کھڑکی پہ دو تین لکیریں کھینچیں اور جلدی ہی سر اندر
، نہر کے کنارے دوڑتے لونڈوں کی طرف اشارہ کیا ۔

"دیکھیں ان کی حرکتیں .... "

" دھیان کرو انہیں ، ذرا غور کرو ، کیا پہچاننا بہت مشکل ہے ان سب کا ؟"

میں نے کہہ جانا ، بہت مشکل ہے ۔ اتنا زمانہ تو نکل گیا ہے ۔ اب وہ بچے زندہ شکلیں کہاں ویسی ہوں گی ۔ نہیں ہے کیا ؟ وہ کہتے کہتے
گئے ۔ ایک ٹرالر کو بس نے اوورٹیک کیا ۔ برابر والی سیٹ کے بوڑھے نے انہیں مسلسل دیکھتے دیکھتے پہلو بدلا ۔

" سب سے پہلے مستو دادا دیوار تلے آیا تھا ؟"

" آپ بات یہ کیا کرتے ہیں ، کون پہلے آیا ؟ دوسروں کی طرح آگیا ہوگا وہ بھی ۔"

عبدالغنی نے سر ہلایا ۔

" یار عبدالستار وہ بے خبری میں نہ مارے گئے ہوں .... "

" آپ کو ہو کیا گیا ہے ۔ کوئی مرنے سے واقف ہوتا ہے ۔ مارے تو وہ بے خبری میں گئے تھے .... "

" میرا مطلب مستو دادا سے ہے ۔ وہ کیوں دیوار تلے آگیا .... "

" جناب میں تو باتیں یہ سن سن کے پاگل ہو جاؤں گا ، مر جاؤں گا " وہ جھنجھلا اٹھا ۔

" ارے میاں بات یہ کہاں ہے ۔ اصل میں حویلی ڈھائے جانے کی خبر اسے ہی تھی ... "

عبدالستار اچھل پڑا " کیا کہا حویلی ڈھائے جانے کی خبر کس کو تھی ؟"

" مستو دادا کو ۔ جی ہاں .... "

" حیرت ہے ... " عبدالستار کا کھلا دہانہ دیر تک مکھیوں کی گزرگاہ بنا رہا ۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی وجہ سے خاصہ غصہ پھیل گیا ۔

" یہ کس نے بتایا ۔ مانا وحیدالدین نے ۔ جب ہم نے دادا مستو کو ملبے میں سے نکالا ، تو میں نے نعرہ لگایا تھا ۔ بچ گیا دادا مستو .... اس
نے گھور کے مجھے دیکھا .... "

" چلو شکر ہے وہ تو زندہ ہے نا "

" کیا زندہ ہے ۔ آسمان سے تو اسے آوازیں آتی ہیں ۔ جواب کیا معلوم کیا دے .... "

عبدالغنی کے برابر میں بیٹھے بزرگ نے گردن لمبی کرکے پوچھا ۔

" کیا آپ دادا مصطفیٰ کی بات کرتے ہیں .... ؟"

دونوں نے یکبارگی کانپ کر دراز قد بڈھے کو دیکھا ۔

" جی کیا کہا آپ نے ؟"

اس کے شائستہ لہجے میں کوئی فرق نہ آیا " دادا مصطفیٰ کی باتیں کر رہے تھے آپ ؟"

" مگر آپ کون ہیں ؟" عبدالغنی نے آنکھیں پھاڑ کر بڈھے کو دیکھا ۔

"نہیں ! بیٹا میں مصطفیٰ کا چھوٹا بھائی عبدالحمید ہوں ۔ آپ باتیں کر رہے تھے دیر سے ان کی تو میں نے .... "

"تو آپ عبدالحمید ہیں ؟"

"جی ہاں میں ہوں عبدالحمید "

"اصل میں ہم تو ملنے ہی دادا مصطفیٰ سے آئے ہیں ۔ میں سولہ سال رہا دوبئی میں ۔ سوچا اب حویلی کے ڈھلنے جانے کا پتہ خود کروں .... "

بوڑھے کی آواز بھر آگئی " مگر آپ کس سے پتہ کریں گے مصطفیٰ کو گزرے تو دوسرا مہینہ ہے "

" دوسرا مہینہ ہے ! ان کا انتقال ہو گیا ! میرے خدا .... ! "

"جی ہاں پندرہ سال تک ان کا دماغ غیر حاضر رہا ۔ آخر فالج نے رہی سہی کسر نکال دی ۔ علاج بہت کرایا ۔ بہت کرایا ۔ لیکن آئے دا
کون ٹال سکا ہے .... " بس کے رکتے ہی بوڑھے نے کاندھے پر جھولتے رومال کو ہاتھ میں پکڑ کر بہت نرمی سے کہا ۔

" آیئے اڈہ آگیا ... دونوں با دلِ نخواستہ بوڑھے کے ساتھ بس سے اتر گئے ۔ اڈے پر لوگوں کے اژدہام میں وہ بچوں کی طر
دوڑتے بوڑھے سے پاؤں ملائے ، آٹے کی مشین تک آئے ۔ سہ پہر کی نرم دھوپ میں دور تک آوازیں رُک رُک کر آتی رہیں ۔ کیا یہ
آوازیں ہیں ! عبدالغنی نے سڑک عبور کر کے سامنے ایک بھورے بھاری پتھر پہ لیٹے دیو کی طرح پھیلائے بازوؤں والے مونچھیل آدم
دیکھ کر عبدالستار کو ٹھوکا دیا ۔

" یہ کیا شے ہے "

" کوئی ہوگا " اس نے بے نیازی سے جواب دیا ۔

بوڑھے نے انہیں بولتے دیکھ کر خود فراموشی کے عالم میں سر ہلایا ۔ وہ ایک طویل باڑے سے گزر کر بازار کے پچھواڑے گلی میں دا
ہو گئے ۔ اکھڑے ہوئے فرش والی تنگ سڑک پر رہڑیوں، سائیکلوں اور تانگوں سے بچتے وہ ایک اندبنلی گلی میں مڑ گئے ۔ آزو بازو مکا
کے آس پاس کھڑے لوگ بڈھے کو جھک جھک کر سلام کرتے جاتے ۔ عبدالغنی کو خواب میں چلتے یہ آدمی کہاں سے مل گیا ۔ وہ ہلکی سردی
ایک لمبا سانس لے کے بوڑھے سے مخاطب ہوا ،

" آپ جانتے ہیں مجھے ؟ "

بوڑھے نے طنزیہ اُسے ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیا ۔

" لو جی کہتے ہیں آپ مجھے جانتے ہیں ؟ ۔ بھئی آپ کے بزرگوں کا رزق میرے بھائی نے کتنے سال کھایا ہے ۔ آپ تو جناب پید
ان کے ہاتھوں میں ہوئے تھے ۔ نبی بخش کے بیٹے ہیں نا آپ " اس نے بہت آہستہ سے جی کہا ۔

" بیٹا یہ ہے اپنا غریب خانہ " وہ پرانی وضع کی کشادہ حویلی کے سامنے رُک گیا ۔ بوڑھے نے دروازہ بند پا کے کنڈی کھڑکائی ۔

" کون ہے ؟ اندر سے زنانہ آواز آئی ۔

" بچہ دروازہ کھول جلدی نال .... " ذرا سی دیر میں بھاری پٹوں والا دروازہ چرمراتا ہوا کھلا ۔ دروازے کے اندر بل کھاتی ہو
ڈیوڑھی کی چونا گچ دیواروں کے ساتھ ساتھ دور تک ڈیزل سے بھرے ڈرم پڑے تھے ۔ بوڑھے نے ڈیوڑھی کے اندر کھلنے والی بیٹھک

ازہ کھول کر بلب روشن کیا۔

"آجایئے اندر۔ میں ابھی آتا ہوں"

دونوں رنگین ٹائیلوں والے فرش پر سے گزرتے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دیوار میں شمالی جانب قدآدم آئینہ، اور چھت کے عین درمیان میں خوبصورت آبنوسی جھاڑ کو دیکھ کر عبدالستار نے سر ہلایا۔

"یار لوگ تو نودولتئے ہیں۔ مگر کام سب درست ہے۔"

"لگتا ہے ایک مدت سے یہاں کوئی آیا نہ گیا ہے۔ کیا سرد کمرہ ہے یہ" عبدالغنی نے خانقاہ کے سامنے نیم برہنہ بڈھے کی بڑی بڑی بتاشہ آنکھیں دیکھتے دیکھتے دیر تک اور کوئی بات نہ کی۔ وہ سیلن زدہ کمرے میں مُردوں کی طرح دبکے بڑبڑ دیواروں میں خود کو آوازیں دیتے ہے۔ لیکن دیوار تلے لوگ کہیں باہر نکل پاتے ہیں۔ ان کے تو سستارے تک دیواریں چاٹ لیں۔ ان کی افسردگی کو بڈھے کے قدموں نے زیر تر کر دیا۔

"آپ کتنے چپ چاپ ہیں، خیریت تو ہے نا؟"

بوڑھے نے ساتھ کرسی پر بیٹھے غور سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"بات یہ ہے میاں عبدالغنی۔ میں نے غلط تمہارا نام تو نہیں لیا نا.... ہاں تو بھئی حویلی آپ کی ڈھانے والے آپ کے بزرگ۔ ایسے اس میں خطا کس کی؟

عبدالغنی نے سینے پر سے سر اٹھا کر بوڑھے کو گھورا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میرے بزرگوں نے قطعی حویلی مسمار کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ گئے تھے برات میں۔ آپ جانیں اس حویلی میں رہتا کون تھا۔ کوئی اجنبی مزدوروں کو لے کر آیا ہے اور تیسرے دن جب ہمارے بزرگ لوٹے ہیں، حویلی کا آدھا حصہ ملبا بنا پڑا ہے۔ لوگوں کی باتیں الگ، جی ہیں جن کے جو آتا ہے کہے جاتا ہے...."

بوڑھے نے متلاطم جی کے ساتھ داڑھی میں انگلیاں پھیریں۔

"معاف کرے اللہ مجھے، مصطفیٰ کی حالت دیکھ کے تو جی اب بھی میرا مسلا جاتا ہے۔ کیا دیوار گری ہے۔ پورے قصبے پر عذاب بلا بڑا جان لیوا آیا۔ ڈھنگ کی فصل تک کسی کی نہ ہوتی۔ مرنے والوں کے گھروں سے کوکیں .... میری توبہ جو ہونی تھی گزر گئی اب یہ گاڑے مُردے اکھاڑیں گے آپ۔ فائدہ اب کھوج کا ذرا نہیں۔

"فائدہ....؟" عبدالغنی نے منہ میں دہرایا۔ شاید وہ کچھ کہنے والا تھا۔ مگر گولڈ کپڑوں والے لڑکے کے ہاتھ طشتری دیکھ کر رہ چپ ہو گیا۔ لڑکے نے بہت احتیاط سے کھانا میز پر چن دیا۔ مکھن سے چپڑی تازہ تنوری روٹی دیکھ کر دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ بوڑھے نے بھنے گوشت کا ڈونگا اس کی طرف بڑھایا۔

"بس جو دال ساگ ہے لیجئے...."

اس نے پلیٹ بھر کر سوئی سوئی آواز میں باتیں کرتے بوڑھے کے بارے میں سوچا بہت۔ وہ باتوں کو کیوں گُڑ، کھانڈ سمجھ کے بانٹتا ہے۔ اتنی رسیلی باتیں سُن کے تو مکھیاں اس پر نہیں بیٹھ جائیں گی.... شاید اسے چسکا ہے باتوں میں رس گھول کے کہنے کا۔ بھوری بھر دیں

ڈاڑھی کے درمیان موٹے سیاہ ہونٹ آپس میں ملتے ، جُدا ہوتے کیا کیا ملنے بچھڑنے کی کہانیاں کہتے ہیں ۔ آدمی بھی وہ جھلملاہٹ دار ہے ۔ نہیں تو ..... بوڑھے نے مٹر کی پلیٹ بھی بڑھا دی ۔

" کھائیے آپ ۔ عبدالغنی میاں ، بہت آہستہ کھاتے ہیں آپ ، کہیں آپ دونوں کا حق میں ہڑپ نہ کر جاؤں .... " وہ زور سے ہنسا۔ مٹر کی پلیٹ کی طرف بغور اُس نے دیکھا ۔

" بات یہ ہے ، مٹر میرا کھاجا ہے ۔ اتنے دنوں بعد ویسی گھی کی مہک سے حویلی میرے اندر کروٹ بدل رہی ہے ۔ خدا بخشے میری دادی کو ..... کیوں جی آپ حیران ہو رہے ہیں ۔"

عبدالغنی نے بوڑھے کو لقمہ اٹھاتے دیوانوں کی طرح آنکھیں پھیلائے دیکھ کر پوچھا ۔

" یہ حویلی کیا بلا ہے ۔ جو بھی وہاں سے گزرا ہے اس کا سایا سا اس کے ساتھ لگ گیا ہے ۔ میں نے بارہا ابراہیم کو دیکھا ۔ کہتا تھا ، حویلی میں ایک سیاہ پرندہ اُنیس سال تک رہا ، صبح شام جنگل سے اڑتا ہوا آتا ۔"

" کون پرندہ ؟ "

" نام یاد نہیں ، رنگت یاد ہے اب ۔" بوڑھے نے کھانے سے دونوں کو ہاتھ روک کر اپنی طرف متوجہ پاکر اشارہ کیا ۔

" کھانا تو کھا لیں ۔"

" بہت کھالیا ۔ بس اب ایک کام باقی رہ گیا ہے بیگم دادا مصطفیٰ سے ملنے کا ۔ ہو سکتا ہے کوئی بات حویلی کی یاد ہو انہیں۔" ناگواری سے بوڑھے نے پہلو بدلا ۔

" یہ مشکل ہے ۔ ان کی تو حالت اس ہوگی بھی نہیں ، دوسرا سانس ہی سنبھل کے لے سکے ۔"

عبدالغنی نے عبدالستار کو اُٹھنے کا اشارہ کیا ۔

" کیوں کیوں ہوا کیا ؟ "

عبدالغنی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے ۔

" اب اجازت ۔ ہم تو آئے تھے جو مقصد لے کے وہ تو ہوا نہیں حل ۔ اب بیٹھنا فضول ہے ..... "

" اتنی دیر ہو چلی ہے رات قیام کرنے میں ہرج ہی کیا ہے ۔ گھر آپ کا اپنا ہے ۔ "

لیکن دونوں نے بوڑھے کی سُنی اَن سُنی کرکے ہاتھ بڑھاکر اجازت لی اور تیز تیز قدم اُٹھاتے خاموش نیم روشن گلیوں میں سے گزرتے ہوئے بھاٹی بھاٹی سڑک پر آ گئے ۔

عبدالستار نے چلتے چلتے اُس کو ٹھنڈی سانس بھرتے پوچھا ۔

" خیریت تو گزری نا ۔ میں تو کہتا تھا ، حویلی کے عذاب میں کودنا ، عقل مندی نہیں ہے ۔ میری تو خیر آپ کیا سُنیں گے .... اب دھیان آیا وقت کیوں یاد نہیں رکھتا میں .... "

" بات یہ نہیں ۔ مجھے لگتا ہے ، یہاں آیا ہوں کبھی ۔ لیکن کب .... یہ دھیان نہیں پڑتا ۔ "

عبدالستار کے سوکھے چہرے پر رونق آگئی ۔

" تم کہاں کہاں نہیں گئے جناب ۔"

عبدالغنی نے زخمی پرندے کی طرح لوٹ پوٹ آواز میں، ہاتھ لمبے کر کے کہا ۔

" تم کو خدا سمجھے ۔ میں کیا کہتا ہوں تم کیا بکتے ہو ۔ کہتا ہوں جگہ یہ نئی نہیں ہے میرے لیے ... میں آیا ہوں یہاں کئی بار، کئی بار !"

" میرے اندر کوئی شے ہے ، بتاتی ہے مجھے یہاں آنے کا ۔ آنے کا یہاں عبدالستار ...."

" یہ سب سایا ہے حویلی کا ۔ بوڑھا سچ کہتا تھا "

وہ اڈے کی طرف پو قدے چلتا ہوا رک گیا ۔

" ایک اور بات مانو گے ، یہ میل کا پتھر ہے نا ۔ یہ حویلی کے محراب میں لگا رہا ہے ۔"

" محراب میں ؟ میل کا پتھر .... یہ تو ... ؟" جھک کر اس نے سیاہ پتھر کو ہلایا ۔

" عبدالغنی ، پتھر یہ حویلی کا کہاں ہے ۔ یہ تو زمانوں کا یہاں گڑا ہے ۔ لوگ باگ بھول گئے ہیں اس کے ہندسوں تک کو ..... ویران ہیں یہ پتھر ... " اس کی یادداشت میں حویلی کے وہ پتھر چمک اٹھے ، جن کے ڈھانے کو وہ گئے تھے ، وہ حویلی کے پتھروں کو ذہن میں لے کے دوبارہ میل کے پتھر پر جھکا ۔

" عبدالغنی یہ پتھر ہے نا ....." اس کی آواز کو گاڑی کے تیز شور نے شاید پھینک دیا ہو ۔ سو وہ اٹھ کے حیرت میں پکارا

" عبدالغنی ... اے عبد .... " نامرادانہ اس کی آواز سارے میں پھیل گئی ۔ وہ عبدالغنی کو چار سُو دیکھتا ، آخر کار میل کے پتھر کے سامنے جڑ کے بیٹھ گیا بے حس و حرکت ، محراب میں چُنے پتھر کی طرح !

رات، مَیں اور دُعا

شمس نعمان

شہر کے جنوبی حصّہ میں واقع پہاڑ جن کے پتھروں کا رنگ سُرخ اور سُرمئی ہے اور جن کی تہوں میں جوگیا رنگی مٹّی جمی ہوئی ہے
مسلسل کئی گھنٹوں سے بادلوں کی خوفناک گرج اور بے حساب بارش کی زد میں ہیں۔

بجلی کی چمک اور کڑک پہاڑوں سے ہوتی ہوئی آوارہ وحشی بلّیوں کی مانند شہر بھر کے گھروں میں جھانکتی پھر رہی ہے نہ جانے
اُسے کس کی تلاش ہے۔ اور نہ جانے کون —— کب جل کر راکھ ہو جائے۔

رات اپنے سفر کے انتہائی آخری مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ تلاطم اور اضطراب میں گرفتار رات پر یہ لمحے بے حد بھاری ہیں
مگر اس کے باوجود شہر کے لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں آرام سے سو رہے ہیں جیسے پانی برسنے کے اس موسم میں ایسی بے کل
اور بے چین راتوں کے وہ عادی ہو چکے ہوں۔

ایک مَیں ہوں، رات کا یہ بے پناہ اذیت ناک اور بوجھل لمحہ ہے اور میرا قبر نُما کمرہ ہے۔
مَیں تنہا نہیں ہوں —— وہ بھی ہے جس کی سرسوں کے ڈنٹھل سے بھی ملائم گردن کی رگیں پھڑک رہی ہیں۔
وہ بڑی گہری نیند سو رہی ہے۔

حسرتوں اور پچھتاووں کے دائرے اور تکونیں میرے گرد رقصاں ہیں —— مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اس قبر نُما
کمرہ میں ہم دونوں کے علاوہ ایک تیسری شے بھی موجود ہے۔

شاید وہ اگست میں کھلنے والے سَرس کے پھُولوں کی خُوشبو جو شاید اس عورت کے بدن سے بھاپ کی جگہ اُٹھ رہی ہے اور
فضا میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔

سَرس کے پھُولوں کی خُوشبو سے بھرا ہوا کُندن ایسا بدن!
جَل جانے کا خوف۔ خوف اور اذیت کا زہریلا نشہ یہ سب کچھ ہے
لیکن مَیں کہاں ہوں!؟

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ مَیں اس لمحے باقاعدہ یہاں موجود ہوتا —— اس سحر زدہ ماحول کی تمام تر لذتوں اور اذیتوں کو اپنے

اپنے حواس سمیت محسوس کرتا ـــــ مگر ایسا نہیں ہے ـــــ

میں یہاں نہیں ہوں ! میں کہاں ہوں ؟ ؟ !

وہ سب کچھ ہے ـــــ جس کے لیے میں نے ہزار راتوں کا سفر کیا ـــــ جس کے لیے میں ہزار صبحوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹے جنگل جنگل بھٹکا ہوں ۔

پتھر پتھر ٹھوکر کھائی ہے ۔

رات کا یہ آخری لمحہ ـــــ میری گرفت میں ہے ۔

میں اپنی گرفت میں نہیں ہوں ۔

میری زندگی کا یہی ایک بڑا المیہ ہے کہ مجھے جہاں ہونا چاہیئے میں وہاں نہیں ہوتا ـــــ اور جہاں مجھے نہیں ہونا چاہیئے میں وہاں سالم کا سالم موجود ہوتا ہوں ۔

موجود ہونے نہ ہونے کے اس مسلسل عمل کے گرداب میں میری توڑ پھوڑ ہوتی رہی ہے قدم قدم پر میں بکھر بکھر گیا ہوں ۔

تو ـــــ میں اس لمحہ بھی موجود نہ تھا ـــــ جبکہ بے جی اپنی آخری سانس لیتے وقت کھلی آنکھوں سے میرا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی تھیں حالانکہ میرے ماما جی کا خیال تھا بے جی تو بہت پہلے ہی سے مر چکی تھیں بس ان کی کھلی آنکھیں صرف میری واپسی کا راہ تک رہی تھیں ـــــ ان کے خشک اور نیلے ہونٹ صرف میرے گالوں پر اپنا آخری بوسہ دینے کے لیے تڑپ رہے تھے ۔

میرے ماما جی کا خیال درست تھا ـــــ بے جی تو اسی روز مر گئی تھیں جس دن میں انہیں بتلائے بغیر گھر سے بھاگ گیا تھا ـــــ بے جی کو میرا گھر سے بھاگ جانا ذرا برا نہ لگا تھا، وہ جانتی تھیں کہ میں بابا جان کی نفرت برداشت نہ کر سکا اور گھر سے بھاگ گیا ـــــ

میں تو اسی دن کہیں گم ہو گیا تھا جب بابا جان نے میری گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے کہا تھا ۔

" اے کاش تو پیدا ہی نہ ہوتا ـــــ میری محبوب تو نہ مرتی "

محبوب میری ماں کا نام تھا جس نے میری پیدائش کے فوراً بعد دم توڑ دیا تھا ـــــ اور وہ سچ مچ میرے بابا جان کی محبوب تھی ـــــ

بابا جان کی محبوب میں نے چھینی تھی ـــــ یہ احساس اس قدر اندر اندر پک گیا کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے بابا جان کے پاس نہیں رہنا چاہیئے ۔

ہمارے گھر کے آنگن اور حویلی کے اندر بابا جان کے گرد اور بہت سے لوگ تھے ـــــ اپنوں کا ایک میلہ تھا ۔ بھرا میلہ ۔ اس بھرے میلہ میں کسی کو میری گمشدگی کا احساس تک نہ ہوا تھا ـــــ بھرے میلہ میں ویسے بھی جو گم ہو جائے ـــــ بس وہ گم ہی ہو جاتا ہے ـــــ

مگر بے جی کی آنکھیں مجھے تلاش کرتی ہی رہیں ـــــ اور بابا جان اپنی محبوب کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے ـــــ اپنے ہی گھر میں لگے بھرے میلہ میں گم ہو گئے ـــــ

(ہر سال بارش اور آندھیوں کے موسم میں اس شہر کو ڈوب جانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر سال پہاڑوں سے طوفانی روڑ شہر کا رُخ کرتی ہے ـــــ گرم اور نمکین پانی کی اندھی روڑھ)

اُدھر شہر کے مغربی حصہ میں ـــــ سیاہ پتھروں کی قبروں کے بڑے قبرستان سے بہت آگے ـــــ جہاں ریتلی اور پیاسی زمین ایک ایک بوند پانی کو ترس رہی ہے ـــــ تاروں بھرے آسمان تلے ـــــ موت کو ناخنوں پر نچانے والوں کا کھیل تو شروع ہو چکا تھا۔

ہر سمت ـــــ ہر ڈھوک ـــــ ہر قصبہ سے جمع ہونے والے یہ لوگ زندگی کے بادبانوں کو یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے قحط زدہ بچہ مُردہ ماں کی چھاتیوں سے چمٹا ہو۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے ـــــ سانس پہ سانس روکے پتھریلی مُورتیاں بنے یہ لوگ موت کے سینہ پر رقصاں سارے کھیل بس دیکھے جا رہے تھے۔

موت کو ناخنوں پر نچانے والے لوگوں میں ـــــ

منوں بھاری اژدہے کو بانہوں پر پھیلائے بوڑھا سپیرا کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

خود کو آگ لگا کر ساٹھ فٹ کی بلندی سے نیچے جلتے پانی میں چھلانگ لگانے والا نوجوان زندگی اور موت کے پُل پر کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

ہر شخص پر جادو کر دینے والی سرکس کی مس نادیا چار شیر ببروں کے ساتھ ہنٹر پکڑے یوں کھیل رہی تھی جیسے وہ شیر نہ ہوں گھر کی پالتو بلیاں ہوں ـــ

کالا سینڈو اپنے بالوں سے بندھے ٹرک کو کھینچ رہا تھا ـــــ اور ـــــ خوبصورت نرگسی آنکھوں والی مس ریتا موت کے کنوئیں میں چار موٹر سائیکل سواروں کے درمیاں بڑی چابکدستی سے کار چلا رہی تھی ـــــ

یہ سب لوگ اپنے اپنے کرتبوں اور موت کے کھیلوں کی نسبت سے ـــــ کسی نہ کسی نام کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے

(میری کوئی پہچان بھی تو نہ تھی ـــــ)

تب اچانک وہ موت کو اپنے ناخنوں پر نچانے والوں اور ان کے گرد جمع ہونے والے پتھریلے چہروں کے عین درمیان سے باہر نکلتی ہے۔ اور میرے سامنے ناگن کی مانند تن کر کھڑی ہو جاتی ہے ـــــ اس کی بانہیں میرے سامنے پھیل جاتی ہیں۔ میں حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھتا ہوں ـــــ مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے پورا میلہ میرے اندر سمو گیا ہے ـــــ جیسے پانی کی روڑھ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہو ـــــ

" تم یہاں ـــــ میں تو تمہیں ابھی ابھی دفن کر کے آیا ہوں ـــــ ؟"

اُس کی آنکھوں سے رنگ برنگی روشنیوں کے فوارے پھوٹتے ہیں ـــــ وہ خاموش رہتی ہے ـــــ بس اک جھلملاتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تیرتی ہے ـــــ

" تم تو مر چکی تھیں ـــــ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں دفن کر کے آیا ہوں ـــــ یہ دیکھو ـــــ میرے ہاتھوں میں ابھی تک تمہاری قبر پر ڈالی گئی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے ـــــ تم زندہ کیسے ہو ـــــ"

رہ آگے بڑھتی ہے ـــــ میرا بازو تھامتی ہے ـــــ جیسے سپیرے کی بانہوں میں کھیلنے والا اژدہا میرے بازو سے چمٹ

ہو ـــــ

رہ مجھے بازو سے پکڑے ـــــ میلہ کی بھیڑ سے کھینچ باہر لاتی ہے ۔ اب ہم دونوں ـــــ سیاہ پتھروں والے بڑے

رستان میں کھڑے ہیں ـــــ میلہ بھی گم ہو گیا ہے ـــــ

تم مجھے دفن ضرور کر آئے تھے ـــــ لیکن قبر پہ مٹی ڈالتے وقت تم ایک پڑی رکھنا بھول گئے تھے ـــــ قبر کی چھت پانچ

ں سے مکمل ہوتی ہے ـــــ اور تم صرف چار پڑیاں رکھ کر بھاگ آئے ـــــ "

ہو سکتا ہے ـــــ میں نے پڑیاں گنی نہ ہوں ـــــ "

یہی ہوا ہے ـــــ تم عجلت میں تھے ـــــ تم ہمیشہ ہی جلدی میں ہوتے ہو ـــــ تم مجھے دفن کرتے وقت بھی جلدی

تھے ـــــ اس لیے کہ تمہیں بزنس میٹنگ میں جانا تھا ـــــ تمہارا المیہ یہی رہا ہے کہ تم ہمیشہ بھاری بھرکم فولادی بوٹ پہن

ریت میں تیز تیز دوڑنے کے عادی ہو ـــــ تبھی تو تم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکے ہو ـــــ حالانکہ تم

ھتے ہو ـــــ تم ہزار میلوں کی مسافت طے کر چکے ہو ـــــ

آؤ میرے ساتھ ـــــ یہاں سے بھاگ چلیں ـــــ میں تمہیں اغوا کرنے آئی ہوں ـــــ آؤ جلدی کرو ـــــ "

لیکن ٹھہرو ـــــ تو ـــــ میں اس عورت کو اکیلی چھوڑ کر تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں ـــــ اب جبکہ وہ مکمل طور پر جاگ

ی ہے ـــــ سنو وہ کچھ کہہ رہی ہے ـــــ

"میں جانتی ہوں ـــــ پرانی کہانی ـــــ پرانا قصہ ـــــ بیان کرنے کی اس پاگل عورت کو عادت سی ہو گئی ہے ـــــ یہ تم سے یہی

رہی ہو گی ـ بوستان خان زندہ ہے ـــــ حالانکہ بوستان خان کو اس عورت کے بھائیوں نے زمین میں گاڑھ کے زمین پر ہل چلا

یئے تھے ـــــ اور اب وہاں مکئی اور جوار کی فصلیں لہلہاتی ہیں ـــــ تم اس عورت کے قصہ کو چھوڑو ـــــ میرے ساتھ آؤ "

"لیکن اس عورت کے بھائیوں نے ایسا ظلم کیوں کیا ؟ "

دیکھو پانی کی رو تمہارے قبر نما کمرہ کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے ـــــ آؤ میرے ساتھ ـــــ چلو ـــــ اس لیے کہ

میرے ساتھ جانا ہے ۔

"لیکن بوستان خان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ـــــ " میں اپنے سوال پر بضد ہوں

"سیدھی سی بات ـ بوستان خان نے اپنی زمین کے عوض یہ عورت اپنے نکاح میں لی تھی ـــــ وہ اپنے وعدہ سے پھر گیا ـــــ

چھوڑو ـــــ یہ عورت تمہیں بھی کھا جائے گی ـــــ آؤ میرے ساتھ "

"کہاں ؟ "

"میری قبر پر ـــــ پانچویں پڑی تو رکھ آؤ "

میں اپنی انگلیوں اور ناخنوں سے اپنے سارے وجود کو کھرچ کھرچ کر محسوس کرتا ہوں ـــــ اور اس سے کہتا ہوں ۔

کیا ایسا ممکن نہیں ـــــ عذاب کے اس اندھے لمحے میں ـــــ ہم دونوں اپنے اپنے جسموں میں لوٹ آنے کی دعا مانگ لیں ۔

اندھی گلی

مرزا حامد بیگ

وہ دن اُکتاہٹ، بے چینی اور مایوسی کے تھے۔

میں بے روزگار تھا اور بھرے پُرے شہر میں اکیلا۔ میرے لیے رات اور دن ایک تھے۔ راتوں کو جاگتا اور دن کو سوتا رہتا تھا۔ میرے ساتھ شہر کے تمام فٹ پاتھ، تفریحی پارک اور دن رات کھلے رہنے والے چائے کے کھوکھے شدید اُکتاہٹ، بے چینی اور مایوسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اوائل جوانی کی اُن اُونگھتی ہوئی شاموں میں سے ایک شام میرا گزر اندرونِ شہر کی ایک تنگ و تاریک، نیم روشن گلی میں سے ہوا۔ میں چلا جا رہا تھا اور گلی کہیں ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

اس روز میں کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا اور اس نہ ختم ہونے والی گلی میں سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کو بڑی مشکل سے گھسیٹ رہا تھا۔ ایسے میں کئی بار میں نے واپسی کا سوچا، لیکن جانے کب سے چلا آتا تھا اور میرے لیے دوبارہ اتنی مسافت طے کرنا ممکن نہ تھا — اس لیے آگے، اور آگے چلتا گیا۔

وہ گلی اس قدر تنگ تھی کہ سامنے سے آنے والوں کے لیے دیوار کے ساتھ لگ کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ ایسے میں یکایک یوں محسوس ہوا، جیسے میرے بہت آہستہ چلنے کے سبب پیچھے سے آنے والوں کو مشکل پیش آ رہی ہے۔ اس خیال نے مجھے اور زیادہ بد دل کر دیا، لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس سے زیادہ تیز چلنا میرے لیے محال تھا۔

میں نے دو ایک بار رک کر راہگیروں سے پُوچھا بھی کہ یہ گلی کہیں ختم بھی ہوگی یا نہیں، لیکن شاید وہ بہت جلدی میں تھے اور میں ہانپ گیا تھا۔ پھر میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا اور شاید اپنے وجود کو زیادہ دیر تک اپنی تھکی ہوئی ٹانگوں پر نہ سہار سکنے کے باعث اس نیم تاریک گلی میں ڈھیتا چلا گیا تھا۔ معاً خیال آیا کہ اُس گلی میں سے تو جنازے کی چارپائی گزرنا بھی مشکل ہے۔ اس خیال نے میرے حواس بحال کر دینے کے ساتھ ساتھ کسی قدر توانائی کا بچا کھچا ذخیرہ بھی فراہم کر دیا اور میں ایک بار پھر اپنے وجود کو آگے کی سمت گھسیٹنے کے قابل ہو سکا۔

میں اس طرف کیوں نکل آیا تھا۔ یہ سوچ کر سخت پشیمان تھا کہ یکلخت اُس اندھی گلی کے ایک بند دروازے کے پیچھے سے ڈھولک

...گھُٹی آواز سُنائی دی۔ پھر پُھرّا مار کر جیسے چڑیاں نکلتی ہیں، اُس دروازے کے پیچھے سے جوان لڑکیوں کا جُھنڈ نکلا اور میرے برابر سے گزر کر آگے نکل گیا۔ لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں میں روشن ہُنڈے اور لالٹینیں تھام رکھی تھیں اور ان کے معصوم قہقہوں کی باڑ پر میں بہتا ... تھا۔ مجھے اس تنگ و تاریک گلی میں پہلی بار زندگی کا احساس ہُوا تھا اور میں لشتم پشتم زندگی کے پیچھے ہولیا تھا یا شاید اُس کی زد میں تھا۔ بالآخر گلی ختم ہوگئی۔

سامنے پُر شور سڑک تھی، جس پر دو طرفہ ٹریفک رواں تھی۔ سکوٹروں، موٹر رکشوں اور بسوں کی لمبی قطاروں اور برقی قمقموں کی چکاچوند میں سے فرّاٹے بھرتی گزر رہی تھی اور کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ وہ لڑکیوں، چڑیوں کا جُھنڈ پُھرّا مار کر جانے کس طرف کو اُڑ گیا، کچھ ... مجھے اس اچانک تبدیلی کے احساس نے حیران کر دیا تھا۔

گلی کے اختتام پر میں نے دیکھا بھالا ایک نیم تاریک چائے کا کھوکھا اُس تنگ گلی اور پُر شور سڑک کے درمیان جیسے ایک پُل تھا اور اُس پُل سے ہو کر ہی دوسری سمت نکلا جا سکتا تھا۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اُس چائے کے کھوکھے پر میری اکثر بیزار شامیں گزری تھیں لیکن اس اندھی گلی کی طرف میرا دھیان اس سے قبل کبھی نہ گیا تھا۔ اس شدید حیرانگی کے احساس سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا اور میں ... کھوکھے کے سامنے جھولتی ہوئی ایک کُرسی پر گر گیا تھا۔

"چائے" میں بمشکل تمام کہہ پایا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس وقت میری آواز گلے تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں کھوگئی تھی۔
مجھے کُرسی میں جُھولتے دیکھ کر کھوکھے کا ادھیڑ عمر مالک غنودگی کے عالم میں چلتا ہُوا میرے سامنے چائے کا مگ رکھ کر واپس اپنی ... پر جا بیٹھا۔ میں نے اپنے دائیں بائیں نگاہ کی اور برقی قمقموں کی تیز روشنی اور دو طرفہ ٹریفک کی یلغار کے باوجود میری آنکھیں ... ہوگئیں۔

میں جانے کتنی دیر سے اُس جھولتی ہوئی کُرسی پر بے سُدھ پڑا رہا تھا۔ جب آنکھ کھُلی ہے تو صبح کے آثار نمایاں تھے۔ چائے کے اس ... کے گرداگرد بدحواس مَردوں کا بہت بڑا ہجوم تھا اور سامنے والی تنگ گلی سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں —

"چائے ویسی کی ویسی پڑی رہ گئی۔" کھوکھے کا ادھیڑ عمر مالک میرے سامنے رکھی ٹھنڈی چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے بڑبڑایا۔
"بابا —— یہ عورتیں کیوں رو رہی ہیں؟"
میں نے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے سوال کیا۔
میرے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر جھاڑن پھیرتے ہوئے اُس نے کچھ تامّل کیا۔ پھر صرف اتنا کہا: "اللہ کے کام ہیں بیٹا۔"
"لیکن بابا —— میں نے تو اس گلی سے ڈھولک کی تھاپ خود سُنی ہے۔ بڑی زندگی تھی یہاں کل رات —— یہ کیا ہوگیا بابا؟"
اب میں پورے ہوش و حواس میں تھا اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
"بابو جی —— جس لڑکی کی شادی تھی نا —— وہ بغیر کسی کو بتائے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اپنی پسند کی چوڑیوں کا انتخاب ... نے یا شاید کوئی اور بات تھی —— ایک کار اسے کُچلتی ہوئی نکل گئی —— وہ تو بے چاری کہتی رہی کہ مجھے گھر لے چلو —— گھر لے چلو۔ ... لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ حالت بہت خراب تھی اُس کی۔ ہسپتال میں ہی مر گئی۔"

"مرگئی ؟"

"ہاں بیٹا۔ سب اُوپر والے کے کام ہیں۔"

مجھے اُس کی آواز کسی گہرے کنویں سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور اُس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا تھا۔ چائے کے پیسے ادا کر کے اُٹھ آیا تھا۔

بہت پُرانی بات ہوگئی۔

مَیں اس واقعہ کو تقریباً بھول بھال گیا تھا کہ آج بیس برس بعد اپنے بیوی بچّوں کو ریلوے اسٹیشن چھوڑ کر گھر واپس آتے ہوئے مَیں نے خود کو اُسی تنگ و تاریک گلی میں ہانپتا ہوا محسوس کیا، جہاں سے جنازے کی چارپائی گزرنا بھی محال تھی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوئے اور گلی میں ڈھیلے ہوتے، مَیں نے ایک راہگیر سے پوچھا: "یہ گلی کہیں ختم بھی ہوگی یا نہیں ؟"

منچلے راہگیر نے شرارت سے آنکھیں جھپکیں اور بولا: "یہ تو پیدل چلنے والوں سے پُوچھو ـــــ مَیں تو فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی پر سوار ہوں۔" اس نے اتنا کہا اور زور زور سے پیڈل مارتے ہوئے، سائیکل پر یہ جا، وہ جا ـــــ

کتنی حیران کُن بات ہے کہ آج مَیں اپنی گاڑی کی آرام دہ نشست پر تھا اور طویل و عریض مال روڈ پر اُڑتے پھرتے اُس اندھی گلی میں سے گزرنے کا گمان ہوا تھا۔ بچّوں کو اسکول کالج سے دو ماہ کی چھٹیاں مل گئی تھیں اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کچھ دن کے لیے گاؤں چلے گئے تھے۔ مَیں ہر سال اِن دنوں میں اُن کے ساتھ خود بھی گاؤں کا چکر لگا لیتا ہوں لیکن اس بار کچھ ایسے کام آ پڑے تھے کہ اُن کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ سو مَیں اکیلا تھا اور اسٹیشن سے واپسی پر یونہی بے کار پٹرول پھونکتا پھرا تھا۔

کئی برس گزر گئے، مَیں اندرونِ شہر کی زندگی سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جانے کیا سوچ کر مَیں پُرانے شہر کی طرف نکل گیا۔ پُرانے شہر کی گلیوں میں، جہاں مَیں نے بے روزگاری کے دن گزارے تھے۔ گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے تا دیر چہل قدمی کرتا رہا اور خواہ مخواہ دُکانیں جھانکتا پھرا۔

پرانی آبادی میں ایک دوکان کے باہر پُرانے گھڑیال لٹک رہے تھے۔ برسوں سے رُکے ہوئے، سوئیوں اور پنڈولم کے بغیر گھڑیال۔ مجھے ان میں کتنی خواہش تھی پنڈولم کے ساتھ چلتے ہوئے گھڑیال کو دیکھنے کی۔ ان میں سے کسی ایک کو تو ٹھیک کروایا جا سکتا ہے، مَیں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دُکان کے اندر قدرے تاریکی تھی۔ مَیں نے جھک کر اندر دیکھا تو وہاں گھڑی ساز کی بجائے حجام ایک لڑکے کے بال تراش رہا تھا جبکہ مجھے گھڑی ساز کی تلاش تھی۔

حجام بولا۔ "بابو جی ـــــ اندر آ جائیں۔"

مَیں نے کہا۔ "مجھے بیٹھنا نہیں ہے بھائی۔ کیا تم گھڑی ساز بھی ہو ؟"

"نہیں ـــــ بال کاٹتا ہوں۔" حجام نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ گھڑیال کیوں لٹکا رکھے ہیں باہر ؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو اور کیا لٹکاؤں بابو جی ؟ بال کاٹتا ہوں۔ گھڑیال ہی لٹکیں گے باہر۔"

مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ ریلوے اسٹیشن سے واپسی پر عجیب لایعنی واقعات پیش آتے رہے تھے۔ میں جھنجھلاکر دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ اب میں گھر لوٹ جانا چاہتا تھا، لیکن ابھی بڑی سڑک پر آکر پہلا موڑ ہی کاٹا تھا کہ سُرخ جوڑے میں سجی سجائی ایک جوان لڑکی اچانک سامنے آگئی۔ میں اگر بروقت بریک نہ لگاتا تو وہ نیچے آگئی تھی یا شاید وہ نیچے آ ہی گئی تھی۔ اس لیے کہ جب میں غصّے میں بھرا نیچے اُترا تو وہ سڑک کے بیچوں بیچ سخت زخمی حالت میں پڑی تھی۔

میں گھبرا گیا اور اسے سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں اسے جلد از جلد ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا، اس لیے تیزی سے نکلا ہوں۔ جب میکلوڈ روڈ کا موڑ کاٹنے لگا تو اُس نے اُدھر جانے سے منع کردیا۔ وہ اُکھڑے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندرونِ شہر جانے کی التجا کر رہی تھی، سو میں گھبراہٹ میں اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا۔

اس نے جس جگہ گاڑی روکنے کا کہا، وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ گلی کی نکڑ پر شدید اُکتاہٹ، بے چینی اور مایوسی میں ڈوبا ہوا چائے کا کھوکھا وہاں اب بھی موجود تھا اور اس کے سامنے کرسیوں پر جھولتے ہوئے نوجوان اب بھی اُونگھ رہے تھے۔ میں نے لڑکی کو سہارا دے کر نیچے اُتارا، وہ خون میں لت پت تھی۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ بغیر دستک دیئے ایک گھر میں گھُس گئی اور میں باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔

میرے طویل انتظار کے بعد بھی جب گھر سے کوئی نہ نکلا تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری بار دروازہ کھٹکھٹانے پر کھانستا کھنکارتا ہوا ایک بڈھا باہر نکلا تو میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے لمبی تمہید باندھی، لیکن وہ لاتعلق سا کھڑا رہا۔ ساری بات سُن کر وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گیا۔

میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر گیا ہوں۔ گھر میں موت کا سکوت تھا۔ مختصر سا صحن الانگھ کر ہم دونوں ایک کمرے میں پہنچے جہاں دیوار کے ساتھ ایک پُرانی نامکمل پینٹنگ لٹک رہی تھی۔ تصویر میں ایک نیم تاریک چائے کا کھوکھا تھا اور اُس کے سامنے ایک نوجوان کرسی پر اُونگھ رہا تھا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ یقیناً میری جوانی کی تصویر تھی۔

بُڈھے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تجھے پہچان لیا ہے بیٹا ـــــ اُس کی شادی ہم نے بچپن سے طے کر رکھی تھی ـــــ مجھے کیا پتہ تھا بیٹا ـــــ اس کی ماں زندہ نہیں تھی، باپ سے کیسے کہتی ـــــ شادی سے دو دن پہلے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ چوڑیاں چڑھانے نکلی تھی یا شاید کوئی اور بات تھی ـــ میں نے اسے خون میں لت پت ہسپتال میں دیکھا۔ وہ تو بے چاری کہتی رہی کہ مجھے گھر لے چلو، گھر لے چلو، لیکن لوگ باگ اسے ہسپتال ـــــ خیر جانے دو۔ مل کر چائے پیتے ہیں۔ تمہارے پاس وقت ہے نا؟"

بُڈھے نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو قمیص کی آستین سے پُونچھتے ہوئے تیل کے چولہے پر چائے کے لیے پانی چڑھا دیا۔

اس سیلن زدہ کمرے میں بہت سی تصویریں جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر جھولتی ہوئی تصویر میں چائے کے نیم تاریک کھوکھے کے سامنے کرسی پر میں تھا جو اُونگھ رہا تھا۔ یہ اُن دنوں کی تصویر تھی جب میں بے روزگار تھا اور پیچھے کی طرف بال بناتا تھا۔ اکثر گرمیوں میں بھی میرے گلے کے گرد مفلر لپٹا رہتا۔ اس تصویر میں بھی یقیناً جاڑے کا موسم نہیں تھا اور میرے گلے میں لمبا مفلر جھول رہا تھا۔

خیال کا سایا

سلطان جمیل نسیم

یہ کیا ہوا — ؟

کچھ معلوم ہو تو کہیں —— جب کچھ خبر ہی نہیں ہے تو ذہن میں ایک ہی سوال کا شعلہ کیوں بھڑکے جا رہا ہے —— سارے وجود میں ابال سا کیوں اٹھ رہا ہے — ہر سانس میں اسی سوال کا تار کیوں بندھا ہے ..... یہ کیا ہوا — ؟ یہ کیا ہوا — ؟ یہ کیا ہوا — ؟ کیا جواب دے کر وہ اندر سے اُٹھنے والے اس تنور کو خاموش کریں ۔ اس ایک سوال نے کتنے سوال اُٹھا دئے ہیں ۔ وہ ...... وہ تو بس — اچانک اُٹھ آنے والے طوفان کا ایک جھکڑ تھا — ہوا کا ایک بے لگام جھونکا تھا جو برسوں کی پڑی راکھ اڑا کے لے گیا اور چنگاریوں کو بے لباس کر گیا — اب وہی برہنہ چنگاریاں ایک سوال کا لباس پہنے تمام بدن کو تپائے دے رہی ہیں ۔

کلب جانے کے ارادے کو ملتوی کر کے انھوں نے شام کی چائے لان ہی میں پی —— وہیں آرام کرسی پر بیٹھی جھولتی رہیں — کلب جانے کا ارادہ یوں بدلا کہ آج ڈاکٹر تنویر نے آنے کے لیے تاکید کی تھی اور وہ تنویر سے زیادہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتی تھیں کہ اب عمر کی وہ منزل گزر گئی ہے جس کے راستے میں خواہشیں خوش رنگ تتلیوں کے مانند آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہیں بلکہ اب تو وہ راہ آگئی ہے جہاں آدمی کو سستانے کے لیے رک بھی جانا چاہیئے ۔

تنویر کی ہر بات کے جواب میں اُنھوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ کہا کہ اپنی طرف دیکھنے کے لیے اُن کے پاس اب ایک لمحہ بھی نہیں رہا ۔ اب تو ہر پل ہر ساعت بس ریحانہ کا مستقبل ہی نظر میں رہتا ہے ۔ مگر عجیب ڈھیٹ آدمی ہے یہ ڈاکٹر بھی — پتھروں جیسے جواب سے بھی آس نہیں ٹوٹتی ہے — ہر بات مسکراتے ہوئے سن لیتا ہے ۔ یہ بات سُن کر بھی اُس نے کہا ۔

" بے شک ریحانہ آپ کی بیٹی ہے —— مجھے بھی عزیز ہے —— مگر آپ دونوں کا الگ الگ وجود ہے — الگ الگ مستقبل ہے ۔ ریحانہ کے مستقبل سے آپ کی وابستگی کب تک — ؟ میری اس بات کو یکسر نظر انداز نہ کیجئے — نا نا نا ۔ ابھی کچھ نہ کہیئے — کل تک خوب دلیلیں ڈھونڈیئے پھر آپ سے مباحثہ ہوگا —— تو کل آپ تشریف لا رہی ہیں — ضرور آیئے گا — "

جو آدمی آس نہ چھوڑے اُس سے کوئی کیا بحث کرے —— بس مَیں جاؤں گی ہی نہیں ۔

وہ آرام کرسی پر جھولتے ہوئے رنگ برنگے پھولوں کو دیکھتی رہیں — جب بھی ریحانہ کے بارے میں سوچا تنویر کا خیال سامنے آگیا ۔

تو اب انتظار کرو — آج کی شام میں اپنے گھر میں گزاروں گی ۔۔

آئی گرمیوں کی شام — زمین کی بُو باس میں لپٹی ہوئی ہریالی کی مہک ۔۔ جاتے سورج کی کرنوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی پھولوں کی خوشبو۔

معطر فضا کو شرارت سوجھی تو اُن کی جھولتی ہوئی کرسی کو پالنا بنا دیا پھر ہلکورے لیتی ہوئی ہوا نے بدن کو تھپکا تو آنکھ لگ گئی ۔

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اندھیرے نے ہاتھ بڑھا کے درختوں کی ہریالی اور پھولوں کے رنگ اپنی مٹھی میں بھر لیے ہیں اور خوشبو کے تعاقب،

نے بھاگتا پھر رہا ہے ۔

وہ اُٹھیں کہ برآمدے میں جا کر سوئچ آن کر دیں — یہی وہ لمحہ تھا جو ہوا کے تیز جھونکے کی طرح اُن کی طرف بڑھتا چلا آیا — پہلے تو انہیں

یوں ہوا جیسے کوئی ان کے قریب سے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے گزرا ہے بلکہ تیزی سے اُٹھتے ہوئے قدموں میں بھاگنے کی شرارت دھمک رہی ہے۔

اسی کے ساتھ کپڑوں کی سرسراہٹ میں لپٹی ہوئی مہک سے وہ پہچان گئیں کہ یہ ریحانہ ہے ۔۔

ارے یہ کب آگئی — مجھے پتہ ہی نہیں چلا ۔

اندھیرے میں یوں ہنستے ہوئے بھاگنے کا سبب معلوم کرنے کے لیے انہوں نے چاہا کہ دو قدم اس کی طرف بڑھ کے آواز دیں اور اپنی موجودگی

کا احساس دلائیں کہ اچانک اس سرسراتے لمحے نے انہیں اپنے بازوؤں میں یوں جکڑ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکیں — ہوا میں جھولتی شاخیں

ساکت ہو جائیں تو پرندے خوفزدہ ہو کر اڑنے لگتے ہیں ۔۔۔۔ بس پلک جھپکنے کی مدت میں اُن بے حرکت ہو جانے والی شاخوں سے

نکل کر ننھا سا پرندہ ان کے ہونٹوں سے آکے ٹکرایا — ریحانہ کو پکارنے کے لیے کھلنے والے ہونٹوں پر ننھے پرندے کے پنجوں کی چبھن

پوری طرح محسوس بھی نہیں کی تھی کہ اس کے اڑنے کی پھڑپھڑاہٹ کان کی لو کے قریب پہنچ کر ہونٹوں کی لرزش بن گئی ۔

بھاگ کر کہاں جاؤ گی — "

پہلے تو وہ پتھرا گئیں — پھر پگھل گئیں — کسی جادوگر کے کرتب کی طرح باہر آتی ہوئی سانس نے لاوے کی صورت پگھلا دیا تو اندر کھینچی ہوئی

سانس نے برف کی مانند منجمد کر دیا — ان دو سانسوں کے درمیان والی ساعت میں کہیں قریب ہی سے ریحانہ کی ہنسی کا چھناکا پھر سنائی دیا تو

پرسش لمحے کی گرفت میں آیا ہوا اُن کا وجود آزاد ہو گیا ۔۔۔۔ پہلے لڑکھڑائیں — پھر سنبھل گئیں ۔

یہ کیا ہوا — !

جادوئی لمحے کی گرفت میں آیا ہوا بدن — طلسماتی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ — سب کچھ اتنی سی دیر میں ہوا جتنی دیر میں کوئی کسی کو نظر بھر

دیکھ لے یا ایک مختصر سا فقرہ ہونٹوں سے نکل کر سماعت تک پہنچے ۔

بھاگ کر کہاں جاؤ گی ۔

یہ کیا ہوا — یہ کیا ہوا ۔ ؟!

کوئی آسیب تھا ۔

کیا برسوں پہلے بڑے بوڑھوں کا دیا ہوا ڈراوا کہ دونوں وقت مل رہے ہوں تو کھلے بالوں آسمان تلے نہ بیٹھو — حقیقت بن گیا تھا ۔!

یا اس کی سنائی ہوئی حکایت تھی یا تصور کا دیا ہوا فریب تھا ۔

کیا وہ اندھیرا جس نے درختوں کی ہریالی اور پھولوں کے رنگ مٹھی میں بھر لیے تھے ۔ اسی نے بانہیں پھیلا کے پکڑ لیا تھا — ؟

کیا دس برس کی مانوس تنہائی نے گرم ہوا کے ایک جھونکے کو سمیٹ کر ہونٹوں سے چھوا دیا تھا — ؟

کیا تھا — کوئی بگولہ — کوئی بھنور — ؟

مگر یہ کیسا بگولہ تھا — کیسا بھنور تھا کہ جس کی گردش میں آنے کے بعد وجود کے کونے کھدرے میں پڑے ہوئے جذبات کے سوکھے پتے بھی کھڑکھڑانے لگے۔

وہ خواہشیں جو سبک خرامی کے ساتھ زندگی کے راستے سے گزر گئی تھیں، دھم دھم کرتی ہوئی یوں لوٹ آئیں کہ اُن کی دھمک سے وجود میں ایک زلزلہ آگیا — !

آخر ہوا کیا — ؟

روشنی ہو گئی — اتنی ساری کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ تالیاں بجاتے درخت — ایک دوسرے کی طرف جھکتی ہوئی ڈالیاں۔ میز پر سجے ہوئے چائے کے برتن — پیروں تلے بچھی ہوئی گھاس —

تاریکی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی فضا روشنی کی سطح پر تیرنے لگی۔

ریحانہ نے دیکھا تو دوڑتی ہوئی آئی — چہرے پر بکھری ہوئی ہنسی اور ہوا کی طرح تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کے درمیان اُس نے پوچھا۔

"ممی آپ — یہاں — "

انہوں نے سُنا ان سُنا کردیا — اس کے چہرے کو تکتی رہیں۔ ابھی تک وہ — یہ کیا ہوا — یہ کیا تھا — کے بین بین جھول رہی تھیں۔ اپنی طرف گھورتے دیکھا تو ریحانہ اٹھلا کر بولی۔

"بتلیئے ممی — آپ یہاں کب سے ہیں — "

جواب میں انہوں نے کہنا چاہا "شام سے"۔ مگر صرف شام ہی ان کے منہ سے نکل سکا کہ یہی لفظ ادا کرتے ہوئے ان کے ہونٹ آپس میں ملے تو جیسے ہونٹوں کا لمس وجود میں اترتا چلا گیا — پھر ہونٹ کپکپائے — اور اس کپکپاہٹ کے ساتھ یہ احساس ہوا جیسے ان کے اندر کوئی بھٹی دھک رہی ہے جس کی حدت سے سانس بھی بھاپ کی صورت نکل رہی ہے۔

وہ کرسی پر ڈھے گئیں۔

ریحانہ کرسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کے ان پر جھک گئی۔

"ممی آج کی فائنل ریہرسل بہت فنٹاسٹک تھی۔ سارے لوگ کلیپنگ کرتے رہے — اور لاسٹ سین — واٹ اے سرپرائز — ایوری ون واز شاؤٹنگ — ونس مور ونس مور — "

وہ ریحانہ کی بات سُن ہی نہیں رہی تھیں بلکہ ہر لفظ کو محسوس کر رہی تھیں۔ ذہن دہرا رہا تھا۔ فنٹاسٹک — کوئی سینے میں بیٹھا تالیاں بجا رہا تھا — اور ہونٹ صدا دے رہے تھے — ونس مور — ونس مور —

ریحانہ کے جذبے میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو اس نے جھکے جھکے اپنی آواز کو دھیما کیا۔

"ممی — سلیم مجھے چھوڑنے آیا تھا — "

پھر گردن گھما کے لان میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

جانے کہاں چھپ گیا — سلی بوائے —۔

جب ذرا سا اندر جھکی — ان کی پیشانی کو چوما — تیز تیز سانسوں کی آواز سنی تو گھبرا کے بول اٹھی۔

"او مائی گاڈ —— آپ کو تو فیور ہے ممی —"

انہوں نے ہمت کر کے اندر دہکتی ہوئی انگیٹھی کی آنچ سے آواز بچا کے کہا۔

"یہاں اوس میں بیٹھے رہنے سے بدن جلنے لگا ہے —"

"تو چلئے اندر —" ریحانہ نے عجلت کے ساتھ کہا اور جب اٹھانے کے لیے بازو تھامے تو محسوس کیا وہ کانپ رہی ہیں۔

"ممی میں تنویر انکل کو فون کرتی ہوں — آپ کو تو بہت تیز بخار ہے — آپ سے تو چلا بھی نہیں جا رہا ہے — یو آر شیورنگ —"

وہ ریحانہ کے سہارے چلتے ہوئے اس کی بات سنتی رہیں۔ اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچنے پر انہوں نے ریحانہ کے کندھے کو تھپتھپایا
آہستہ سے کہا۔

"ڈونٹ وری مائی ڈیئر — آئی ول بی آل رائٹ —"

مگر جب ریحانہ نے مچل جانے کے انداز میں کہا۔

"ممی ڈاکٹر انکل کو ......"

تو انہوں نے سرزنش بھرے لہجے میں کہا۔

"ڈونٹ بی سلی —— اپنے کمرے میں جاؤ — میرے پاس اسپرین ہے — اور — اب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے —"

کمرے میں پہنچنے کے بعد وہ کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہیں۔ پھر لرزتے ہاتھوں سے ائرکنڈیشنر آن کیا — اور کمرے میں ٹھنڈک پھیلتے ہی لمبے لمبے سانس اس خیال سے کھینچے کہ شاید یہ ٹھنڈک بدن میں پھیلی ہوئی تمازت کو کچھ کم کر سکے — مگر کمرے کی سرد فضا نے تو سرور کی طرح حدت کچھ اور بڑھا دی ...... کمرے کے سارے بلب روشن تھے اور روشنی کی اس یلغار میں ان کا سایا بھی کہیں ان ہی کے آس پاس چھپ گیا تھا — اور وہ اندھیرا بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا جس نے فروزگی سے فائدہ اٹھا کر ایک پل میں ایسی آگ بھر دی تھی کہ وہ گرمی سے پگھلنے لگی تھیں۔

گزرے ہوئے لمحے کا احساس آنکھوں پر پہرا دیتا رہا اور نیند —— بازوؤں پر — سینے پر — ہونٹوں پر — جلن کے احساس کی لکیریں کھینچتی رہی۔ اور ان لکیروں پر جذبات سرسراتے رہے۔ انہوں نے ائرکنڈیشنر سے نکلتے ہوئے یخ جھونکوں کے سامنے کبھی اپنے بازو بڑھائے — کبھی ہونٹ — لیکن شام کے اندھیرے کا احساس کن کھجورے کی طرح اپنے ڈنک چبھو کر بدن میں جلن کا زہر اتارتا رہا — تپش کے اس حصار سے نکلنے کے لیے انہوں نے کیا کیا جتن نہیں کیے — تھک ہار کے مسعود کے خیال کا بھی سہارا لیا ...... مسعود جو شادی کے بعد انہیں انگلستان لے گیا تھا۔ جہاں اپنی صحت کو نئی آب و فضا کے رحم و کرم پر چھوڑ کے دس سال تک لگاتار محنت کرتا رہا اور ریحانہ کے مستقبل کے منصوبے بناتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے اپنے مستقبل کی حد آن پہنچی — ڈاکٹروں کے فیصلے کو مان کر — ریحانہ اور مسعود کے ساتھ جب انہوں نے اپنی سرزمین پر قدم رکھا تو اسی زمین کی خاک ان کے اور مسعود کے درمیان پردہ بن گئی — اور پھر وہ پردے ہی میں بیٹھ گئیں۔ — کسی نے انہیں دیکھا ہی نہیں — کسی پر ان کی نظر گئی ہی نہیں —— برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹی کے مانند وہ اپنے ارادوں پر قائم رہیں۔ کسی کو کیا خود ان کو بھی گمان تک نہیں تھا کہ برف کی ان تہوں میں کوئی آتش فشاں بھی ہے۔ ... حرارت میں اگر ایک ڈگری کے ہزارویں حصے کی بھی کمی ہو تو ابال پیدا نہیں ہوتا — اور وہ ہزارواں حصہ بہت ہی حقیر سہی — اپنی اہمیت رکھتا

سے کم نہیں ہوتا — بس وہ اسی ہزارویں حصے کو — ایک نقطے کو اپنے وجود سے بالکل علیحدہ کرکے — ریحانہ کی محبت اور پرورش میں ایسی مگن رہیں کہ دن کے اجالے یا رات کے اندھیرے میں انہیں مسعود کا خیال بھی نہیں آیا — اُس مسعود کا جس کے استخوانی شکنجے میں آنے کے بعد وہ ساری آزادیوں کو تج دینے پر آمادہ ہو جاتی تھیں ...... مگر آج کی شام کا لمس — ایک ایسا ذرّہ جو پھٹا تو آگ اُبل پڑی — سارا بدن آتش فشاں کی طرح بھبک اُٹھا۔ ایک زلزلہ — پہاڑ پر جمی ہوئی برف تڑخ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

وہ رات کے بوجھتے کسمساتی رہیں — بستر پہ ہاتھ پاؤں پٹختی رہیں — ایسی بیکل کر دینے والی تنہا رات سے تو کبھی واسطہ پڑا نہیں تھا۔ وہ بار بار اُٹھ بیٹھتی تھیں — یہ آواز — یہ کون کراہ رہا ہے — میں یا رات —

جوانی کی طرح ٹوٹ پڑنے والی رات اس طرح بھنبھوڑتی رہی کہ اُن کو اپنے آپ سے خوف آنے لگا ... تب انہوں نے سائڈ ٹیبل کی دراز سے خواب آور دوا کی شیشی نکالی۔ ایک کے بجائے دو گولیاں — ایک گھونٹ کے بجائے ڈگڈگا کے پانی پیا — پلنگ پر لیٹیں تو شام کے اندھیرے کی سرگوشی نے کروٹ بدلنے کے لیے کہا — کروٹ بدلی تو تنویر کا لہجہ سُنائی دیا — تنویر کا خیال — بوجھل ہوتا ہوا ذہن — وہ ایک ساعت کے لیے مسکرائیں — عجیب فضول آدمی ہے ایک ہی بات کی رٹ لگائے رہتا ہے — مستقبل — ریحانہ کا ہے — میں تو — اُس کے — مستقبل میں — بس رہی ہوں ...... مستقبل ....

جب نیند نے ان کی آنکھوں کا بوسہ لیا اُس وقت رات اندھیرے سے اپنی باہیں چھڑا کر کمرے کے باہر جا رہی تھی۔

وہ سو کر اٹھیں تو بدن میں ہلکا ہلکا درد چٹخ رہا تھا۔ ذہن میں گزری ہوئی شام کی گرد اڑ رہی تھی — رتجگے کا خمار اور بیتی ہوئی شام کے خیال کا دھبہ دُور کرنے کے لیے وہ بہت دیر تک شاور کے نیچے کھڑی رہیں۔

ڈھلتی دوپہر میں اُنہوں نے خود کو اس طرح نک سک سے درست کیا جیسی تیاری وہ عام طور سے کلب جاتے ہوئے کرتی تھیں۔ آئینہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے لحظہ بھر رُک کر پھر اپنے سراپے پر ایک نظر ڈالی — اور مطمئن انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئیں۔

سورج آسمان پر بھی ڈوبا تھا اور ان کے دل میں بھی۔ روشنیاں زمین اور آسمان کے بیچ ہی نہیں دل میں بھی تو ڈوب جاتی ہیں۔ پرندوں کا ایک جھنڈ آسمان کے ایک سرے پر اُڑتا چلا گیا۔ تمام تر منظر نگاہوں سے اوجھل ہوئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے پلٹ کر ان دنوں کی طرف دیکھنا چاہا جنہیں وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے ـــ مگر ایک دھند تھی۔ وہ بھولے بسرے دنوں کے نشانات کہاں دیکھ پاتے ـــ!؟ سب کچھ ڈوبتا جا رہا ہے، ہوتا جا رہا ہے۔ کس کس ڈور کا سرا تھام کر وہ پچھلے دنوں کی دہلیز پر قدم رکھیں ـــ؟

اس دن جب کریتا نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تو انہوں نے اپنی آنکھوں کے اُمڈتے سیلاب کے پیچھے سے آسمان کو دیکھا تھا، روشنی بڑی تیزی سے اوجھل ہو گئی تھی، نگاہیں جھکیں تو وہ تاریک دلدل پر کھڑے تھے۔

کریتا ـــ! کھڑکی کے شیشوں پر سر ٹیک کر انہوں نے آنگن میں ساکت کھڑے تلسی کے پودے کی طرف دیکھا ـ "یوں بھی بھلا کوئی آنکھیں موند لیتا ہے ـــ!؟" تاریک دنوں کے بے انت سفر کو اپنے دل میں چھپائے جیسے ایک بار پھر انہوں نے اس ڈور کو پکڑنا چاہا، مگر لگا جیسے ایک بگولہ اٹھا اور ان کے چاروں طرف چھا گیا ـــ صرف دھند تھی اور ہر منظر اوجھل ـــ

انہوں نے سوچا ـــ

دھول دھرتی سے اٹھتی ہے تو آسمان دھندلا کرتی ہے، مگر دل میں اٹھتی دھول کو کوئی دیکھ بھی پاتا ہے؟ وہ کسی آسمان کو دھندلا نہیں کرتی، اس میں تو جیون کی ریکھائیں گم ہو جاتی ہیں، مٹ جاتی ہیں۔

کمرے میں اچانک سنگ اٹھنے والی روشنی پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سُمیت خاموش کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرائے،

"روشنی نہیں جلائی آپ نے ـــ" اُس نے دھیمی آواز میں کہا ـــ "آپ یوں بھلا کیوں کرتے ہیں اب تو ہمیشہ مجھے ہی روشنی جلانی پڑتی ہے۔"

"روشنی تو اب تمہارے ساتھ ہے بیٹے ـــ" انہوں نے کہنا چاہا مگر دھند کا ایک سیلاب پھر سے امڈ اٹھا، کنارول کو دیکھا تو سُمیت گنگناتا ہوا گیلری سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا تھا۔

کندھوں پر ڈھلکتی شال کو سمیٹ کر وہ دھیرے دھیرے چلتے کمرے سے باہر نکل آئے، آنگن میں سناٹا تھا، وہ تلسی مندر کے نزدیک جا کر رک گئے، کھڑکی کے شیشوں سے گزر کر آتی روشنی میں چھوٹے سے مندر پر تلسی کا گملا رکھا تھا، پودا ساکت تھا، پتیاں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے اپنے

بدن کو چھپا رہی ہوں۔

"اپنے آپ میں سمٹتی جا رہی ہو کویتا ——؟" انہوں نے انگلی بڑھا کر ایک پتّی کو چھوا، پانی کی ایک بوند ان کی انگلی پر پھیل گئی۔

"رو رہی ہو ——؟" ایک ہاتھ سے انہوں نے اپنے دل کو تھام لیا —— تبھی تو لگا پتّیوں کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز بھی بہہ رہی ہو۔ انہوں نے اپنا ہاتھ چہرے پر پھیرا، سیلاب تو ان کے چہرے پر بھی بہہ رہا تھا —— ڈوبی ڈوبی نگاہ سے انہوں نے تلسی کو دیکھا اور تھکے قدموں سے واپس چل پڑے۔

گیلری سے گزرتے ہوئے انہوں نے سُمیت کے کمرے کی کھڑکیوں میں سے دیکھا۔ لمبی میز پر کتابیں، کاغذات اور فائلیں بکھری پڑی تھیں۔

"بکھراؤ ادھر بھی ہے ——؟" وہ ذرا سے رُکے، چھت پر تیزی سے گھومتے پنکھے کی ہوا سے میز پر پڑے کاغذات پھڑپھڑانے لگے ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں نگاہیں سُمیت پر ٹھہر گئیں۔ میز پر کہنیاں ٹیکے وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں چہرہ انجانی لکیروں میں
"یہ دُکھ کیا ہے ——؟" دُکھ کی تمام ریکھائیں اس گھر میں کیوں سمٹ آئی ہیں؟ انہوں نے دیوار سے پیٹھ لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے کھڑے کھڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔

"یہ دُکھ کیسا ہے ——؟" ان کے ساتھ ساتھ اب سُمیت نے بھی اپنے قدم اس گھنے جنگل میں رکھ دئے ہیں تو لگتا ہے تمام راستے کر ایک جگہ آ کر رک گئے ہیں۔ اس طرف آگ ہی آگ ہے تو بھی بھی نگاہ سے وہ پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھنا چاہتے ہیں، مگر پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ایک سیلاب سا نظر آتا ہے۔

"کویتا ——" ان کے دل کی دیواروں سے موجیں آ کر ٹکراتی ہیں اور پھر سب کچھ ڈوب جاتا ہے۔ آگ کی لپٹیں دھیرے دھیرے اندر سمٹ آ رہی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ خاک ہوئے جاتے ہیں۔

"یہ کیونکر ممکن ہے بھلا ——" دیوار پر ٹنگی کویتا کی تصویر پر نگاہ جما کر انہوں نے اپنے دل میں اٹھتی آواز کو پکڑنا چاہا "یہ سُمیت سمجھ کیوں نہیں یہ گھر ——؟ ٹھیک ہی تو ہے، یہ تو اب ہو ہی جائے گا ——؟ مگر —— مگر میں کیا کروں ——؟ وہ جگہ ——؟" آنکھیں بند کر کے انہوں نے دل کی آنکھیں کھول دیں ——

تلسی کے مندر کے پاس کویتا کے کھڑے رہنے کی جگہ ان کے دل میں اتر آئی —— کویتا نہیں ہے، مگر جس جگہ وہ کھڑے ہو کر تلسی میں پانی گلال چھڑک کر جب وہ آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑتی تو ان کے دل میں کوئی درخت اپنی پتّیوں کی دھیمی دھیمی آوازیں گنگنانے لگتا۔

پلٹ کر انہوں نے دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرف ایک بار پھر سے دیکھا ——

کویتا کے ہاتھ ہوا میں اُٹھے ہیں، ان میں ننھا سُمیت کھلکھلا کر ہنس رہا ہے۔

کویتا آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گئی ہے اور سُمیت دھرتی پر اکیلا کھڑا ہے —— انہوں نے ان انجانے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو اب سُمیت کی طرف بڑھ رہے ہیں، سفید، نرم و نازک، لمبی لمبی انگلیاں، چھنکتی ہوئی چوڑیاں، سُمیت کے ہونٹوں پر کھلکھلاہٹ نہیں، بلکہ دھیمی دھیمی مسکراہٹ ہے۔ پھر وہ ہاتھ بڑھا کر ان ہاتھوں کو تھام لیتا ہے، پھر وہ ان کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں۔ وہ کبھی گیلری کی طرف سے آتی ہے، کبھی کمروں کی طرف سے، پھر آنگن میں کھڑے جامن کے پیڑ کے نیچے سے انہیں ان کی دبی دبی سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ایک بار پھر قدموں کی چاپ۔

ارے ــــ یہ ! یہ ـــ ! سنندہ کی حیرت اور خوشی میں ڈوبی آواز، قدموں کی چاپ تُلسی مندر کے نزدیک جاکر رک جاتی ہے۔ سُنندہ کے ہاتھ
جڑے ہیں اور سُمیت بازو تھامے ہے۔ سنندہ کے پیر ٹھیک اسی جگہ پر ٹکے ہیں جہاں کویتا کے قدم ٹکا کرتے تھے ـــ
یہ جگہ ـــ ! یہ جگہ ـــ !! ان کا دل کانپا۔ انہوں نے سر سے پیر تک خود کو شعلوں میں گھرا محسوس کیا۔ سب کچھ جل جائے گا ـــ !!
ان کے اندر جیسے راکھ کے بگولے اُٹھنے لگے۔ اور گویا وہ پھٹ پڑے۔
سنندہ سہم کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں ہیں ـــ اور سُمیت ـــ ! چہرے پر کرب اور نگاہوں
میں حیرت ـــ
آپ کبھی ایسے تو نہ تھے، وہ انہیں یوں دیکھتا ہے جیسے انہیں پھر سے تلاش کر رہا ہو۔ پریم کا وہ منہ زور سمندر آج آپ کو کہاں بہالے گیا
ـــ ؟!
وہ خاموش ہیں، دھیرے دھیرے کانپ رہے ہیں۔ سُمیت اور سنندہ چُپ چاپ سر جھکائے آنگن سے ہو کر گیلری کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔
ان کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتے تُلسی کے پاس جاکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈبڈبائی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ـــ ساکت سر جھکائے
آنکھیں نیچی کیے ہری ہری پتیاں ـــ
کویتا ـــ بھلا ہماری جگہ کوئی اور بھی کھڑا ہو سکتا ہے ـــ ؟!
دھیمی دھیمی بہتی ہوا آنگن میں اُتر آتی ہے تو تُلسی کی پتیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔
وہ حیرت سے دیکھتے ہیں ـــ !
رو رہی ہو تم ـــ ؟ کیوں ـــ ! بھلا کیوں ـــ ؟! وہ گملے پر اپنے کانپتے ہاتھ ٹیک دیتے ہیں۔ آنکھوں میں سینکڑوں سوال ـــ
پھر خاموشی اور سنّاٹا ـــ
چُپ ہو گئی ـــ ؟ وہ بے بسی سے دیکھتے ہیں ـــ "اب تو کھل کر کسی بات کا جواب نہیں دیتی ہو ـــ" نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف
دیکھتے ہیں ـــ
آنگن سے گزر کر کمرے تک پہنچتے پہنچتے سینکڑوں سال کا سفر معلوم ہوا، وقت نے جیسے اپنے پر سمیٹ لیے ہیں۔
سُمیت کے کمرے سے ابھی تک روشنی باہر نکل کر گیلری میں پھیل رہی تھی، کھڑکی کے شیشوں میں سے ایک بار پھر کمرے کے اندر دیکھا، وہ
اسی حالت میں چُپ چاپ بیٹھا ہوا ہے ـــ الماریوں میں جمی کتابیں، میز پہ پھیلے ہوئے کاغذات اور فائلیں ـــ اور ـــ سر پر تیزی سے گھومتا
ہوا پنکھا، کاغذات کی پھڑپھڑاہٹ، کوئی پرندہ بے آواز ان کے اندر پھڑپھڑاتا ہے،
سُمیت ـــ ؟! ایسے پانیوں پر لے جاکر کھڑا کر دیا ہے، جہاں صرف موجیں ہیں اور جس کا کوئی کنارا نہیں ـــ اور قدم تو تم نے بھی ان ہی پانیوں
میں اتار دیئے ہیں ـــ
پلٹ کر جا بھی سکوگے بھلا ـــ ؟!
وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر لمبی کرسی پر آ بیٹھے، میز پر ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا، اچانک انہیں خاموشی اور اکیلے پن کا احساس ہوا۔ ہاتھ بڑھا
کر انہوں نے ٹیپ کا بٹن دبا دیا ـــ سنگیت اکاڈمی کے سالانہ پروگرام کا ریکارڈ، سُمیت کی آواز، وہ سنندہ کا پریچے کرا دیا ہے ـــ پریچے

کی آواز۔ الفاظ اور اتار چڑھاؤ ——

دل —— اے دل —— !؟ وہ سوچتے ہیں —— پھر بانسری، ستار اور مردنگ کی آواز میں سنندہ کی آواز کا دریا —— انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور میز پر ان کی انگلیاں چلنے لگیں ——

پھر سنندہ کی آواز کا تار ٹوٹا۔ تالیوں کی گونج —— انہیں یاد آیا۔ روشنیاں ہوئیں تو وہ بھی بھیڑ میں اسٹیج پر چڑھ گئے تھے۔ کیمروں کی روشنیاں، لوگوں کی مبارک باد کی آوازیں، سنندہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر لوگوں کا شکریہ ادا کر رہی تھی، وہ سُمیت کے بازو کھڑی تھی، وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے سنندہ کے قریب پہنچ گئے تھے، انہوں نے دیکھا سُمیت سمٹ گیا ہے اور سنندہ کی پیشانی بھیگ گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ جوڑے آگے بڑھ آئی۔ انہوں نے مُسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے، مبارک باد دی اور پھر اسٹیج سے نیچے اُتر گئے ——

ٹیپ چُپ تھا، ہر آواز اپنا جادو جگا کر پھر چُپ ہو جاتی ہے۔

خاموشی اور سنّاٹا اگر مقدر بن جائے تو پھر کوئی آواز —— !؟ وہ ایک بار پھر کُرسی سے اُٹھ گئے۔ شال کو اپنے بدن کے اطراف لپیٹا اور کمرے سے باہر نکل آئے ——

آنگن میں ابھی تک سُمیت کے کمرے سے چھن کر آتی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اندر خاموشی تھی، صرف پنکھے کی آواز، سُمیت اب کوئی فائل میز پر پھیلائے آنکھیں جُھکائے بیٹھا تھا ——

گھاؤ لگتے ہیں، نظر نہیں آتے —— انہوں نے سوچا —— اور آگے بڑھ گئے۔ آنگن میں سنّاٹا تھا —— ایک بار پھر وہ تُلسی مندر کے پاس کھڑے تھے ——

"اب مجھے تم سے بہت کچھ بولنا ہے کویتا ——" انہوں نے تُلسی کی طرف دیکھا۔ پتّیاں یوں سر جُھکائے ہوئے تھیں جیسے آنچل سے سر کو ڈھک لیا ہو،

انہیں یاد آیا ——

کبھی کویتا بھی دفتر جاتے وقت ان کے سامنے ایسے ہی کھڑی ہو جاتی تھی۔

"تمہیں یوں دیکھتا ہوں نا —— !؟" وہ دھیرے سے کویتا کے چہرے پر پھیل آنے والے بالوں کی ایک لہر کو اپنی انگلی سے ہٹا کر دھیمی آواز میں کہا کرتے تھے —— "مجھے تمہاری تُلسی یاد آ جاتی ہے، جی چاہتا ہے تمہیں پرنام کروں، پوجا کروں" —— کویتا کی دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز میں ان کی آواز دب جاتی۔ وہ اسے بازو سے پکڑے وہیں آنگن میں بیٹھ جاتے —— باتیں، سرگوشیاں، ہنسی کی مدھم آوازیں آنگن میں گونجا کرتیں۔ وہ اس وقت چونکتے، جب سُمیت کے اسکول کی بس کی آواز گھر کے باہر آ کر رکتی۔ سُمیت اپنا اسکول کا بیگ پیٹھ پر لٹکائے دوڑتا ہوا ان کے قریب آ جاتا، کویتا انہیں چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑے اسے بس میں بٹھانے چلی جاتی اور وہ اپنی سائیکل سنبھالے دفتر کے لیے نکل پڑتے ——

آنگن میں خاموشی تھی، سنّاٹا تھا، صرف جامن کے پیڑ کی آواز تھی جو کبھی کبھی تیز بہتی ہوا سے ٹکرا کر بول اُٹھتا تھا۔ اُنہیں لگا جیسے تُلسی کی دوسری طرف سے کویتا کی دھیمی دھیمی پوجا کی آواز آ رہی ہو۔ پھر تُلسی میں گرتے پانی کی آواز —— پھر اُنہیں لگا کویتا دھیرے سے ان کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی ہو —— اُنہوں نے مدھم روشنی میں اس جگہ کی طرف نگاہ ڈالی جہاں کویتا کھڑے ہو کر پوجا کیا کرتی —— وہ غور سے اس جگہ کو دیکھنے لگے اُنہیں لگا، جیسے کئی برس گزر جانے کے بعد بھی کویتا کے کھڑے رہنے کی جگہ پر اس کے قدموں کے نشان اُبھرے، اُبھرے سے ہیں ——

انہوں نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو پکڑ کر کچھ پل کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں ——

ہوائیں تیز بہہ رہی ہیں ——

پھر آسمان پر سیاہ بادل اُمنڈ رہے ہیں، پھر وہ گرجے، پھر چمکے اور آسمان سے طوفان دھرتی پر بہنے لگا ہے، آنگن پانی سے بھر گیا ہے، جامن کا پیڑ کمر جھکائے اپنے اُوپر سے گزرتے طوفان کو دیکھ رہا ہے ——

پھر طوفان رُکتا ہے، بہتی ہَوا تھمتی ہے۔ آسمان کے کھل جانے کے بعد وہ دیکھتے ہیں، بھیگی بھیگی تُلسی اپنے بدن کو چرائے کھڑی ہے۔ اور قریب کویتا کے قدموں کے نشان صاف صاف نظر آ رہے ہیں ——

برستے آسمان، گزرتے ہَوا کے جھکڑ، آگ برساتی دوپہر، کوئی بھی تو ان بیس برسوں میں ان نشانات کو مٹا نہیں سکا ہے۔ کویتا کے گزر جانے کے بعد ان بیس برسوں میں انہوں نے کبھی بھی بھول کر اس جگہ پر اپنے قدم نہیں رکھے تھے ——

انہیں لگتا تھا بھول کر بھی ان کے قدموں نے اس جگہ کو چھو لیا تو پھر کویتا سدا کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ جائے گی، آنگن خالی ہو جائے گا ——

انہیں وہ دن یاد آیا جب کویتا نے منڈیر پر تُلسی کا پودا لا کر لگایا تھا، پھر چند پتیاں ان کے ہاتھ پر رکھ کر دھیمی آواز میں کہا تھا ——

"ان میں میری آتما چھپی ہے۔ میں نہ رہوں، اور کبھی تم یہاں کھڑے رہو تو گزرتی ہَوا میری آتما جگایا کرے گی ——" بھیگی بھیگی نگاہ سے انہوں نے خلا میں دیکھا، ہر چیز دھند میں ڈوبی ڈوبی سی لگتی تھی ——

بیس سال گزر جانے کے بعد بھی انہیں لگتا تھا، کویتا گھر میں موجود ہو ——

اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بہت کم گھر سے باہر نکلا کرتے۔ دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے یا اکیلے ہی شطرنج کھیلا کرتے۔ دوسری طرف کوئی بیٹھا دھیمی دھیمی ہنسی ہنستا، وہ نگاہ اٹھا کر دیکھتے، تمام مہریں ایک ہی گھر میں کھڑی نظر آتیں ——

تنہائی کے احساس سے اُکتا کر وہ کبھی کبھی آنگن میں نکل آتے۔ جامن کے پیڑ پر بیٹھی چڑیاں انہیں دیکھ کر چپ ہو جاتیں —— یہ اچانک ان کی آواز اُڑا لے گیا ——

پھر انہیں لگتا جیسے وہ سب ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھ رہی ہوں، جیسے آپس میں کہہ رہی ہوں ——

چُپ ہو جاؤ —— چُپ —— اب اپنا یہاں کیا کام —— پھر وہ سب اُڑ کر آسمان میں کھو جاتیں —— وہ مسکراتے، سب ہی نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ انسانوں نے بھی اور پرندوں نے بھی، اب صرف سناٹا ہے اور آوازیں —— ؟! وہ نگاہ پھیر کر گیلری کی اس طرف دیکھتے۔ پڑوس والی بلڈنگ کے سامنے والے فلیٹ کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہیں، دھیمی دھیمی آواز میں ٹیپ چل رہا ہے، سنندہ کی آواز، پھر تالیوں کی آواز —— اور —— ؟!

سناٹا —— اس طرف بھلا کوئی آواز کا جادو کیسے آ سکتا ہے —— ؟!

"کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی ——" وہ چونک کر تُلسی کی طرف دیکھتے ہیں، پتیوں کے پیچھے سے کوئی مدھم آواز میں کہتا ہے "ذرا باہر تو نکلو، پڑوس میں دو نمبر بابو کے گھر کچھ نئے لوگ آئے ہیں، وہاں تک ہو آؤ۔"

"میں چلا گیا تو پھر تم اکیلی نہ رہ جاؤ گی ——" وہ تُلسی کے بالکل قریب جا کر کھڑے ہو جاتے، وہ اپنے ہاتھ تُلسی کے کانپتے پتوں پر پھیرتے۔ یوں لگتا جیسے کویتا شرما کر اپنے آپ میں سمٹ گئی ہو ——

"میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں —— ؟!" وہ اس جگہ کو دیکھنے لگتے جہاں کھڑے ہو کر کویتا پوجا کیا کرتی تھی ——

"بابوجی ——!! انہیں وہ رات یاد آئی۔ جب سُمیت سائیٹ کا معائنہ کر کے گھر لوٹا تو انہیں آنگن میں تُلسی کے قریب کھڑے دیکھ کر، وہ اس کے پاس چلا آیا ——

" آپ یہاں کھڑے ہیں؟ اس وقت، اس جگہ ——؟؟"

سر پر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ رم جھم بارش زور پکڑ رہی تھی، وہ شرابور تھے —— بارش ان کے پاؤں کی زنجیر بن سکتی تھی؟!

کوئی بھی تو کب سے بارش میں بھیگ رہی ہے —— ان کی آواز تو صرف سینے میں ہی گھٹ سکتی ہے۔ سُمیت اس آواز کو سن پائے گا ——!!

وہ سُمیت کی طرف پلٹے۔ اس کے لمبے سنہرے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ کچھ کہے بغیر انہوں نے سُمیت کے کندھوں کو تھپتھپایا، اور اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے تھے۔ سُمیت حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا، پھر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سر کو ہلکے سے جھٹکا، اور گنگناتا ہوا ان کے کمرے کے سامنے سے گزر گیا ——

" یہ آواز، یہ گنگناہٹ ——؟! سُمیت کے گزر جانے کے بعد انہوں نے سوچا تھا —— کیا ہے یہ سب کچھ ——!!"

انہوں نے اپنے نزدیک بالکل نئی آوازوں کو سنا —— وہ ان آوازوں کو سن سکتے ہیں، اور —— سمجھ بھی سکتے ہیں —— یہ بہت پیچھے سے آنے والی آوازیں ہیں —— یہ آوازیں، بہت پیچھے سے اپنے سفر پر نکلیں اور اب ان کے آگے آگے چل رہی ہیں۔

یہ گنگناہٹ نہیں، یہ ایک آہٹ ہے، جو ان کے اندر سے نکلی اور پھر آگے آگے چلنے لگی، اس آواز کے ساتھ وہ بھلا کہاں چل سکتے ہیں،

سُمیت کے کمرے میں روشنیاں ہیں، آوازیں ہیں ——

سُمیت جو ان کے کمرے کے سامنے سے گزر گیا ہے، مگر اس کے دل کے کواڑوں پر ایک نئی آواز کے ساتھ دستک دے کر گیا ہے —— وہ مسکرائے ——

انہیں سُمیت کے کالج کا آڈیٹوریم یاد آیا، جس کے اسٹیج پر پہلی بار انہوں نے سُمیت کی کانپتی آواز سنی تھی —— پھر سنندہ کی —— سُر تال اور مردنگ کی آواز،

انہوں نے میز پر سامنے پڑے ہوئے البم کو اٹھا لیا جو آج وہ سُمیت کے کمرے سے اٹھا لائے تھے —— انہوں نے البم کے صفحات پلٹنے شروع کیے ——

تصویروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے سُمیت اور سنندہ کی آوازیں بھی سُنی تھیں ——

مدھم آوازیں، سرگوشیاں، دبی دبی ہنسی کی آوازیں —— یہ سب ہی جیسے ان تصویروں میں سمٹ آئے تھے —— اُفق میں ڈوبتا سورج اور سمندر کی اٹھتی موجوں کی طرف جھکا ہوا سُمیت اور اُسے اپنی طرف کھینچتی سنندہ، انہوں نے صفحہ پلٹا ——

کھلا وسیع میدان، سوکھے درختوں کی ٹہنیاں، ایک سوکھے تنے پر بیٹھی سنندہ، چہرے پر سورج کی لکیریں ——

انہوں نے جلدی سے صفحہ الٹ دیا —— تصویریں ہی تصویریں —— وہ راستے جن سے وہ واقف بھی تھے اور جو ان کے لیے نئے بھی تھے —— کھلا کھلا آسمان، چمکدار، دو پرندے بلندیوں کی طرف اڑتے ہوئے —— وہ بڑی دیر تک اس تصویر کو دیکھتے رہے ——

پھر انہوں نے البم بند کیا تھا، اور سُمیت کے کمرے کی طرف چل پڑے تھے، مدھم روشنی، میز پر بکھرے کاغذات اور قلم چلاتے ہوئے گگن :

سمیت، وہ مسکرائے۔ آہٹ پاکر نگاہ اُٹھا کر سمیت نے ان کی طرف دیکھا تھا، اور ہڑبڑا کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا —
انہوں نے ڈھیر سے البم میز پر رکھ دیا۔ مسکرا کر سمیت کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئے تھے —
...ب بٹن دبا کر سمیت نے روشنی کی تو آنکھیں جیسے نئے منظر دیکھ رہی تھیں —
لائٹ تو جلادی ہوتی — سمیت کی مدھم آواز — روشنی نے تو اپنے راستے بدل لیے ہیں، اب تمام سمتیں کسی اور طرف مڑ گئی
ہیں —؟!

سمیت اپنے کمرے کی طرف چل پڑا تو لگا — ایک راستہ بہت آگے نکل گیا ہے — بہت ہی آگے — سمیت نے
ڈھیر سے اپنا تمام کاروبار جمالیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، وہ اب مطمئن بھی تھے، دُنیائیں الگ الگ جم ہی جاتی ہیں۔
ان دنوں وہ بے حد مصروف تھا۔ اس نے ڈھیر سے ڈھیر سے پرانے مکان کے کئی حصے گروا دیئے تھے، کام دن بھر چلتا، وہ دن بھر اپنے
کمرے میں چپ چاپ بیٹھے رہتے یا کتاب پڑھتے رہتے۔ شام سمیت جب دن بھر کے کام کا جائزہ لیتا تو وہ بھی کمرے سے نکل آتے۔ دیکھتے
تو لگتا جیسے اپنے ہی گھر میں کوئی اجنبی آگیا ہے —
پہلے پہل سمیت نے چاہا تھا کہ شہر سے دُور ماڈل کالونی والے اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو جائے۔ اُنہوں نے انکار کر دیا —
کیا وہاں وہ زندہ بھی رہ سکیں گے —؟!
بے بسی سے اُنہوں نے سمیت کی طرف دیکھا تھا —
تم مجھے کس جگہ لے جانا چاہتے ہو —؟! وہ جگہ جہاں میرا کچھ بھی نہیں —؟!
سمیت سمجھتا تھا، اس نے مجبور ہو کر پرانے مکان کے کچھ حصوں میں تبدیلی شروع کر دی، پہلی بار جب مکان کے اُوپر پُرانی چھت والا
حصہ گرایا گیا تو انہیں بے حد تکلیف کا احساس ہوا تھا۔
زمین بھی بدل رہی ہے اور آسمان بھی —؟ اُنہوں نے سوچا تھا، انہوں نے خلا میں دیکھا تھا۔ جانے نگاہیں کس چیز کو تلاش
کر رہی تھیں —
کام تیزی سے ہوتا گیا۔ وہ چپ چاپ دیکھتے رہے۔ شام جب آتی تو وہ خود کو اس گھر میں اجنبی سا محسوس کرتے۔ یہ سب کیا ہے؟!
سوچتے — پرانی مٹی مجھے اپنی طرف کیوں کھینچتی ہے —؟! وہ اپنے آس پاس نئے نئے کام کر دیکھتے تو لگتا، ان سے میرا کیا سمبندھ!
کام بڑھا، اُوپر کے حصوں کی تکمیل کے بعد سمیت نے نچلی منزل کی طرف توجہ کی تو انہوں نے سختی سے سمیت کو روک دیا —
میرے آنگن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی — وہاں کی ہر چیز ویسی ہی رہے گی — اُنہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ سمیت
نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے چپ کر دیا تھا —
تم مجھ سے سب کچھ چھین لینا چاہتے ہو سمیت —" سمیت کے جانے کے بعد وہ جامن کے پیڑ سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہوئے تو ان
آنگن کی دیواروں سے ٹکرا کر ان کی آواز جیسے ہانپنے لگی —
در و دیوار، چھت، منڈیریں، کمروں کے کچے فرش، چھوٹے چھوٹے روشن دان اور کھڑکیاں، جن کے پیچھے سے کویتا کی روشن آنکھیں
راستے پر بھی رہتی تھیں —

"سُمیت نے اب سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے" وہ زیرِ تعمیر نئے کمروں میں پھرتے تو لگتا ــــ

گھر بدل گیا ہے یا وہ خود ــــ ؟! وہ اپنے دل کی آواز پکڑنے کی کوشش کرتے مگر بے سود۔ ان کا دل گھبرانے لگتا، اور وہ بے چین ہو کر آنگن میں نکل آتے۔ لگتا آتما سمٹ کر آنگن میں چلی آئی ہو۔

آج دن بھر سے انہیں شدید بے چینی کا احساس ہو رہا تھا ــــ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے ــــ مگر ــــ ؟! دل تیز دھوپ میں اڑان بھر کر ہانپتے پرندے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سُمیت نے تو جیسے انہیں آگ کے پُل پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا ــــ

وہ کس قدر اُلٹی سیدھی باتیں سوچنے لگے ہیں ان دنوں، اس میں سُمیت کا کیا قصور ہو سکتا ہے ــــ ؟!

پھر ایسا کیوں ہے یہ سب کچھ ــــ ؟! میں کیا سوچنے لگا ہوں ان دنوں؟ میرا دل ان راستوں پر کیوں چل پڑا ہے؟ راستے اب بدلنا چاہیئے ــــ؟ نئی نئی دیواریں سر جُھکا کر ان کی طرف دیکھتی ہیں۔

ان پر چل کر تو وہ بھٹک جائیں گے ــــ؟ وہ اپنے راستوں کو کیسے گم ہو جانے دیں ــــ ؟! پیٹھ لگائے، آنکھیں بند کیے وہ سوچتے رہے ــــ

آج صبح ہی سے ان کا دل بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ آسمان بھی بھاری بادلوں سے دبا ہوا تھا اور بوجھل ہُوا ان کے اندر سُلگتی آگ کو دھیرے دھیرے بھڑکا رہی تھی ــــ

صبح جب اُنہوں نے تُلسی میں پانی چھوڑا تو یہ دیکھ کر ان کا دل اچانک بیٹھ گیا کہ اس کی پتّیاں سُوکھی سُوکھی سی لگ رہی ہیں۔ اُداس، ویران اور اپنے آپ میں سمٹی ہوئی ــــ

"کویتا ــــ ؟!" اُنہوں نے بڑے دُکھ سے سوچا تھا ــــ "کیا اس طرح بھی کوئی ساتھ چھوڑتا ہے ــــ ؟!"

ہَوا کا ایک دھیما جھونکا گزرا تو سوکھی پتّیاں کھڑکھڑائیں۔ انہیں لگا، جیسے کویتا دھیمی دھیمی آواز میں رو رہی ہو۔ دُکھ کے اس موڑ پر لگا، واقعی اب ہر چیز ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ وہ اکیلے ہو گئے ہوں گے۔ گھر کے پرانے حِصّے، کھڑکیاں، روشن دان، چھت، در و دیوار اور منڈیریں ــــ اور ــــ اور اب؟!

ایک تیز لہر اُٹھی اور ان کے دل کی دیواروں سے ٹکرانے لگی ــــ

سُوکھی سوکھی پتیاں، سُوکھی تُلسی ــــ تھکے تھکے قدموں سے وہ اپنے کمرے کی طرف چلے تو لگا، آج انہوں نے کویتا کی ارتھی کو آگ دکھائی ہو ــــ

بے چینی، بے بسی اور آنسو ــــ اُنہوں نے روکا نہیں، کئی برس بعد آج ان کا دل خوب رونے کو چاہ رہا تھا ــــ ان آنسوؤں کو بھلا کوئی دیکھ بھی پاتا ــــ ؟!

کون ہے ــــ ؟!

کون ہے اب ؟! بیس برس گذر جانے کے بعد اب کویتا بھی ساتھ چھوڑ جائے گی ــــ ؟! اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ کُرسی پر گر پڑے۔ کمرے میں پڑے پڑے صدیاں بیت گیئں ــــ گھر میں خاموشی تھی ــ ــ ــ سنّاٹا تھا۔ وقت کا بے آواز پرندہ کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گزرتا رہا ــــ

دوپہر ہوگئی تھی۔ دھوپ گھر کی چھت اور منڈیروں سے اتر کر آنگن میں پھیل گئی تھی۔ ان کے اندر جیسے ایک سناٹا پھیل گیا تھا —
پھر انہوں نے گیلری میں سُمیت اور سنندہ کے گزرنے، دھیمی دھیمی باتوں اور ہنسی کی آواز سُنی —
سُمیت اور سنندہ مکان کے اُوپر کے حصے کی طرف چلے گئے۔ سُمیت، سنندہ کو گھر کا نیا کام دکھاتا پھر رہا تھا — دونوں کی باتوں کی
آواز، ہنسی اور سرگوشیوں کی آواز میں چھپا مسرت کا احساس انہوں نے صاف صاف محسوس کیا۔ انہوں نے خود کو سنبھالا۔ کمرے سے نکل
کر باہر آئے تو سُمیت اور سنندہ آنگن میں کھڑے تھے۔ سُمیت سر جھکائے دھیرے دھیرے کچھ بتا رہا تھا۔ سنندہ سر پہ ساری کا پلو اوڑھے
ٹھیک اسی جگہ کھڑی تھی جہاں کویتا کھڑے ہوکر پوجا کیا کرتی تھی — وہ جگہ — وہ مقام —؟!
ان کا بدن کانپنے لگا! انہوں نے اپنے اندر ایک چتا کو سلگتا محسوس کیا۔ آگ کی لپٹیں جیسے انہیں راکھ بنا رہی تھیں۔ سُمیت —
انہیں خود اپنی ہی آواز سے ڈر لگا۔ یہ آواز ان کی اپنی تھی؟! سُمیت اور سنندہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو ان کی نگاہوں میں بیٹھے
خوف کو دیکھ کر سہم گئے —

یہ آواز —؟!

یہ آواز ان کی اپنی ہی ہے —؟! آج اس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا —؟!
انہوں نے خود کو تلاش کرنا چاہا، بے کار —؟! سب کچھ بھٹک گیا ہے، چتا میں بھی ایک لکڑی زور سے بھڑک اٹھی تھی۔ وہ تینوں
آنگن میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے — ڈرے ڈرے سے —
انہوں نے ایک بار پھر سُمیت اور سنندہ کی طرف دیکھا، تیزی سے مڑے اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ دن اور رات
— کرب کا احساس جان لیوا تھا۔ کئی بار کمرے کے دروازے کے قریب انہوں نے سُمیت کی آہٹ سُنی، دو ایک بار ہلکی آواز بھی دی سُمیت
نے مگر وہ چُپ چاپ پلنگ پر پڑے رہے —
دن چڑھے انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا، گھر میں سناٹا تھا۔ سُمیت شاید سائٹ پر چلا گیا تھا۔ انہوں نے اشنان کیا، ٹھنڈا مہربان
پانی سُلگتی آگ مدھم پڑی۔ دھوپ آنگن کی دیواروں سے اتر کر چاروں طرف پھیل گئی تھی — جامن کا پیڑ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پانی سے
بھرا لوٹا لے کر وہ سیڑھیوں سے اُتر کر آنگن میں آئے تو ایک بار پھر ان کا دل دھیرے دھیرے کانپنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے تُلسی کے قریب
کھڑے ہوگئے۔ نگاہ بھر کر دیکھا، دھوپ میں چمکتی پتیاں کچھ اور سُوکھی سُوکھی سی لگ رہی تھیں —

"اپنے آپ میں سمٹتی جا رہی ہو —؟!"
کیوں — ایسا کیونکر —؟! وہ اپنے اندر جیسے آنسوؤں میں بھیگ گئے۔
کوئی مجھے اندر سے دیکھ سکتا ہے —؟! انہوں نے تُلسی کی طرف دیکھا، سُوکھی، سمٹی پتیاں، ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا گزرا،
لگا، پتیوں کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز آ رہی ہو — پھر خاموشی —؟
پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے بکھر رہی تھیں —
اپنی آنکھوں کو بند کر ہی لیا آج — دُکھ کی ایک لہر انہیں ساحل سے اکھاڑ کر گہرے پانیوں میں لے گئی۔
آہٹ پر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ سُمیت اور اس کے پیچھے سنندہ کھڑی تھی۔ سُمیت کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ انہوں نے نگاہ ہٹا کر پیچھے

کھڑی سنندہ کی طرف دیکھا —— اُونچی پوری، خوبصورت، نازک، گہرے سیاہ لمبے لمبے بال، اُلجھے اُلجھے سے، آنکھیں سُرخ اور کنارے بھیگے بھیگے، وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ اُنہوں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، پرندے آسمانوں میں اڑے جا رہے تھے، سُوکھی، سمٹی تُلسی کی طرف مڑے ——

"شاید اسے اب میرے پانی کی ضرورت نہیں —— ؟"

میری پوجا —— ؟

انہیں لگا، کویتا ان کے اندر سمٹ آئی ہو، اس کی دھیمی دھیمی آواز جیسے ان کے وجود کے اندر پکار رہی ہو —— اُنہوں نے ہاتھ میں تھمی پانی کی لُٹیا آہستہ سے سنندہ کے ہاتھ میں تھما دی، بائیں ہاتھ سے اس کے گال کو تھپتھپا کر نگاہ نیچی کی تو سنندہ کے قدم ٹھیک اسی جگہ ٹکے تھے —— کویتا کے قدموں کی جگہ —— وہ مُسکرائے، اپنی جگہ چھوڑ کر کمرے کی طرف چلے تو انہیں لگا، ان کے قدموں میں کوئی تھکن نہیں ہے ——

لال سینڈل

سلیم آغا قزلباش

اس کی جھگی شہر کے گندے نالے کے پاس ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کسی کبڑے شخص کی طرح بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ نالے کے پہلو میں موجود چھوٹی جھگیاں یوں لگتی ہیں جیسے جسم پر کھولتا ہوا پانی گرنے سے جگہ جگہ آبلے پڑ گئے ہوں۔ وہ اپنی سرکنڈوں کی جھگی میں سر نہوڑائے بیٹھا رہتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار دن بمشکل اٹھا کر گدلائی نظروں سے گندے نالے میں بہتی غلاظت کے سیال مادے کو ٹٹولتا ہے گہرا سانس بھرتا ہے اور اپنا سر دوبارہ جسم میں چھپا لیتا ہے جو دکھتا ہوا ایک پھوڑا بن چکا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی جھگی میں چپ چاپ بیٹھا ہوا کچھ یوں جان پڑتا ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ مگر گندے نالے کے پہلو میں بیٹھ کر کم از کم کسی ایسی چیز کا انتظار کرنا بے سود ہے جو واقعی انتظار کے لائق ہو۔

اس تیتر بتر، لیر لیر بستی میں صرف اس وقت ہلچل پیدا ہوتی ہے جب سائیں بابا کی جھگی میں سے دلخراش آواز بلند ہوتی ہے "آ آ ــــ آگئی، لو ــ آ ــ آ آ ــــ گئی" اور اس کے ساتھ ہی بستی کی کالی کلوٹی پنجر نما جسموں والی گندی مندی عورتیں، بہتی ناکوں اور پھولے پیٹوں والے کالے بھجنگ بچے اور ان بچوں کے مریل بیمار کانے بھینگے باپ، اس جھگی کی طرف، لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھنے لگتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر سب کی نظریں گندے نالے میں کسی خطرے کو ڈھونڈنے لگتی ہیں اور جب وہ خطرہ سامنے آجاتا ہے تو پھر اُن کی نگاہیں چیونٹیاں بن کر اس سے چمٹ جاتی ہیں اور تب دوسرے ہی لمحے ان سب کی سانسیں سینوں میں درد کی ٹیسیں بن کر بکھرنے لگتی ہیں۔ اس وقت کوئی نہ کوئی عورت اپنے دونوں کانوں کی لوؤں کو چھو کر اور زبان کی نوک دانتوں میں دبا کر بول اٹھتی ہے "ربا کبڑا اوترا زمانہ آگیا اے" اور اس کے بعد ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگتی ہے جو شور بن کر اس علاقہ کے قریبی تھانہ تک بھی آپ پہنچ جاتی ہے اور وہ کہانی پھر سے دہرائی جاتی ہے جو شاید ازل سے اُن جھگیوں کے مکینوں کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

گندے نالے کے پاس اُس چھوٹے سے ٹیلے پر ڈیرہ لگانے کے بعد سے مہینہ میں دو ایک مرتبہ انسانی جسم کے کٹے پھٹے کسی نہ کسی حصے کو دیکھ لینا بابا کے لیے اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ مثلاً گزشتہ دو مہینوں کے دوران ایک بریدہ سر، دو کٹے بازو اور ایک سالم ٹانگ اُس کے سامنے سے گزری تھی۔ مگر جب کبھی کوئی نومولود انسانی وجود نالے میں بہتا ہوا گزرتا تو ساری بستی میں قیامت سی آجاتی۔ نتیجتاً پولیس سب سے پہلے سائیں بابا کے اعصاب پر آن سوار ہوتی۔ تھانے دار کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو وہاں کے بے یار و مددگار مکینوں پر مغلظات کے ہنٹر اندھا دھند برسانا شروع کر دیتا۔ اس پر بھی دو چار مریل اور نشے کے عادی مرد اُس کے ہتھے چڑھ جاتے انہیں آگے لگا کر ہنکارتا ہوا تھانے میں لے جاتا۔ تھانے پہنچ کر اُن کے بیان لکھے جاتے شام تک باری باری حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے تھانے کے عملے کا چھوٹا بڑا اُن سے اپنے پاؤں دبواتا۔ شام ڈھلے [illegible] ۔۔ چار جوتیاں لگا کر

دوپٹے کے پلو سے یوں پونچھتی جیسے اس کی بلائیں لے رہی ہو۔ شام نے سُرخ شال اوڑھ لی تھی اور اس کی شال کے کنگرے تیزی سے سیاہ ہونے لگے تھے۔ سوکھے سڑے درخت کے نیچے پہنچ کر کاکی نے باپو کو اپنی نئی نئی خریدی سینڈل دکھائی اور ابھی اس نے اپنی خوشی کا کھُل کر اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ ایک بدہیبت جیپ بالکل فٹ پاتھ کے کنارے آکر رکی اور چند مشٹنڈے کود کر باہر نکلے اور پلک جھپکنے میں کاکی کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے جیپ میں زبردستی ڈال کر فرار ہوگئے۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا کہ ہاشو کو بیساکھی کا سہارا لے کر اپنی جگہ سے اُٹھنے اور اس کی بیوی کو دوڑو پکڑو، روکو کا واویلا کرنے کا موقع تک نصیب نہ ہو سکا۔ وہ منظر دیکھ کر کاکی کی ماں غش کھا کر وہیں ڈھیر ہوگئی اور خود ہاشو تادیر پتھر کا بُت بنا فٹ پاتھ کی اس جگہ کو خالی خالی نظروں سے تکتا رہا جہاں چند لمحے پہلے کاکی کی نئی نکور لال سینڈل اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

وہ میلا چکٹ فٹ پاتھ جہاں ہاشو پر قیامت ٹوٹی تھی، کسی گہرے گھاؤ پر جم جانے والے کھرنڈ کی طرح دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ جیسے کاکی کو چند مشٹنڈے اس کی آنکھوں کے سامنے زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے اور کاکی کی ماں سوکھے سڑے اپاہج درخت کے نیچے خون تھوک تھوک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہمیشہ کی نیند سوگئی تھی، ہاشو اسی فٹ پاتھ پر میلی سی دری بچھا کر دن رات سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ دفتروں میں چھٹی کے وقت پر سکے اس کی بوسیدہ دری پر بے جان سے گرتے، جن کر لمحہ بھر کے لیے برستے اور پھر اگلے روز تک کے لیے سوکھ جاتے۔ اس نے جب بھی سکوں کو اپنی چھوٹی پرانی ہتھیلی پر اکٹھا کر کے گنا تھا تو ان میں سے آدھے کھوٹے نکلے تھے۔ یہ کھوٹے سکے بھی عجیب شے ہیں، سرسری نظر سے دیکھو تو بالکل ٹھیک ٹھاک مگر جب ذرا آنکھوں کے قریب لاکر دیکھو تو بالکل کھوٹے۔ ہاشو کھوٹے سکوں کو چن چن کر علیحدہ کر لیتا اور تادیر ان سکوں کے بے چہرہ دھندلائی سطحوں کو اپنی بدوضع پوروں سے سہلاتا رہتا اور پھر غیر شعوری طور پر اپنے چہرے کو انگلیوں سے ٹٹولنے لگتا جیسے وہاں کسی کے نقوش ڈھونڈ رہا ہو یا شاید اس بات کی تشفی کرنا چاہتا ہو کہ کہیں وہ کسی کھوٹے سکے کی طرح بے نشان تو نہیں ہوگیا۔

جس مہینے انسداد گداگری کی مہم زور شور سے شروع ہوئی تھی اس کی معمول کی آمدن گھٹ کر آدھی بھی نہیں رہی تھی اور حوالات میں بند کر دیے جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ یوں بھی جب سے کاکی اٹھالی گئی تھی اور کاکی کی ماں سسک سسک کر مر گئی تھی وہ بزدل ہوگیا تھا، ذرا سی گڑبڑ پر اس کا دل دہل جاتا جیسے دل اس کے وجود کے سیئے پرانی سے بن گیا ہو۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز کی شوکر فائر برگیڈ کی ٹن ٹن ٹن، ایمبولینس کا سائرن، سرکاری گاڑی کا ہوٹر، بس کا ہارن، سائیکل کی گھنٹی اور بریک تلے بُری طرح چیخنے کرلاتے پہیوں کی آواز سُن کر اس کا دل پھڑکنے لگتا تھا۔ چنانچہ ہاشو نے اس جگہ کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اگلے دن وہ جھگیوں والی بستی کی جانب اپنی بیساکھی کا سہارا لیے چل دیا۔ شام ڈھلے جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گندے نالے کے کنارے جھگیاں کھمبیوں کی طرح پھر سے اُگ آئی تھیں اور کڑوے دھوئیں نے انہیں اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ جب وہ بیساکھی کھٹ کھٹاتا ہوا جھگیوں کے درمیان پہنچا تو ننگ دھڑنگ کیچڑ مٹی میں لتھڑے بچوں کی ایک ٹولی دھوئیں کی اوٹ سے نکل کر اس کے پیچھے لگ گئی اور لنگڑا شیر کہہ کر اسے چھیڑنے لگی، حالانکہ وہ تو ہر وقت گیدڑ کی طرح خوفزدہ رہتا تھا۔ کچھ دیر بعد جھگی نشینوں نے اپنے ساتھی کو پہچان لیا اور بچوں کی چھیڑ چھاڑ چھٹ گئی جب مطلع صاف ہوا تو ہاشو کی کہانی بن کہے اُن تک پہنچ گئی، یوں بھی جھگیوں میں بسنے والوں کو اپنی اپنی کہانیاں ایک دوسرے کو سنانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو چال دیکھ کر دل کا حال جان لیتے ہیں — چند دنوں بعد ہاشو نے گندے نالے کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر اپنے لیے سرکنڈوں کی ایک جھگی ڈال لی۔ وہ بہت کم کھاتا اور بہت کم بات چیت کرتا۔ لگتا جیسے اُدھیڑ عمر سے بڑھاپے تک کا سفر سالوں کے بجائے مہینوں میں طے کر چکا ہو۔ اس کے سر کے بال کھچڑی ہوگئے تھے، آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو ٹپکتے محسوس ہوتے، جسم پر میل اور خاک جمی رہتی، بدن کے کپڑے پیوندوں سے اٹ گئے تھے۔ وہ سٹھیا گیا تھا، خواہ مخواہ آدھی رات کے قریب زور زور سے رونے لگتا۔ علی الصبح بے طرح قہقہے لگانے لگتا۔ جھگیوں والے اب اسے سائیں

کہہ کر پکارنے لگے تھے اور اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر انہیں یقین ہو چلا تھا کہ سائیں بابا کے قبضے میں جنّات ہیں اور وہ کوئی جنتر منتر پڑھ کر انہیں حاضر کرتا رہتا ہے۔ خاص طور پر اُس بستی کی ضعیف الاعتقاد عورتیں سائیں بابا کو پہنچا ہوا بزرگ ماننے لگی تھیں اور وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی عورت اپنے بچے کی بیماری، شوہر کی بے توجہی اور ساس کی سخت گیری کے تدارک کے لیے دم درود کرانے سائیں بابا کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی۔ شروع شروع میں تو اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، پھر شاید وہ حقیقت کو بھانپ گیا اور تبھی سے وہ منہ ہی منہ میں اُوٹ پٹانگ کچھ اُول جلول پڑھ کر بچے اور بچے کی ماں پر پھونک دیا کرتا اور بدلے میں مٹھی بھر چنے، کچے چاول یا گُڑ کی بھیلی اس کی دری پر ڈھیر ہو جاتی۔ اس قسم کی مصروفیت عموماً شام کے وقت ہوتی تھی۔ باقی سارا دن وہ سر جھکائے اپنے وجود کے مرقد پر جھکا رہتا تھا۔

اس شام اتفاق سے بستی کی کوئی بھی عورت دم درود کرانے اُس کے پاس نہیں آئی تھی، سو سائیں بابا کی بوجھل آنکھیں گندے نالے کی دلدل نما غلاظت پر بلا وجہ تیرنے لگیں اور تب اُسے گندے نالے کی بہتی ہوئی غلاظت میں ایک لال سینڈل تیرتی ہوئی دکھائی دی اور اُسے دیکھتے ہی سائیں بابا کا جسم تھر تھر کانپنے لگا، سانسیں زبردست بھونچال میں کھلتے بند ہوتے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرح اس کے سینے میں بُری طرح کھڑکھڑانے لگیں۔ جب بہتی ہوئی سُرخ سینڈل اس کی جھگی کے عین سامنے سے سرکتی ہوئی کئی قدم آگے کو بڑھ گئی تو سائیں بابا کو جیسے کرنٹ سا لگ گیا اور اس کے حلق سے رُک جا کا کی، رک، رک جا کا تا کی۔۔۔ کے دلدوز الفاظ اٹک اٹک کر، ٹوٹ ٹوٹ کر، بکھر بکھر کر نکلے اور دوسرے ہی پل وہ بیساکھی کو وہیں چھوڑ، دونوں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا لال سینڈل کے تعاقب میں دیوانہ وار بڑھا اور گندے نالے کے اُوپر پہنچ کر یکا یکی اس پر یوں جھکا جیسے اُس میں کود پڑے گا۔ شہر کی طرف جانے والی شاہراہ پر سے کوئی راہ گیر اُس وقت اُسے اس حالت میں دیکھ لیتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کوئی شخص سارے زمانے کی غلاظت، تعفن اور آلودگی کو غٹا غٹ پی جانے کی کوشش کر رہا ہے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، گندے نالے نے بالآخر سائیں بابا کو گریبان سے پکڑ کر اپنے اندر کھینچ لیا۔

اگلے دن صبح سویرے اس علاقے کی پولیس چوکی کا تھانے دار اور اونگھتے ہوئے چار سپاہی اپنی اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے سائیں بابا کے غلاظت سے لت پت جسم کو اپنے چمکیلے بوٹوں کی نوکوں سے الٹ پلٹ رہے تھے گویا اس کی شناخت کر رہے ہوں، نازک ہیل والی لال سینڈل اس وقت بھی سائیں بابا کے دونوں ہاتھوں میں بُری طرح سے بھنچی اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی اور علاقے کے تھانے دار نے جھگیوں میں رہنے والوں پر گندی گندی گالیوں کی غلاظت بے تحاشا انڈیلنا شروع کر دی تھی۔ سارے کا سارا گندا نالہ اب اُس کے منہ سے بہنے لگا تھا اور بہتا ہی چلا جا رہا تھا۔

آکسیجن! آکسیجن

نگہت سیما

بیٹھے بیٹھے میرا سانس رُکنے لگتا ہے جیسے میرے چاروں اور کسی نے آکسیجن بند کر دی ہو یا جیسے کوئی اَن دیکھا ہاتھ میرے ارد گرد کی ہوا کو مجھ تک آنے سے روک دیتا ہو۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا آدمی نے اتنی ترقی کر لی ہے اتنا پاور فل ہو گیا ہے کہ اُس نے ہواؤں پر بھی اختیار حاصل کر لیا ہو اور جب چاہے جہاں چاہے کسی کے ارد گرد کی ہوا روک لے جیسے سینکڑوں برس پہلے فرات کا پانی روک لیا گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ کمرے میں حبس تھا اس لیے میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان اٹھا کر باہر آ گیا تھا۔ ساون کے مہینے میں کمروں میں کتنا حبس ہوتا ہے کتنی گھٹن بالکل ایسی ہی جیسے میرے اندر ہے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اور بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس میں امرود کے پتوں اور مٹی کی ملی جلی مہک تھی۔ میں برآمدے میں کرسی بچھائے بارش کے قطروں کو ایک تواتر سے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کہاں سے اپنی کہانی شروع کروں کیونکہ میرے معالج اور دوست ڈاکٹر شیرازی کئی دنوں سے مجھے مجبور کر رہے تھے کہ اپنی ذات اور ماضی کے حوالے سے جو کچھ میرے ذہن میں آتا ہے بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی ربط اور ترتیب کا لحاظ کیے لکھ ڈالوں۔ دراصل اُن کا خیال ہے کہ اس طرح شاید انہیں میرے مرض کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ قلم ہاتھ میں لیتے ہی جس شخص کا تصور میرے ذہن میں آیا تھا وہ میاں جی تھے۔ میاں جی کے تصور کے ساتھ ہی میرے اندر ایک خنک سی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور پھر مجھے یوں لگا تھا جیسے میاں جی میرے پاس سے گزرے ہوں اور پھر میرا سانس میرے سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ پہلے ہولے ہولے میں نے اپنے سینے کو مسلا پھر منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لیے لیکن کوئی چیز جیسے میری سانس کی نالی میں اٹک سی گئی تھی۔ میں منہ کھولے بے چینی سے اپنے سر کو ادھر اُدھر ہلاتا رہا۔ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر تھک کر نڈھال ہو کر میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔ اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر شاید میں چند لمحوں کے لیے مر گیا اور اسی موت یا غنودگی کی حالت میں میں نے دیکھا کہ لق و دق صحرا میں خشک ہونٹوں کے ساتھ چاروں اور بھاگ رہا ہوں۔ گرم ریت اڑ اڑ کر میری آنکھوں میں چبھی جا رہی ہے۔ میں دیوانہ وار بھاگ رہا ہوں اور پھر اس گرم ریت نے جو میرے حلق میں گھس گئی ہے میرا سانس بند کر دیا ہے اور میں نڈھال ہو کر گر پڑا ہوں۔ اور ریت کے گرم سمندر پر پڑے پڑے میرا جسم ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ شاید موت کی خنکی میرے اندر اتر رہی ہے پھر اچانک کوئی میرے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور میرے ہاتھوں میں حرارت سی دوڑ جاتی ہے۔ زندگی کی حرارت۔ میں بے چینی سے پہلو بدلتا ہوں اور کوئی جُھک کر میرے یخ ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہے۔ اور اس بوسے کی حدت میرے ماتھے سے ہوتی ہوئی میرے سارے وجود

میں اتر جاتا ہے اور میرا ٹھنڈا جسم ہولے ہولے گرم ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ ریت کے گرم صحرا میں کسی ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں والے نخلستان کی طرح زیتون بی بی کا وجود میرے اُوپر جُھکا ہوا ہے۔ سفید دوپٹے کو پیشانی تک لپیٹے مُسکراتی آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی مُسکراہٹ نے ان کے پورے چہرے کو روشن کر رکھا ہے۔

"بی بی جی"

میں انہیں بلاتا ہوں اور جتنی بار بلاتا ہوں اتنی بار وہ جُھک کر میری پیشانی کو چومتی ہیں اور پھر یکا یک میں ہوش کی دُنیا میں پلٹ آیا تھا۔ میری سانس بحال ہو گئی تھی اور میں برآمدے میں کُرسی کی پُشت سے سر ٹکائے نیم دراز تھا، اور میرے ہاتھ میں کھلا ہوا قلم تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اسی طرح جاری تھی۔ اور میں اپنی پیشانی پر زیتون بی بی کے بوسے کی حلاوت اور حدت کو محسوس کر رہا تھا اور یہ جو تھوڑی دیر پہلے میرا سانس رکنے لگا تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے مر گیا تھا۔ ایسی موت میں سینکڑوں بار مرا ہوں اور یہی میری بیماری ہے جو کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آتی۔

ایک طویل عرصہ تک میں دمے کا علاج کراتا رہا۔ کچھ عرصہ تک ہارٹ سپیشلسٹوں کا نشانہ بنا رہا۔ غرض میرا مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھ پر سایہ ہے اور مجھے کسی خوفناک بلا نے جکڑ رکھا ہے یا کسی جن نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے لیکن ڈاکٹر شیرازی کا خیال ہے کہ میں نفسیاتی مریض ہوں وہ میری PSYCHOANALYSIS کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی کے حوالے سے مجھے جو باتیں یاد آتی ہیں لکھ ڈالوں۔ ہر اہم اور غیر اہم بات۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پہلی بار میرا سانس بند ہوا تھا تو میری عمر تقریباً نو یا دس سال کی تھی، اس روز سکول میں ماسٹر سلیم اللہ نے میری لکھائی پر خوش ہو کر مجھے چونی دی تھی۔ یہ پہلی چونی تھی جو میرے ہاتھ میں آئی تھی۔ میاں جی بچوں کے ہاتھوں میں پیسے دینے کے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا اس طرح ایک تو بچے بگڑ جاتے ہیں دوسرے بازار سے فضول چیزیں خرید کر کھاتے ہیں جس سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ٹافیاں بسکٹ اور ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزیں اپنی الماری میں رکھی ہوئی تھیں اور صبح سکول جانے سے پہلے وہ اپنی الماری کا تالا کھول کر ہم سب بچوں کو ٹافیاں اور بسکٹ دیا کرتے تھے جبکہ مجھے کھانے پینے کی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ میرا دل چاہتا تھا کہ میرے پاس چونی یا اٹھنی ہو تو میں ٹوں ٹوں کرنے والا باجا لوں، خانہ بدوش عورتوں سے ربڑ کا سانپ اور ٹر ٹر کرنے والا مینڈک لوں گیس بھرے غبارے خریدوں یا پھر رنگ برنگ کنچے خریدوں۔ چنانچہ اُس دن میں نے چھٹی کے وقت چونی کے کنچے لیے تھے۔ پورے بارہ کنچے۔ رنگ برنگ ہرے، پیلے، نیلے، سرخ، اور انہیں خرید کر مجھے یُوں لگا تھا جیسے میں نے ہفت اقلیم کی سلطنت خرید لی ہو۔ ایک عجیب سی خوشی سے میں سارا دن سرشار رہا اور وقفے وقفے سے انہیں بستے سے نکال کر دیکھتا رہا۔ شام کو جب گلی میں بچوں کا شور سنائی دیا تو میں بھی یہ سارے کنچے جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں چمکتے ہوئے نئے نویلے کنچے دیکھ کر سجاد، جواد، ننھا، یہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ سجاد نے اپنی جیب سے کنچے نکالے تھے میلے میلے سے پھیکے پھیکے رنگوں والے اور مجھ سے سودا کرنے لگا تھا کہ میں اُس کے دو پرانے کنچوں کے بدلے ایک نیا کنچا دے دوں کہ میاں جی دُکان سے آ گئے۔ وہ ہر روز اسی وقت دُکان سے آتے تھے۔ لیکن میں کنچوں کی خوشی میں بھول ہی گیا تھا کہ میاں جی نے گلی میں کھیلنے سے منع کر رکھا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح بچے گالیاں سیکھتے ہیں اور آوارہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے گھر میں کیرم، لڈو، کرونچی اور ایسی ہی دوسری گیمز لا کر رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن میں شام کے وقت گلی میں بچوں کا شور سنتا تو بے چین ہو جاتا۔ میرا دل اُن کے ساتھ کھیلنے کو چاہتا تھا لیکن میاں جی سے ڈر لگتا تھا۔ اس وقت بھی میں سہم گیا تھا میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ماریں گے

لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا میرے ہاتھ سے کینچی لے کر زمین پر پھینک دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئے اور دروازہ بند کرتے ہوئے انہوں نے مجھے تنبیہہ کی کہ آئندہ وہ مجھے گلی میں کھیلتا ہوا نہ دیکھیں ورنہ ـــــ وہ بات نامکمل ہی چھوڑ کر کمرے میں چلے گئے تھے اور میں وہیں دروازے کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے مجھے کھلی فضا میں سے اٹھا کر زنداں میں بند کر دیا گیا ہو۔ میں اپنے کھلونوں کے نقصان پر رونا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں میرے آنسو کہاں چلے گئے تھے۔ شاید میاں جی کے خوف کی وجہ سے خشک ہو گئے تھے۔ مجھے میاں جی پر غصہ آ رہا تھا اور میں اپنے معصوم غصے کا اظہار کسی سے کرنا چاہتا تھا کسی کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے آج کینچے خریدے تھے۔ نیلے، پیلے، سرخ، ہرے جن کے رنگ بڑے پیارے تھے لیکن جنہیں میاں جی نے گلی میں پھینک دیا تھا۔ آج جب میری عمر تیس برس کے قریب ہے اور میں ایک بہت بڑی فرم میں سیلز منیجر ہوں۔ آج بھی مجھے کانچ کی یہ رنگ برنگی گولیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور میں نے بہت سی گولیاں شیشے کے ایک مرتبان میں ڈال کر میز پر رکھی ہوئی ہیں اور اکثر بے دھیانی میں انہیں دیکھتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی دفتر میں میز پر پڑا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ دیکھ کر مجھے وہ کینچے یاد آ جاتے ہیں جنہیں میاں جی نے زمین پر پھینک دیا تھا اور گیلی مٹی پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے کینچے میرے تصور میں آتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ایئرکنڈیشنڈ دفتر میں سے آکسیجن ختم ہو گئی ہو۔ اس روز میرا جی چاہا تھا کہ میں ماں جی سے میاں جی کی شکایت کروں۔ اور ماں جی مجھے گود میں بٹھا کر پیار کریں۔ جھوٹ موٹ ہی سہی مجھے دلاسہ دیں کہ وہ اس زیادتی پر میاں جی سے احتجاج کریں گی لیکن میں ایسا نہیں کر سکا تھا کہ ماں جی اس وقت مصروف تھیں (اور وہ ہمیشہ مصروف رہتی تھیں) اور وہ پانی کی بالٹی اٹھائے غسل خانے کی طرف جا رہی تھیں۔ میاں جی کا معمول تھا کہ وہ دکان سے آتے ہی پہلے نہاتے پھر اپنے کمرے میں مغرب کی نماز پڑھتے اور پھر وہیں نماز کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے سرِشام ہی رات کا کھانا کھا لیتے تھے۔

میں وہیں کھڑا ماں جی کو دیکھتا رہا جو پانی رکھ کر کپڑے نکالنے چلی گئی تھیں۔ یقیناً میری بات سننے کے لیے اُن کے پاس وقت نہ تھا اور ان کے پاس بچوں کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنا سارا وقت میاں جی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جب میاں جی گھر پر نہ ہوتے تو ان کے کپڑے استری کرتیں۔ ان کے کرتوں کی مرمت کرتیں اور ان کے لیے طرح طرح کے حلوے بنا کر رکھتیں اور جب وہ گھر پر ہوتے تو ان کے گرد چکور کی طرح گھومتی رہتیں۔ میں ان سے مایوس ہو کر آپو کی طرف چل پڑا۔ آپو جو کبھی کبھی مجھے بادشاہوں اور پریوں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ اور مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اچھے تو مجھے سبھی لگتے تھے۔ ماں جی اور میاں جی، نسیم، وسیم، شفیق اور نصیر بھی۔ بس مجھے ان سب سے گلہ تھا کہ مجھ پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور چاہتا تھا کہ سب مجھے بہت سا وقت دیا کریں۔ مجھ سے باتیں کیا کریں۔

میرے ساتھ کھیلا کریں لیکن کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا سوائے آپو کے۔ جو گھر میں سب سے بڑی تھیں اور میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا انہیں ماں جی کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سر پر بڑا سا دوپٹہ لپیٹے وہ سارا وقت کسی مشین کی طرح کام کرتی رہتی تھیں۔ میاں جی لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ وہ اسے وقت اور پیسے کا ضیاع سمجھتے تھے اس لیے میٹرک کے بعد انہوں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور اب فارغ وقت میں تکیوں اور غلافوں پر ریشمی دھاگوں سے پھول کاڑھا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی بڑے کمرے میں دری پر بیٹھی کسی چادر پر پھول کاڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ اس گھر میں صرف آپو تھیں جو کبھی کبھی مسکراتی تھیں ورنہ میاں جی اور ماں جی کو تو میں نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں دونوں کے چہرے یکساں طور پر بے تاثر اور سپاٹ تھے جیسے کسی اناڑی سنگ تراش نے انہیں تراشا ہو اور پھر انہیں کوئی تاثر دینے میں ناکام رہا ہو۔ آپو میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھیں اور میرا دل چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں اور

پھر آپو مجھے گلے سے لگالیں۔ میرے رونے کا سبب پوچھیں اور میں انہیں بتاؤں کہ میرے کپڑے ----- لیکن آپو نے فوراً مجھ سے نگاہیں ہٹالی تھیں اور چادر اور دھلنے کی کچھیاں ٹوکری میں رکھ کر کھڑی ہوگئی تھیں اور کیل پر لٹکا ہوا میرا بستہ اتار کر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر لے گئی تھیں اور برآمدے میں چوکی پر بٹھا کر حساب کی کاپی نکال کر میرے سامنے رکھ دی تھی اور خود ماں جی کا ہاتھ بٹانے کچن میں چلی گئی تھیں اور میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ آپو اس وقت مجھے اسکول کا کام کرواتی تھیں۔ میں چپ چاپ چوکی پر بیٹھا تھا کتابیں میرے سامنے پڑی تھیں اور ان کتابوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب میں جانتا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ جانتا تھا جو اسکول میں استاد مجھے رٹاتے تھے۔ میرے استادوں کا خیال تھا کہ میں جینئس ہوں۔ وہیں چوکی پر بیٹھے بیٹھے میں نے نسیم، وسیم اور شفیق کے متعلق سوچا تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ نسیم بھائی اپنی میڈیکل کی کتابوں میں الجھے ہوئے ہوں گے۔ میڈیکل کی کتابوں میں ان کا دل نہیں لگتا تھا اس لیے انہیں بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ وسیم اور شفیق بھی پڑھ رہے ہوں گے۔ نصیر اگرچہ مجھ سے صرف تین سال بڑا تھا لیکن اُس کا بھی سارا دھیان پڑھائی کی طرف ہوگا تاکہ میاں جی اُسے کام چور اور نالائق نہ سمجھیں۔

ہم پانچ بھائی تھے اور ایک آپو تھیں۔ نسیم ڈاکٹری پڑھ رہے تھے۔ وسیم، میاں جی کی خواہش کے مطابق وکالت کر رہے تھے۔ شفیق ان دنوں میٹرک میں تھا اور سکول سے آکر دکان پر میاں جی کا حساب کتاب میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ کیونکہ میاں جی لکھنا نہیں جانتے تھے بس صرف زبانی حساب کتاب کرلیا کرتے تھے۔ رجسٹروں وغیرہ میں لکھنے کا کام شفیق ہی کرتا تھا۔

برآمدے میں چوکی پر بیٹھے بیٹھے حساب کی کاپی سامنے رکھے میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں اپنے دکھ اور غصے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لیے میرے اندر بغاوت سی پیدا ہوگئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ میں چپکے سے باہر چلا جاؤں اور زمین پر پڑے ہوئے کنچے اٹھالاؤں اور اگر کسی نے اٹھالیے ہوں تو اس سے چھین لوں۔ بھلا میاں جی کو کیسے پتا چلے گا اور اگر پتا چل بھی گیا تو کیا ہوگا یہی نا کہ میاں جی مجھے ایک دو تھپڑ ماریں گے جیسے ایک بار نصیر کو مارے تھے جب وہ گلی میں سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی تاش سے کھیل رہا تھا۔ تو تھپڑ مار کے خیال سے میرے رخسار جل اٹھے اور میں دبے قدموں صحن میں آگیا لیکن دروازے پر تالا پڑا دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا تھا دراصل — میاں جی کا معمول تھا کہ مغرب کے بعد گیٹ پر تالا لگا دیتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ مغرب کے بعد کوئی گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ میں نے گیٹ پر دونوں ہاتھ رکھ کر باریک سی جھری سے باہر دیکھنے کی کوشش کی تاکہ دیکھ سکوں کہ گلی کی گیلی مٹی پر میرے کنچے اب بھی پڑے ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہ جھری ایسی نہیں تھی جس سے باہر کا منظر دیکھ سکتا۔ کرب کا ایک شدید احساس لیے میں مڑا تو مجھے لگا جیسے میں زنداں میں ہوں اور اس میں موجود آکسیجن ختم ہو چکی ہے۔ میرا سانس رکنے لگا تھا میں نے لمبے لمبے سانس لیے لیکن کوئی چیز میری سانس کی نالی بند کرنے لگی۔ میں گلے کو بری طرح مسلتا ہوا زور سے چیخا تھا اور برآمدے میں دکان کے حساب کتاب کے رجسٹر اٹھائے میاں جی کے کمرے کی طرف جاتا ہوا شفیق میری طرف دوڑ پڑا تھا۔

"کیا ہوا منوں؟"

اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

میں چیخ چیخ کر رونے لگا اور مچلنے لگا کیونکہ سانس رکنے کی اذیت ناقابلِ برداشت تھی پھر شاید نسیم نے یا وسیم نے مجھے گود میں اٹھالیا تھا اور مجھے کمرے میں لے آئے تھے۔ سب میرے اردگرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ نسیم کے ہاتھ میری نبض پر تھے آپو بار بار مجھے بلا

رہی تھیں، اور میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ پھر میاں جی کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔ سپاٹ بے لوچ آواز۔

"کیا ہوا اسے؟"

"پتا نہیں میاں جی۔"

شاید شفیق یا نسیم نے بتایا تھا۔

پھر میاں جی میرے قریب آکر مجھے دیکھنے لگے تھے اور مجھے لگا تھا جیسے اُن کے آتے ہی کمرے میں خنکی کی لہر دوڑ آئی ہو۔ میں کانپنے

"سردی لگ رہی ہے منوں۔"

آپو نے پوچھا۔

میں چپ رہا لیکن میرا وجود جیسے کسی نے فریزر میں رکھ دیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو آپو کی آ
میرے کانوں میں آئی۔ سہمی سہمی سی جھجکتی ہوئی۔

"میاں جی زیتون بی بی کو بلا لاؤں۔ منوں شاید ڈر گیا ہے۔"

"زیتون بی بی کی اور ہمارے گھر کی دیوار سانجھی تھی۔ بی بی جی بچیوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتی تھیں۔ اُن کے میاں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ پھر شاید چند لمحوں کے لیے میں مر گیا تھا۔ دوبارہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرا سر زیتون بی بی کی گود میں تھا اور اُن کے ہونٹ میرے ماتھے کو چھو رہے تھے اور میرے وجود میں جیسے کوئی حرارت سی اتر رہی تھی۔ میرا سانس بھی اب ٹھیک ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر یوں بیٹھ گیا جیسے ابھی چند لمحے پہلے مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔ زیتون بی بی کے نورانی چہرے پر روشنی سی بکھری ہوئی تھی اور وہ من ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

"ڈر گیا تھا شاید۔"

وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں اور جاتے جاتے جھک کر پھر میرے رخساروں کو چوما۔ مجھے اس سے پہلے کبھی کسی نے پیار نہیں کیا تھا میاں جی نے نہ ماں جی نے۔ اس لیے میں رخساروں پر ہاتھ دھرے عجیب سی کیفیت میں وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اور سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ میری اس بیماری میں میاں جی کا ہاتھ ہے۔ خواہ یہ جسمانی بیماری ہے یا نفسیاتی۔ میاں جی کی شخصیت میں دوسروں پر اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت تھی بظاہر ان کی شخصیت میں ایک خاص وقار اور رعب تھا وہ اونچے لمبے قد کے اور گورے چٹے تھے ستواں ناک اور بے حد خوبصورت آنکھیں، اجنبی پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت کے سحر اور حُسن میں جکڑے جاتے تھے۔ میں نے اکثر لوگوں کو ان کی تعریف کرتے سنا ہے لیکن گھر کے اندر وہ ایک جابر حاکم تھے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی نسیم، وسیم اور آپو سب کو ان سے ڈرتے دیکھا تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی خاموشی چھا جاتی تھی جس میں خوف گھلا ہوا ہوتا تھا۔ میں نے انہیں بچوں سے باتیں کرتے بہت کم دیکھا تھا۔ خود مجھ سے اُنہوں نے زندگی بھر میں کوئی چھ سات بار باتیں کی ہوں گی، وہ بہت کم بولتے تھے لیکن اس کے باوجود گھر کے اندر ایک پتا بھی اُن کی مرضی کے خلاف نہیں ہل سکتا تھا۔ نسیم، وسیم، شفیق اور آپو کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنی کسی خواہش کا اظہار میاں جی کے سامنے کرتے اگر کسی کے دل میں کوئی خواہش پیدا بھی ہوتی ہو گی تو وہ اسے دل ہی دل میں مار دیتا ہو گا۔

میاں جی سب کے بارے میں سارے فیصلے خود کرتے تھے۔ کس کو کس چیز کی ضرورت ہے ہر بات کا انہیں علم ہوتا تھا۔ کپڑے کتابیں اور ضروریات کی چیزیں گویا دل میں پیدا ہونے والی آرزوئیں اور تمنائیں بھی ان کی پابند تھیں۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے پورے گھر کو ہپناٹائز کر رکھا ہو۔ پورے گھر کے لوگ کٹھ پتلیاں ہوں اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھ میاں جی کے ہوں اور ان کی مرضی سے کٹھ پتلیاں حرکت کر رہی ہوں۔ بھے اوروں کا تو علم نہیں لیکن باوجود اس کے کہ میں بھی میاں جی کی مرضی سے حرکت کرتا تھا میرا دل مکمل طور پر آزاد تھا اور اس میں طرح طرح کی آرزوئیں پیدا ہوتی رہتیں، ایسی آرزوئیں اور تمنائیں جو میاں جی کے نزدیک قطعی طور پر لغو اور فضول تھیں۔ مثلاً کینچے خریدنا اور گرمیوں کی راتوں میں گلی میں بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، گیڑا گیڑی اور چھو گرم کھیلوں۔ یہ آرزوئیں اور تمنائیں میرے اندر پنپتی رہتی تھیں اور جب میاں جی ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے تو میرے اندر عجیب طرح کی ٹوٹ پھوٹ ہونے لگتی تھی۔ زندگی کی ہر شے کے بارے میں میاں جی کے اپنے نظریات تھے اور وہ اپنے نظریات پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ ان کے نظریات اور اصولوں میں کوئی لچک نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ وہی کرتے تھے جو ان کا دل اور ان کا ذہن کہتا تھا کسی اور کی بات کوئی دلیل، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ صحیح ہوتا ہے اور اس میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی سب کی بہتری اسی میں ہوتی ہے۔ پیسے کا حساب کتاب ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور بہت سنبھال کر خرچ کرتے تھے۔ یوں گھر میں خوشحالی تھی ہم اچھا کھاتے اچھا پہنتے تھے لیکن میاں جی نے کبھی کسی کے ہاتھ میں پیسہ نہیں دیا تھا، بلکہ سب کی ضرورتیں اپنے ہاتھ سے پوری کرتے تھے۔ میاں جی کنجوس نہیں تھے کیونکہ گھر میں ڈھیروں فروٹ آتا تھا۔ میاں جی خود اچھے کھانے کے شوقین تھے سو گھر میں اچھا پکتا تھا اور مہمان نوازی میں بھی نہیں تھے۔ میری خواہش ہوتی کہ میں اپنی مرضی سے بازار سے کالا گولا خرید کر چوسوں یا پھر آئس کریم لے کر کھاؤں جس میں سوائے رنگ، میدے اور سکرین کے کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ گھر میں اکثر میاں جی پولکا کے فیملی پیک لاتے تھے۔ لیکن یہ میری خواہشیں تھیں جو میرے اندر چپکے چپکے پیدا ہوتیں، جڑ پکڑتیں اور مر جاتیں۔

میاں جی زندگی میں ہر کام حساب کتاب اور منصوبے سے کرنے کے قائل تھے حتیٰ کہ انہوں نے محبت بھی حساب کتاب سے ہی کی۔ کبھی پتا نہ چل سکا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی اپنی اولاد سے بھی محبت کی یا نہیں اور اگر کی تو کس سے کم اور کس سے زیادہ۔ معلوم نہیں ان کے سینے میں کیسا دل تھا۔ گوشت پوست کے بجائے پتھر یا لوہے کا۔ میں نے انہیں کبھی پگھلتے گداز ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے اس کا منصوبہ بناتے تھے۔ انہوں نے انسانوں کو بھی ایک پروجیکٹ سے زیادہ اہمیت نہ دی مثلاً انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وسیم کو ڈاکٹر بنائیں گے وسیم کو وکیل، نصیر کو انجینئر وغیرہ۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی سے کوئی رائے نہیں مانگی تھی اور نہ ہی کسی کی کوئی مرضی اور خواہش پوچھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں سب کی بہتری اور بھلے کے لیے کرتے ہیں۔ چونکہ وہ بڑے ہیں انہوں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ غرض وہ اپنی زندگی کو ایک جامع منصوبے کے تحت گزار رہے تھے اور شادی بھی غالباً انہوں نے منصوبے کے تحت ہی کی تھی کیونکہ ماں جی کا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ قبول صورت تھیں بلکہ قبول صورت سے بھی دو درجے کم ہی تھیں۔ ان کی عمر کا چوکور چہرہ سانولی رنگت، مچی مچی آنکھیں قدرے موٹے ہونٹ اور چپٹی سی ناک جبکہ میاں جی خود بہت خوبصورت تھے۔ شاید میاں جی نے سوچا ہوگا کہ اپنے سے کم تر شکل والی عورت سے شادی کریں گے تو وہ ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی اور ان کے آگے سر جھکائے رکھے گی اور یہ صحیح تھا۔ میں نے ماں جی کو ہمیشہ ان کی ہر جائز و ناجائز بات کے سامنے سر جھکائے دیکھا۔ بچپن سے ہی میں انہیں میاں جی کے لیے گاجر، کدو اور پیٹھے کے حلوے بناتے اور مربے بھونتے دیکھتا آرہا تھا۔ یہ سارے حلوے الماریوں میں بند ہو جاتے

اور میاں جی کے آتے ہی تھالیوں میں سج کر ان کے کمرے میں پہنچ جاتے اور ان کی بارگاہ سے شرفِ نیاز پانے کے بعد بچوں میں تقسیم کیے جاتے۔ میاں جی ہمیشہ کھانا اپنے کمرے میں کھاتے تھے۔

ماں جی شاید میاں جی کی اتنی زیادہ مصروف تھیں کہ ان کی شکرگزاری سے انہیں وقت ہی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنے بچوں سے محبت کر سکیں۔ ہر وقت میاں جی کے گرد ہی چکر لگاتی رہتی تھیں۔ میاں جی اُن کی سوچوں تک پر حاوی تھے اور اس حد تک ان پر اثر انداز تھے کہ ہم سب میں سے کسی ایک میں بھی ماں جی کی شباہت نہیں تھی بلکہ ہم سب میاں جی کی طرح ہو گئے تھے۔ گورے چٹے، اونچے لمبے قد، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک۔

ماں جی دوسری ماؤں سے بالکل مختلف تھیں۔ انہوں نے کبھی ہمیں گود میں نہیں بٹھایا تھا۔ کبھی ہمیں پیار نہیں کیا تھا اور کبھی ہم سے کوئی فضول بات نہیں کی تھی۔ ان کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔ سپاٹ اور خالی خالی آنکھیں جیسے وہ کوئی معمول تھیں اور ان کی روح میاں جی کی قید تھی۔ وہ ایک معمول کی طرح ہی ادھر اُدھر گھومتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں اکثر سوچتا تھا ان کے اور میاں جی کے چہرے یکساں طور پر سپاٹ تھے جیسے مندروں میں رکھے ہوئے دیوی دیوتاؤں کے بت لیکن نہیں اُن پر پھر کوئی تاثر منجمد ہوتا ہوگا جو بنانے والے نے انہیں دینا چاہا ہو۔ جیسے کالی دیوی پر ظلم کا تاثر، رام کی دیوی کے چہرے پر رحم کا احساس لیکن میاں تو یوں لگتا تھا جیسے بنانے والا اُنہیں کوئی تاثر دینے میں ناکام رہا ہو۔

ماں جی ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ جب میاں جی گھر پر ہوتے تھے تو وہ سر جھکائے کچن سے ان کے کمرے اور ان کے کمرے سے کچن تک کے چکر لگایا کرتی تھیں اور جب وہ گھر پر نہیں ہوتے تھے تب بھی ماں جی کا سارا وجود ان کی ذات کے لیے گروی رکھا ہوتا۔ ان کے ادھڑے ہوئے کپڑوں کو درست کرتیں، ٹوٹے ہوئے بٹن لگاتیں اور ان کے لیے پستے بادام اور کھوپرا ڈال ڈال کر حلوے بناتیں۔ انہوں نے بھی میاں جی کی طرح کبھی کسی سے بلا ضرورت بات نہیں کی تھی۔ بلکہ شاید انہوں نے تو اپنے بچوں کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اُن کے مسائل، ان کی خوشیوں اور اُن کے غموں کے بارے میں۔ حتیٰ کہ آپو کے بارے میں بھی نہیں جبکہ ماؤں کو بیٹیوں کی شادی کے بارے میں بڑی فکر ہوتی ہے لیکن ماں جی کو میں نے کبھی آپو کی شادی کے بارے میں فکرمند ہوتے نہیں دیکھا۔ اس مسئلے کو بھی شاید انہوں نے میاں جی پر چھوڑ رکھا تھا اور میاں جی نے آپو کے بارے میں کیا سوچ رکھا تھا یہ اُنہیں ہی معلوم تھا۔ یقیناً اُن کے ذہن میں کوئی منافع بخش منصوبہ ہوگا کیونکہ اُنہوں نے گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کیا تھا۔

آپو کے مزاج میں دھیما پن تھا۔ ہولے سے آہستہ سے بات کرتیں، دھیمے سے مسکراتیں اور گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر بڑے کمرے میں دری پر بیٹھ کر چادروں اور تکیوں پر پھول کاڑھا کرتیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹ اچھی لگتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تھیں تو اُن کا پورا چہرہ روشن سا ہو جاتا تھا۔ یوں وہ بڑی پیاری بڑی دلکش تھیں۔ گلابی رنگت، چھوٹی سی ناک، ذرا سے خم کھائے ہوئے ہونٹ، نازک سراپا، پُرکشش آنکھیں۔ وہ ہمیشہ مطمئن نظر آتی تھیں۔ لیکن جب کبھی پڑھنے کے وقت میں بے دلی کا اظہار کرتا تو کہتیں پتا ہے منوں میں تمہاری جگہ ہوتی تو خوب دل لگا کر پڑھتی۔

"لیکن اب آپ کیوں نہیں پڑھتیں؟"

"میاں جی نے منع جو کر دیا ہے اور جو وہ منع نہ کرتے نا تو میں بہت سارا پڑھتی۔"

"کتنا"

میں اشتیاق سے پوچھتا۔

"اتنا ڈھیر سارا"

وہ ہاتھ پھیلا لیتیں اور ان کی آنکھیں پانی سے بھرے بادلوں کی طرح لگنے لگتیں اور میں حیرت سے انہیں دیکھ کر سوچتا یہ ایک دم سے اُن کی آنکھوں میں پانی کہاں سے آگیا۔ لیکن وہ فوراً ہی نگاہیں جھکا کر مجھے قالبوں کے سیٹ سمجھانے لگتیں۔ مجھے آپو اس لیے بھی اچھی لگتی تھیں کہ وہ کبھی کبھی رات کو مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ شہزادوں اور پریوں والی کہانیاں۔ گرمیوں میں جب کبھی وہ چھت پر سب کے لیے چارپائیاں بچھاتی تھیں تو میں اور نصیر نیچے سے بستر اٹھا اٹھا کر لاتے اور وہ بچھاتی جاتیں۔ بستر بچھانے کے بعد میں چھت کی منڈیر پر سے نیچے گلی میں بچوں کو دیکھنے لگتا جو آنکھ مچولی اور پٹھو گرم کھیل رہے ہوتے اور ایسے میں کبھی کبھی اپنی چارپائی پر لیٹ کر خاموشی سے چاند کو تکتے ہوئے وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتی تھیں اور کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور یوں وقتی طور پر کہانی کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر گلی میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے کی خواہش کی شدت کم ہو جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپو گھر میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب تھیں کیونکہ جس روز اُن کی منگنی ہوئی تھی اس روز وہ مجھے گلے لگا کر خوب روئی تھیں۔ اس وقت تو مجھے پتا نہیں چلا تھا کہ وہ اتنا کیوں رو رہی ہیں لیکن بعد میں جب میں نے عطا خان کو دیکھا تھا تو میں جان گیا تھا کہ وہ کیوں روئی ہیں۔

عطا خان کی یہ تیسری شادی تھی اس سے قبل وہ دو بیویوں کو قبرستان پہنچا چکا تھا اور دونوں بیویوں سے اس کے پانچ بچے تھے معلوم نہیں میاں جی آپو کی شادی اس سے کیوں کر رہے تھے۔ میاں جی کی مصلحتیں میاں جی خود ہی جانتے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ بوڑھا شوہر بیوی کو بہت آرام سے رکھے گا یا پھر اس لیے کہ اس نے کسی قسم کے جہیز کا کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ بڑھی ہوئی توند اور چمکتی ہوئی چندیا کے ساتھ وہ مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔ سر پر گنے چنے چند بالوں پر خضاب لگانے کی کوشش میں اس نے سر کی جلد ہی رنگ لی تھی۔ وہ کوئی عجیب و غریب مخلوق لگ رہا تھا۔ اس روز مجھے مغرور شہزادی والی وہ کہانی بہت یاد آئی تھی جس میں بادشاہ شہزادی کو سزا دینے کے لیے لولے لنگڑے اندھے فقیر سے اس کا بیاہ کر دیتا ہے۔ لیکن آپو نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا اور وہ مغرور بھی نہیں تھیں پھر میاں جی نے انہیں ایسی سزا کیوں دی تھی کیا پتا لنگڑے اندھے فقیر کی طرح عطا خان بھی ایک دن خوبصورت شہزادہ بن جائے۔ میں نے سوچا تھا اور جب یہی بات میں نے آپو سے کہی تھی تو صندوق میں جہیز کے کپڑے رکھتے ہوئے آپو کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور آنکھیں بادل بن گئی تھیں اور پھر یکایک وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اتنا روئی تھیں کہ ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور انہیں یوں روتا دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا تھا اور پھر جیسے میرے ارد گرد سے آکسیجن ختم ہو گئی تھی۔ اور آپو دوڑ کر زیتون بی بی کو بلا لائی تھیں۔

آپو کے دل کی بات کسی نے نہیں جانی۔ کسی نے ان کے دل کا خیال نہیں کیا، ماں جی نے بھی نہیں حالانکہ وہ ماں تھیں لیکن انہوں نے بغیر کسی احتجاج کے میاں جی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا البتہ نسیم کو میں نے ان دنوں بہت بے چین دیکھا تھا۔ شاید وہ میاں جی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے تو اضطراب کے عالم میں بار بار میاں جی کے کمرے تک جاتے، بے چینی سے ہونٹ کاٹتے، انگلیاں مروڑتے اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ جاتے۔ وہ میاں جی سے بات نہ کر سکے اور آپو ڈولی میں بیٹھ کر عطا خان کے گھر اتر گئیں۔

دراصل نسیم تھوڑے سے بزدل تھے۔ وہ آپو سے چھوٹے تھے اور میاں جی سے بہت ڈرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں میاں جی سے

ہمیں اونچا بولتے یا ہنس ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میاں جی سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن اُن کی زیادتی کو محسوس کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ میاں جی کے لائے ہوئے کپڑے انہیں کبھی پسند نہیں آئے تھے۔ مگر وہ یہ بات میاں جی سے کہہ نہیں سکتے تھے اس لیے خاموشی سے پہن لیتے تھے۔ اسی طرح اُن کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی ادب میں ایم اے کریں اور یونیورسٹی میں پڑھائیں لیکن میاں جی انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے سو وہ ڈاکٹر بن گئے تھے لیکن چونکہ انہیں ادب سے بہت لگاؤ تھا اس لیے جانے کہاں کہاں سے لا لا کر کتابیں پڑھا کرتے تھے اور ان کے کمرے میں بہت سی کتابیں تھیں۔ پھر ایک دن اُن کے دل میں جانے کیا آئی کہ انہوں نے یہ ساری کتابیں صحن میں رکھ کر آگ لگا دی اور جب ان کا دھواں میرے حلق میں گھسنے لگا تو میری سانس اکھڑنے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد کی ہواؤں کو کسی نے روک لیا ہو اور جب کافی دیر بعد میری سانس بحال ہوئی تھی تو میں نے پہلی بار وسیم کو نسیم کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُداس کھڑے دیکھا تھا۔ شاید اسے نسیم کی کتابیں جلنے کا دکھ تھا۔ حالانکہ وسیم گھر میں وہ واحد شخص تھا جو ہمیشہ مطمئن رہتا تھا اور جس کے دم سے گھر میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اگر وسیم نہ ہوتا تو یہ گھر مُردوں کی بستی ہوتا۔ وہ موڈ میں ہوتا تو میاں جی کی غیر موجودگی میں خوب اونچی آواز میں گانے لگتا صحن میں میری تختی کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کی کوشش کرتا اور لطیفے سُنا سُنا کر خوب اونچے اونچے قہقہے لگاتا۔ وہ میاں جی کی بہت عزت کرتا تھا اور اکثر نسیم سے کہتا تھا میاں جی مثالی انسان ہیں اور ان کی سختیاں اگرچہ بُری لگتی ہیں لیکن جانِ برادر اگر ماں باپ سختی نہ کریں تو اولاد بگڑ جائے اور آج ہم اگر کسی مقام پہ ہیں تو میاں جی کے ہی طفیل۔ اُسے میاں جی کی کسی بات سے کبھی اختلاف نہیں ہوتا تھا میاں جی اُسے وکیل بنانا چاہتے تھے اور چونکہ خود اُس کے دل میں کچھ اور بننے کی خواہش نہیں تھی اس لیے وہ وکیل بن گیا۔ میاں جی بہت خوش تھے کیونکہ اب جائیداد کے مقدموں کے سلسلے میں انہیں وکیلوں کے پاس نہیں بھاگنا پڑے گا۔

پھر جانے کب اور کیسے وسیم نے زیتون بی بی کی بیٹی زہرہ کو پسند کر لیا۔ میں نے ایک دو بار اسکول سے آتے ہوئے وسیم کے ساتھ زہرہ کو دیکھا تھا اور جب میں زیتون بی بی کے گھر جاتا تو وہ ضرور بہانے بہانے سے مجھ سے وسیم کے متعلق پوچھتی، دراصل میں نے بڑی جلدی جلدی شعور کی منزلیں طے کی تھیں اور باشعور ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرا گھر ایک بہت بڑا کولڈ اسٹوریج ہے اور اس میں رہنے والے سب لوگ موم کے مجسمے ہیں اور میاں جی نے اسی لیے تمام روزن، کھڑکیاں اور دروازے بند کر رکھے ہیں کہ دھوپ کی کوئی کرن اندر نہ آنے پائے تاکہ یہ مجسمے کہیں پگھل نہ جائیں اسی لیے میں اسکول سے آتے ہی زیتون بی بی کے گھر چلا جاتا تھا۔ زیتون بی بی کے گھر مجھے ہمیشہ خوش کن سی حدت کا احساس ہوتا تھا۔ اور کئی بار میں نے اُن سے کہا تھا۔

"بی بی جی آپ کا گھر بہت گرم ہے"

وہ میری بات نہ سمجھ کر ہنس دیتی تھیں۔

میں ان کے گھر سے جو حرارت جذب کر کے جاتا اُسے اپنے گھر کی خنکی کم کرنے میں خرچ کر ڈالتا۔ سوچتا ہوں اگر وہ نہ ہوتیں تو میں بہت جلد ٹھٹھر کر مر جاتا۔ میں میاں جی کے آنے سے بہت پہلے ہی گھر آ جاتا تھا اور جوں ہی آتا وسیم مجھے جھپٹ لیتا اور کرید کرید کر زہرہ کی باتیں پوچھتا رہتا۔ میاں جی وسیم اور نسیم کی شادی اونچے گھرانوں میں کرنا چاہتے تھے۔ کئی اچھے گھرانوں سے رشتے آ رہے تھے لیکن وسیم نے ماں جی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زہرہ سے شادی کرے گا، لیکن میاں جی نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

وہ ہمیشہ مختصر اور حتمی بات کرتے تھے لیکن اُس روز بہت دیر تک غصے میں بولتے رہے اور پھر وسیم کو گھنٹوں اپنی عادت کے

خاں سمجھاتے رہے، آرام سے ملائمی سے لیکن وسیم کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ زہرہ سے شادی کرے گا۔ زندگی میں پہلی بار اُسے میاں جی کی بات سے اختلاف ہوا تھا اور وہ اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن میاں جی نے زندگی میں کبھی کسی کی بات نہیں مانی تھی تو اب کیسے مان لیتے اس لیے اُنہوں نے ماں جی سے کہہ دیا کہ اسے کہہ دو کہ اگر اسے زہرہ سے شادی کرنی ہے تو گھر چھوڑ دے۔ اور وسیم نے میاں جی کی بات مان لی۔

"ٹھیک ہے ماں جی میں گھر چھوڑ دوں گا۔"

اُس نے فیصلہ سُنا دیا تھا اور یہ میاں جی کی ہار تھی۔ سراسر کھلی ہار اور میاں جی نے کبھی ہار نہیں مانی تھی۔ وہ اپنے اس پروجیکٹ کو اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگلی صبح میں نے دیکھا کہ زیتون بی بی کے گھر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ راتوں رات ہی اپنا سامان لاد کر کہیں چلی گئی تھیں۔ یوں بھی یہ کرائے کا ہی مکان تھا۔ اُن کے جانے کے بعد وسیم بالکل چُپ ہو گیا تھا۔ سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا رہتا، برائے نام کھاتا۔ میرا دل چاہتا تھا ماں جی اس کی دلجوئی کریں اور اسے دُکھ کے اس بھنور سے باہر لے آئیں لیکن ماں جی نے اس کی کبھی دلجوئی نہیں کی۔ کبھی اس کا دُکھ نہیں پوچھا۔ انہیں میاں جی کی چاکری سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے کہیں سے وسیم کو پتا چلا کہ زیتون بی بی کو گھر چھوڑنے پر میاں جی نے مجبور کیا تھا۔ چنانچہ وہ میاں جی سے خفا ہو گیا اور گھر چھوڑ کر چلا گیا کہ اب وہ زیتون بی بی کو تلاش کرنے کے بعد ہی گھر آئے گا۔ وسیم جو کبھی کبھی قہقہے لگایا کرتا تھا اور آپو جو میٹھے میٹھے مُسکرایا کرتی تھیں دونوں ہی چلے گئے تھے اور گھر میں ایک وحشت اُتر آئی تھی اور مجھے لگتا جیسے ہم سب ایک مصنوعی آکسیجن ٹینٹ میں رہ رہے ہیں اور کسی دن اچانک آکسیجن ختم ہو جائے گی اور ہم سب دم گھٹنے سے مر جائیں گے۔

چھ یا سات ماہ بعد اچانک وسیم گھر لوٹ آیا۔ تھکا ماندہ بیمار اور بڈھا سا۔ میں دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ ماں جی برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی میاں جی کے کُرتوں پر بٹن لگا رہی تھیں۔ میں نے چیخ کر اُنہیں بتایا۔

"وسیم بھائی آگئے ہیں۔"

میرا خیال تھا ماں جی اُسے گلے لگا کر خوب روئیں گی اور اس سے ان سات ماہ کی روداد پوچھیں گی لیکن انہوں نے بڑی آہستگی سے صرف اتنا ہی پوچھا۔

"تم آگئے۔"

اور پھر سر جھکا کر میاں جی کے کُرتے پر بٹن ٹانکنے لگی تھیں۔ جیسے وسیم گھر سے خفا ہو کر ناراض ہو کر نہیں گیا تھا بلکہ یونہی چند دن کے لیے کہیں گھومنے گیا تھا۔ اُس روز مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ماں جی مکمل طور پر پتھر سے تراشی ہوئی ہیں اور اُن کے سینے میں کوئی گداز کوئی نرمی نہیں۔

وسیم کی واپسی پر میاں جی بہت خوش تھے اور اس رات بڑے کمرے میں جہاں وہ کبھی کبھار ہی آتے تھے کافی دیر تک بیٹھے رہے تھے اور نسیم اور وسیم سے باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وسیم وقت ضائع کیے بغیر اپنی پریکٹس شروع کر دے۔ انہوں نے اس کی غیر موجودگی میں اُس کے دفتر کے لیے نہ صرف جگہ لے لی تھی بلکہ دفتر کی عمارت کو اپنی مرضی سے ڈیکوریٹ بھی کروا دیا تھا۔ جیسے انہیں پورا یقین تھا کہ وسیم لوٹ آئے گا۔ وسیم نے اُن کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا بس سر جھکائے بیٹھا رہا تھا اور میاں جی کے جانے کے بعد میں نے وسیم کے چہرے پر اتنی نفرت دیکھی تھی کہ اندر سے کانپ گیا تھا۔

وسیم بہت کمزور اور بیمار لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دکھ اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہا ہو۔ ایک شام جب میں بڑے کمرے میں دری پر بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا اُس نے مجھے بلایا۔

"منوں ادھر آؤ میرے پاس۔"

وہ بہت مضطرب اور بے چین لگتا تھا اور بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال کی تھی اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"منوں تو گواہ رہنا۔ میں نے اسے بہت تلاشا، بہت ڈھونڈا اور اگر زندگی میں کبھی وہ تجھے ملی تو اُسے بتا دینا کہ میں بے وفا نہیں تھا۔"

وہ ذرا سی دیر کو چُپ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

"بھائی۔"

میں نے اُس کے ہاتھوں کو ہولے سے دبایا

میرا دل گداز ہو رہا تھا، پگھل رہا تھا اور میں اس کی دلجوئی کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اس کا سلیقہ نہیں تھا۔

"مجھے موت سے پہلے میاں جی نے شکست دے دی، انہوں نے باہر میرا ہر راستہ مسدود کر دیا تھا۔ باہر بھی اُن کے بڑے اختیارات ہیں، ہر دفتر میں جہاں میں جاتا میرے لیے نو ویکنسی کا بورڈ لگا ہوا ہوتا تھا، میاں جی ہر جگہ میرے آگے یا پیچھے رہے اور میرے لیے لوٹ آنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کیونکہ اب بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی جبکہ میں مرتے دم تک اُسے تلاش کرنا چاہتا تھا"

اُس کا سانس پھول گیا مگر وہ بولتا رہا۔

"میاں جی نے مجھے جیتے جی مار دیا ـــــ منوں تو گواہ رہنا میاں جی میرے قاتل ہیں۔"

میرے حلق میں بہت سارے آنسوؤں نے کڑواہٹ گھول دی تھی اور میں بہت دیر تک وسیم کا ہاتھ ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہا اور پھر خود ہی کافی دیر بعد وسیم مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"اچھا اب تم جا کر پڑھو۔"

میں اُٹھا تو اُس نے سرگوشی کی۔

"سُنو اس دن جب تم نے آخری بار زہرہ کو دیکھا تھا تو اُس نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ کیسی لگ رہی تھی۔"

بہت بار بتائی ہوئی بات جب میں نے دہرادی تو اُس کا چہرہ چمک اُٹھا اور آنکھوں میں روشنی سی اُتر آئی۔

اور پھر اُسی رات وسیم کسی وقت مرگیا۔ ماں جی اور میاں جی کو اس کی موت کا کس قدر دکھ ہوا تھا میں نہیں جانتا کیونکہ میں تو خود کئی دن بعد سنبھلا تھا۔ البتہ مہینوں بعد بھی میں نے نسیم، شفیق اور نصیر کو وسیم کو یاد کر کے بچوں کی طرح روتے دیکھا تھا اور خود بھی ان کے ساتھ مل کر رویا تھا لیکن ماں جی یا میاں جی کے چہروں سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا وہی ہمیشہ کا معمول تھا۔

وسیم کے مرنے کے بعد دن میں کئی کئی بار میرا سانس رُکنے لگا تھا۔ اس اذیت نے مجھے نچوڑ لیا تھا اور میں بے حد کمزور ہو گیا

میاں جی نے میرا بہت علاج کروایا۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ہر پیر فقیر سیانے کے پاس لے گئے اس لیے نہیں کہ انہیں
ے محبت تھی بلکہ اس لیے کہ میں اُن کی جائیداد تھا اور وہ اپنی جائیداد کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ اور جائیداد کو بچانے کے
ہ آدمی سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ میاں جی نے میرے علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہایا کہ وہ مجھے وسیم کی طرح ضائع نہیں کرنا
تے تھے۔ پہلے بھی اُن کا ایک انتہائی قیمتی پروجیکٹ اُن کی معمولی سی غلط حکمتِ عملی کی وجہ سے ضائع ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ مجھے
قیمت پر بچانا چاہتے تھے۔ اس دوران شفیق انجینئر بن گیا تھا۔ نسیم نے اپنے ذاتی کلینک میں کام شروع کر دیا تھا اور میاں جی نے
ی منگنی ایک اونچے خاندان میں کر دی تھی۔ نصیر نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم۔ اے کر لیا تھا اور عارضی طور پر ایک فرم میں منیجر کی حیثیت
ے کام کر رہا تھا۔ جبکہ میاں جی نے اپنی آبائی زمین پر جو بنجر ہو چکی تھی مل بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ مجھے کیا بنانا چاہتے تھے
لے میری بیماری نے اُن کے منصوبے میں کچھ گڑبڑ کر دی تھی۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے اتنی اذیت اُٹھانے کے باوجود میرا تعلیمی سلسلہ
ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ دراصل گھر سے باہر میں ٹھیک ہی رہتا تھا۔ سانس تو گھر میں آتے ہی رکتا تھا اور پھر ایک شام یوں ہی کمرے
میں بیٹھے بیٹھے مجھے وسیم بہت یاد آیا اور میں نے سوچا ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میرا سانس ہمیشہ کے لیے رک جائے گا اور میں بھی
وسیم کی طرح ___ لیکن میں اس مُردوں کی بستی میں نہیں مرنا چاہتا تھا ___ بلکہ کھلی فضاؤں میں مرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک دن میں نے چپکے
سے کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر چھوڑ دیا۔

اگرچہ گھر چھوڑنے کے بعد میری تکلیف میں بہت کمی آگئی ہے۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی میرا سانس رکنے لگتا ہے اور کوئی چیز حلق کی
گہرائی میں اٹک جاتی ہے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے نجات پالوں اور ڈاکٹر شیرازی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت
جلد میری بیماری پر قابو پالیں گے ___

منیر احمد کی اس خود نوشت کو میں نے کئی بار پڑھا۔ منیر احمد میرا مریض ہی نہیں میرا دوست بھی تھا۔ میں نے دورے کی حالت میں
کئی بار اس کا مشاہدہ کیا۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ جاتا تھا اور سانس یوں اٹک اٹک کر سینے سے نکلتی جیسے قریب المرگ شخص کی ہو۔
پھر کبھی تو لمحہ بھر کے لیے سانس یوں اکھڑ جاتی جیسے وہ مر گیا ہو۔ میں نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس کی یہ بیماری
نفسیاتی ہے اور اب اُس کی خود نوشت پڑھنے کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نفسیاتی مریض ہے اور میں اس کے مرض کا علاج
ڈھونڈ لوں گا۔ اس کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار ضرور اُس کے والدین سے رابطہ قائم کروں گا۔ اگرچہ میں ایک فزیشن ہوں لیکن میں
نفسیات پر بھی یقین رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ہماری اکثر بیماریاں جسمانی کے بجائے ذہنی اور نفسیاتی ہوتی ہیں۔ اور میں دواؤں کے ساتھ
نفسیاتی علاج بھی کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ میں میاں جی کے پاس جاؤں گا اور زیتون بی بی کا کھوج نکالوں گا۔ میرے
خیال میں منیر احمد کی صحیح مسیحا وہی ہو سکتی تھیں۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ میں منیر احمد کی خود نوشت کو میز کی دراز میں رکھ کر بھول سا گیا۔ منیر احمد
بھی پھر نہیں آیا تھا اور میں بے حد مصروف تھا۔ وہی روٹین لائف۔ صبح اُٹھنا اور ہاسپٹل جانا۔ ہاسپٹل سے کلینک اور پھر گھر اور پھر
شام چھ بجے سے رات دس بجے تک کلینک۔ عجیب مشینی سی زندگی تھی۔ ایک رات یوں ہی بستر پر لیٹے لیٹے مجھے منیر احمد کا خیال آگیا
اور میں نے سوچا صبح سب مصروفیات ملتوی کر کے میاں جی سے ملنے جاؤں گا تاکہ اُس زندان کے دروازے کھلوا سکوں جہاں منیر احمد

قید تھا لیکن جب صبح میری آنکھ کھلی تو میرا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ میری بیوی نے پوچھا کہ کیا بات ہے ہاسپٹل نہیں جانا۔

"ہاں طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

مَیں نے پھر آنکھیں موند لیں اور سوچا ذرا طبیعت سنبھل جائے تو پھر منیر احمد کو فون کر کے میاں جی کا ایڈریس لیتا ہوں لیکن طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی ہی جا رہی تھی، دل پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر شور سا مچا تھا بچے اسکول اور کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری بڑی بیٹی نے میرے بیڈ روم میں جھانکا اور اندر آ گئی۔ فل میک اپ کیے وہ کسی فنکشن میں نہیں بلکہ کالج جا رہی تھی۔ میری بیوی کے ڈریسنگ ٹیبل سے اُس نے کچھ نکالا۔ شاید نیل پالش تھی یا پھر لپ اسٹک، آئینے میں اپنے آپ کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور مجھ پر ایک نظر ڈالتی پرس جھلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میرا سانس میرے سینے میں اُلجھ رہا تھا۔

مَیں نے اپنے سینے کو مَلا۔

شاید گیس ٹربل ہے۔

مَیں نے سوچا اور ذرا سا سر اُٹھا کر میز پر سے میوکین کی شیشی اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا۔ لیکن دم اسی طرح الجھ رہا تھا اور سانس رُک رہا تھا۔ مَیں نے گہرے گہرے سانس لیے لیکن کوئی چیز سانس کی نالی میں اٹک رہی تھی۔ مَیں بے چینی سے اپنے سینے کو مسلنے لگا۔ میری بیوی زور زور سے باتیں کرتی اندر آئی، پیچھے پیچھے میرا بیٹا تھا۔

"ابھی کل ہی تم دو سو روپے لے کر گئے ہو بیٹے۔"

"دو سو روپے کیا حیثیت رکھتے ہیں ممی۔"

"ہاں دو سو روپے"

میں نے سوچا

اور انہی دو سو روپیوں کے نہ ہونے سے میرا باپ مر گیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس ڈاکٹر کی فیس کے پیسے نہ تھے اور وہ سوچتا رہا تھا کہ دو سو روپے اکٹھے ہوں تو وہ ڈاکٹر کو دکھائے کیونکہ سول ہاسپٹل کے ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ اُسے دل کی تکلیف ہے شاید اور اسے کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہیئے۔ وہ دو سو روپے اکٹھے نہ کر سکا اور ایک رات اُس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

میری بیوی نے اُسے پیسے دیئے، اور وہ چلا گیا۔

"آپ کلینک بھی نہیں جائیں گے آج۔"

مَیں نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے کی کوشش کی اور مجھے لگا جیسے یکایک میری بیوی کی داڑھی اُگ آئی ہو اور چہرہ پتھر ہو گیا ہو۔ سپاٹ بے تاثر چہرہ۔

"میاں جی"

میرے لب ہلے لیکن آواز نہیں نکلی، اور مجھے خاموش دیکھ کر وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی اور مجھے لگا جیسے میرے اردگرد کی ہوا بند ہو گئی ہو۔ مَیں بے چینی سے کبھی سینے کو مسلتا کبھی گلے کو، اور سر کو بار بار تکیے پر پٹختا — میری بیوی ہنس ہنس کر فون پر

اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی اور میری حالت سے بے خبر تھی۔ میں نے اُسے بُلانا چاہا، بتانا چاہا کہ میں کس کرب سے گزر رہا ہوں لیکن پھر سے میرا سانس رُک گیا اور میں شاید لمحہ بھر کے لیے مر گیا۔ میرے ارد گرد کی ساری چیزیں میری نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئیں۔

"شیرازی ——— شیرازی بھی مسز یونس تمہیں سلام کہہ رہی ہیں۔"

اپنی بیوی کی آواز مجھے بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"لگتا ہے آج شیرازی کا موڈ نہیں ہے کلینک جانے کا مزے سے پڑے سو رہے ہیں۔"

اس کی ہنسی کی آواز پر میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کی پُشت سے اپنی پیشانی صاف کی اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری

"وہی منیر احمد والی تکلیف"

میں نے سوچا۔

اور بیڈ سے اترا لیکن میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ سانس رُکنے کی اذیت نے میرے اندر کی ساری قوت نچوڑ لی تھی۔ میں پھر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

نہیں مجھے بھلا منیر احمد والی تکلیف کہاں ہو سکتی ہے۔

وہ خالص نفسیاتی مرض ہے

محض اس کے لاشعور کی کارستانی

اور میں ———

اوہ نہیں ——— میں تو کسی زندان میں نہیں ہوں اور نہ ہی کسی میاں جی نے میرے دروازے بند کیے ہیں میرے تو سارے دروازے ساری کھڑکیاں، سارے روشندان کھلے ہیں۔

اوہ میں بھی کتنا احمق ہوں منیر احمد کی بیماری دراصل میرے لاشعور میں بس گئی ہے۔

ورنہ یہ تو معمولی تکلیف ہے۔ وہی گیس ٹربل۔

میں نے خود کو یقین دلایا۔

بہر حال بہتر ہوگا کہ میں آج ہی ڈاکٹر محسن سے بھی مشورہ کر لوں۔ یہ گیس ٹربل بھی بعض اوقات بڑی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ ابتدا ہی میں علاج کر لینا اچھا ہوتا ہے۔

میں نے ایک نظر اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو ابھی تک فون پر گفتگو کر رہی تھی۔ ہمت کر کے میں پھر اُٹھا، اور تیار ہونے لگا۔ اور جلدی جلدی چائے کا ایک کپ پی کر میں نکل آیا۔

ویٹنگ روم خلافِ توقع مریضوں سے بھرا ہوا تھا حالانکہ اس وقت بہت کم مریض ہوتے تھے۔ زیادہ مریض شام کو آتے تھے۔

"غلام حسین آج ذرا مریضوں کو جلدی نبٹانے کی کوشش کرو مجھے ڈاکٹر محسن کی طرف جانا ہے۔"

غلام حسین کو تاکید کر کے میں اپنے کمرے میں آیا۔ غلام حسین نے پہلا مریض بھیجا۔

"ہاں بابا جی کیا تکلیف ہے آپ کو۔"

"بیٹھے بیٹھے سانس رک جاتا ہے ڈاکٹر جی۔ لگتا ہے جیسے ابھی دم نکل جائے گا۔"

"کب سے یہ تکلیف ہے آپ کو۔"

"بہت دنوں سے لیکن اب جلدی جلدی دورے پڑنے لگے ہیں۔"

"پہلے کسی سے علاج کروایا کبھی۔"

"جی کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔"

"کھانسی بھی ہے۔"

"نہیں جی کھانسی تو نہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔"

اُسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد میں نے کہا چلیں آپ ذرا ایکسرے کروائیں اور خون ٹیسٹ کروائیں۔ پھر میں آپ کو بلا

"فرید علی"

غلام حسین نے اگلا مریض بھیجا۔

"جی فرید صاحب"

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

گھنے سیاہ بالوں والا نوجوان بے حد گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

"کیا کہوں ڈاکٹر صاحب عجیب بیماری ہے۔ گھر والے ہنستے ہیں۔"

آپ کہیں فرید صاحب۔

"جی وہ مجھے لگتا ہے جیسے کسی نے میرے اردگرد کی ہوا بند کر دی ہو۔ ایسا بھی کبھی ہوا سر۔ بھلا ہواؤں پر کس کا اختیار

ہے کیا"

میں ایک دم اُچھل پڑا۔

"جی"

وہ نادم سا ہو گیا۔

"یقین کریں جی ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے چاروں اور دیواریں کھڑی کر دی ہوں اور آکسیجن کو مجھ تک آنے سے

دیا ہو۔"

میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب بڑی اذیت ہوتی ہے جی۔ یوں جیسے کوئی روح کو جسم سے کھینچے لے جا رہا ہو۔"

"آپ کے گلے کے غدود میں تو کوئی خرابی نہیں۔"

میں نے اچھی طرح اُس کے گلے کا معائنہ کیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے۔

"ماں آپ یہ ایکسرے چیسٹ کا اور یہ ٹیسٹ کروا کر باہر تشریف رکھیں۔"

میں نے بمشکل کہا۔

"غلام حسین انہیں نوید (لیب بوائے) کے حوالے کر دو — اور نور خان سے کہو مجھے ان کی جلدی رپورٹیں چاہئیں۔ فوراً۔

عائشہ رفیق"

غلام حسین نے پکارا

میں نے ڈرتے ڈرتے اُسے دیکھا۔

گہری گدلی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں، ہونٹوں پر پپڑیاں اور زرد چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے۔

"میرا دم گھٹتا ہے ڈاکٹر صاحب بس جی دل کرتا ہے کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں۔ کھلی ہواؤں میں بیٹھے بیٹھے سانس الجھنے لگتا

باہر بھی اندر بھی ہر جگہ سانس رکنے لگتا ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ڈاکٹر جی میری ساس کہتی ہے شاید مجھ پر کسی جن کا سایہ ہے پر میرا خاوند کہتا ہے یہ دمے کی تکلیف ہے۔"

"بی بی آپ باہر تشریف رکھیں۔"

وہ حیران نظروں سے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"یہ — یہ سب کیا ہے غلام حسین — یہ سب مریض —"

میں نے غلام حسین کی طرف دیکھا لیکن وہ سٹول پر بیٹھا سینے کو بے چینی سے مسل رہا تھا، اور سانس رکنے کی اذیت سے اُس کا چہرہ

رہا تھا —

"نہیں — نہیں یہ سب وہم ہے میرا۔"

میں کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ اور منیر احمد کی خود نوشت دراز سے نکال لی —

غلام حسین ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"حوصلہ غلام حسین میں ابھی آکسیجن سلنڈر منگواتا ہوں —"

شاید تمہاری سانس کی نالی میں کچھ اٹک گیا ہے۔"

باہر ویٹنگ روم مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی رپورٹس ہاتھ میں لیے منہ کھولے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب پلیز"

گھٹی گھٹی آوازوں نے مجھے پکارا۔

"میں — میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔
یہاں ایک ہی آکسیجن سلنڈر ہے اور ـــــ
" خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب ہم مر جائیں گے۔"
انہوں نے بے چینی سے اپنے سینوں کو مسلا، اور التجا کی
تو ـــــ تو پھر ـــــ
ان کی التجا کرتی تھرتھراتی اذیت سے سفید ہوتے چہرے
میں نے گھبرا کر نور خان اور نوید کو آواز دی۔
نوید ـــــ نور خان آکسیجن سلنڈر لاؤ جلدی اور زور سے بولنے سے میرے حلق میں کانٹا سا پڑ گیا اور پھر میرا سانس اندر الجھنے لگا۔ اور میں نڈھال سا ہو کر ایک خالی بنچ پر گر پڑا۔
" آکسیجن، آکسیجن ـــ"
میں چلّایا۔
اور میرے ساتھ ہی وہ سب بھی چیخنے لگے۔
ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہروں سے وحشت برس رہی تھی اور وہ چلّا رہے تھے۔ آکسیجن لیکن ان کی آوازیں لیب تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ان کی آواز وہاں تک پہنچ سکتی پھر بھی ان کے ساتھ مل کر چلّا رہا تھا۔ صرف ایک موہوم سی امید پر کہ شاید وہ ہماری آوازیں سن لیں اور پھر ہمارے آکسیجن سلنڈر لے آئیں اور ہمیں بچا لیں ـــ
سو میں چیخ رہا تھا
چلّا رہا تھا
میرے ہاتھ میں منیر احمد کی خود نوشت تھی اور میری آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔

بند کواڑوں پر اجنبی

طاہر نقوی

اس رات آخری پہر میرے ساتھ اچانک عجیب بات ہوئی جو اس سے پیشتر مجھے کبھی پیش نہیں آئی تھی، میں نے اپنے اندر آتش فشاں پہاڑ پھٹنے کی آواز سنی، چنانچہ اس دوران میری حالت عجیب و غریب رہی اور میں اپنے اندر نفسیاتی اکھاڑ پچھاڑ محسوس کرنے لگا، اس سے مجھے یہ ادراک ہوا کہ شاید یہ میری ذات کا پہاڑ تھا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو نامعلوم واہموں میں گھرا ہوا پانے لگا اور پھر لمحوں کے چہرے میرے لیے بے رونق ہوتے چلے گئے۔
اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری شخصیت میں جو اعتماد اور استقلال تھا وہ اب اس پہاڑ کے ٹوٹ جانے سے جاتا رہا، اور اس کی بجائے ئند کے ناردوں نے لے لی۔ گویا کوئی مہیب سناٹا میرے اندر داخل ہو گیا ہو۔ سناٹا انسان کے اندر داخل ہو جائے تو وہ خالی ڈبّہ سا لگتا ہے، لہٰذا اب مجھے ہر لمحے یہی گماں رہتا کہ گھر سے باہر نکلوں گا تو کہیں سے بندوق کی کوئی گولی آکر مجھے اپنا نشانہ بنائے گی اور میں بے یار و مددگار وہیں اسی جگہ دم توڑ دوں گا۔ کوئی پولیس والا کسی ہنگامے کے ناکردہ جرم میں مجھے دھر لے گا، کسی کونے سے آکر کوئی چھرا گھونپ دے گا۔ اپنی اس کیفیت کے اچانک پیدا ہو جانے کا مجھے بظاہر کوئی سبب بھی نظر نہ آتا، تاہم اس صورت حال سے مجھے ہر جگہ دوچار ہونا پڑتا اور ہر اک کے چہرے پر پڑے ہوئے ظاہری پردے کے پیچھے اس کی عیارانہ فطرت صاف نظر آتی اور میرے ذہن میں سانپ رینگنے لگتے۔ البتہ میں اس بات کی کوشش کرتا کہ میری یہ کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے لیکن ان دنوں منافقت ہر طرف سے ٹپکتی، میں ہر ایک کو پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو دیکھ کر مجھے یہی احساس ہوتا کہ ذہن اور روح کے پیمانے جدا جدا ہوتے ہیں لہٰذا مجھے ان سے خوشی نہ ملتی کیونکہ ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ان کے اندر کا کوئی اندازہ نہ ہو پاتا اور میں ان سے فرار چاہتا۔ البتہ میں ان انسانوں کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ اپنی دوہری کیفیت اور کشمکش کی وجہ سے میری حالت روز بروز بگڑتی رہی۔

ایسے دن اکثر آتے ہیں جب ہر کام اوندھا ہوتا چلا جاتا ہے اور مزید خرابی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، چونکہ میں بھی آج کل ایسے ہی دنوں سے دوچار تھا اس لیے دفتر میں ایسی باتوں کے دوران ایک روز ایک ساتھی کے بارے میں یہ علم ہوا کہ وہ ہاتھ دیکھنا جانتا ہے اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے اپنا ہاتھ دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ کچھ دیر ہاتھ دیکھنے کے بعد اس نے مشکوک انداز میں میری طرف دیکھا، میرا دل دھک دھک کرنے لگا اور میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اس سے سبب دریافت کیا تو وہ پریشانی سے بولا۔ "تمہیں مستقبل قریب میں کوئی قید بھگتنی پڑے گی۔"

اس کی یہ بات جس زدہ دوپہر کی مانند میرے اندر گھس کر بیٹھ گئی اور واہموں اور توہمات نے مجھے مزید گھیر لیا ۔ مجھے یوں لگا گویا م
ہونے والی ہے ۔ اب میں بس محض یہی سوچتا رہتا کہ آخر مجھ سے ایسا کونسا جرم سرزد ہونے والا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ قید بھگتنی پڑ
شبہے کا ہالہ میرے اردگرد خود بخود بنتا چلا گیا ۔ گھنے جنگلوں کی لمبی سرگوشیاں میرے اندر خوف کے دروازے کھولتی چلی گئیں ۔ گھر سے سنا
جگ دپلے میں اتر کر مدوح کو ریزہ ریزہ کر دیا اور میں نے مایوسیوں کا لبادہ اوڑھ لیا ۔

اس روز گھر پہنچا تو میری بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر بیوی نے مجھے کریدا ۔ میں نے غیر ارادی طور پر اسے سب کچھ بتا دیا ۔ پہلے تو وہ ہنس
شک قرار دیا لیکن مجھے اس قدر ہراساں دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئی اور مجھے احتیاط برتنے کا مشورہ دیا ۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ میرے چہر
نے اب اس کے چہرے پر بھی گھر کر لیا تھا ۔ بہر حال میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا کہ اب میں نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کہیں جاؤں گا ۔ لہٰذا اب
حتی الامکان نہ کسی سے اُلجھنے کی کوشش کرتا ، کہیں کوئی ہنگامہ نظر آتا تو وہاں سے بچ کر نکل جاتا ، کسی سے کوئی تکرار نہ کرتا بلکہ خاموش ہی
کے برعکس یہ شک مجھ پر اب پوری طرح قبضہ کر چکا تھا ۔ چنانچہ میں نے دفتر سے احتیاطاً چند روز کی رخصت لے لی تاکہ کوئی ایسی ویسی بات
کا کھٹکا ہی باقی نہ رہے ۔

جس روز میں دفتر سے رخصت لے کر گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ محلے میں آوارہ گردی کرنے والے لڑکوں کے درمیان کسی معمولی بات پر ع
ہو گیا ہے جو رفتہ رفتہ پھیلنے لگا ، بیوی میری طرف سے اب تک پریشان تھی مجھے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا ۔ ادھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ معمولی
کر سنگین علاقائی فساد کی صورت اختیار کر گیا اور پچھلے واقعات سے کہیں زیادہ خون ریزی ہوئی ۔ زمین ان لمحوں کی خاموش تماشائی بنی اس بے
کو دیکھتی رہی اور دکھوں کی بارش مسلسل ہوتی رہی ۔ لہٰذا اسی شام ہمارے محلے میں کرفیو کا اتنا سخت قانون نافذ کر دیا گیا کہ گھر سے باہر نکلنے
اجازت نہ تھی کیونکہ ہر گلی میں فوجی تعینات کر دیا گیا تھا ، ان حالات سے مجھے مجبوراً گھر ہی میں محدود ہو جانا پڑا ۔ اس شہر میں آئے دن کسی نہ کسی
ہنگامے کھڑے ہو جاتے ہیں جن سے شہری زندگی معطل ہو جاتی ہے ، آپس کے اعتماد اور محبت کی فضا چھٹتی چلی جاتی ہے ، لوگوں کے من ک
سے منہ موڑ لیتے ہیں اور انا کے پربتوں کو وقت کا لاوا ریزہ ریزہ کر دیتا ہے ۔ چنانچہ ان دنوں روشنی درزوں میں چھپتی پھرتی ہے اور ان
ٹپک ٹپک کر اس شہر کی زمین کے لبوں کی پیاس بجھاتا ہے ۔ تاہم وقت کے بے رحم ہاتھوں ختم ہونے والے اچھے لوگوں کی یادیں ان کے چاہنے وا
دلوں میں گھنٹیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں چنانچہ کبھی کبھی درختوں کی شاخوں پر پھدکتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر میرا جی یہی چاہتا کہ میں بھی پرندہ ب
انسانوں کے درمیان سے اُڑ جاؤں ، دراصل میرے اندر ان انسانوں کے درمیان بسنے کا حوصلہ اب ختم ہو چکا تھا ۔

خدا خدا کر کے شہر کے حالات معمول پر آئے اور کرفیو اُٹھا تو ایک آدھ روز کے بعد میری چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں مگر میں پہلے ہی کی طرح
ہوا تھا گویا کسی اندھیری گلی میں ابھی تک گرا پڑا ہوں ، مختلف واہمے میرے ذہن میں اب بھی کلبلا رہے تھے اور شبہات سے میرا ذہن
تھا کیونکہ وہی پیش گوئی میرے ذہن میں اب بھی اُسی طرح بالکل تازہ تھی لہٰذا دفتر جانے کے واسطے بے دلی سے تیاری کرتے ہوئے میں نے اما
عالی دھیمی آواز میں بیوی سے کہا ۔ " وہ قید مجھے نا جانے کب بھگتنی پڑے گی "

" وہ تو تم بھگت چکے ہو ۔ "

" بھلا وہ کیسے ؟ "

" بھئی یہی فساد اور کرفیو کی وجہ سے "

اس لمحے میں جلتی دھوپ میں پیڑوں سے گرنے والے سوکھے پتوں کی کہیں دور سے آنے والی آوازیں سن رہا تھا ۔ مجھے سڑک کی گپھاؤں میں جیتے دیکھ کر بیوی بولی ۔ " یہ بھی تو قید ہی تھی ــــ "

ایک ثانیے کے واسطے مسرت کی دھیمی چمک سی مجھے اپنے وجود کے کسی کونے میں محسوس ہوئی جس کے ردِ عمل کے طور پر میں نے لپک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا مگر باہر سارے منظر زنگ آلود تھے چنانچہ گھبرا کر میں وہاں سے پیچھے ہٹا اور ذہن پر انجانے خوف اور واہموں کے بوجھ کی وجہ سے بر محل لہجے میں اب بیوی کی بات کا جواب دیا ۔

" ہاں اجتماعی قید ــــ "

گویا میں اپنی قید سے ابھی رہا نہیں ہوا ہوں ، یہ سن کر اس لمحے چونک کر اُس نے عدم اعتماد سے مجھے دیکھا اور پھر یقین کرنے کی غرض سے خود بھی کھڑکی سے باہر جھانکا ۔ اب اس کی کیفیت بھی یکسر بدل گئی تھی گویا میری طرح وہ بھی دشمن موسموں کی ہم سفر ہو ، اب میں نے اپنے وجود کے خول سے نکل کر ارد گرد توجہ دینی شروع کی تو مجھے ہر شخص سہما ہوا اور ہراساں سا چلتا پھرتا نظر آیا جیسے محصور ہو اور نامعلوم جرم کی پاداش میں اس شہر کے قید خانے میں سزا بھگت رہا ہو اور تمام بیرونی دروازوں پر محافظ کھڑے کر دیئے گئے ہوں ۔ تاہم لوگ اس بات سے بھی لاعلم ہوں کہ وہ قیدی ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ آزادی سے سانس لے رہے ہیں ۔

چنانچہ میں نے شدت سے یوں محسوس کیا گویا میرے آس پاس اجنبیت کا موسم گزر رہا ہو ، دکھوں کی کالی گھٹا چھائی ہوئی ہو اور دوسروں کی طرح میں بھی وسوسوں کے دلدل میں پھنسا زندگی کے غار سے بھاری پتھر ہٹنے کا انتظار کر رہا ہوں ۔

سو میں اب اپنے ہی گھر کے اندر ایک قیدی کی طرح وقت کاٹ رہا ہوں ۔ اور محسوس یہ کرتا ہوں جیسے میرا نجومی دوست میرے بدن کی کال کوٹھڑی میں بیٹھا مجھ پر قہقہے لگا رہا ہے ۔

جسم سے جاں تک

محمد سعید شیخ

وہ اپنے جسم کی عادت کے ہاتھوں بہت تنگ تھی۔

اکیلے وجود سے اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ جس رات شیدا نشہ کرکے اور جُوا کھیل کے آتا تھا بہت دیر ہوجاتی تھی۔ وہ اپنے ایک کمرے کے گھر کے چھوٹے سے صحن میں بولائی پھرتی تھی۔ پیپل کے زرد سُوکھے پتے اس کے پاؤں کے نیچے ٹوٹتے رہتے تھے۔ اس کی حالت ڈار سے بچھڑی اُس کونج کی سی ہوجاتی تھی جس کا گھونسلا گم ہوگیا ہو۔ شیدا گرتا پڑتا جب گئے رات لوٹتا تو وہ اُسے سنبھالا دے کر بستر پر لٹاتی اُس کے کیچڑ بھرے جُوتے اتارتی، اُس کے مُنہ سے نکل کر باچھوں پر پھیلے بدبُودار مواد کو دوپٹے کے پلّو سے صاف کرتی اُسے نیم بے ہوشی کی حالت میں کھانا کھلاتی اور وہ جب پلنگ پر ڈھے جاتا تو دروازوں کی چٹخنیوں کی دیکھ بھال کرتی، اور باہر ٹین کی چھت والے برآمدے کے نیچے کھاٹ پر لیٹی شیدے کی ماں پر کھیس ڈالتی، اپنا دوپٹہ اُتار کر تکیے کے نیچے رکھتی اور آنکھوں میں آنسو لیے شیدے کے بے سُدھ جسم سے لپٹ کر سو جاتی۔ اُسے لگتا شیدا کوئی بڑا سا سایہ دار درخت ہو اور وہ اُس کے تنے سے لپٹی کوئی سبز بیل ہو جس کا اپنا کوئی وجود نہ ہو۔ اکیلے میں اُسے نیند نہیں آتی تھی۔

"نیند تو سُولی پر بھی آجاتی ہے" یہ بات اُس نے بھی سُن رکھی تھی۔

مگر چھیمو جانتی تھی یہ بات غلط تھی۔ اُس کے تن پر یہ بات صادق نہ آتی تھی۔

لاکھ شیدا اُسے دن میں پیٹتا، اپنی غربت کی ذمہ داری اس پر ڈال کر گندی گالیاں دیتا۔ دُنیا، دُنیا والوں اور معاشرے کو کوستا اور سرِ شام اُسے پکڑ کر بھنبھوڑ ڈالتا، پر جونہی رات کا اندھیرا چاروں اور سے اُمڈتا، اس کا جسم اینٹھنے لگتا۔ وہ شیدے سے اس لیے ناراض بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کا جسم وہ نشہ تھا جس کے بغیر چھیمو کا پنڈا تڑخنے لگتا تھا۔ شیدے سے لگ کر سوتی تو لگتا آسمان کی وسعت میں اُس کا بھی حصّہ ہے۔ رات کو اگر شیدا نہ ہوتا تو وہ اُس بچّی کی طرح ہوجاتی جس کے سارے کھلونے کسی نے چھپا دیئے ہوں۔

شیدے نے ایک دفعہ اُس سے کہا تھا۔

"جب میں چھوٹی سی تھی تو اُستانی جی نے مجھے بتایا تھا کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہوتی وہ تو سُورج کی روشنی کا محتاج ہے۔ جبھی تو زمین چاند کے سامنے آجاتی ہے تو چاند کو گرہن لگ جاتا ہے۔ شیدے! باقی ساری تعلیم تو میں بھول گئی پتا نہیں یہ بات کیونکر یاد رہ گئی ـــــ شیدے تُو میرا سُورج ہے رے! تیرے جسم کی حرارت مجھے نہیں ملتی تو میں برف بننے لگتی ہوں۔ میرا سارا وجود ٹھنڈے اندھیرے میں ڈوبنے لگتا ہے۔"

شیدے کو چھیمو کی یہ باتیں اتنی عجیب لگیں کہ وہ ہکا بکا سا مُنہ کھولے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم تو آج مجھے میٹرک پاس لگتی ہو چھیمو!"

وہ اپنی حیرت نہ چُھپا سکا۔

"میں سچ کہتی ہوں شیدے۔ یہ میرے وجود کا سچ ہے۔ میں اسے چُھپا نہیں سکتی۔" چھیمو شیدے کے قریب ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔

"چھیمو تیری یہی عجیب باتیں کبھی کبھی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ ورنہ اب تک اپنی غریبی کے ہاتھوں ریل کے پہیئے کے نیچے لیٹ گیا ہوتا۔"

شیدا آبدیدہ سا ہو گیا۔

"تم سارا دن جو مرضی کرو شیدے! میں کبھی تم سے نہیں پوچھوں گی، بس تم اپنی راتیں میرے نام رہنے دو...... میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔"

چھیمو نے شیدے کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

"میں چھوڑ دوں گا یہ سب نشہ رشہ! میں اچھا آدمی بن جاؤں گا۔ مجھے جب ریلوے کالونی میں کوارٹر مل جائے گا دیکھنا میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کروں گا۔"

چھیمو کو تو اتنے کچھ کی پروا نہیں تھی۔ ویسے بھی اُسے پتہ تھا شیدا اپنے جوئے کی لت نہیں چھوڑے گا۔ اُس کا اپنا باپ بُڈھا کھوسٹ ہو گیا تھا پر اپنی یہ عادت نہیں چھوڑ سکا تھا۔ ایسے ہی جُوا کھیلتے کھیلتے اُس نے چھیمو کو بازو سے پکڑ کر شیدے کے حوالے کر دیا تھا۔ شیدا بازی جیت گیا تھا۔ اور چھیمو کے باپ کے پاس چھیمو کے سوائے اور کوئی چیز نہیں تھی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو وہ اُسے بازو سے اُچک کر نیچے فرش پر ڈال دیا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ ہر رات اپنی ماں سے لپٹ کر سوتی تھی۔ اُس کا باپ سارا دن ریلوے پلیٹ فارم پر اُونچی اُونچی آوازیں لگا کر نان کباب بیچتا تھا اور شام کو جب تقریباً سب گاڑیاں گزر جاتیں تو وہ اپنی ریڑھی کو مال گودام کے ساتھ بند کرتا، اس کے پہیوں میں لوہے کی زنجیر ڈال کر تالا ڈالتا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آؤٹر سگنل کے کیبن کے پاس تاش کی بازی ضرور لگاتا تھا۔ جس دن کسی وجہ سے اس کا شوق پورا نہ ہوتا تو وہ گھر آکر رات کو چھیمو کی ماں کو بے تحاشا پیٹتا تھا۔ جب تھک جاتا تو دال روٹی یا پھر بچے کھچے نان کباب کھا کر لیٹ جاتا۔ اور چھیمو حیران ہوتی کہ اس کی ماں مار کھانے کے بعد بھی اس آدمی کے ساتھ سوتی تھی۔ پھر سمجھتے سمجھتے یہ بات جیسے اس کے ماس میں اُترتی گئی۔

شیدے کے گھر آکر چھیمو کو لگا جیسے وہ مُڑ تُڑ کر اپنے ہی گھر میں آگئی ہو۔ وہی ایک کمرے کا مکان۔ ایک چھوٹا سا صحن، کچا چھتا ہوا

یوں لگتا تھا مالک مکان نے یہ حصّہ سرونٹ کوارٹر کے طور پر بنوایا تھا اور بعد میں اسے بھی کرائے پر اُٹھا دیا تھا۔ شیدے کا باپ
بیوسے میں درجہ چہارم کا ملازم تھا جب اس کو پنشن ہوئی تو یونین کے کسی عہدہ دار کی مدد سے شیدے کو باپ کی جگہ یہ نوکری مل گئی۔ باپ کو
اطمینان سا ہو گیا کہ چلو جیتے جی بیٹا اپنے جوگا ہو گیا۔ پر باپ میں جو تھوڑی بہت قناعت اور تسلیم و رضا کا مادہ تھا وہ شیدے میں نہیں تھا۔
شیدا تو اس نئے عہد میں رہتا تھا آنکھیں رکھتا تھا دماغ سے سوچتا بھی تھا پر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ باپ کے جوتوں میں پاؤں تو رکھ چکا تھا پر
ہر وقت پاؤں پٹختا رہتا تھا۔ اپنے نصیب سے اُس نے سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ اپنے نصیبوں سے سمجھوتہ نہ کرنے والوں کے لیکھ میں خواری تو
پھر ہوتی ہی ہے۔ شیدے کو اس کا پتہ تھا۔ لیکن وہ کرتا بھی تو کیا کرتا ـــــ اُس نے دیکھا ضرور تھا کہ چھوٹے چھوٹے کئی ملازم بڑے ٹھاٹھ
سے رہتے تھے اور دھڑلے سے نوکری بھی کرتے تھے۔ اُسے یہ بھی علم تھا کہ ہر سال محکمہ کو کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

وہ سوچتا رہتا اپنا نصیب بھی کیا نصیب ہے۔ بنانے والے نے پتہ نہیں کس لئے اسے بنایا ہے۔ یا پھر گری پڑی چیز کی طرح
خود ہی کہیں سے بن گیا۔ یا پھر نصیب بھی یہیں کہیں سے ماں باپ کی پُشتوں سے کیڑوں کی شکل میں ہمارے جسموں میں منتقل ہو جاتے
ہیں۔ اور ساری زندگی ہمارے خون کو اپنا رنگ دیتے رہتے ہیں۔

کیبن میں سگنل کی ڈیوٹی پر ٹرینوں کو کنٹرول کرتے ہوئے عجیب واہیات قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں بگولوں اور وا ورولوں
کی طرح اُڑتے رہتے۔ اگر میں غلط کانٹا جوڑ دوں تو کتنوں کے نصیب بھسم کر سکتا ہوں، پر یہ تو بدنصیبی ہوگی ..... تو پھر بدنصیبی کیوں
ہمارے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ اور وہ بونگوں کی طرح اپنے ہاتھ کی لکیروں کو گھورنے لگتا۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشن والے
ٹیلی فون کی ٹن ٹن اُسے چونکا دیتی۔ عجیب بے چینی سی اُس پر چھانے لگتی۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا گھر آ جاتا۔

اس کا باپ ریٹائر ہو کر اب زیادہ وقت گھر پہ ہی گزارتا تھا۔ اُسے کبھی کبھی تو بالکل سمجھ نہ آتی کہ اب اس کی زندگی کا کیا مصرف رہ گیا
ہے۔ ایک بے سمتی کا سا احساس اُسے گھیرے رہتا۔ شیدا گھر لوٹتا تو دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر گاڑی کی پٹڑی کی طرح
اپنے اپنے خیالوں میں متوازی سے چلتے رہتے۔ کھٹ سے کہیں کانٹا بدلتا تو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور تھوڑی دیر کے گڈم گڈام
کے بعد پھر سے پٹڑی کی طرح ہو جاتے۔

چھٹی کے دن شیدے کا باپ گھر سے نکل جاتا اور سارا دن ریل کی پٹڑی پر چلتا رہتا۔ گرتے اور بلند ہوتے سگنلز کی حرکات کو گھورتا
رہتا، اور آنے جانے والی ٹرینوں کے ڈبوں کو گنتا رہتا۔

ایک دن کھانا کھاتے اُسے بڑے زور کا اُچھو لگا اس کے دماغ کی نسیں تک ہل گئیں، اُس کی آنکھوں میں نمی بھر گئی۔ اُس دن کے بعد
جیسے اس کی یادداشت پر غنودگی سی طاری رہنے لگی۔ ماضی کے سارے سال نظروں کا سُراب بن کر اُس کی آنکھوں کے سامنے بنتے اور بگڑتے
رہتے۔ غنودگی کے پردوں سے ٹکراتے، وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا کہ اُس نے جو زندگی گزاری ہے وہ صحیح گزاری ہے یا غلط۔ اپنے ارد گرد
کی ویرانی، بیوی کی بے حالی اور خشک آنکھیں، بیٹے کی بے چینی عجب سوال بن کر اُس کے سامنے تن جاتے تو وہ اپنے محور سے نکل کر
بے سمت ہو جاتا۔ اُسے اپنی بیوی کی آواز دُور سے آتی سُنائی دیتی۔

"گئے وقتوں کا مت سوچا کر عبدالکریما! جو بیت گیا سو بیت گیا۔"
اور عبدالکریم شیدے کی ماں کے چہرے کو غور سے دیر تک دیکھتا رہتا۔

"میرے پاس گئے وقت کے سوا اور ہے ہی کیا جھلیئے لڑکے !"

اور شیدے کی ماں اُسے تسلی دیتے دیتے خود ہی گئے وقتوں میں اُتر جاتی ۔

باپ کے مرنے کے بعد شیدا بہت دن اداس رہا ۔ چھیمو اُسے تسلیاں دیتی ۔ شیدا اب اور بھی دیر سے گھر آنے لگا تھا اور
ر کافی دیر ڈکارتا رہتا تھا ۔ اب وہ زیادہ تر ولیسی ہی پیتا تھا ۔ اُس کی آواز گلی میں اور ساتھ والے پڑوسی تک سُن سکتے تھے ۔
یدے کا گھر تو پہلے ہی سے اس گلی میں بدنام تھا ۔

اُنہوں نے دیکھا کہ اچانک ایک دن کچھ لوگ نئے کپڑے پہن کر اس گھر میں آئے اور اس کے بعد اس گھر میں چوڑیوں کی چھنک
ی جانے لگی اور برتن کھڑکنے لگے ۔ محلے والوں کو پتا چل گیا کہ شیدے کی شادی ہو گئی تو لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں ۔

"ایسے بھی ماں باپ ہوتے ہیں جو شیدے جیسے بدقماش کو اپنی بیٹی دے دیتے ہیں" وہ اُونچی آواز میں سوچتے ۔

چھیمو نے تو آنکھ کھولتے ہی اپنی ماں کو باپ کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تھا اس لیے جب پہلی مرتبہ شیدے نے چھیمو کو پیٹا تو اُسے
جیب کیسے لگتا ۔ وہ سمجھتی تھی مرد بس ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ لپٹاتے بھی ہیں مارتے بھی ہیں ۔ اُس نے ماں کو پٹتے دیکھا تھا شیدے کے ساتھ
ے کیا مشکل لگتا ۔ اُسے تو بس ایک ہی لالچ تھا کہ شیدا رات اُس کے پاس سوئے اس کے بدلے بھلے ہی وہ دن کو اُس کے ٹکڑے
ے ۔

شیدے کی شادی کے بعد اس کی ماں نے اپنی کھاٹ گھسیٹ کر باہر دالان میں ڈال لی تھی جس کے اُوپر ٹین کی چھت تھی جہاں گھر
تھ کباڑ پڑا رہتا تھا ۔ چھیمو کی حالت دیکھ کر اس کا دل دُکھتا ضرور تھا پر شیدے کو وہ کیسے سمجھاتی ۔ شیدا گھر پر ٹکتا ہی کب
ا ۔ البتہ شیدے کے جانے کے بعد وہ کبھی کبھی چھیمو کو اپنے پاس بٹھا لیتی اور سمجھاتی ۔

"دھی رانی ! تو جب تک شیدے کو ترسائے گی نہیں وہ تیری قدر نہیں کرے گا !"

"کیسے ترساؤں اماں !؟" چھیمو حیرانی سے پوچھتی ۔

"بس کبھی کبھی روز اُس سے علیحدہ سو جایا کر پُتر ! ہر رات اس کے ساتھ نہ سویا کر ! ویسے بھی مرد اس سے سُست اور بیمار
اتے ہیں !"

چھیمو اماں کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں آ بھی جاتی تو وہ بھلا کیا کرتی ، اس کا جسم اس کے دماغ کا
تھ نہیں دیتا تھا ۔

کئی دفعہ اُس نے ارادہ بھی کیا کہ اماں کی ایک آدھ بات پر عمل کر کے دیکھے تو سہی مگر جونہی رات آتی اُس کا تن بدن جیسے
سُلگنے لگتا ۔ وہ اپنی ساس کی تمام باتیں بھول کر شیدے سے لپٹ کر سو جاتی ۔ اور شیدا اپنی تمام مایوسیاں اور محرومیاں جیسے
ر ڈھیر کرتا چلا جاتا ۔ شیدے کے لیے وہ بہت سستی تھی ۔ اس کی ساس اب ہر وقت اس کی حرکات نگاہوں میں رکھتی تھی ۔
ع بہ موقع وہ چھیمو کو اپنے پاس بٹھا لیتی اور سمجھانے لگتی ۔

ایک دن تو اُس نے چھیمو کو خوب سُنائیں ۔

نکھتی ! "اگر تجھے تھوڑا بہت بھی اپنے خاوند کا اور اپنے گھر کا خیال ہوتا تو یوں ہر وقت یوں نہ گھسی رہتی ۔

غضب خدا کا عورت ذات کی ایسی ہی ڈیوڑھی تو نے ! کچھ تو اپنے کو لگام دو ! جوانی ہم پر بھی آئی تھی پر تیری طرح ندیدی نہیں ہوئی تھی ۔" وہ بولتی گئی اور چھیمو کو آج بہت ہی شرم محسوس ہوئی ۔ تنہائی میں تو وہ رو ہی پڑی ۔ " پتہ نہیں کیا رکھ دیا ہے میرے جسم میں اللہ نے ! میرے بس میں ہی نہیں ہے ۔" پھر وہ اپنی ماں کے دودھ کو کوسنے لگتی ۔

" اُس دودھ ہی میں کچھ تھا جو میرے تن سے الگ نہیں ہوتا ۔"

وہ دُکھ سے سوچتی ۔ پھر اسے یاد آنے لگتا ۔

وہ چھوٹی سی تھی تو ماں کے ساتھ سویا کرتی تھی ۔ اور جب باپ نے اُسے علیحدہ فرش پر سُلانا شروع کیا تو بہت روتی تھی ۔ اُسے اکیلے میں نیند نہیں آتی تھی ۔ طرح طرح کی شکلیں نظر آتی تھیں ۔ ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے ۔ جیسے وہ جنگل میں اکیلی ہو اور جنگلی جانور اُس کا پیچھا کر رہے ہوں ۔ وہ ڈر جاتی اور کئی دفعہ رات کو اُٹھ کر ماں کے پلنگ کی پائنتی پر پڑ رہتی ۔ دو ایک دفعہ تو نمونیا ہو گیا ۔ مشکل سے جان بچی ۔ پھر باپ نے اُسے صحن میں سُلانا شروع کر دیا اور اندر سے وہ کمرہ کا دروازہ بند کر لیتا تھا ۔ رات کو کبھی جب اُس کی ماں اکیلی ہوتی تو وہ خوب چمٹ کے اس کے ساتھ سوتی اور دل دعائیں مانگتا کہ اللہ کرے اس کا باپ کبھی پلٹ کے نہ آئے ۔ اور جب رات گئے اُس کا باپ آتا تو بڑی بے رحمی اور حقارت سے اُسے بازو سے اُچک کر نیچے فرش پر ڈال دیتا ۔ پھر جب اس کی شادی ہو گئی تو شیدے نے اُسے ساتھ سُلانا شروع کر دیا ۔ وہ بہت خوش ہوئی ۔ اب اُسے اکیلے سونا نہیں پڑتا تھا ۔ دُور کہیں اس کے دل میں اب بھی یہ خوف پوشیدہ تھا کہ کہیں کوئی اُسے اُچک کر علیحدہ کر کے فرش کی سختی پر نہ پٹخ دے ۔ یہ احساس ایسی حقیقت تھی جس کے سامنے باقی ساری حقیقتیں بے معنی سی لگتی تھیں ۔ رات شیدے سے لپٹ کر سوتی تھی اور صبحدم یوں تر و تازہ اُٹھتی تھی کہ چاہو تو پہاڑ کٹوا لو اس سے ۔

شیدے کو چھیمو کی اس کمزوری کا علم تھا ۔ اس کے ہاتھ میں چھیمو کی نکیل تھی جب چاہتا جدھر چاہتا موڑ لیتا تھا ۔ جب کبھی شیدا اس سے ناراض ہوتا تو وہ علیحدہ چارپائی پر سو جاتا یا پھر ایک ہی پلنگ کے دوسرے کنارے پر مُنہ موڑ کر لیٹ جاتا ۔ ایسے میں چھیمو یوں تڑپتی جیسے کسی نے مچھلی کو پانی سے نکال کر ریت پر پھینک دیا ہو ۔ وہ معافیاں مانگتی ۔ شیدے کے پاؤں پڑتی ، روتی ۔ شیدے کے پھیرے لیتی تب جا کر کہیں شیدا رام ہوتا ۔ چھیمو کی بے بسی سے وہ بہت محظوظ ہوتا تھا ۔

پھر ایک دن شیدے کو پولیس نے اُس کے ساتھیوں کے ہمراہ آؤٹر سگنل کے پاس جوا کھیلتے پکڑ لیا ۔ اُسے دو راتیں جیل میں گزارنا پڑیں ۔ پہلی رات تو چھیمو نے جل بھر کر کٹی پھٹی نیند کی حالت میں گزار دی ۔ دوسری رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر بوڑھی ساس کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔

" اماں ! آج کی رات سو جا میرے ساتھ ، ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جائے ۔ میں آج اکیلی نہیں سو سکوں گی ۔"

اماں نے پہلے تو اس کی زندگی پر تُف کیا اور پھر کچھ سوچ کر اس کے ساتھ سونے پر رضامند ہو گئی ۔ بوڑھی اماں جب چھیمو کے ساتھ لیٹی تو خود اُسے ایک عرصہ کے بعد کسی جسم کا لمس محسوس ہوا ۔ راکھ میں جیسے کسی نے چنگاریاں چھیڑ دیں ۔ اُسے اپنی جوانی کے دن یاد آنے لگے ۔ اس کے جھُرّیوں بھرے چہرے پر روشنی سی ہونے لگی ۔

" کاکی ! ہم تو میرا بھی بڑا منہ زور تھا پر مجال ہے جو شیدے کے باپ کو .... ۔ شیدے کا باپ میرے گرد پھیرے لگاتا تھا ، میرے پاؤں پکڑتا تھا تب کہیں اُسے پاس آنے دیتی تھی تیری طرح نہیں تھی ہر وقت مرد کی گود میں بیٹھنے کو تیار ۔"

بوڑھی کے لہجے میں ناپسندیدگی بھر آئی۔ چھیمو اس مٹھی بھر عورت کے جسم سے چمٹی سوچنے لگی۔
پتہ نہیں اماں نے رشیدے کے باپ کو کس طرح قابو میں کیا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے عورت ..... عورت وہ تو بنی ہے مرد کی غلامی کے لیے ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے تصور میں اس کی ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ سہما سہما لُٹا ہوا چہرہ۔ وہ دل میں ساس سے کہنے لگی۔
۔ تو کیا جانے بھولیئے اماں! مجھے تو جسم کی غلامی ورثے میں ملی ہے۔ میں تو ہمیشہ سے اس کی قیدی ہوں۔ میرے خون میں میرے مولا نہ پتہ نہیں کیا رکھ دیا ہے، میرے بس میں ہی نہیں آتا اور تو سمجھتی ہے مجھے اپنے خاوند کا خیال نہیں اپنے گھر کا خیال نہیں۔ میں کیا کروں۔ ... میں کیا کر سکتی ہوں ؟ ! "
" چھیمو پتر! میں تو جب اپنا آپ رشیدے کے باپ کے حوالے کر دیتی تھی نا! تب بھی پُوری کی پُوری اس کے قبضے میں نہیں ہوتی تھی۔ میرا دماغ میرے پنڈے سے نکل بھاگتا تھا۔" بوڑھی اماں نے چھیمو کے چہرے کو قریب سے دیکھتے ہوئے کہا۔ چھیمو پر نیند غالب آنے لگی تھی۔ پر بوڑھی ساس بولے جا رہی تھی۔
" گزرتے دن بندے کے جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ اُس کے خون میں رچ بس جاتے ہیں۔ گاؤں کے نمبردار کا لڑکا فیقا اب تو اور بھی یاد آنے لگا ہے۔ اس کا خیال میرے لہو میں بہتا رہتا ہے۔"
" کیوں اماں! وہ کون تھا تیرا ؟" چھیمو نے ہوشیار ہوتے ہوئے کہا۔
" اُس سے میری منگنی ہوئی تھی پر گاؤں کے الیکشن میں ابا نے اس کے چاچا کی مخالفت کی تھی ہماری منگنی ٹوٹ گئی۔ ابا نے جلدی سے مجھے رشیدے کے ابا سے بیاہ دیا۔ رشیدے کا ابا شہر میں گاڑیوں کے محکمے میں بابُو تھا۔"
" اور فیقے کا کیا بنا اماں ؟" چھیمو نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
" فیقا نمانا تو بس دیکھتا ہی رہا۔ سُنا تھا اُس نے بعد میں بھی شادی نہیں کی پر کیا چھا ئیدہ ؟ مرد کا بچہ ہوتا تو کچھ کر گزرتا۔ گھڑسے جوان بھگا نہیں لے جاتے اپنی منگوں کو ! "
چھیمو حیرانی سے دھیمی روشنی میں اُس عورت کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو اپنی ساری زندگی گزار کر اس کے آخری کناروں پر کھڑی تھی۔
" اب کیوں یاد کر رہی ہو یہ باتیں ؟ "
" پتہ نہیں !" اماں نے چھیمو کے سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے سوچا۔ مجھے تو جیسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ باتیں اب تک میرے دل میں موجود ہیں۔"
" یہ گزرا ویلا گھیرے رہتا ہے آدمی کو ہر وخت! ———— یہ دُوری مُکا دیتی ہے بندے کو۔ وخت تو بندہ گزار لیتا ہے پر اپنے سے چھُپ چھُپ کر۔"
اماں خاموش ہوگئی۔ جیسے راستے میں کہیں رُک کر سانس لے رہی ہو۔ چھت پر کونوں میں مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے۔ کمرے میں ہوا کا گزر نہیں تھا پر پھر بھی وہ بوڑھی عورت کے سانسوں کے ساتھ جیسے ہل رہے تھے۔ جیسے اُن میں کوئی چھُپا بیٹھا ہو۔
وہ پھر بولنے لگی۔ اس بات سے بے نیاز کہ کوئی اُسے سُن رہا ہے یا نہیں۔
" پر کیا چھائیدہ اگر تن میں رُوح نہ ہو۔ تن کی ساری بات تو وہی ہوتی ہے جسے پڑھا کو لوگ محبت کہتے ہیں "——

بوڑھی اماں نے محبت کی م کو لمبا کر کے بولا اور ب کو مختصر بول گئی۔

چھیمو جیسے یک لخت سوچنے لگی۔ "کیا شیدے سے اُسے محبت ہے؟ کیا اس کے باپ کو ماں سے یا اس کی ماں کو باپ سے محبت تھی؟" سوچ کا ذائقہ جیسے اُس کی زبان پر اُتر آیا۔ لفظ کی مٹھاس تو اُس نے محسوس کی پر جسم نے اس کے مفہوم کا ردِ عمل نہیں پڑھا۔ وہ سوچتی رہی۔ کئی دن بوڑھی ساس کی باتوں نے اُس کی سوچ کو نئے رُخ کا انکشاف دیا۔

وہ خود کو اجنبی سی لگنے لگی۔

شیدا تیسرے دن ضمانت پر رہا ہو کر آگیا۔ اماں کی باتیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ بن کر اُس کے احساس سے چمٹی رہیں۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ اندر ہی اندر آدمی گھلتا پلتا بڑھتا رہتا ہے۔ بندے کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ اُس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

اور پھر اُس کے اندر ایک وجود پرورش پانے لگا۔ وہ یوں جیسے اپنے عشق اپنی محبت میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔

شیدے کے بغیر وہ اب بھی نہیں رہتی تھی۔ شیدے کو البتہ یوں لگ رہا تھا چھیمو جیسے وہ پہلے والی چھیمو نہ رہی ہو۔ چھیمو اپنے اندر کی جس دُنیا کے گرد اب پھیرے لیتی تھی اس میں شیدا جھانک نہیں سکتا تھا۔

جس دن چھیمو کے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوا اُس نے اپنی محبت کی تجسیم دیکھی۔ اس کے جسم پر ایک اچھوتا نیا نشہ سا چھا گیا۔ وہ اس میں بھیگ گئی۔ شیدا سمجھتا تھا یہ زچگی کی تھکاوٹ ہے۔ اُس رات وہ بیٹے کو سینے سے لگائے لیٹی ہوئی تھی جب شیدا آکر اس سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ شیدے کے مُنہ سے بدبُو کا بھبھکا جب چھیمو کے نتھنوں تک پہنچا تو وہ جیسے کسی سہانے خواب سے چونک پڑی اُس نے ناپسندیدگی اور نفرت سے اپنی پُشت کر کے اس طرح جھٹکا دیا کہ شیدا دھڑام سے پکے فرش پر گر پڑا۔ وہ کمر سہلاتا ہُوا اٹھا اور چاہتا تھا کہ جھک کر بچے کو بازو سے اُچک کر فرش پر ڈال دے کہ چھیمو شیرنی کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گئی اور غرّا کر کہنے لگی۔

"شیدے اس طرح تُو نے میرے وجود کو ہاتھ بھی لگایا تو تمہارا مُنہ نوچ لوں گی۔ جا اور جا کر صحن میں سو جا اپنی ماں کے پاس۔ میں اب تیسری قید سے آزاد ہو چکی ہوں۔"

اور شیدا ششدر کھڑا عورت کا وہ رُوپ دیکھ رہا تھا جو اس سے پہلے اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کوئی موسم ہو

انور زاہدی

سڑک کی طرف کھلنے والی بیڈ روم کی کھڑکی میں سے سویرا کمرے میں جھانک رہا ہے۔

وہ بستر سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھتی ہے اور آئینہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ برش سے اپنے بال سنوارتی ہے اور اک نظر بیڈ روم پر ڈالتی ہے، جہاں اُس کا شوہر گھوڑے بیچ کر چاروں شانے چت بیڈ میں بے سُدھ پڑا ہے۔

ابھی کچھ دیر میں جب وہ باتھ روم سے لوٹے گی تو دن کی روشنی اُس کے شوہر کے پہلو میں دراز ہوگی—— چھٹی کا یہ دن بھی بس یوں ہی گزر جائے گا۔

دو کمروں، لاؤنج، کچن، باتھ روم، اسٹور اور باہر کو کھلتے ہوئے مختصر سے ٹیرس پر مشتمل فلیٹ میں سب ہی کچھ ہے، سجا سجایا ڈرائنگ روم، صاف ستھرے ہلکے سبز رنگ کے مخملی صوفے، سینٹر ٹیبل پر رکھے گلدان میں گلاب کے تازہ پھول۔ دیوار پر ایک طرف بڑے سے فریم میں متلاطم سمندر، ایک کونے میں شیلف میں رکھی کتابیں اور شیلف کے اُوپر سنہرے فریم میں اُس کی شادی کی تصویر—— بہت سا زمانہ اک دم پر لگا کر پیچھے کی سمت اُڑ جاتا ہے۔

آٹھ سال پہلے جب وہ اس فلیٹ میں بیاہ کے آئی تھی تو یہاں کا حُلیہ کس قدر مختلف تھا، کہیں بھی کوئی ترتیب نہ تھی۔ اندر باہر ہر طرف بے سروسامانی کا عالم تھا۔ اب آٹھ برس گزرنے کے بعد ہر شے سلیقے سے رکھی نظر آتی تھی —— چاروں جانب صفائی اور ترتیب کا بسیرا تھا لیکن یہ سلیقہ، صفائی اور ترتیب ان سب کے باوجود ایک عجیب سا سناٹا ہے جو بیڈ روم، ڈرائنگ روم، لاؤنج، کچن غرض فلیٹ کے ہر کونے میں موجود اس کا دامن تھامے اُس سے سوال کرتا رہتا ہے۔

خالی پن کا ایک احساس ہے جو پورے گھر پہ براجمان ہے

"ارے بھئی دیکھو یہ منی پلانٹ کی بیل کو کیا ہوا ہے؟"

بیڈ روم سے اُس کے شوہر کی آواز آتی ہے

وہ بیڈ روم میں واپس آتی ہے

کھڑکی میں رکھی شیشے کی صراحی میں سجی منی پلانٹ کی بیل کو مرجھاتا دیکھ کر اُسے یوں لگتا ہے جیسے کسی اَن دیکھے ہاتھ نے جسم کی گہرائیوں میں اُسے مسوس لیا ہو اُس کی انگلیاں منی پلانٹ کی بیل کو چھوتے ہوئے کانپ اُٹھتی ہیں—— جانے کیوں اس تمام مدت میں منی پلانٹ کی بیل کبھی بھی اُس کے ہاں

نہ تھم سکی۔

چھوٹے سے گھر میں ربر پلانٹ، اسپیراگس، آراکیریا، پام، ڈراسینیا اور نہ جانے کتنی ہی قسم کے دوسرے پودے موجود تھے لیکن یہ منی پلانٹ جانے کیوں ——؟

اُس کا شوہر باتھ روم سے واپس آکر اخبار پڑھنے میں مصروف ہے۔ وہ عینک کے اُوپر سے دیکھ کر کہتا ہے

"آج شام نرسری سے دوسرا منی پلانٹ لے آئیں گے"

وہ بغور اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی ہے جیسے وہاں کچھ پڑھنا چاہتی ہو لیکن شوہر کا سپاٹ جذبات سے عاری چہرہ اسے اخبار کے اس ہنگ کالم کی طرح نظر آتا ہے جو بالکل کورا ہو۔

وہ ناشتہ بنانے کچن میں چلی جاتی ہے

ان آٹھ سالوں میں کتنے ہی حکیم ڈاکٹر، اسپیشلسٹ حتیٰ کہ پیر فقیر سبھی کچھ تو کر کے دیکھ لیا اُس نے —— کسی نے کہا وظیفہ کرو تو کسی نے مشورہ دیا چالیس میل دُور نیلی پہاڑی پر رہنے والے سنیاسی بابا سے جا کر ملو۔ مراد پوری ہو جائے گی لیکن اس کی مراد تو جیسے صحرائی زمین میں اُگے ہوئے اُس ناگ پھن کی مانند تھی جو بس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

لاؤنج میں پڑی ہوئی ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھ کر وہ دونوں ناشتہ کرتے اور ایک گمبھیر خاموشی چائے کے لوازمات میں ہمیشہ شریک رہتی۔

پچھلی مرتبہ ایک ڈاکٹر کے محض اُس سے یہ سوال کر دینے پر "آپ کو کسی قسم کا تردد یا کوئی فکر تو لاحق نہیں" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے تھے اور وہ بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"جی سب کچھ ہی ہے بس ایک ...."

چائے پیتے ہوئے اُس کا شوہر اخبار کا صفحہ پلٹتا ہے —— خاموش ماحول میں صفحہ پلٹنے کی پھڑ پھڑاہٹ سے لگتا ہے کسی نے شیشے کی دیوار پر ناخنوں کو کھرچ دیا ہو۔

"کیوں۔؟ آخر کیوں؟" وہ سسک اُٹھتی ہے۔

"معلوم نہیں کیوں؟ —— شاید منی پلانٹ کو یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی"۔ اس کا شوہر اچانک بول اُٹھتا ہے لیکن جونہی اخبار ہٹا کر اُسے دیکھتا ہے تو اُس کی نظروں کی کاٹ کی تاب نہ لا کر نگاہیں نیچے جھکا لیتا ہے۔ وہ خود کبھی نہیں سمجھ سکی —— جب اُس کے اپنے سارے ٹیسٹ نارمل ہوتے ہیں تو پھر کیوں اُس کا گھر اب تک ننھی آوازوں سے ناآشنا ہے؟

بیڈ روم کی کھڑکی میں سے دن باہر نکل کر واپس جا چکا ہے، نیچے بازار کا دریا پوری توانائی سے بہہ رہا ہے۔

یہ دریا صبح شروع ہونے سے بہت پہلے شور مچانے لگتا ہے اور گئی رات تک یونہی زور شور سے بہتا رہتا ہے، بلکہ کبھی کبھی جب باہر کے ممالک سے آنے والی پروازوں کے شیڈول میں اچانک تبدیلی آجاتی ہے تو ذرا سی دیر کو تھمنے والا وقفہ بھی نہیں رہتا —— تب یہ دریا بس بہے چلا جاتا ہے۔

آج چھٹی کا دن بھی ختم ہونے کو ہے

اُس کا شوہر باہر جا چکا ہے۔

نچلی منزل کے فلیٹ سے بچوں کے قہقہے پرندوں کی طرح اس کے بیڈ روم کی کھڑکی میں سے اس کے کمرے میں آجاتے ہیں۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔ آٹھ سال کا طویل سُنسان عرصہ جیسے اچانک ایک منظر کی طرح کیلنڈر پر سے غائب ہو جاتا ہے ـــ لیکن اس سے قبل کہ وہ ان قہقہوں کو اپنی بانہوں میں لے سکے وہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ کھڑکی میں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ بیڈ روم میں سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ٹیبل کلاک ٹک ٹک کرتا رہ جاتا ہے۔

اسے نرسری کا مالی یاد آتا ہے۔

"بیگم صاحب منی پلانٹ کی بیل کے لیے خاص آب و ہوا درکار ہوتی ہے"

وہ بیڈ روم سے باہر نکل کر لاؤنج میں جاتی ہے، ٹی وی آن کرکے بیٹھتی ہے۔ پھر سوئچ آف کر دیتی ہے۔ ایک بے کلی سی ہے جو اُس کے پورے وجود پہ طاری ہے، وہ لمحۂ قرار کی متلاشی ہے لیکن بس وہی ایک لمحہ اس کے ہاتھ نہیں لگتا۔

کچن میں کھانا پکاتے ہوئے کئی بار ایسا ہوا ہے جیسے کوئی خلا میں سے اُسے پکار رہا ہو۔ وہ چونک کر باہر کی طرف دیکھتی ہے۔

دروازہ کھلتا ہے اور اس کا شوہر اپنے ہاتھوں میں کچھ لیے ہوئے سیدھا بیڈ روم میں چلا جاتا ہے ـــ رات پورے فلیٹ پر چھا جاتی ہے۔

نائٹ بلب کی مدھم نیلی روشنی میں سارا بیڈ روم سمندر کی تہہ میں غرق شدہ صدیوں پرانا بحری جہاز دکھائی دیتا ہے ـــ ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے کھلے صندوق مدھم روشنی میں جگر جگر کرتے ہیں ـــ پھر اچانک جہاز کی کھڑکیوں میں سے ننھے ننھے بچے نکل کر تیرتے ہوئے اُس کی جانب آتے ہیں۔

نیلاہٹ مائل اُن کے مرمریں جسم ـــ اب ربر پلانٹ کے پتوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ ڈرائی سینیا کے پتوں کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔

اُن میں سے ایک بچہ اپنے ہاتھوں میں آبدار موتیوں کی بنی ہوئی صراحی تھامے اُس کی جانب تیرتا ہوا آتا ہے۔ جھلمل کرتی صراحی میں سے منی پلانٹ کی لٹکتی ہوئی بیل سرسبز نظر آتی ہے۔

بچے کے سنہری بال اُس کے شانوں پہ لہراتے ہیں اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں اجنبی دُنیاؤں کے پیغامات ستاروں کی طرح ٹمٹماتے ہیں۔

وہ صراحی اُس بچے کے ہاتھوں سے لے کر بچے کو گلے لگانا چاہتی ہے کہ نائٹ بلب بُجھ جاتا ہے۔

رات کا منظر دن کے اُجالے میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی ہے ـــ برابر کے بیڈ سے اُس کا شوہر غائب ہے۔

"آج آفس کو دیر ہو گئی" باتھ روم سے اُس کے چیخنے کی آواز آتی ہے، وہ اٹھتی ہے، سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ اُسے دیکھ کر خاموش رہتا ہے۔ وہ بُرش سے اپنے بال سنوارنے لگتی ہے کہ کھڑکی میں رکھے ہوئے ایک خوبصورت گملے پر اس کی نظر جا ٹکتی ہے۔

جالی کے سفید پردوں میں سے چھنتی ہوئی صبح کی دُودھیا روشنی میں کانٹوں سے بھرا ہوا کیکٹس کا پودا کھڑکی کے فریم میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔